دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
جنوری 2010
معراج رسول

جنوری 2010ء

11 — چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

18 — [illegible] — احمد اقبال

61 — [illegible] — [illegible]
ایک لڑکی کے [illegible]

71 — [illegible] — [illegible]

75 — [illegible] — [illegible]

90 — [illegible] — [illegible]

131 — بزدل — محمد عفان

139 — آزمائش — [illegible] عارف
آزمائش کی آخری گھڑیوں میں ایک
نیا رخ اختیار کرنے والی صورت حال

147 — خواہش — سلیم انور
ایک انوکھے اور اچھوتے خیال کے ذریعے
پوری ہونے والی خواہشات کا ڈراما

151 — نسیان — تنویر ریاض
دیرینہ تہوں میں چھپے جرم کا قصہ
جو صورت عیاں ہونے کو تھا

156 — گرداب — اسما قادری

195 — [illegible] — [illegible]

203 — [illegible] — [illegible]

211 — [illegible] — [illegible]

221 — [illegible] — [illegible] زبیر

256 — التفات دوستاں — غوثیہ شبیر

سال نو کے آغاز پہ قارئین
کے لیے یاد رہ جانے والا سرورق

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

سال نو مبارک

جلد 39 • شمارہ 01 • جنوری 2010 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی، نکتہ چینی

مدیراعلیٰ

عزیزانِ من

السلام علیکم!

چند برس پہلے تک... دسمبر کے جانے کا افسوس اور نئے سال کے آمد کی ملی جلی خوشی سرد موسم میں بھی دل کو گرما دیتی تھی۔ نئے سال کی آمد پر ہر شخص عجب سی سرمستی میں غلطاں نظر آتا تھا لیکن پچھلے چند سالوں سے دلوں میں خوف کا موسم اُتر آیا ہے۔ خوف کی یہ رات جس کی طوالت... سرما کی سرد اُداس راتوں سے بھی بڑھ گئی ہے۔

دہشت اور دہشت گردی نے پورے ملک میں خوف کے پنجے گاڑے ہوئے ہیں، دل چاہتے ہوئے بھی دماغ کو کسی بات پر توجہ مرکوز کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ مہینوں ہو چلے ہیں، ہر طرف سے خاک اور خون کی خبریں مل رہی ہیں، روزانہ معصوم لوگوں کو زمین کا رزق بنا دیے جانے کے واقعات... لگتا ہے یہ اب ہر روز کا معمول ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب ملک میں خودکش بم دھماکے نہ ہوئے ہوں۔ اب جبکہ آپ کے ہاتھوں میں موجود شمارہ پریس میں جانے کے بالکل اختتامی مراحل میں تھا کہ امامِ مظلوم، سید الشہداء، نواسۂ رسول ﷺ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی یاد تازہ کرنے والے روزِ عاشور... کراچی میں دہشت گردی کے نتیجے میں شقی القلبی سے چالیس سے زائد مرد و خواتین، بچے اور حفاظت پر مامور اہلکار بہشتِ بریں کو سدھار گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور ان سے پہلے بم دھماکوں کی نذر ہونے والے تمام شہدا کی مغفرت فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ اس سانحے کے بعد جس منظم پیمانے پر قرب و جوار کے علاقوں میں شہر کے کاروباری مراکز کو لوٹ کر نذرِ آتش کیا گیا، ہزاروں تاجروں کو لمحوں میں بے سروسامان کیا گیا، وہ ہمارے نظم و نسق کے ذمے داروں کے لیے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ دہشت گرد، قاتل اور لٹیرے کب تک ہمیں یونہی تاراج کرتے رہیں گے!

سالِ گزشتہ پر بھی کچھ یہی حالات تھے، اس سے پچھلے برس بھی نئے سال کا سورج خون کی سرخی لیے ہی طلوع ہوا تھا اور 2009ء کے آخری دن بھی لہو کی سرخی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ صوبہ بلوچستان میں خراب امن و امان، لہولہان صوبہ سرحد، پھر پنجاب اور اب پاکستان کے دل کراچی میں ہونے والا یہ اندوہناک سانحہ... سوچیے، یہ حالات 2010ء کے نئے سال کی کیسی منادی دے رہے ہیں۔ دو تین سال ہونے کو آرہے ہیں، لہو میں ڈوبے پاکستان پر دہشت گردی کے بادل ہر آنے والے دن زیادہ گہرے ہو رہے ہیں۔ اسلام کے دعویدار ہی کلمہ گو کے قاتل ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ کس کا لہو ہے، کون مرا ہے؟

آیئے، بارگاہِ ایزدی میں دعا کریں کہ اے اللہ، تیرے محبوب نبی ﷺ کی اُمت پہ عجب وقت پڑا ہے، ہم کمزور گنہگار، عاجز بندے ہیں، ہمیں اس نئے برس پرانی آزمائشوں سے نجات دے، نگاہوں کو محبت آفریں، ذہن کو بے خوف اور قلب کو اطمینان عطا کردے (آمین)

امیدِ یار نظر کا مزاج درد کا رنگ
تم آج کچھ نہ پوچھو کہ دِل اُداس بہت ہے

چلتے ہیں اپنی بزم میں، دور دیس سے آئے سندیسوں کی باتیں سننے...

ارسلان رضا کی چکوال سے آمد اور درخواست ”چینی ویسے ہی اتنی گراں اور مہنگی ہے اس لیے ہم نے یہ سوچا اور ارادہ کیا کہ تھوڑی سی چینی ہم بھی نکتہ چینی کی بزمِ خاص میں ڈال دیں۔ شاید اس سے مٹھاس کچھ بڑھ جائے۔ ہم جاسوسی کے اس وقت سے قاری ہیں جب ہم اسکول میں تھے اور زیادہ تر چھوٹی کہانیوں کی تلاش ہوتی تھی کیونکہ زیادہ انہیں پڑھا جاتا تھا لیکن جب ایک دن کاشف زبیر صاحب کا ایک رنگ پڑھا تو روح تک سرشار ہوگئی پھر تو... مت پوچھیے۔ القصہ یقین کیجیے جاسوسی نے نہ صرف ہماری اردو بہترین کردی بلکہ ہمیں اچھا خاصا لفاظ یا یوں کہیں کہ جاسوس بنا دیا۔ جاسوسی سے ہمیں بہت استفادہ ہوا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح اچھا ہوتا ہے۔ کاشف صاحب کے جلیل اور دراجا ہمیں بہت پسند ہیں۔ منظر امام کا انداز پسند آیا۔ تراش خراش میں خطرناک غلطیاں پڑھ کے کان کھڑے ہوگئے۔ بہت پسند آئیں۔“

ہمایوں سعید رومیو کی بنوں سے داد و فریاد ”سب سے پہلے تو جاسوسی ڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام دوستوں کو بہت بہت عید مبارک۔ خلافِ معمول اس دفعہ جاسوسی نے بہت انتظار کروایا۔ یہی کوئی آٹھ، دس چکر لگوا کر اپنی جھلک دکھلائی۔ سرورق کو یکسر نظرانداز کر کے تیزی سے ورق گردانی کر کے اپنی پسندیدہ محفل میں وارد ہوئے۔ چھٹی حس کے بجنے والے ایمرجنسی الارم نے مجھے مجبور کیا کہ میں سب سے پہلے بلیک لسٹ میں مقیم دوستوں کا جائزہ لوں۔ بلیک لسٹ پر نظر پڑتے ہی دل سے بے شمار شیشے ٹوٹنے کی آواز برآمد ہوئی۔ ایک ٹھنڈی آہ کی صورت میں جگر، پھیپھڑوں اور گردوں نے بھی اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا۔ خلافِ معمول کرسیٔ صدارت پر ایک نئے دوست کو براجمان پایا۔ تبصرہ واقعی اول پوزیشن کا حق دار تھا۔ مبارک ہو۔ ناصر بھائی! بے شک حق، باطل کو مٹاتا ہے۔ آپ کا شعر اچھا لگا۔ سائرہ مسعود، آپ کے رضوان اور آمنہ پٹھانی کو دیے گئے مفت مشورے ہمیں بے حد پسند آئے۔ دلنشیں بلوچ! آپ تو جاسوسی سے اظہارِ محبت میں اس قدر جذباتی ہوگئیں کہ غلطی سے اپنی عمر جیسا خفیہ راز افشا کردیا۔ سرفراز صاحب! آپ بلاوجہ خفا ہو رہے ہیں۔ جو اچھا تبصرہ لکھے گا، وہ بلاشبہ سراہا جائے گا۔ آپ نے اس بار اچھا اور تفصیلی تبصرہ لکھا۔ سو آپ ہوئے تعریف کے حق دار۔ حسبِ معمول گرداب سے شروعات کی۔ دھماکے کا عینی شاہد ہونے کے باوجود اے سی صاحب نے جس کمال سے اپنے اعصاب پر قابو رکھا، وہ بلاشبہ لائقِ تحسین ہے۔ چودھری کی تازہ کارروائی نے بے حد اپ سیٹ

کیا۔ پلیز اسماجی! ماہ بانو کو کسی بھی طرح منظرِ عام پر لائیں۔ گرداب کی تلخی کو کم کرنے میں ہنس کی چال اور سادہ لوح نے اہم کردار ادا کیا۔ سادہ لوح نے تو کمال ہی کر دیا۔ مرنی کی ذہانت نے متاثر کیا۔ راجا اس بار برا پھنسا۔ مشورہ نہ کرنے سے اور اپنی من مانی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ چڑیل کو بالکل کسی انگلش فلم کی طرح انجوائے کیا۔ خوب صورت منظر نگاری پر مریم کے خان کو مبارک باد۔ اس کے بعد سلیم فاروقی کی راندۂ درگاہ پڑھی۔ اگر اس ملک کا ہر جوان اعجاز جیسی حب الوطنی کا مظاہرہ کرے تو کسی کی اتنی جرأت نہیں کہ وہ اس پاک سرزمین کو اپنے ناپاک عزائم کے لیے استعمال کر سکے۔ تصویرِ گماں جعلی پیروں فقیروں کے کرتوتوں سے پردہ اٹھاتی خوب صورت کہانی تھی مگر اس کے باوجود ہماری قوم ان پیروں، فقیروں سے خطرناک حد تک عقیدت رکھتی ہے۔ بہر حال، مصنف کا کام حقائق کو منظرِ عام پر لانا ہے۔''

رحیم یار خان سے قاری عبدالماجد اشرفی کی ناراضی وتنقید ''سنسنی جاسوسیت اور دریاؤں سے بھرپور ریت کا دریا، اولین صفحات پر آنے کا حق خوب ادا کر رہی ہے جبکہ گرداب تو واقعی گرداب ہی ثابت ہو رہی ہے کہ موصوفہ کا ہیرو جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہے، وہی اس کے لیے گرداب بن جاتا ہے اور رہی ہیروئن ماہ بانو بی بی تو وہ جانے کہاں چھپا دی ہے اسما قادری نے۔ رنگِ اول فاروقی کا تھا، سو اسے دیکھے بغیر ہی آگے بڑھ گئے۔ رنگِ دوم منظر امام کا تھا جسے دیکھنے بلکہ پڑھنے بیٹھ گئے لیکن ذرا سی دیر میں ہمیں محسوس ہوا کہ یہ رنگ بھی ہمارے مطلب کا نہیں۔ اس لیے اقبالؒ کے شاہین کی طرح واپس پلٹے چھوٹی کہانیوں پر۔ (ہوسکتا ہے آپ کو تحریر پسند نہیں آئی ہو لیکن ہر قاری کی یہ رائے نہیں ہے)۔ پرانا زخم میں مجرم تو سلمان جتنی افروز بھی تھی لیکن اپنے روایتی نسوانی ہنر سے سلمان کو مروا دیا۔ پینڈورا باکس اس ماہ کی خاص جبکہ جاسوس خاص الخاص سوغات تھیں جنھیں دل تھام کے پڑھنا پڑا۔ چڑیل اور راز گزارے لائق ہی تھیں جنھیں ٹائم پاس کرنے کے لیے پڑھنا پڑا اور آخر میں ایک عرض وگزارش کہ آخری صفحات کے رنگوں کا معیار پست ہوتا جا رہا ہے مصنف ایسے انداز میں کہانی چلاتے ہیں کہ جیسے وہ 12 سال کے بچوں کو کہانی سنا رہے ہوں۔ (ایسا ہے تو نہیں... مگر آپ کی رائے کا احترام کیا جائے گا... اس ماہ کے سرورق پڑھ کے رائے دینا نہ بھولیے گا)۔''

چارسدہ سے عابد جان لکھتے ہیں ''جاسوسی حسبِ معمول چار تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو ایک خوب صورت سی لڑکی اپنی نشیلی آنکھوں اور سرخ لبوں کے ساتھ کسی کو تک رہی تھی۔ (شاید ہمیں)۔ ایک طرف ایک لمبے بالوں اور ہلکی ڈاڑھی مونچھوں والا ایک آدمی عینک لگا کے ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا جبکہ دوسری طرف ایک اور آدمی منہ کھولے کھڑا تھا۔ ویسے انکل سے ایک تجویز نما درخواست ہے۔ آپ لڑکیوں کو بہت نازک بنا لیتے ہیں اور مردوں کو نہایت ہی کرخت صورت... اس کا الٹ بھی کیجیے نا۔ اشتہارات سے پیچھا چھڑاتے ہوئے سیدھا اپنی محفل میں جا پہنچے۔ پہلے نمبر پر اپنا نام دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ویسے میرا نام عابد جان ہے عابد خان نہیں، لہٰذا درستگی کر لی جائے تا کہ سند رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔ ویسے سائرہ مسعود صاحبہ، پٹھانوں کی اپنی ہی ایک شان ہے (اپن خود بھی پٹھان ہیں)۔ سندس صاحبہ کو گرداب اچھی نہیں لگتی۔ ویسے یہ کہانی حقیقت کے بہت قریب تر ہے۔ جتوئی صاحب ذرا خیال رکھا کریں، ایک ہی سانس میں سب پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ شبلی صاحب! ایس ایس ناز سے نہ ملیں تو اچھا ہے۔ اگر کھڑا آپ کی امیدوں کے برعکس نکلا تو؟ تو لی صاحب! دھیرج بھائی دھیرج۔ لگتا ہے آپ کریلا بہت کھاتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ریت کا دریا پڑھی۔ آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ لگتا ہے اقبال کاظمی صاحب ان علاقوں کے بارے میں کافی جانکاری رکھتے تھے۔ اس کے بعد گرداب کی باری آئی۔ بہت زبردست جا رہی ہے لیکن پہلی بار کسی ہیروئن کے بغیر کہانی کی ایک پوری قسط پڑھ کر حیرت ضرور ہوئی۔ سرورق کے دونوں رنگ بالکل فضول لگے۔ سلیم فاروقی صاحب کی کہانیوں میں یکسانیت آتی جا رہی ہے۔ ان کا ہر ہیرو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتا ہے اور مارشل آرٹ کا ماہر ہوتا ہے جو کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے۔ منظر امام صاحب کی تصویرِ گماں بھی خاص اثر نہ چھوڑ سکی۔ چھوٹی کہانیوں میں سب سے بہترین کہانی جاسوس تھی۔ ایک بچے کے جذبۂ حب الوطنی نے بہت متاثر کیا۔ ہنس کی چال میں بے چارہ راجا پھر پھنس گیا اور لگتا ہے کہ جلیل میاں سہرا باندھنے ہی والے ہیں۔ باقی کہانیوں میں چڑیل، سادہ لوح اور پرکھ اچھی کہانیاں تھیں۔ راز انتہائی بور کہانی تھی۔''

محمد اسحاق انجم کی التماس قصور سے ''ہاتھ میں پستول پکڑ کر عید مبارک کہنا... لاکھ حسینہ ساتھ ہو، کیا خاک ہماری عید ہوگی! ہمیں تو حسینہ کی آنکھیں ہی بتا رہی ہیں کہ بچ جاؤ اس آدمی سے، یہ کوئی گہری چال ہے جو آپ کو عید مبارک کہہ رہے ہیں اور حسینہ کے ہونٹ کہہ رہے ہیں، پریشانی ہی پریشانی آنے والی ہے۔ یہ سبز چشمے والے سے بچو... سو ہم نہ کہتے ہوئے بھی خیر مبارک کہہ کر بھاگ کر ریت کا دریا پار کرنے پہنچ گئے۔ سادہ لوح تھے اس لیے پرکھ نہ سکے اور گرداب میں پھنس گئے۔ بھلا ہو ہنس کی چال چلتا ہوا ایک جاسوس کا جو ہمیں راز سے پینڈورا باکس میں بند کر کے ایک چڑیل کے پاس لے گیا۔ ہم پرانا زخم بنے تصویرِ گماں کی طرح چلتے ہوئے راندۂ درگاہ خدا خدا کر کے پہنچ ہی گئے۔ اب آگے چینی، نکتہ چینی والوں کی مرضی ہے کہ وہ ہمیں تراش خراش کرتے ہیں کہ نہیں؟''

عبدالسلام صدیقی بن عبیداللہ نائب کی تنقید ملتان سے ''اس دفعہ سب سے بہترین کہانی پینڈورا باکس تھی، ایک دم پرفیکٹ اور سب سے بور کہانی تھی راز۔ اور جہاں تک چڑیل کا تعلق ہے، یہ بچوں کے لیے تو یقیناً دلچسپ ہوگی لیکن ہمارے لیے... ہنس کی چال... اس دفعہ مسکراہٹیں کم تھیں۔ گرداب... یہ کسی کروٹ بیٹھتی نظر نہیں آتی۔ کیا پاکستان کے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔ راندۂ درگاہ... اس میں کئی جھول تھے۔ (آپ نے جن باتوں کی نشان دہی کی ہے اگر تمام باتیں شروع میں عیاں کر دی جائیں تو کہانی لکھنے کا فائدہ۔ اس میں سسپنس بھی رکھنا ہوتا ہے اور باتیں قاری کی سمجھ بوجھ کے لیے چھوڑی جاتی ہیں)۔ تصویرِ گماں... پہلے تو وہ روح ہی تھی، بعد میں ڈراما قرار دے دیا گیا۔ رائٹر نے کہانی کو یک دم پلٹا دیا۔ بھلا کوئی انسان پلک جھپکنے پر ہر جگہ پہنچ جاتا ہے البتہ جو رائٹر کا پر پڑتا وہ ٹھیک تھا کہ دنیا بھر میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص ایسے مرشد بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ عابد جان صاحب! آپ کن چکروں میں پڑ گئے، وہ تو محاورے والا مکھن استعمال کرتے ہیں۔ انعام علی مہمند صاحب! معقول لڑکی دانت نہیں نکالتی ہے۔ سندس جبیں صاحبہ! مغل اور پٹھانی کا کوئی جوڑ نہیں اس لیے چونچ لڑانے سے باز رہیں۔ نومی اے صاحب! آئی لائک یور ریمارکس اباؤٹ ویمن۔ محمد سرفراز صاحب! ہنسنا مسکرانا اب شاید پاکستانیوں

کے مقدر میں نہیں ہے۔ شجاع چودھری صاحبہ! باجی جیسا مقدس رشتہ آپ کو پسند نہیں یا آپ کسی اور رشتے کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ مصدق محمود دانش صاحب! اپنے نام ہی کی لاج رکھ لیں اور واہیات قسم کی باتوں سے پرہیز کریں اور دوسروں کی بہنوں کو اپنی بھی بہنیں سمجھو۔ محمد شبیر شبلی صاحب! اتنے کم ہمت تو نہیں ہیں لیکن ذاکر صاحب کی سختیوں نے تھکا دیا۔ ایس ایس ناز صاحبہ! کیا بات ہے اپنی زبان میں مٹھاس پیدا کریں، یہ روٹھی ہوئی بیویوں کی طرح چک چک مجھے اچھی نہیں لگتی۔ کیا بات ہے اس دفعہ چھوٹی کہانیاں بڑی کہانیوں سے بڑی تھیں اور آخر میں سرورق... حسبِ منشا تھا... یعنی ایک انار اور تین بیمار... ایک کرخت اور دوسرا برِ سر تلوار... آپ پریشان کیوں ہو گئے۔ تیسرا انار ''میں'' ہوں... مم.. مم... میں... (سب سے درست بات یہی لکھی ہے آپ نے... تنقید کرنے کے باوجود ہم تبصرے شائع کرتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہو گیا؟)

مہر اے ڈی سیال کی باتیں خانیوال سے ''اس سرتبہ حسینہ سرورق تو اچھی نہیں لگی البتہ ایک صاحب منہ کھولے بھاگ رہے ہیں اور دوسرے عید مبارک کے اوپر ریوالور تانے سبز چشمے میں سے ہمیں دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اشتہارات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے بزم چٹخارا میں پہنچے۔ چینی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے اب محفل کا ٹائٹل چینی، نکتہ چینی کے بجائے مرچ ڈاٹ چٹخارا ہونا چاہیے انکل جی کا لکھا ہوا اداریہ پڑھ کر ہمارے ذہن کے کسی کونے میں بہت شدت سے ایک گیت گونجنے لگا۔

دھرتی سنہری، امبر نیلا ہر موسم رنگیلا، ایسا دیس ہے میرا

مگر ہم میں سے کچھ عاقبت نااندیش اس دیس کی رنگینیوں کو خون کے رنگ سے گہنا دینا چاہتے ہیں مگر پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ خدا ان کو ہدایت عطا فرمائے اور انکل جی کے لیے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو شفائے کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے اور ان کو علم وادب کی مزید خدمت کرنے کی ہمت عطا فرمائے (آمین)۔ چارسدہ سے نئے آنے والے عابد جان کی پہلی توصیف ہی منظور ہو گئی۔ ورنہ ندا مغل تو توضیح کر کر کے بھی تھک چکی ہیں اور اب لگتا ہے بہ طور احتجاج واک آؤٹ کر گئی ہیں۔ دل بہار جب ہم سیاست کی گرما گری سے تنگ آ کر آپ کا نام دیکھتے ہیں تو سردیوں میں بھی دل بہار فالودہ کی یاد آ جاتی ہے۔ ایس ایس ناز صاحبہ! آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ، ہم بھی یہی سوچ رہے تھے۔ انکل جی! ہم ساگر ٹکو کر کی فرمائش سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ محمد سرفراز! آپ کو تو ناپ پر ہونا چاہیے تھا۔ خیر، ہماری طرف سے اتنا اچھا تبصرہ لکھنے پر مبارک باد۔ شجاع چودھری! یہی سب سے بڑی خرابی ہے صنفِ نازک کی کہ آپ ہر کسی کے خلوص پر شک کرنے لگتی ہیں۔ ڈیئر ہمایوں سعید! صنفِ نازک کی عزت کرنے میں محتاط رہیے گا۔ محمد سلیم شبلی! جناب اس میدان میں تو بڑے بڑے برج الٹ جاتے ہیں ہم کس گگن کے تارے۔ مصدق محمود دانش صاحب! جناب ہم نے تو ایک کاغذی حسینہ کو حسرت سے دیکھا مگر جناب نوشی جی کے لیے اتنا زیادہ ایموشنل کیوں ہو رہے ہیں۔ کچھ تو خیال کریں اپنی صنف کی عزت کا۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ریت کا دریا جو کہ ہمارے مرحوم مصنف اقبال کاظمی صاحب کی کاوش ہے اس لیے ہم کوئی مشورہ تو نہیں دے سکتے البتہ اپنی پسند کا اظہار کر سکتے ہیں اور وہ ہے ففٹی ففٹی۔ گرداب میں لگتا ہے اب چودھری اور اے سی میں دوبدو مقابلہ ہونے والا ہے۔ سادہ لوح میں مزاح تو ہمیں نظر نہیں آیا البتہ مزہ دے گئی۔ جاسوس میں گورکی کے کردار نے متاثر کیا اور کرنا بھی چاہیے تھا کیونکہ ہم بھی محبِ وطن ہیں۔ ہمارے آئیڈیل اور موسٹ فیورٹ رائٹر جناب کاشف زبیر صاحب عید قرباں کا تحفہ جلیل میاں لے کر آئے جو کہ اپنی شادی اور راجا کو بچانے کے چکروں میں نظر آئے۔ اب ہمیں یہ جاننے کا بے چینی سے انتظار رہے گا کہ جلیل صاحب ٹیلر ماسٹر بن کر شادی رچاتے ہیں یا ٹیلرنگ کے شعبے کا بھی ان کے ہاتھوں سوا ستیاناس ہوتا ہے۔ راز بہت ہی بور اسٹوری تھی جسے ہم آدھا ہی پڑھ سکے۔ ثمر عباس کی پینڈورا باکس بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ پہلا رنگ تو کچھ اچھا تھا مگر دوسرا رنگ بالکل بے مزہ۔''

ایم اے صدیقی کا محبت نامہ واہ کینٹ ضلع راولپنڈی سے ''ٹائٹل خوب صورت ماہ جبیں سے جگمگا رہا تھا۔ ایک شخص پسٹل تھامے حسینہ کو ڈرانے میں مشغول تھا اور دوسرا شخص 2009ء گزرنے کے غم میں حسرت وامید سے بلبلا رہا تھا۔ اشتہارات کو ایک نظر سے دیکھ کر اپنی محفل، محفلِ خونچاں میں حاضر ہو گئے۔ عابد جان فرام چارسدہ نمبر ون پوزیشن حاصل کرنے پر خوشی سے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ جان صاحب! ذرا دھیرے دھیرے، کہیں خوشیوں کو زنگ نہ لگ جائے۔ ہم آپ کو وکٹری اسٹینڈ پر آنے کی خوشی میں ایک عدد لولی پوپ پیش کرتے ہیں، قبول فرمائیے۔ سائرہ مسعود صاحبہ! جیلس ہونا چھوڑ دیں۔ ساری عمر حسد پن میں گزر گئی، اب آخر میں توبہ استغفار کر لیں۔ آخرت سنور جائے گی۔ ایس ایس ناز صاحبہ! آپ کا نام دیکھ کر ہمیں نجوی ایس ایس کاظمی یاد آ گئے۔ کہیں خدانا خواستہ آپ موصوف کی رشتے دار تو نہیں...؟ ہمارے پڑوس ٹیکسلا سے دلنشیں صاحبہ بھی اپنے دانتوں کی نمائش کر رہی تھیں۔ میڈم شجاع صاحبہ! آپ یہ بتائیے کہ آپ نے زندگی میں کتنی بار دماغ استعمال کیا ہے، دماغ ہے بھی یا...؟ آپ کا تبصرہ پڑھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے... خواتین میں سے ہمارے ننھیال سے آمنہ صاحبہ کا تبصرہ قابلِ تعریف تھا۔ محترمہ بونگیاں ذرا کم مارا کریں، ایسا کرنے سے آپ بھی تختِ طاؤس پر براجمان ہو سکتی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اقبال کاظمی کے درشن دیے۔ زن، زر اور زمین کے گرد گھومتی ہوئی اسٹوری بہت خوب صورت کاوش ہے۔ ریت کا دریا اس مادہ پرست سماج کا آئینہ ہے۔ جاگیرداروں اور افسر شاہی کا محور گرداب لاقانونیت کا خوب صورت اظہار ہے۔ جس ملک کے افسر اور جاگیردار خود ہی ملک وقوم کے دشمن بن جائیں، اس ملک وقوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔ لوڈر کے ڈرائیور نے جھوٹ بول کر خود اپنی موت کو آواز دی۔ شاہنواز جیسے لوگ ملک وقوم کے ناسور ہیں۔ ایسے لوگوں کو ختم کرنے سے ہی ہماری بقا ہے۔ شہریار کا جذبۂ حب الوطنی اور دلیری قابلِ تعریف ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں سے محترم کاشف زبیر کی ہنس کی چال نے بہت محظوظ کیا۔ راجا کی قسمت اچھی تھی جو وہ مرزا کے شکنجے سے بچ نکلا۔ جلیل نے اس مرتبہ اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا۔ سادہ لوح آصف ملک کی بہترین کاوش تھی۔ ڈیکوٹ کو اپنے کیے کی سزا ملی۔ کلین اینڈ اس کی فیملی کو ہیروں کی صورت میں جزا مل گئی۔ پرکھ خوش قسمت انسان کا احوال تھا۔ جارج کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا ورنہ چاقو کا ٹیسٹ ہونے کی صورت میں سزائے موت اس کا مقدر بنتی۔ ثمر عباس پینڈورا باکس لیے حاضرِ خدمت تھے۔ فان اینڈ کمپنی کا منصوبہ زبردست تھا مگر وہ شراب کے نشے کی وجہ سے ملیا میٹ ہو گیا۔ شیرن دولت کی لالچ کی وجہ سے موت کے منہ میں جا گرا۔ مریم کے خان چڑیلوں کے درشن کرا رہی تھیں۔ بے چاری سرینا اپنی معصومیت کی وجہ سے گمراہ ہو گئی۔ شیرن غرور اور طاقت کے نشے کی وجہ سے تباہی کا شکار ہوئی۔ راز اور پرانا زخم

بھی بہترین کہانیاں تھیں، خوب انجوائے کیا۔ سلیم فاروقی کے دستِ قلم سے تحریر شدہ راندۂ درگاہ ایمان فروشوں کی داستان تھی۔ چودھری شہباز اور چودھری سرفراز جیسے لوگوں کو زندہ درگور کر دیا جانا چاہیے۔ اعجاز نے غدارِ وطن سے صحیح سلوک کیا۔ وہ اسی سلوک کے مستحق تھے۔ آخری رنگ تصویرِ گماں بے بس اور مظلوم انسانوں کی داستان تھی۔ مرشد نظام الدین انسان کے روپ میں بھیڑیا تھا۔ آج ہمارا معاشرہ مرشد جیسے جعلی پیروں اور عاملوں سے بھرا ہے۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے فضل محمد کی یاد آوری ''آج تقریباً دو سال کے بعد یارانِ محفل کے ہاؤ ہو میں شرکت کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ میری دو سالہ کچھ ایسی مصروفیات تھیں کہ جاسوسی کو خط تک نہ لکھ سکا۔ میں دعویٰ تو نہیں کر رہا کہ کسی دور میں جاسوسی کے یارانِ محفل میں ہمارا طوطی بولتا تھا لیکن یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت کے کشش فرام فیصل آباد، مریم احمد سیالکوٹ، مس سعدیہ ایڈووکیٹ سرگودھا، بشریٰ افضل اور ضیغم عباس صاحب تھے جو ایک دوسرے سے نمبر لے جانے کی دوڑ میں شامل تھے۔ اب بھی تبصرے اچھے تھے۔ میں نے پولیس فورس جوائن کی ہے آپ سب اسٹاف، قارئین اور اسٹاف کے ذریعے عوام سے التماس ہے کہ ہمارے لیے دعا کریں کہ ہم ملک دشمن عناصر کے خلاف سینہ سپر اور لوہے کی دیوار کی مانند ثابت ہوں تاکہ ہمارا پاکستان جو کہ اس وقت عراق اور افغانستان سے بدتر ہے، پہلے والا پاکستان اقبال اور قائداعظم کا پاکستان بنے۔ 2009ء کا سال ہنگاموں اور دھماکوں کا سال تھا جو کہ اختتام ہو رہا ہے اور انشاء اللہ 2010ء کا سال خوشیوں کا سال ہوگا، آمین۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ 4 دسمبر کو ملا۔ دو دہشت گردوں کے درمیان ایک خوب صورت حسینہ کسی تیسرے کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ کسی تیسرے کی مدد سے ان دو دہشت گردوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں تھی۔ ایک دہشت گرد چیخ چیخ کر شاید کسی کو للکار رہا تھا جبکہ دوسرا ریمبو کی طرح ایکشن میں ہتھیار کی نمائش کر رہا تھا جبکہ نیچے کونے میں عید مبارک کا پیغام تھا۔ شاید یہ دہشت گردوں کی طرف سے وارننگ یا آخری پکار تھی۔ بہرحال، سرورق خوب صورت تھا اور ایک طرح سے پیغام بھی... جبکہ پری چہرہ کا کوئی جواب نہیں۔ اس دفعہ تبصروں پر کچھ کہنے یا لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا لانگ جمپ لگاتے ہوئے سیدھا کہانیوں کی طرف چلا گیا۔ اقبال کاظمی کی ریت کا دریا پڑھی۔ یہ دوسری قسط تھی۔ دوسری قسط میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سفرنامہ پڑھتے ہوئے یا سید عابد براہِ راست جنگلوں میں جا پہنچے جہاں ایڈووکیٹ ندیم گئے جبکہ سلطان زیدی بطور وکیل خاص فیروز یا ہمن کے وکیل کے طور پر اچھے جا رہے تھے۔ دوسرے نمبر پر اسما قادری صاحبہ کی گرداب پڑھی۔ سلسلہ وار کہانیاں اچھی جا رہی ہیں۔ ثمر عباس کی پنڈورا باکس پڑھی۔ فان کا گروپ صحیح تھا لیکن دنیتو نے ان سب کی کامیابیوں پر اس وقت پانی پھیر دیا جب وہ شیرن سے بار میں ملا۔ بہرحال، ایک اچھی کوشش تھی۔ تنویر ریاض کی کہانی راز کی سمجھ نہیں آئی۔ ایسی بورسی کہانی تھی۔ اگر اس طرح کوئی عورت فادر یا مسجد کے مولوی کی جگہ لے تو یہ سب اتنی آسانی سے ممکن ہے؟ نجمہ مودی صاحبہ کی کہانی پرانا زخم پڑھی۔ بڑی سبق آموز کہانی تھی کہ عورت جنت اور جہنم بھی ہے۔ سرورق کے رنگوں میں سلیم فاروقی صاحب کا پہلا رنگ راندۂ درگاہ پڑھی۔ دوسرا رنگ منظر امام صاحب کا تھا۔ کہانی تصویرِ گماں تھی، کہانی اچھی تھی لیکن کیا اس دور میں بھی دو ہم شکل اور جڑواں بہنیں ہوتی ہیں؟ (کیوں، اس دور میں کیا بچے پیدا نہیں ہو رہے؟) میرے خیال میں نہیں۔ انیس بیس کا فرق واضح ہوتا ہے۔ آخری کہانی کاشف زبیر صاحب کی ہنس کی چال پڑھی۔ ایک بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ کاشف صاحب کی جلیل سے کیا دشمنی ہے کہ اس کی شادی نہیں کروا رہے یا پھر دونوں آنکھوں میں سے ایک آنکھ کی نظر خدانا خواستہ شنو پر لگی ہوئی ہے۔ تو کاشف صاحب، جلیل سے یہ ٹکراؤ مہنگا پڑے گا سوچ لیں۔ جلیل اکیلا نہیں، اس کے ساتھ اس کا یار راجا بد بخت بھی ہے۔''

ٹریل ایس کے اسماعیل کی دستک خیبر ایجنسی شاہ کس سے ''چار دسمبر کو مارکیٹ سے ڈائجسٹ حاصل کیا۔ سرورق پر ایک حسینہ موجود تھی۔ کافی عرصے بعد ذاکر انکل کے ہاتھوں سے کوئی زبردست حسینہ برآمد ہوئی۔ ستواں ناک، لپ اسٹک سے رنگے ہوئے سرخ خوب صورت ہونٹ، سرخ و سفید رخسار اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں کے ساتھ ایک بھرپور حسینہ تھی۔ حسینہ کے نیچے ایک آدمی کسے پر پیچ پر رہا تھا اور حسینہ کے سر سے سر ملائے ایک آدمی ہاتھ میں کھلونا پستول لیے کسی کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چارسدہ سے عابد جان کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ سائرہ صاحبہ! لوجی میں حاضر ہو گیا مگر طویل تبصرے کے ساتھ نہیں کیونکہ کالج میں پری بورڈ ایگزام چل رہا ہے۔ چودھری دل بہار اگر قیصر عباس کو نہیں ڈرا رہی وہ چڑیل تو مجھے ضرور ڈرا رہی ہے۔ محمد سرفراز جلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شجاع چودھری کو باجی نہ کہو بلکہ دادی کہو۔ محمد سلیم اپنا بے کار مشورہ اپنے پاس رکھو۔ رضوان صاحب اپنے ساتھ پوری قوم اور گاؤں کو لائے تھے۔ سائرہ صاحبہ! آپ کو جاسوسی ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید اینڈ شکریہ۔ کہانیوں کی ابتدا گرداب سے کر دی۔ ہمیشہ کی طرح غریب لوگ مر گئے اور وی آئی پی لوگ زندہ بچ گئے۔ اے سی نے بہت ہوشیاری سے سارا معاملہ سنبھال لیا۔ ایس پی اور اے سی کے درمیان کافی سرد جنگ جاری ہے۔ آئی جی صاحب نے اے سی کو ہر کام میں ملوث ہونے سے روک دیا۔ باجوہ کی رہائی اور گواہ کی موت نے افسردہ کر دیا۔ ریت کا دریا میں ندیم بہت تکالیف اور مصیبتوں کے بعد گگن دیپ تک پہنچا مگر اس کو پیسوں سے کوئی مطلب نہیں ہے اور وہ دستخط نہیں کرنا چاہتی۔ دیکھتے ہیں ندیم اس کو کس طرح راضی کر لیتا ہے۔ دوسری طرف فیروز کے خاندان پر وصیت ظاہر ہونے سے ان کی زبانیں تالو سے چپک گئیں اور انہوں نے وصیت کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ وکرم نے بھی خوفناک انٹری کر دی اور فیروز کو ذہنی مریض اور دوسری معلومات کے لیے وکیل چوپڑا سے معاہدہ کر لیا۔'' (محترم کیا پوری کہانی لکھ دو گے، کچھ پڑھنے کے لیے بھی چھوڑ دو۔)

بہاولپور سے نومی اپنے ادھورے تبصرے کے ساتھ ''سب سے پہلے تمام دوستوں کو نیا سال مبارک۔ دعا و امید یہی کہ آنے والا سال ہمارے ملک کے لیے خوش آئند ثابت ہو۔ 5 دسمبر کی سرد شام کو رسالہ لیے بھاپ اڑاتی کافی کے مگ کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔ سرورق میں حسینہ کی چمکتی آنکھوں کے سوا کچھ خاص نہ تھا۔ اداریے کی چٹخارے دار تحریر پڑھ کر عید کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ عابد جان صاحب کی پہلی کوشش اس قدر کامیاب ہونے پر مبارکباد۔ سائرہ آپی، ندا مغل اینڈ فاطمہ گل کو خیر سے مکھن لگ رہے ہیں... دل بہار انجم جاسوسی کی حسینہ کی دلفریب مسکراہٹ سے صنفِ کرخت کا حال دوسرے رنگ میں پڑھ کر

سبق حاصل کرو، کہیں تم بھی... عبدالسلام صدیقی آپ کے آٹھ لفظ سمجھ نہیں آئے؟ دلنشین صاحبہ آپ کا اظہارِ محبت کچھ زیادہ ہی جوشیلا تھا، ہتھ ہولا رکھیں۔ سندس جبیں دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ (بیماری ہیپا ٹائٹس اے اور ساتھ ہی اپینڈ کس کا آپریشن) اور کمال ہے آپ کو گرداب ٹائم برباد کہانی لگتی ہے۔ مصدق محمود تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ رضوان تنولی صاحب کے تعاون کے بعد سب کو تسلی ہو گئی ہوگی۔ کہانیوں میں گرداب نے جکڑا، شہریار کے کام قابلِ ستائش ہیں۔ ہیروئن کو تو واپس لے آئیں۔ دونوں رنگ بھی جاسوسی ڈائجسٹ کی شایانِ شان تھے۔ باقی کہانیاں امتحانات کی تیاری کے باعث پینڈنگ میں چلی گئیں۔''

ایم افضال ذوالفقار کی شاہ پور صدر، سرگودھا سے تعریفیں ''شمارہ حسبِ معمول چار دسمبر کو ملا۔ سرورق کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اس کے لیے باقی لوگ کافی ہیں۔ اس کے بعد اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے محفل اوٹ پٹانگ میں انٹری دی جہاں پر چارسدہ سے تشریف لائے ہوئے عابد جان صاحب کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ تبصرہ واقعی جان دار تھا۔ ناصر محمود صاحب کا شعر تو ہمارے اوپر سے ہی گزر گیا۔ کوئٹہ سے آغا گل صاحب کی مختصر سی تحریر اچھی لگی۔ سائرہ مسعود صاحبہ نے ندا مغل صاحبہ کی جگہ خوب سنبھالی ہے۔ چوہدری دل بہار صاحب یہ سینگوں والی چڑیلیں قیصر صاحب کو ڈراتی ہیں یا نہیں، بہرحال آپ اپنا خیال رکھیے گا۔ انعام علی مہمند کا تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ عبدالسلام صدیقی صاحب، آپ کا تبصرہ میرا پسندیدہ تبصرہ ہوتا ہے۔ دلنشین بلوچ آپ جاسوسی کو کسی اور نام سے نہ پکاریں بلکہ جاسوسی ہی درست ہے۔ گوجرانوالہ سے سندس جبیں کی باتیں من کو بھا گئیں۔ نومی اے صاحب آپ کا تبصرہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ رضوان صاحب آپ کے نام کے بارے میں تفصیل جان کر خوشی ہوئی، باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی جان دار تھے۔ سب سے پہلے گرداب کی چھٹی قسط پڑھی، اسما صاحبہ پلیز کہانی کو تھوڑی رفتار سے چلائیں، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ریت کا دریا اقبال کاظمی کی پُرکشش تحریر ہے لہٰذا اس کو فی الحال رہنے دیں۔ سادہ لوح، آصف ملک صاحب کی قابلِ انعام تحریر تھی جس میں گلین کی فیملی کے ہاتھ لاٹری لگ گئی تھی۔ پرکھ، یعقوب جمیل صاحب کی تحریر کوئی خاص تاثر نہ قائم کر سکی۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں جاسوس محمد عفان کی پہلے نمبر پر رہی۔ محمد عفان صاحب میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔ ہنس کی چال، کاشف زبیر صاحب کی پُرمزاح تحریر کے اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ پنڈورا باکس ثمر عباس کی دلکش تحریر تھی۔ ثمر صاحب مبارک ہو۔ مریم کے خان صاحبہ کی چڑیل ہمارے تو اوپر سے گزر گئی۔ راز میں بالآخر جم ڈینڈی اور ڈوڈی نے راز فاش کر ہی دیا۔ تلاش جستجو میں لکھی گئی تحریر کافی خوبصورت تھی۔ نجمہ مودی صاحبہ کی مختصر مگر سبق آموز تحریر دل کو کافی اچھی لگی۔ رنگوں میں پہلا رنگ راندۂ درگاہ پہلے نمبر پر رہی۔ سلیم فاروقی صاحب دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد وصول کیجیے۔ دوسرا رنگ تصویرِ گماں منظر امام صاحب کی بھی دلکش تحریر تھی۔ غرض اس سال کا آخری پرچہ پہلے نمبر پر رہا۔''

ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ کی نکتہ چینی ''دسمبر 2009ء سال کا آخری شمارہ کس تگ و دو سے حاصل کیا، یہ دل شکن، ٹانگ شکن، پسینہ شکن، ایک لمبی گمبھیر، دل پذیر اشک گیر داستان ہے جسے میں گھپا میں ہی رہنے دوں تو یہ میرے لیے بہتر ہے۔ سرورق پر نظر ڈالی، حسینہ تازہ تازہ فیشل کروائے، خوب لشک پشک کر رہی تھی اور اب بہت غور سے شاید آئینہ دیکھ رہی ہے۔ سائیڈ پر ایک ولن ٹائپ نوجوان جو کہ بال، ڈاڑھی، مونچھ براؤن رنگوا کر سبز چشمہ خرید بیٹھا ہے۔ تمام چیزوں سے بچتے ہوئے اپنی محفل کی طرف بڑھی، یہ کیا؟ اداریے کے خوبصورت الفاظ میں ان کے طلسم میں کھو گئی۔ دسمبر بہت بہت پسند ہے اور میری بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ عابد جان مبارکاں۔ سائرہ مسعود آپ نے آمنہ پٹھانی کو درست جواب دیا۔ ایس ایس ناز، عبدالسلام صدیقی، محمد سلیم شبلی، بھئی تساں ملتان وچ کیہڑی جگہ راہندے ہو۔ شجاع چودھری، نوشی مامی ہے تو ماما جی کا نام کیا ہے؟ اے جے کسانہ اب اپنا جرم ظاہر کر دو، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا شاباش! رضوان تنولی ہم پہلے ہی تنولیوں سے الرجک ہیں، اوپر سے تم کھتری بھی ہو، استغفار۔ گرداب پڑھی۔ قسط بور تھی، سر میں درد ہو گیا۔ منظر امام صاحب، تصویرِ گماں میں متاثر نہ کر سکے۔ بالکل پھیکا تحریر تھی۔ نجمہ مودی صاحبہ پرانا زخم لے کر آئیں، گڈ! عورت نے اپنا صدیوں کا آزمودہ حربہ استعمال کیا اور کامیاب ہوئی۔ آصف ملک صاحب کی سادہ لوح بہت اچھی تحریر تھی۔ کہانی میں کوئی جھول نہ تھا، کاش ایک ہیرا مجھے مل جاتا۔ باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔''

چودھری دل بہار انجم کا تبصرہ بستی ملوک سے... ہے نا حیرت کی بات ''دسمبر 2009ء کا جاسوسی ہاتھ میں لیے شدید بخار کے باوجود ہم خط لکھ رہے ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات اور اس بار ہمیں خط کا لفافہ بھی ڈبل قیمت یعنی دس روپے میں ملا... کیوں؟ ہے نا حیرت کی بات۔ سرورق کی حسینہ سانولی رنگت ہونے کے باوجود پُرکشش لگ رہی ہے اور پستل والا ولن بھی اتنا برا نہیں تھا... ہے نا حیرت کی بات۔ عابد جان کا انتہائی سادہ سا خط اول قرار پایا، سو مبارک باد۔ ناصر محمود اپنے آپ کو علی بابا چالیس چوروں کا ساتھی بنا رہے ہیں... ہے نا حیرت کی بات۔ کوئٹہ سے آغا گل نے صرف یہ بتانے کے لیے خط لکھا کہ جاسوسی میں واقعی کہانیاں ہوتی ہیں... ہے نا حیرت کی بات۔ ایس ایس ناز مجھے کون سا الہام ہوا تھا کہ آپ آ رہے ہیں ورنہ راہوں میں پلکیں ضرور بچھاتے۔ ویسے ہم سرکاری اسپتال کے قریب ہی رہتے ہیں۔ محمد سلیم شبلی، آپ کو ٹائٹل پر تبصرہ کرنا نہیں آتا۔ ہے نا حیرت کی بات۔ آمنہ پٹھانی... آپ کے خط میں انکل کی صحت کی دعا بہت اچھی لگی۔ خط بھی اچھا تھا۔ رضوان تنولی، آپ نے خط میں اتنی لمبی وضاحت کی اپنے نام کی اور انکل جی کی قینچی خاموش رہی... ہے نا

انتباہ

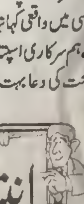

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

حیرت کی بات۔ شعاع چودھری، سرفراز، نومی اے اور سندس جبیں نے بھی اچھا لکھا۔ نور الہدیٰ... لگتا ہے آپ نے بلیک لسٹ کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ گرداب اب تک ہیروئن کے بغیر جاری ہے... ہے نا حیرت کی بات۔ ریت کا دریا اتنی اچھی تحریر اور اتنے عرصے بعد اسے شائع کرنے کا خیال آیا۔ ہے نا حیرت کی بات۔ ہنس کی چال جلیل کا نیا کارنامہ مگر ادھورا... اور انکل جی محمود احمد مودی اتنے عرصے سے نہیں لکھ رہے... ہے نا حیرت کی بات اور اس بار ہم رنگ نہیں پڑھ سکے... ہے نا حیرت کی بات۔ پورا خط لکھ لیا مگر آپ سب کو ہیپی نیو ایئر نہیں کہا... ہے نا حیرت کی بات۔ میری جانب سے تمام ارکان کو Happy New Year۔"

انعام علی مہمند کی رائے پشاور سے "اس سال کا آخری مگر دسمبر کا تازہ شمارہ خلافِ توقع 4 تاریخ کو ملا۔ سال 2009ء جہاں بہت سارے لوگوں کے لیے خوشیوں کا باعث بنا ہوگا، وہاں اس سال کے دوران سوہنی دھرتی کے سینے پر ایسے گہرے زخم بھی لگائے گئے جن کو بھرنے کے لیے لمبی مدت درکار ہوگی۔ دعا ہے کہ نیا سال پاکستان کے لیے خوش حالی اور امن کا پیغام لے کر آئے، آمین۔ سرورق اس دفعہ بھی ہمیشہ کی طرح تین چہروں پر مشتمل تھا۔ دو منفی کرخت کے درمیان پھنسی ہوئی بے چاری حسینہ شاید نزلے کا شکار تھی۔ اشتہارات سے نظر چراتے ہوئے چینی، نکتہ چینی میں قدم رنجا فرمائے تو عابد جان کو وکٹری اسٹینڈ پر دیکھا۔ تبصرہ تو کوئی خاص نہیں تھا مگر نیا ہے اس لیے مبارک باد دینی پڑے گی۔ مبارک ہو۔ دوسرے تبصروں میں ناصر محمود، سائرہ مسعود، ایس ایس ناز اور عبدالسلام صدیقی کے تبصرے شان دار تھے۔ ہمارا اپنا تبصرہ بھی شائع ہوا تھا، بس تھوڑا قینچی نے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ بہر حال غنیمت تھا کہ ہمیں بھی قیمتی صفحات پر موقع ملا۔ انکل! بہت شکریہ۔ اولین صفحات پر ریت کا دریا اپنے اسٹائل کی منفرد کہانی ہے۔ کردار نگاری زبردست ہے۔ فیروز باہمن نے اپنی تمام دولت و جائداد کا وارث اپنی گمنام بیٹی گگن دیپ کو ٹھہرایا ہے جس کا واپس آنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ زر کی حرص و ہوس رکھنے والے بہن بھائیوں کا انجام کیا ہوتا ہے، آئندہ ماہ شدت سے انتظار رہے گا۔ اپنی من پسند تحریر گرداب میں ایسے جکڑے کہ اردگرد سے بے خبر ہو گئے۔ گرداب کی تعریف لکھنے کے لیے مناسب الفاظ آخر کہاں سے لاؤں۔ گرداب کی ہر قسط میں نیا تجسس پیدا ہوتا ہے اور اگلے ماہ کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ویسے اسما قادری صاحبہ، ماہ بانو کے ساتھ آپ نے کچھ اچھا نہیں کیا، کہانی میں تھوڑا بہت رومانس ہونا چاہیے۔ اے سی صاحب کا واسطہ جس قسم کے لوگوں سے ہے، ایسے کردار معاشرے میں بہت زیادہ ہیں مگر اے سی شہر یار جیسے آفیسر آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ بہر حال، شہر یار صاحب کی محنت ضرور رنگ لائے گی اور چودھری افتخار عالم شاہ کا غرور اور مرتبہ خاک میں مل جائے گا۔ بے چارے انور کے ساتھ چودھری نے بہت برا سلوک کیا۔ آئندہ ماہ کی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں اس ماہ کی بکواس کہانی چڑیل ثابت ہوئی اور پڑھتے ہوئے کافی بور ہو گئے۔ انکل پلیز! ایسی کہانیوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ آج کل کے زمانے میں کون ایسی کہانیوں کا شوق رکھتا ہے۔ (اب آپ کو نہیں ہے تو کیا سب کو نہیں ہے؟)۔ سادہ لوح میں گلین جیراڈ اور مرفی واقعی سچے دوست تھے۔ مرفی مصیبت کے وقت جیراڈ کے کام آیا اور جیراڈ لکھ پتی بن گیا۔ کہانی اچھی تھی اور پسند آئی۔ جاسوسی کہانیوں میں اس دفعہ کی زبردست کہانی جاسوس واقعی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ اپنی بیمار ماں کی کفالت کرنے والا گورکی زمانۂ جنگ میں روسیوں کے کام آیا اور گورکی ہی کی وجہ سے جرمنوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ثمر عباس کی کہانی پنڈورا باکس کافی اچھی کہانی تھی۔ بہترین منصوبے کے باوجود بھی فان اور اس کے ساتھی اتنی بڑی دولت کی حفاظت نہیں کر سکے اور ایک ایک کر کے مرتے گئے۔ نجمہ سودی صاحبہ کی کہانی پرانا زخم ایک منفرد کہانی تھی۔ افروز نے سلمان کو جان بوجھ کر اتنا موقع فراہم کیا کہ جمیل کے آنے کا وقت ہو گیا اور آخر میں داویلا مچا کر سلمان سے اپنے پچھلے تمام زخموں کا حساب برابر کر دیا۔ سرورق کے رنگوں میں سلیم فاروقی صاحب کا راندۂ درگاہ عام سی کہانی تھی۔ وہی پرانی روٹین وڈیروں اور چودھریوں کے گرد گھومتی یہ تحریر کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں ناکام رہی۔ منظر امام کا دوسرا رنگ تصویرِ گماں ٹاپ پر رہی۔ منظر امام جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نام ہی کافی ہے۔ قتل کا ایک مشکل کیس نہایت خوب صورتی کے ساتھ حل ہو گیا۔ مرشد بہ ظاہر نیک اور پرہیز گار تھا مگر صبا کا قاتل نکلا۔ ایسے پیرو مرشد ہمارے معاشرے میں لاتعداد ہیں۔ رنگوں میں تصویرِ گماں بہت پسند آئی اور اچھا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہی۔"

عتیق الرحمٰن، ملکہ کوہسار مری سے فرماتے ہیں "اس ماہ کا شمارہ بھی حسبِ سابق کافی لیٹ ملا۔ سرورق پر تو تبصرہ شاید میرے جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ اشتہارات پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے پہنچے محفلِ یاراں میں۔ کرسیٔ صدارت پر عابد جان صاحب کو پایا، مبارک ہو وے۔ آپ نے تو ہمارے سیانے حکمرانوں کی طرح پہلی ہی بار میں کرسی اپنے نام کر لی۔ تبصرے تو ہر ایک نے اپنی محنت اور کاوش سے بھرپور کیے مگر کچھ دوستوں کا انداز اچھا نہیں لگا۔ شاید یہ ہماری اجتماعی کمزوری ہے۔ خیر، ناصر محمود صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ علی بابا کون ہے اور چالیس چور کون۔ شاید وہ اب پچھتا رہے ہوں۔ آغا گل صاحب! جاسوسی اور جنرل پوسٹ کا کیا تعلق؟ چودھری دل بہار انجم! اتنا بڑا نام رکھنے کی وجہ؟ ویسے سلطان راہی کے ہاتھ میں گنڈاسا ہوتا تھا، پستول نہیں۔ زوار انجم! افسوس کہ آپ کو صبح ناشتے کی جگہ جاسوسی ملا۔ مجھے تو اب پتا چلا کہ توانائی کے لیے کھانا ضروری نہیں۔ ایس ایس ناز کی شکایت۔ یہاں آج تک کسی کی شکایت کی شنوائی نہیں ہوئی، آپ کی کون سنے گا؟ انعام علی اور ساگر تلوکر صاحب! آپ کے تبصرے شان دار ہیں۔ عبدالسلام کی باتیں دل کو لگیں۔ دلنشیں بلوچ! آپ کی ریٹائرمنٹ کا ٹائم ہو گیا ہے۔ سندس جبیں! کیا آپ ڈینٹسٹ ہیں؟ نومی اے! ہمارے ہاں سردی ہوتی ہے۔ کوٹ ہم بھیج دیں گے، آپ کو فکر کی ضرورت نہیں۔ شعاع چودھری! ویسے آپ نے مامی کا لفظ کیوں استعمال کیا اور کس کے لیے کیا؟ ڈاکٹر نعیم اختر صاحب! آپ کس قسم کے ڈاکٹر ہیں؟ رضوان کریڑوی، آپ نے تو شجرۂ نسب ہی لکھ ڈالا۔ مکھن لگا کے۔ کہانیوں میں ریت کا دریا شان دار جا رہی ہے۔ سادہ لوح ایک اچھی کہانی تھی۔ پرکھ میں اگر عدالت کے سامنے چاقو کا ٹیسٹ کیا جاتا تو کہانی کا انجام شاید کچھ اور ہوتا۔ اسما قادری کی گرداب ہمارے ملک کے مسائل کی منہ بولتی تصویر ہے۔ جاسوس ایک بہترین کہانی تھی جس میں ننھا جاسوس ہونے کے ساتھ ساتھ غریب بھی تھا۔ ہنس کی چال کا انتظار رہے گا۔ پینڈورا باکس کا انجام بہترین تھا۔ جاسوسی کے لحاظ سے بہترین کہانی تھی۔ چڑیل پڑھ کر احساس ہوا کہ مغربی طاقتیں ہمارے لیے چڑیلیں ہی ہیں۔ یہ ہمارے کبھی نہیں ہو سکتے۔ میرا تبصرہ موضوع سے ہٹ

کر ہے مگر حقیقت یہی ہے۔ پرانا زخم مختصر مگر جان دار تحریر تھی جو آخر نئے زخم پر ختم ہوئی۔ راز... وہ بھی مصنف کی ایک اچھی کاوش تھی۔ راندۂ درگاہ سمجھ میں نہیں آیا کہ سسپنس ہے کہ جاسوسی۔ بہرکیف پہلا رنگ چاولوں کے رنگ کی طرح پھیکا ہی رہا۔ البتہ دوسرا رنگ پہلے رنگ کو بھی اپنے اندر جذب کر گیا۔ اس امید پہ ہمیں بھی کوئی ایسی روح مل جائے۔"

محمد نعمان کراچی سے لکھتے ہیں "اس دفعہ شمارہ کچھ دیر سے ملا۔ سرورق پر اداس سی حسینہ نقلی پسٹل کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ اس کے نیچے ایک آدمی دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ جاسوسی کا ٹائٹل اس دفعہ قدرے اچھا لگا۔ سب سے پہلے چینی، نکتہ چینی کی محفل میں قدم رکھا جہاں پر سب طوطے اور طوطیاں اپنی زبان میں بات کر رہے تھے اور جہاں پر کرسی پر بیٹھ کر رعب جھاڑ رہے تھے اور باقی سب نصیحتوں کا ڈھیر لے کر حاضر ہوئے تھے۔ مصدق محمود دانش کی عقل مندی کو سراہا، ویلڈن۔ مسز آمنہ فرام فتح پور! آپ کو نصیحت کرنے کی کیا ضرورت ہے، آپ خود نصیحت ہیں۔ اب بات کہانیوں پر ہو جائے۔ اس دفعہ دونوں رنگ پسند آئے۔ اس بار راندۂ درگاہ بالکل تماشائے زر میں خرم کے کردار کی طرح تھا۔ ریت کا دریا پڑھی تو اس میں پھنس گئے جہاں سے بہت مشکل سے نکلے۔ اس کے بعد گرداب پڑھی، کہانی بورنگ سی ہو گئی ہے۔ پرانا زخم میں افروز نے سلمان سے پرانا حساب پورا کر لیا۔"

اب بات ہو جائے ڈاکٹر اصل باز آفریدی کے خط کی... لکھتے ہیں "میں جاسوسی میں پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ایک سیدھے سادے پٹھان کی زبان کی ساری غلطیاں معاف کر دیں گے۔ سب سے پہلے سرورق پر بات ہو جائے۔ (ضرور)۔ تو جی یہ ایک مرد ہے۔ (واہ! کیا قیافہ شناسی... کمال کر دیا) اور کسی کا موبائل چھیننا چاہتا ہے اس لیے پستول کی نمائش کر رہا ہے۔ دوسرا آدمی کوئی مکینک لگتا ہے جو اپنے چھوٹے شاگرد کو چائے لانے کے لیے چیخ رہا ہے۔ اور ہاں اب بات ہو جائے لڑکی کی۔ تو یہ لڑکی مجھے دیکھ کر اپنی جگہ حیرت اور خوف سے جم سی گئی ہے۔ (اتنے خوفناک ہیں یا دیومالائی حسن کے مالک!) حالانکہ میں ایسی چیز نہیں کہ مجھ سے کوئی ڈر جائے، سوائے بچوں کے۔ اب بات ہو جائے چینی کی اور نکتہ چینی کی۔ خواتین و حضرات! سب سے پہلے تو آپ سب کھڑے ہو جائیں کہ میں تشریف لا رہا ہوں۔ مہمان بھی ہوں اور نیا بھی۔ یعنی چینی کی نکتہ چینی میں ایک اور نکتے کا اضافہ ہو گیا۔ یہ تم لوگوں کے لیے خوشی کی بات ہے۔ (تالیاں!) تو دوستوں سب سے پہلے میں نے تم لوگوں کے نکتے "خطوط" پڑھ لیے جو قابلِ گرفت تھے، ان پر ہاتھ ڈال دیا۔ سب سے پہلے سائرہ مسعود کو پکڑا۔ اس لڑکی نے کسی آمنہ پٹھانی کو فری اسٹائل میں لڑنے کے لیے للکارا ہے۔ اب ہوگا تماشا میرے آگے۔ تبصرے تو مرد حضرات بھی اچھے کرتے ہیں مگر کچھ شور شرابا کیے بغیر۔ آئیں سنائیں اور چپ چاپ ایک طرف انعام پانے کی امید لیے بیٹھ گئے۔ لگتا ہے محفل پر کسی تبصرہ نگار یا نگارہ کا سایہ ہے۔ ارے... اے مردو! میں آ گیا ہوں، ہمت کرو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ لڑکیوں کا یہ شور شرابا عارضی ہوگا۔ آتا کیا ہے لڑکیوں کو سوائے شور کرنے کے؟ مجھے دیکھو، آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں سمیت اعلان کرتا ہوں۔ خبردار! اب اگر کسی نے کچھ کہا تو مجھ سے اچھا کوئی نہیں ہوگا۔ بچوں کو ڈراتی ہو... خاموش۔ چپ، بہت ہو گیا۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ ثمر عباس کا پینڈورا باکس کھلا تو پتا چلا کہ فان اور وینتو کو ایسی گاڑی چوری کرنے کے لیے مل گئی جس کا دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ (سب کچھ ہو سکتا ہے۔) اور جب دوسری گاڑی کی ضرورت پڑ گئی تو چابی سمیت مل گئی۔ آئے ہائے! ثمر عباس کیا ہو گیا؟ (آپ کیوں جل رہے ہیں؟)...... شاباش ثمر شاباش، نورما پولیس سے بھاگ گئی وینتو اسپتال سے مگر کیسے؟ یہ دو تین غلطیاں معاف کر کے اچھی خاصی اور تیز کہانی تھی کل نمبر 63 فیصد۔ کاشف زبیر کی ہنس کی چال اچھی کہانی تھی مگر بعض جگہ محسوس ہوا کہ بغیر موڈ کے لکھی گئی ہے اور اب تو شنو کی شادی ہونی چاہیے۔ 4 لاکھ اچھی خاصی رقم ہے... جہیز پر لعنت! جاسوس، محمد عفان نے دکھی کر دیا۔ بچے کو مروانے کے بجائے انعام دینا تھا۔ پرکھ، یعقوب جمیل کی کوشش کمزور سی لگی بلکہ انجام تو بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ بوڑھے نے خود کو زخمی کیوں کیا؟ سادہ لوح، آصف ملک کی اس کہانی میں مزے کی بات یہ تھی کہ بیوہ کو کچھ نہ کچھ تو مل ہی گیا۔ چڑیل، مریم کے خان کی شان دار کہانی تھی۔ اس میں انسانی فطرت پر بات ہوئی۔ یعنی اور زیادہ کی حرص اور اگر اختیار اور طاقت مل جائے تو انسان فرعون بننے میں دیر نہیں لگاتا۔ راز، تنویر ریاض کی گرفت کمزور تھی یا تو میں نیند میں تھا۔ میں نے رات بارہ کے بعد پڑھنا شروع کی تھی، سمجھ نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے قصور میرا ہو، کچھ تو ہے۔ منظر امام کی تصویرِ گماں۔ لکھا ہے کہ یہ ایک بھرپور مسکراہٹ تھی، آگے پھر لکھتے ہیں اس کے ہونٹوں پر وہی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ بھرپور اور پُراسرار میں بہت فرق ہے۔ (آپ نے واقعی کمال کا نکتہ اٹھایا ہے۔ داد دینے کو جی کرتا ہے۔) جناب! آئندہ خیال رکھنا۔ راندۂ درگاہ سلیم فاروقی، یہ سلیم فاروقی مجھے کچھ جانے پہچانے لگتے ہیں۔ کہانی تیز رفتار اور مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ کہانیوں اور نکتہ چینی کا معاملہ تو حل ہوا، اب عرض یہ ہے کہ لطیفے اور کارٹون بڑے ہونے چاہئیں اور ساتھ میں سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا جائے یعنی سیر کو سوا سیر۔

انتقالِ پُرملال

جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ محترمہ عنبریٰ خیال کی والدہ بہ رضائے الٰہی انتقال فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ ان کے لیے دعا گو ہے کہ پروردگار انہیں جنت الفردوس میں مقامِ اعلیٰ عطا کرے، برزخ کی منزل آسان کرے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ قارئین سے مرحومہ کے لیے تلاوتِ سورۂ فاتحہ کی التماس ہے۔

خالہ کا برقع

احمد اقبال

اتفاقات کبھی کبھی حالات کی ایسی کڑیاں بنانا شروع کردیتے ہیں جو حالات کی مہربانیوں سے زنجیر کی صورت اختیار کر جاتی ہے... زنجیر جس کی ہر کڑی ایک کہانی ہے... 'اتفاق' سے رونما ہونے والا ایک واقعہ جس سے حالات کی وہ بُنت شروع ہوگئی جس کے ہر تار میں شگفتگی کا نغمہ پوشیدہ تھا۔

اتفاق سے جنم لینے والی پرمزاح داستان جو آپ کے اداس ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دے گی

صبح مجھے ایک ٹی وی شو میں خاتون میزبان کے چند سوالات کے جوابات دینے ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ صبح جب مرد کام کرنے چلے جاتے ہیں... پتھر کوٹنے سے قوم کو لوٹنے تک سارے کام مشکل ہوتے ہیں... تو خواتین فراغت سے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر ایسے ہی پروگرام دیکھتی ہیں۔ ان میں کرغزستان سے ٹانگانیکا تک ہر ملک کے کھانے پکانے سکھائے جاتے ہیں (جن کے پکنے کے بعد چکھنے کے سین میں کوئی خاتون کمال اداکاری سے آنکھیں پھیلا کے تعریفی انداز میں کہتی ہے... واؤ!) تاہم شام کو کارکن شوہر کے سامنے وہی کھانا رکھا جاتا ہے جو اسے زہر مار کرنا پڑتا ہے۔

خیر... یہ جملہ معترضہ تو بیچ میں ایسے ہی آگیا... بات تھی مارننگ شو کی... اسے میری کمپنی نے اسپانسر کیا تھا۔ جب ٹی وی اسکرین پر نمودار ہونے کا مرحلہ آیا تو سب سے پہلے ایم ڈی صاحب نے انکار کیا کہ بھئی میں مصروف ہوں۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ خود بیوی کے مقابلے میں شوہر سے زیادہ رقیبِ روسیاہ لگتا تھا۔ قد میں کوئی سو ملی میٹر کم تھا تو وزن سو کلو... چنانچہ بکرا منڈی میں ایک سیاہ بکرے کے ساتھ گائے کو دیکھ کر کسی دل جلے نے کہہ دیا۔ ''لو... اپنے ایم ڈی صاحب بھی بیگم کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔''

دوسری پوزیشن رکھنے والے نے شادی ہی نہیں کی تھی اور تیسری پوزیشن والے کی بیوی بھاگ گئی تھی۔ بالآخر قرعہ فال میرے نام نکلا... پرابلم یہ ہے کہ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔

لیکن اپنی کہانی سنانے سے پہلے میں آپ کو ایک حقیقی واقعہ سنا دوں۔

1956ء میں ایک بحری جہاز غالباً تیل لے کر سمندر میں جا رہا تھا کہ کسی چٹان سے ٹکرایا اور ڈوب گیا تاہم عملے کو بچا لیا گیا۔ جب تفتیش شروع ہوئی کہ حادثہ کیسے پیش آیا تو کپتان نے بیان دیا کہ میں عرشے پر کھڑا ہوا تھا اچانک اوپر سے بارش کے ساتھ ایک بھینس گری... آسمان پر بادل دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔

تفتیش کرنے والوں نے اسے سرزنش کی اور بار بار پوچھا لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے ماہرینِ نفسیات کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے بہت سر کھپانے کے بعد فیصلہ دیا کہ کپتان جھوٹا ہی نہیں، پاگل بھی ہے... کپتان کو پاگل خانے بھیج دیا گیا جہاں وہ سچ مچ پاگل ہوگیا۔

چھتیس سال بعد.... ایک پائلٹ نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ اس نے لکھا کہ ایک جنگل میں آگ لگ گئی تھی اور کنٹرول نہیں ہو رہی تھی۔ ائرفورس سے مدد طلب کی گئی۔ ان کے پاس ایسے جہاز تھے جو کسی قریبی جھیل یا دریا سے پانی اٹھا کر جنگل پر گرا سکتے تھے۔ یہ AMPHEBIAN کہلاتے تھے۔ اس پائلٹ نے ایک جھیل سے پانی اٹھایا اور جنگل کی آگ پر چھوڑ دیا۔ اس نے ایسا کئی بار کیا۔ ایک بار اسے یوں لگا جیسے پانی حرکت کر رہا ہے اور اس حرکت کی وجہ سے جہاز کا توازن بگڑ رہا ہے... اسے خطرہ محسوس ہوا کہ جنگل تک پہنچنے سے قبل ہی جہاز گر نہ جائے۔

اس نے پانی وہیں چھوڑ دیا۔ پائلٹ نے لکھا کہ جھیل کے پانی کے ساتھ ایک بھینس بھی آگئی تھی جو اچھل پھاند مچا

رہی تھی اور وہ اسے نہ گراتا تو یقیناً جہاز گر جاتا... یہی وہ بھینس تھی جو 1956ء میں حادثے کا شکار ہونے والے بحری جہاز پر گری... اور یہی وہ بارش تھی جو دور دور تک بادلوں کا نشان نہ ہونے کے باعث اس بحری جہاز پر ہوئی۔

وہ بحری جہاز کا کپتان جو پاگل خانے میں پاگل ہو کے مر گیا، نہ جھوٹ بول رہا تھا اور نہ پاگل تھا۔

☆☆☆

ساری خرابی اس نامراد ننھی سی کیل سے شروع ہوئی جو ایک رکشا میں بڑی غلط جگہ نکلی ہوئی تھی۔ چنانچہ جب اماں نے اپنے برقعے میں ملفوف (برقعے میں بہن کے لیے خریدا گیا ایک تربوز بھی تھا) بھاری بھرکم جسم کے ساتھ خالہ کے گھر کے دروازے پر اترنے کی کوشش کی تو اس کیل میں پھنس کر ان کا برقع پیچھے سے پھٹ گیا اور جب اماں نے اسے چھڑانا چاہا تو وہ مزید پھٹ گیا۔

میرا خیال ہے کہ پندرہ سال رگیدے جانے کے بعد اس مظلوم برقعے کو پھٹ ہی جانا چاہیے تھا تاہم رکشا والے نے اسے اماں کی غلطی قرار دیا... آپ کو خارجی دروازے سے زیادہ چوڑا نہیں ہونا چاہیے تھا یا سنبھل کر اترنا چاہیے تھا... اماں اس دلیل سے قائل ہونے والی کہاں تھیں... انہوں نے واجب الادا کرایہ دینے سے انکار کر دیا... اس نامراد کیل کے چبھنے سے اماں نے ''اوئی اللہ'' قسم کی کوئی چیخ بھی ماری تھی اور خود کو سنبھالنے کی کوشش میں گفٹ آئٹم یعنی تربوز برقعے سے برآمد ہو کے رکشے میں گر گیا تھا... رکشا والا وہی لے کر چمپت ہو گیا اور اماں کو یہ بات بہن کے گھر کے اندر پہنچ کے یاد آئی تو کرایہ نہ دینے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی... انہوں نے سر پیٹ لیا۔ ''اے لو... وہ کم بخت تربوز ہی لے گیا... کرائے سے دگنی قیمت کا... تمہارے لیے لائی تھی۔''

خالہ نے منہ میں انگلی دبا کے کہا۔ ''ارے جانے دو آپا... مگر یہ تمہارا برقع... یہ تو سارا پھٹ گیا۔''

اماں نے برقع اتارتے ہوئے رکشا چلانے، بنانے اور ایجاد کرنے والوں کو کوسا۔ ''پتا نہیں کہاں سے نازل ہو گئی یہ مصیبت... اچھے بھلے تانگے چلتے تھے۔ اوپر سے بے ایمانی کا یہ حال ہے کہ رکشے اتنے چھوٹے بنانے لگے ہیں جیسے ان میں وہ بیٹھیں گی... ہڈیوں کا ڈھانچا آج کل کی لڑکیاں...''

''آپا، تمہارا برقع ہی نہیں... پیچھے بھی...''

اماں نے مڑ کر دیکھا۔ ''اوئی اللہ... ساری شلوار بھی ادھڑ گئی ہے... نہ جانے کس کس نے دیکھا۔''

خالہ کے مردود بیٹے نے کمپیوٹر اسکرین سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ''لو خالہ! اب کون دیکھے گا تمہیں... ہاں پرانے بوائے فرینڈ اب بھی پیچھا کرتے ہوں تو اور بات ہے۔''

جو جوتی اس بدمعاش کو اماں نے پھینک کر ماری تھی، وہ پونے دو گز دور کھڑکی سے بغیر پائلٹ والے جہاز کی طرح گزر گئی۔ اسے میں پیچھے کھڑی ٹماٹروں کی ایک ریڑھی پر سے اٹھا کے لایا۔ اس روز اماں کی واپسی اپنی بہن کی دی ہوئی شلوار اور اسی کے برقع میں ممکن ہوئی۔ اگر ہم خیال ہونے کے ساتھ دونوں بہنیں ہم وزن نہ ہوتیں تو یہ ممکن نہ ہوتا۔

تیسرے دن مجھے خالہ کے برقعے کی واپسی کا مشن سونپا گیا۔ اس کے نہ ہونے سے خالہ ایم پی او کے نظر بند جیسی ہو گئی تھیں کہ گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ اپنی ڈاڑھی اور خالہ کے برقعے پر خالو کا اسلام ختم ہو جاتا تھا۔ وہ بجلی کے میٹر کی رفتار کم کرنے کے ماہر تھے اور بتا سکتے تھے کہ اب بل کتنا آئے گا... وہ چنے کے چھلکوں میں مختلف اشیا ملا کے چائے کی پتی اور چائے کا ذائقہ پیدا کر سکتے تھے۔ ''اللہ معاف کرے'' ان کا تکیہ کلام تھا۔

میں برقع بغل میں دبائے دنیا کے نظارے دیکھتا اور موج میں گاتا جا رہا تھا۔ ''دردِ ڈسکو... دل میں میرے دردِ ڈسکو...'' میرا خیال ہے کہ میں بیشتر پاپ سنگرز سے بہتر گاتا ہوں لیکن ایک میرا خبیث پڑوسی جو خود کو ہومیوپیتھک ڈاکٹر کہتا ہے... رات کو میرا گانا سن لے تو صبح پوچھتا ہے۔ ''ہاں، کل پھر رات کو درد تھا تیرے پیٹ میں... کتنا کہا ماش کی دال مت کھا۔''

میرا ایک نیک ارادہ تو یہ تھا کہ میں خالہ کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے برقع اوڑھ لوں... اگر حسنِ اتفاق سے ان کی چھپکلی ٹائپ بیٹی خود دروازہ کھولنے آئے تو اسے برقعے میں سمیٹ لوں اور خالہ کو پتا چلنے سے پہلے... برقعے میں خاصی جگہ تھی... وہ بھی ٹھیک ہے کہ جگہ دل میں ہونی چاہیے۔

اچانک میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا، اس کے ساتھ ہی میں گر پڑا۔ مجھے یوں لگا جیسے ساری کائنات لال رنگ میں رنگ گئی ہے۔ لال زمین... لال آسمان... لال روشنی... سب لال... اس کے ساتھ ہی میرا دماغ ایک مدہوش کرنے والی خوشبو سے بھر گیا۔ لال رنگ اگر میرے خون کا ہوتا تو اس میں یہ مہک کہاں سے آتی۔

میں یہ بتا دوں کہ اس وقت میں ایک عقبی گلی سے گزر رہا تھا جسے کچھ لوگ جائز طور پر گندی گلی کہتے ہیں۔ تمام گھروں کے پچھلے دروازے جو کوڑا کچرا پھینکنے یا کسی پڑوسن کو بے نقط سنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اسی گلی میں کھلتے ہیں اور

اس گلی سے گزرنے والے پر اچانک کوڑے کچرے کی تھیلی آ گرنے کے امکانات خاصے روشن ہوتے ہیں۔

مجھے یہ رسک اس لیے لینا پڑا کہ سامنے والے حصے کو شامیانے لگا کے ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ گھر کے سامنے والے حصے پر دوڑنے بھاگنے والی روشنیوں سے واضح ہو گیا کہ یہاں کسی کا چہلم نہیں بلکہ نکاح ہو رہا ہے۔

میں چند سیکنڈ بعد ہی سنبھل گیا۔ مجھے چوٹیں تو آئی تھیں لیکن نہ کوئی ہڈی ٹوٹی تھی اور نہ ہی بے ہوش ہوا تھا۔ تاہم تاریک گلی میں بھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے جو یہ چیز لال نظر آنے لگی تھی... جیسے ساون کے اندھے کو ہرا سوجھتا ہے... اس کا سبب کیا تھا... اور جو خوشبو میرے حواس پر چھا گئی وہ گندی گلی میں کہاں سے آئی۔

وہ مکمل سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس ایک دلہن تھی جو دس فٹ کی بلندی پر ایک کھڑکی سے میرے اوپر آ گری۔ زندہ سلامت اور بہ قائمی ہوش و حواس اس نے میرے اوپر چھلانگ ماری تھی اور میرے اٹھنے سے پہلے اٹھ کے کھڑی بھی ہو گئی۔

غصہ مجھے بعد میں آیا... شک پہلے یہ ہوا کہ دلہن نظر آنے والی درحقیقت کوئی چڑیل ہے... وہ جہاں چاہیں اور جس حلیے میں چاہیں دکھائی دیں... ابھی میں کوئی دافع بلیات آیت یاد ہی کر رہا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے ساتھ کھینچنے لگی۔ ''چلو... جلدی چلو... بھاگو، یہاں مت کھڑے رہو۔ انہوں نے پکڑ لیا تو ذبح کر دیں گے... مجھے بھی اور تمہیں بھی...''

ظاہر ہے، ایک اسٹینڈرڈ سائز کی دلہن کوئی رنگین غبارہ نہیں ہوتی... چوٹیں مجھے آئی تھیں لیکن پتا نہیں کیوں میں لنگڑاتا کانپتا اس کے ساتھ ہی بھاگ کھڑا ہوا... قتل کے نام سے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس وقت میں ہیرو نہیں بن سکتا تھا۔

گلی اونچی نیچی تھی اور تاریک تھی۔ وہ میرے اوپر گری تھی چنانچہ بچ گئی تھی لیکن وہ سخت خوف زدہ تھی اور مسلسل میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی... کچھ دور میں نے بلا ارادہ اس کا ساتھ دیا کیونکہ مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کہاں ملا تھا... پھر میں رک گیا۔

''ٹھہرو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

اس نے گھبرا کے مجھے دیکھا۔ ''میں... میں بھاگ رہی ہوں... رکو مت ورنہ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تو بہت ماریں گے۔''

''اگر اسے صحیح بال کرانا آتی تو تمہیں اس سے زیادہ چوٹیں آتیں''

''لاحول ولاقوۃ... مجھے کیوں ماریں گے؟''

''میں تمہارے ساتھ جو جا رہی ہوں... سمجھا یہی جائے گا کہ تم مجھے بھگا کے لے جا رہے ہو... چلو...''

میں پھر دو قدم چلا۔ ''مگر تم کیوں بھاگ رہی ہو؟''

''اوفوہ... میں سب بتا دوں گی... پہلے یہاں سے تو نکلو۔'' اس نے دانت پیس کے کہا۔ ''اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے۔''

وہ الٹا کہہ گئی مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں... لیکن پھر میری عقل میں ایک بات آ گئی۔ ''دیکھو ایسے تم پکڑی جاؤ گی... چلو، یہ پہن لو۔''

''یہ کیا ہے؟'' اس نے چلتے چلتے پوچھا۔

''خالہ کا برقع... دیکھو... تم زرق برق لباسِ عروسی میں ہو اور میں... ذرا بھی دولہا نہیں لگتا... لگتا، تب بھی ہم پکڑے جاتے... کوئی دولہا ایسے دلہن کو لے کر نہیں بھاگتا۔''

''میں نے تو کبھی برقع نہیں پہنا... مگر تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔'' اس نے مجھ سے برقع لے لیا اور پہن لیا۔ ''اب کوئی مجھے پہچان نہیں سکتا... تھینک یو ویری مچ۔''

''تھینک یو کس بات پر؟''

''پہلے تو تم نے میری ہڈیاں ٹوٹنے سے بچائیں... پھر میرا ساتھ دے رہے ہو۔ تم ایسے آدمی ہو... مصیبت کے وقت مدد کرنے والے اور...''

میں لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ چلتا گیا۔ ''دونوں باتیں غلط... مصیبت مجھ پر نازل ہوئی... اور میں مدد نہیں کر رہا ہوں... جان بچا کے نکل رہا ہوں... تم نے بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''بس اب ڈرنے کی بات نہیں... ہم خطرے

کی حد سے دور آ گئے ہیں... برقع کیا زبردست چیز ہے... ابھی جو شخص سامنے سے آیا تھا، مجھے پہچان لیتا تو شور مچا دیتا۔"

"کون تھا یہ؟"

اس نے غور کر کے کہا۔ "اگر میں یہ شادی کر لیتی تو کسی رشتے سے یہ میرا ماموں سسر کہلاتا... بے چارہ..."

اب میں بھی نروس نہیں تھا کیونکہ خالہ کے برقعے نے لباس عروسی کو بالکل چھپا لیا تھا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ میری خالہ ہی لگتی تھی۔ برقع پرانے فیشن کا تھا... ہم اس گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔

میں نے کہا۔ "بس... اب بتاؤ کہ تمہیں ایسے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ بھی عین شادی والے دن!"

"افوہ! میں اب بھی نہ نکلتی تو میری شادی ہو جاتی۔"

"ایسے زبردستی کیسے ہو جاتی؟"

"ہو جاتی... تم لڑکے ہونا... تم نہیں سمجھ سکتے... ہم لڑکیوں کا انکار کون سنتا ہے... وہ بھی آخری وقت میں۔"

"آخری وقت میں تو لڑکے کا انکار بھی کون سنے گا... آخری وقت کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔" یہ کہنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میری دوسری بات بالکل بے تکی تھی۔

"میں تو پہلے دن سے انکار کر رہی تھی۔ کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہاں بیچ سڑک میں؟"

"افوہ... میرا مطلب تھا یہاں کہیں ایسی جگہ ہو جہاں اطمینان سے بیٹھ کے میں تمہیں ساری بات بتاؤں۔"

اس کا "افوہ" کہنے کا انداز میرے دل کو بھا گیا۔ ویسے تو وہ پوری کی پوری جب مجھ پر اتری تھی تو میرے دل میں اتر گئی تھی لیکن اس کے بعد اس نے مجھے اپنا مطیع کر لیا تھا۔ میں وہی کر رہا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ حالانکہ یہ بڑا جان لیوا اور خطرناک کام تھا جو میں سوچے سمجھے بغیر... اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اب وہ بالکل پُرسکون تھی۔

میں نے کہا۔ "بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے... اب بتاؤ اس وقت میں تمہیں کہاں لے جاؤں اس حلیے میں؟"

"برقعے میں میرا حلیہ کوئی نہیں دیکھ سکتا... چلو، اس پارک میں چلو۔"

"پارک میں... اس وقت؟ پولیس والا آ گیا تو پوچھے گا یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"کہہ دینا کہ بیوی ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"حد کرتی ہو تم بھی... وہ نکاح نامہ مانگے گا فوراً... اصل میاں بیوی پھنس جاتے ہیں۔"

"بے وقوف پھنستے ہیں۔ کیا پچاس روپے بھی نہیں ہیں تمہاری جیب میں انہیں ٹالنے کے لیے... مگر اس سے تو بہتر ہے کہ ہم کسی ریسٹورنٹ میں چلے جائیں... بات یہ ہے کہ مجھے بھوک بھی لگی ہے... میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا... عجیب اوٹ پٹانگ چیزیں لائی جاتی تھیں میرے سامنے۔"

خوف، گھبراہٹ اور پریشانی سے میرا حال اس دلہن سے بدتر ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں نے یہ مصیبت کیوں مول لی؟ کیا میں ذہنی طور پر اتنا کمزور ہوں کہ کسی خوب صورت لڑکی کو انکار نہیں کر سکتا؟ کوئی لڑکی مجھ سے جو چاہے منوا لے...؟ یہی حال رہا تو کل کو دنیا میں میرا نام زن مرید نمبر ون کی حیثیت سے روشن ہوگا۔

لیکن کل کی بات تو کل ہوگی، ابھی میں کیا کروں؟ ادھر وہ دلہن تھی کہ ذرا پریشان نہ لگتی تھی اور مجھے ایسے اپنے اشاروں پر چلا رہی تھی جیسے وہ اس کی عادی ہے... یا پھر میں شکل سے حکم کا غلام لگتا ہوں۔ میں تو اتفاق سے گزر رہا تھا... مجھے گزر جانا چاہیے تھا... بھاگ جانا چاہیے تھا... اب مجھے پسینے آ رہے تھے اور میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں کہ آگے کیا ہوگا۔

دلہن نے مجھے ٹہوکا دیا۔ "کھڑے کیوں ہو... چلو۔"

میں نے بھنا کے کہا۔ "یہ تم نے کس عذاب میں ڈال دیا ہے مجھے... کہاں چلوں؟ چل تو رہا ہوں۔"

"کیا پہلے کسی لڑکی کو کسی ریسٹورنٹ میں نہیں لے گئے؟"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "اگر تم گئی ہو کسی کے ساتھ تو مجھے بتاؤ۔"

اسی وقت مجھے دوسرے درجے کا ایک ریسٹورنٹ نظر آ گیا جس میں فیملی کیبن بنے ہوئے تھے اور پردے پڑے ہوئے تھے۔ اندر پہنچتے ہی میں نے ایک گلاس پانی پیا... پھر میں نے چائے منگوائی۔

"میں سموسے بھی کھاؤں گی... دو..."

میں نے ویٹر کو معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھا۔ "اُف... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس قسم کی لڑکی ہو... کیا چیز ہو... کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے؟"

"افوہ... ابھی میں سب بتا دوں گی... چائے تو پی لو۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ زہر پی لوں۔"

"ابھی ویٹر آیا تھا اسے بتا دیتے... مگر یہاں مشکل ہے... یہاں تو کوک بھی نقلی ملتی ہے... اصلی زہر کہاں ملتا ہے

آج کل۔"

چائے آئی تو اس نے پردہ برابر کر کے نقاب الٹ دیا۔ میں نے اسے اجالے میں دیکھا تو دم بہ خود رہ گیا۔ حسین تو ہر دلہن لگتی ہے... خصوصاً میرے جیسے کنواروں کو... مگر وہ بلاشبہ حسین تھی۔ میک اپ نہ ہوتا، تب بھی اس کی صورت کے نقوش، اس کا رنگ روپ معیارِ حسن پر پورے اترتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بائیس سال کی ہوگی یا کچھ کم۔

وہ میرے حصے کے سموسے بھی کھا گئی۔ "معاف کرنا... مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ تمہیں پتا ہے یہاں دلہنوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے، جب انہیں مایوں بٹھایا جاتا ہے؟ اوٹ پٹانگ چیزیں کھلاتے رہتے ہیں اور ہلنے بھی نہیں دیتے... بیٹھے بیٹھے میں بے زار ہو جاتی تھی... قبض الگ ہو گیا تھا... صبح سے تو مجھے تیار کیا جا رہا تھا... اور میں سوچ رہی تھی کہ کیسے نکلوں... بھوک مر گئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "لڑکی... ذرا سوچو تم نے یہ کیا حرکت کی ہے؟"

"میرا نام لڑکی نہیں ہے، روبینہ شاہین ہے... تم بھی مجھے روبی کہہ سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "ذرا سوچو اس وقت وہاں کیسی قیامت مچی ہوئی ہوگی۔"

"افوہ... یہ سب میں کیوں سوچوں؟ وہ اپنا کیا بھگتیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں ذرا احساس نہیں... آخر وہ ماں باپ ہیں تمہارے... ان کی کتنی رسوائی ہوگی۔"

وہ مسکرائی۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ میرے ماں باپ ہیں؟"

"پھر کون ہیں؟"

"اب میں کیا کہوں... ایک کہنے کو ماما ہے، ایک چاچا ہے اور وہ بھی سگے نہیں... انہوں نے پالا تھا مجھے۔"

"اوہو... وہ جو بھی ہیں... ذرا سوچو وہاں کیا ہوگا، جب عین وقت پر پتا چلے گا کہ دلہن بھاگ گئی... دولہا کیا کرے گا؟ برات آنے والی ہوگی۔"

"افوہ... بھاڑ میں جائے دولہا... تمہیں اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے... کیا جانتے ہو تم اس کے بارے میں؟ میں بتاتی ہوں۔"

"دیکھو، مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں... میں سب سمجھ گیا ہوں، اس قسم کی کہانیاں ہوتی ہیں... تمہارا ارادہ کسی اور سے شادی کرنے کا ہوگا جسے تم سے محبت ہوگی... ماں باپ

للکار

قارئین کے محبوب لکھاری

طاہر جاوید مغل

کے قلم سے ہنگامہ خیز سلسلہ

فروری 2010ء

سے جاسوسی ڈائجسٹ کے صفحات پر

تحیر۔ تجسس اور ایکشن سے بھرپور، تیز رفتار داستان

ماہنامہ سرگزشت

اپنے ہاکر کو آج ہی ہدایت کر دیں

اسے پسند نہیں کرتے ہوں گے۔‘‘

’’افوہ... پھر وہی ماں باپ... اور یہ محبت کرنے والا کہاں سے آگیا بیچ میں؟ بلاوجہ فلمی اسٹوری مت بناؤ... میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی... میں پڑھنا چاہتی تھی... ایم اے، پی ایچ ڈی... ایم بی بی ایس، ایل ایل بی۔‘‘

غصے کے باوجود مجھے ہنسی آگئی۔ ’’تم واقعی پاگل ہو... چلو تم نکل آئیں وہاں سے... اب کیا کروگی...؟ کہاں جاؤ گی؟‘‘

’’میں تمہارے ساتھ جاؤں گی اور کہاں جاؤں گی۔‘‘ وہ قطعی لہجے میں بولی۔

میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا۔ ’’میرے ساتھ...؟ یہ ناممکن ہے۔‘‘

’’کیوں ناممکن ہے؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’اس لیے کہ میرا ایک گھر ہے، خاندان ہے... وہ جوتے مار مار کے مجھے گنجا کر دیں گے کہ یہ کسے بھگا لایا... میری کوئی ایک نہیں سنے گا۔‘‘

’’میں خود انہیں سچ بتا دوں گی۔‘‘ اس نے مجھے تسلی دی۔

’’یا میرے خدا... گھر سے مجھے بھیجا گیا تھا کہ خالہ کو برقع واپس کر آؤ... میں اس میں ایک دلہن لے جاؤں جو گھر سے بھاگی ہو... تو تمہاری یا میری کون سنے گا؟ سب کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے... تمہیں پہنچا دیں گے تھانے... اور وہاں پہلے سے رپورٹ درج ہوگی تمہارے فرار یا اغوا کی... پھر وہ ہیرو بھی پکڑا جائے گا۔‘‘

اس نے کہا۔ ’’تم کرتے کیا ہو... کہانیاں لکھتے ہو؟‘‘

میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ’’یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا... میں نے تو تمہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ میرا نام اقبال احمد ہے۔‘‘

وہ اچھل پڑی۔ ’’تم احمد اقبال ہو... اس کی کہانیاں تو...‘‘

میں نے کہا۔ ’’احمد اقبال نہیں... اقبال احمد... احمد اقبال کی کہانیاں بھی کوئی کہانیاں ہوتی ہیں... پتا نہیں کس کی سفارش ہے اس کے پاس کہ اس کی ہر اوٹ پٹانگ بور اور بے کار کہانی شائع ہو جاتی ہے... میں صرف کہانیاں لکھتا ہوں... انہیں شائع کوئی نہیں کرتا... پیسے لے کر بھی۔‘‘

وہ کچھ مایوس ہوئی۔ ’’پھر تم کہانیاں لکھتے ہی کیوں ہو... کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتے؟‘‘

میں نے ہنس کے کہا۔ ’’میری مرضی... مگر تم نے کیسے اندازہ کر لیا کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں... کیا میں شکل سے احمق لگتا ہوں؟‘‘

’’ہاں... تم بار بار کسی ہیرو کو بیچ میں لے آتے ہو... بابا نہ میں کسی کی ہیروئن ہوں، نہ کوئی میرا ہیرو ہے۔‘‘

میں نے خفگی سے کہا۔ ’’خبردار جو پھر مجھے بابا کہا... یار دوست اور گھر والے مجھے ضرور بالا کہتے ہیں۔‘‘

’’میں نے بھی تو تمہیں اجازت دی تھی کہ مجھے روبی کہہ سکتے ہو... میں بھی بالا ہی کہوں گی تمہیں۔‘‘

’’دیکھو... یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔ تم گھر سے بھاگ آئی ہو... اب مجھے بتاؤ کہ تمہیں کہاں چھوڑوں؟ تمہارا کوئی عزیز رشتے دار... قریب کا یا دور کا ضرور ہوگا۔‘‘

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ’’کوئی نہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’تمہاری کوئی قریبی سہیلی... کلاس فیلو... جو تمہاری مدد کر سکے؟‘‘

اس نے پھر وہی کہا۔ ’’کوئی نہیں۔‘‘

’’کوئی نہیں تو پھر میں کہاں لے جاؤں تمہیں؟ اور تم ایسے کسی اجنبی پر کیسے بھروسا کر سکتی ہو جسے تم نے آج سے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں۔‘‘

’’بالے! میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔‘‘

’’بھاڑ میں گئی تمہاری چھٹی حس... میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں... اگر تھانے نہیں جانا تو پھر چلو، میں تمہیں دارالامان لے چلتا ہوں... تمہیں دروازے پر چھوڑ کے میں بھاگ جاؤں گا۔‘‘

اچانک اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ’’خدا کے لیے ایسا مت کرو بالے... میں ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں... میری مدد کرو پلیز... ورنہ میں آج ہی رات ٹرین کی پٹڑی پر لیٹ جاؤں گی۔‘‘

میں نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ ’’ایک گھنٹے میں خیبر میل گزرے گی... اس کی رفتار بھی کافی ہوتی ہے۔‘‘

’’تم مذاق سمجھ رہے ہو... سچ میں میری لاش ملے گی اور تصویر آئے گی اخبار میں تو تمہیں احساس ہوگا کہ میرا خون تمہاری گردن پر ہے... تم مجھے بچا سکتے تھے مگر تم نے بزدلی دکھائی... یوم حشر...‘‘

میں نے کہا۔ ’’اتنی دور تک مت جاؤ... میں کچھ کرتا ہوں... یہ رونا بند کرو... ابھی ویٹر آ جائے گا۔‘‘

ویٹر جیسے باہر کھڑا میرے الفاظ کا ہی منتظر تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کے بتیسی دکھاتے ہوئے کہا۔ ’’چالیس روپیا... ابھی کیبن خالی کرو۔‘‘

میں نے متانت سے کہا۔ ’’دو چائے اور لے آؤ۔‘‘

وہ بے بسی سے پسپا ہو گیا۔ روبی کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ ’’تمہیں اندازہ نہیں کہ میں یہ انتہائی قدم اٹھانے پر کتنی مجبور ہو گئی تھی۔‘‘

’’ابھی میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے ایک دوست سے کہوں... وہ ایک دو دن تمہیں اپنے گھر میں رکھ لے... اس کے بعد تمہیں جانا ہی ہوگا... اس کی بیوی فی الحال میکے گئی ہوئی ہے... اس کی واپسی ڈریکولا کی واپسی سے کم نہیں ہوگی۔ وہ سوال بعد میں کرے گی... قتل پہلے... شوہر کا... تمہارا یا پھر تینوں کا... اس کا باپ آٹھ دس کی گردن پر روز چھری پھیر دیتا ہے۔ وہ بھی میرے جیسے قربانی کے بکرے ہوتے ہیں۔‘‘

نقاب ڈال کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ’’چلو... اس کی بیوی سے بھی میں نمٹ لوں گی۔‘‘

میرا مذکورہ دوست اپنے فلیٹ کے اندر زور زور سے گا رہا تھا... انکھیوں سے گولی مارے... وہ یقیناً یوم آزادی منا رہا تھا۔ جب میں نے دوبارہ دروازے پر مکے مارے تو وہ اندر سے چلایا۔ ’’ابے آ رہا ہوں... کیا باتھ روم سے تولیا باندھے بغیر ہی آ جاؤں؟‘‘

پھر وہ تولیا باندھے ہوئے نمودار ہوا اور پلٹ کے دوڑا۔ ’’یار! بتا تو دیتا کہ خالہ بھی ہیں۔‘‘

میں روبی کے ساتھ اندر گیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ ’’دراصل خالہ کا یہ برقع انٹرنیشنل فیم کا ہے... چمپو... میرا مطلب ہے میرا یہ دوست جان شیر خان بچپن سے دیکھ رہا ہے اس لیے پہچانتا ہے۔‘‘

صوفے پر بیٹھنے سے پہلے روبی نے برقع اتار کے ایک طرف ڈال دیا۔ ’’اسے تم چمپو کیوں کہتے ہو؟‘‘

’’جان شیر خان کی طرح اسے بھی چیمپئن بننے کا شوق تھا... لیکن صرف چمپو بن سکا... اسکواش کھیلنا نہ آیا... اب اسکواش پی کے گزارہ کرتا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

چمپو دوسری بار شریفانہ لباس میں نمودار ہوا تو پھر ایسے بدکا جیسے میرے ساتھ کمرے میں کوئی دلہن نہیں، اس کا خوں خوار سسر اسے ذبح کرنے کے لیے چھرا لیے بیٹھا ہو۔

’’ابے... بالے...‘‘ اس نے ہکلانا شروع کیا۔ ’’تو... تو نے شادی کر لی... سالے... چپ چاپ... ہمیں بتایا تک نہیں.. بھابی آداب!‘‘

میں نے کہا۔ ’’چمپو! آرام سے بیٹھ جا.. یہ میری بیوی نہیں ہے۔‘‘

’’اچھا اچھا... میں سمجھ گیا... ابھی بیوی کے عہدے پر تقرری نہیں ہوئی ہے... نوٹیفکیشن نہیں ہوا... تُو فکر مت کر... میں ابھی بلاتا ہوں قاضی کو اور گواہوں کو... پیسے تو ہیں نا تیرے پاس بالے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’یار! ایسی کوئی بات نہیں... میرا اس لڑکی سے شادی کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔‘‘

وہ بیٹھ گیا۔ ’’کیوں؟ میرا مطلب ہے... کیا ارادہ بدل گیا یہاں آتے آتے... جھگڑا ہو گیا؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’اگر تُو اپنی بکواس سے پہلے میری پوری بات سن لے تو...‘‘

ظاہر ہے میں نے مختصر مگر مدلل بات کی۔ اس میں ایک فیصد جھوٹ بھی نہیں تھا مگر زمانہ ہی ایسا ہے، نہ خالص دیسی گھی ہضم ہوتا ہے نہ خالص سچ! چمپو مجھے اور دلہن کے گیٹ اپ میں پُرسکون بیٹھی ہوئی روبی کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا... پھر اس نے اعلان کر دیا کہ میں بکواس فرما رہا ہوں۔

’’بالے! یہ کہانی تو نے مجھے پہلے سنائی تھی... کسی رسالے کو بھی بھیجی تھی۔‘‘ چمپو نے سفید ترین جھوٹ کہا۔

میں نے دہاڑ کے کہا۔ ’’میں نے کبھی ایسی کہانی نہ لکھی، نہ کسی کو اشاعت کے لیے بھیجی۔‘‘

’’جواب میں مدیر نے فون پر کیا کہا تھا... بتا دوں بھابی کے سامنے۔‘‘

میں نے میز پر مکا مارا۔ ’’الو کے پٹھے... یہ تیری بھابی نہیں ہے۔‘‘

’’غریب کی جورو سب کی بھابی... یہ محاورہ ہے۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے... تُو بتا اس مدیر نے کیا کہا تھا؟‘‘ میرا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا۔

’’اس نے تجھے ایک مشورہ دیا تھا کہ کہانی لکھنے کے بجائے تم فلموں میں کام کیا کرو... اصل الفاظ سنسر کی زد میں آتے ہیں۔‘‘

میں نے ہار مان کے کہا۔ ’’چمپو... چل تُو روبی سے پوچھ لے۔‘‘

’’یہ روبی کون ہے؟‘‘

’’روبی میرا نام ہے... آخر تم مانتے کیوں نہیں کہ بالا... میرا مطلب ہے تمہارا دوست سچ بتا رہا ہے۔‘‘ روبی نے خفگی سے کہا۔

یہ چمپو کے لیے خلافِ توقع تھا۔ ’’دراصل... یہ سچ کبھی نہیں بولتا مجھ سے... مجھے پتا ہے.. ہم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’اچھا میرے باپ، میرے دادا... تُو بتا

دے کہ تو کیا سمجھ رہا ہے۔"

چمپو نے غور کر کے کہا۔ "بالے... ایسا سورما تو ہے نہیں کہ کسی اور کی دلہن اٹھالائے... اگر تم دونوں نے شادی کرلی ہے چھپ کے تو کوئی بات نہیں.. میرے سامنے اعترافِ جرم کرلو... میں تمہیں معاف کردوں گا... وہ بھی اس لیے کہ میری بیوی گھر میں نہیں ہے اور میں اس کے لیے بھی تیار ہوں کہ تمہیں خلوت فراہم کرنے کے لیے گھر چھوڑ کر کہیں نکل جاؤں... جنگل کی طرف!"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "خدا کے لیے اب میری بھی سن لے... یہ ٹھیک ہے کہ یہ دلہن میرے ساتھ بھاگ کے آئی ہے... لیکن اس کی شادی مجھ سے نہیں، کسی اور سے ہو رہی تھی۔"

چمپو نے اسے دیکھا۔ "ہاں... ایسی تیری قسمت کہاں؟"

"ابے، یہ وہاں شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

"چنانچہ اس نے تجھے ایس او ایس بھیجا... تو کب سے جانتا ہے اسے؟"

"تو صرف پانچ منٹ چپ بیٹھ... میں تجھے سب بتا دیتا ہوں۔ اس کے بعد تو بے شک اسکاٹ لینڈ یارڈ سے تفتیش کرالینا۔"

میں نے ساڑھے چار منٹ میں اسے جملہ حقائق سے آگاہ کردیا۔ خلافِ توقع چمپو سنتا رہا۔ وہ سیریس ہوگیا تھا۔

آخر میں نے کہا۔ "تو بس دو چار دن کے لیے اسے رکھ لے۔"

چمپو ایک چیخ مار کے اچھلا۔ "دو چار دن... پرسوں میری بیوی آجائے گی... اس نے مجھے بتایا تھا... لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کل شام اچانک چھاپا مارے گی۔ ذرا سوچ بالے کہ میرا کیا ہوگا... تو نے میرے سسر کی دکان پر الٹے لٹکے ہوئے بکرے دیکھے ہیں... میں بھی انہی میں لٹکا ہوا دکھائی دوں گا۔"

"یار! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ایسی ہی بات ہے پیارے... پہلے تو وہ کٹا دے گی ایف آئی آر کہ میں نے اس کے جاتے ہی دوسری کرلی... پھر گلا کٹوائے گی... ہاں اگر تو یہاں رہے اور اس کے سامنے مان لے..."

"یہ نہیں ہوسکتا... مجھے ابھی واپس جانا ہے۔ میں تو گھر سے خالہ کا برقع دینے نکلا تھا... کئی بار خالہ پوچھ چکی ہیں... ادھر اماں گالیاں دے رہی ہیں کہ کدھر نکل گیا... بتا میں کیا کروں؟"

چمپو عزمِ مصمم کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور اس نے ہوا میں ایک فرضی تلوار بھی لہرائی۔ "یار! کیا ہم ایک مصیبت زدہ لڑکی کی مدد بھی نہیں کرسکتے؟ یاد کر محمد بن قاسم کو..."

میں نے کہا۔ "آخر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ "تجھے سب سے پہلے ایک جھوٹ بولنا چاہیے اپنی اماں اور خالہ سے... کہنا چاہیے کہ میں آج رات نہیں آسکتا۔ جھوٹ بولنے کا تو ماہر ہے اور بے سروپا کہانیاں بھی لکھتا ہے۔

"تو کہہ دے کہ میرے ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے... میں حیدرآباد جارہا ہوں، بس میں بیٹھا فون کررہا ہوں... دو چار دن تو ایسے ہی گزار سکتا ہے پھر چاہے تو اسے اللہ کو پیارا کردینا... سوئم تک رک جانا۔ تجھے ایک ہفتہ مل جائے گا۔"

"ایک ہفتہ کیا کروں گا میں... رات بھر کا کہہ دیتا ہوں... مگر رات بھر میں ہوگا کیا...؟" میں نے اپنے گھر کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

اماں کو میں نے دو منٹ میں قائل کرلیا۔ سب ماؤں کی طرح وہ بھی سمجھتی تھیں کہ جھوٹ بولنا تو مجھے آتا ہی نہیں۔

چمپو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "چل، اب ایک طرف سے تجھے فراغت ہوئی۔ دیکھ یہ حادثہ... یا خوش گوار واقعہ... آٹھ بجے پیش آیا تھا۔ اب بجے ہیں دس... دو گھنٹے میں دلہن کے فرار کا راز تو یقیناً افشا ہوچکا ہوگا۔ اب پہلے تو ہم چلتے ہیں جائے واردات پر یعنی مقامِ برات پر... لائیو ٹیلی کاسٹ ممکن ہوتا تو بھابی... روبی... یہاں ٹی وی پر دیکھتی کہ وہاں کیا ہورہا ہے... لیکن ہم اخباری رپورٹر یا جاسوس کی طرح رپورٹ لا سکتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"صورتِ حال کے مطابق مسئلہ حل کرنے میں مدد ملے گی۔ فرض کرو دولہا... نامرد دولہا... بالکل برا نہیں مناتا اور کہتا ہے چلو جی لڑکی اور بس کا کیا ہے... ایک کے بعد دوسری... اور کہا سنا بلکہ کھایا پیا معاف کرا کے چلا جاتا ہے اسی گھوڑے پر واپس... راجا کی جائے گی برات... نامراد گاتا۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" روبی نے اچانک کہا۔

"ہاں... عموماً گھوڑے دولہا کو گرا کے یعنی ڈراپ کر کے چلے جاتے ہیں... خیر، وہ برات کے ہمراہ بس میں بیٹھ کے لوٹ جاتا ہے۔"

"میں نے کہا نا یہ ناممکن ہے۔" روبی نے چلّا کے کہا۔ "وہ اپنے پیسے..." اس نے عروسی جوڑے اور جوتے سے میچ کرتا پرس کھول کے ایک ڈائری نکالی۔ "دس لاکھ چوالیس ہزار دو سو بارہ روپے کیسے بھول سکتا ہے؟"

چمپو نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"ایک دلہن کی قیمت... ایک مجبور بے سہارا یتیم دلہن کی قیمت!" اس نے کاغذ واپس پرس میں رکھا اور ٹشو پیپر سے آنسو صاف کیے۔

میں نے کہا۔ "گویا یہ اسٹوری ہے۔"

چمپو نے کہا۔ "خاتون... آپ یہ کہانی ضرور سنائیں... بالے! نوٹ کرتا جا... شاید یہ کہانی چھپ جائے۔"

روبی نے کہا۔ "میرے ماں باپ کا انتقال تو بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔"

چمپو نے کہا۔ "گویا ان کی بچپن میں شادی ہوگئی تھی... پہلے ہوتی تھی۔"

"میں اپنے بچپن کی بات کررہی تھی۔" روبی نے خفگی سے کہا۔ "اس وقت میں آٹھ سال کی تھی۔ ابّا کی ایک دکان تھی پرچون کی... اس پر چاچا نے قبضہ کرلیا... ہمارا چار کمروں کا مکان بھی تھا... اسے بھی بیچ دیا۔ میرے بھائی بہن..."

"انہیں بھی بیچ دیا... ظالم چچا..." چمپو نے آہ بھری۔

"میرے بھائی بہن تھے ہی نہیں... میری پرورش انہیں کرنا پڑی۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہوں گے۔"

چمپو نے سر ہلایا۔ "ہاں... مجھے شادی کے بعد تین سال کا تجربہ ہے۔"

"میں بھی بہت ڈھیٹ تھی... آپ کی طرح... میں نے کہا کہ بس ذرا بالغ ہوجاؤں اور پڑھ لکھ کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لوں۔"

میں نے چمپو کو بتایا۔ "یہ ایم اے، پی ایچ ڈی... ایم بی بی ایس... ایل ایل بی کرنا چاہتی تھی۔"

"لیکن اس سے پہلے ہی چاچا نے میرا سودا کردیا... اس نے ابّا کی پرچون کی دکان کو بہت پھیلا لیا تھا۔ اسے سپر اسٹور بنانے کے چکر میں اس نے ایک شخص سے مال لیا اور کچھ پیسا... چاچا پیسا واپس دینا نہیں چاہتا تھا... ایک دن ان کی لڑائی ہوئی تو میں نے سنا... اس نے جتنی رقم بتائی میں نے فوراً نوٹ کرلی... پھر اس شخص نے ایک چال چلی... اس نے کہا کہ میں ساری وصولی کی رسید لکھ دیتا ہوں... شادی کا سارا خرچہ بھی میں اٹھاؤں گا... اپنی بھتیجی روبینہ مجھے دے دو۔"

چمپو نے دانت پیس کے کہا۔ "وہ خبیث چچا فوراً مان گیا ہوگا؟"

"ہاں... میں پردے کی اوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ ملائے اور معاہدہ کرلیا... اس کے بعد چچی نے مجھ سے کہا کہ بیٹی تیرے لیے ایک بڑا اچھا رشتہ آیا ہے... میں نے وہی کہا کہ مجھے تو بہت پڑھنا ہے... تمہاری ہونہار بیٹی میٹرک کی ڈگری لے کر فارغ التحصیل ہوچکی ہے... اس کے ہاتھ لال، پیلے کردو... چچی لال پیلی ہو کے بولیں کہ کیا یہ میرے اختیار میں ہے؟ جو تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اسے زبردستی اپنی بیٹی تھمادوں... میں نے کہا کہ پھر اس سے کہو چودہ سال کی جیل کاٹ آئے... اور اگر وہ ضد پر قائم رہا... آپ لوگوں نے زبردستی کی تو میں چلی جاؤں گی جیل... دو چار کو مار کے... لیکن اس لنگور کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "روبی... آخر ایسی کیا خرابی تھی اس میں؟"

"ابھی تم جارہے ہو نا... خود ہی دیکھ لینا... اور بات صرف صورت شکل کی نہیں ہوتی... اخلاق و کردار کی بھی ہوتی ہے۔ ایک شادی وہ پہلے کرچکا ہے چار سال پہلے... اس کی بیوی نے تیسرے مہینے طلاق لے لی تھی... اور میں نے سنا ہے کہ دو بار جیل جاچکا ہے... ایک بار لین دین کے معاملے میں کسی کا سر پھاڑ دیا تھا... دوسری بار شاید پیٹ یا کچھ اور... اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ اس بار چودہ سال کے لیے چلا جائے۔"

چمپو نے سوچ کے کہا۔ "اس حساب سے تو وہ خاصی عمر کا آدمی ہوگا۔"

"مجھ سے دگنی عمر ہے اس کی... مجھ سے ہر طرح الٹ ہے۔ میں گوری ہوں... وہ کالا بھجنگ... میں اسمارٹ ہوں... وہ موٹا بھدّا ہے... میں تعلیم یافتہ ہوں... وہ جاہل ہے... میں شریف ہوں تو وہ بدمعاش ہے... ایسا آئیڈیل ہو سکتا ہے میری جیسی لڑکی کا...؟"

ہم نے ایک ساتھ سر نفی میں ہلائے۔ چمپو نے کہا۔ "آخر کون ہے وہ خوش نصیب جس سے آپ محبت کرتی ہیں اور شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"کوئی نہیں۔" روبی نے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" چمپو بولا۔ "کہ آپ جیسی لڑکی..."

میں نے کہا۔ "چمپو... جب وہ کہہ رہی ہے تو مان کیوں نہیں لیتا؟"

روبی نے باقی کہانی شروع کی۔ ''چچا نے بھی اپنا فیصلہ صاف سنا دیا اور مجھے گھر میں بند کر دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بی اے کا امتحان میں دے چکی تھی... چچا نے شادی کی ساری تیاری کر لی۔ مجھے نہ فرار ہونے کا موقع ملا... نہ خودکشی کا اور نہ کسی کو قتل کرنے کا... وہ سارے یعنی میرے چچا کے گھر والے دن رات میری نگرانی کرتے تھے... ایک منٹ کے لیے مجھے اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔ اس کی تین چڑیل ٹائپ بیٹیاں... دو اس کے لومڑ ٹائپ بیٹے!''

''پھر آج تم نے باہر کیسے چھلانگ ماردی؟''

وہ خفگی سے بولی۔ ''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم وہاں سے گزر رہے ہو... وہاں باتھ روم ہے... میں نے اس کے روشن دان کی جالی کاٹی... وہ زنگ آلود تھی۔ کموڈ پر چڑھ کے روشن دان تک پہنچی اور بس... باہر کود گئی۔''

میں نے کہا۔ ''وہاں اگر میں نہ ہوتا...''

''تو میں گلی میں گرتی... اور مر جاتی... تم نے دیکھا، وہاں ایک گٹر بنا ہوا ہے... اس کا لوہے کا ڈھکنا ہے... اس سے میرا سر پھٹ جاتا۔''

''اور نہ مرتیں پھر؟''

''اب جو نہیں ہوا اس کی بات مت کرو... مفروضات کی تو کوئی حد نہیں ہوتی... تم جتنی فضول کہانیاں بنانا چاہو بنا سکتے ہو۔''

''ہمیشہ کی طرح...'' چمپو بولا۔ ''خیر، ہم جاتے ہیں مس روبی! آپ کو فریج میں کچھ کھانے پینے کے لیے ضرور مل جائے گا... ہم انشاء اللہ برات کا کھانا کھا کے ہی آئیں گے... یا پھر جوتے!''

میں نے کہا۔ ''روبی! تم ایزی ہو جاؤ... اس کی بیوی کا کوئی ڈریس نکال لو وارڈروب سے۔''

چمپو نے ایک چیخ ماری۔ ''خبردار... خبردار! میری بیوی کی ناک فوراً خوشبو سونگھ لے گی... میں کیا بتاؤں گا کہ یہ کس عورت نے پہنا تھا؟''

''تم اپنی بیوی سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟'' روبی نے افسوس سے کہا۔

''یہ خاندانی اثرات ہیں... خاندانِ غلاماں کا ہر شوہر ایسا ہی ہوتا ہے... ایک ہمارے آباؤ اجداد تھے... بیویاں تھر تھر کانپتی تھیں... ذرا غصہ آیا اور تلوار سے گردن یوں اڑا دی... مونچھیں بھی تلوار مار کے رکھتے تھے۔''

چمپو نے کہا۔ ''تجھے پھر جھوٹ بولنے کا دورہ پڑ گیا۔ اچھا روبی! دروازہ اندر سے بند رکھنا... کسی کے لیے مت کھولنا۔''

روبی نے کہا۔ ''آپ کی بیوی آجائے پھر بھی...''

چمپو نے کہا۔ ''وہ خود کھول لے گی... ہم تمہیں باہر دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے۔''

باہر نکل کے چمپو نے کہا۔ ''یار! ہم غیر مسلح ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہم میدانِ جنگ میں نہیں... برات میں جارہے ہیں۔''

لیکن جیسا کہ واقعات نے ثابت کیا، چمپو کا اندیشہ غلط نہ تھا... ہم گیارہ بجے کے بعد پہنچے تو برات آچکی تھی۔ پیچھے بیٹھ کے ہم نے مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ میزبان صاف پہچانے جاتے تھے۔ ان کے رنگ ایسے اڑے ہوئے تھے جیسے سب کا خون سفید ہو گیا ہو... چیف مجرم یعنی میزبان پر تو نزع کا عالم طاری تھا اور غالباً وہ بار بار غائب ہوتا تھا تو باتھ روم جاتا تھا۔ براتی ناک اٹھا کے سُوں سُوں کرتے ہوئے مینیو کا اندازہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے اور خود مجھے دوسری طرف لگائے جانے والے کھانے کے برتنوں کی جھنکار شدید بھوک میں اے آر رحمٰن کی موسیقی سے اچھی لگ رہی تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ دلہن کے فرار کی خبر چھپائی جارہی ہے... غیر موجود دلہن کے قریب المرگ چاچا خود بھی ایسا خوفناک انکشاف کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا لیکن پھر ایک پستہ قد گول مول سی باریش چیز لڑھکتی ہوئی میرے قریب سے گزری۔ یہ قاضی تھا۔

اس سے پہلے نہ جانے گھر میں جانے والی مہمان خواتین کے سامنے دلہن تک رسائی نہ ہونے کا کیا بہانہ کیا جارہا تھا۔ پھر ایک دم جیسے دھماکا ہوا... یقیناً کسی نے بریکنگ نیوز دی کہ دلہن تو کب کی بھاگ گئی اور اسے تلاش کرنے کے لیے جانے والی ٹیم جھک مار کے لوٹ آئی ہے... اس کے بعد ایک غلغلہ بلند ہوا... دلہن بھاگ گئی... کس کے ساتھ بھاگی؟ اپنے کالج کے یار کے ساتھ؟ نہیں جی، پڑوس کا لونڈا لے گیا... پرانا چکر تھا... یہ بھی پتا چلا ہے کہ حاملہ تھی۔

اصل ہنگامہ اسٹیج پر شروع ہوا... جب دولہا نے سہرا نوچ کے پھینکا تو اس کا اصل جلوہ نظر آیا۔ وہ اس سے کچھ بدترین تھا جتنا روبی نے بیان کیا تھا۔ اس نے بھینسے کی طرح ڈکرانا شروع کیا۔ ''میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے... میں چھوڑوں گا نہیں۔''

جواب میں دلہن کی ٹیم کے ایک رکن نے کچھ کہا تو بات بڑھتی گئی۔ دولہا اور اس کی ٹیم نے چلّانا شروع کر دیا، کیا یہ غلط ہے کہ دلہن بھاگ گئی ہے... اس الزام کو جھٹلانے والوں نے اسے جھوٹ کہا مگر ان کا جھوٹ نہیں چل سکتا تھا۔ میں کھسکتا ہوا

اسٹیج کے خاصے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے چمپو کو فرطِ جذبات میں عین اسٹیج پر دیکھا۔

اصل دنگل وہیں شروع ہوا۔ دولہا نے اپنے نہ ہونے والے سسر کو اٹھا کے پھینکا... اس کی ٹیم کے کسی شہ زور نے دولہا کو ٹکر ماری۔ وہ قاضی پر گرا اور صوفہ الٹ گیا تو وہ یوں پیچھے گرے کہ ان کی ٹانگیں آسمان کی طرف تھیں۔ چمپو بیچ بچاؤ کرتے ہوئے مارا گیا... غالباً وہ دونوں طرف سے پٹا... میری آواز پر وہ اسٹیج سے کودا۔

جب میں نے چمپو کے ساتھ واپسی کا راستہ اختیار کیا تو وہاں فریقین گتھم گتھا ہو چکے تھے... کرسیاں الٹ رہی تھیں... لوگوں کے کپڑے پھٹ رہے تھے... بھوکے بٹیرے لڑ رہے تھے... نہ جانے کیسے شامیانے کا ایک بانس گر گیا... توازن بگڑنے سے دوسرا گرا... میں نے دیکھا کہ کچھ موقع شناس عقل مند یا غیر جذباتی لوگ دوسرے خیمے میں ماحضر تناول فرما رہے ہیں... مجھے اندیشہ تھا کہ کسی نے پولیس کو ضرور فون کر دیا ہوگا... میں چمپو کے ساتھ جائے واردات سے فرار نہ ہوتا تو وہ رات نہ جانے کسی تھانے میں قورمہ بریانی کے بجائے پولیس کے چھتر کھاتے گزرتی۔

واپسی پر آدھے راستے میں ہم نے ایک دوسرے کا میڈیکل چیک اپ کیا۔ چمپو کی دائیں آنکھ کے اوپر نیل تھا اور وہ بایاں کندھا ہلاتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وہ ٹھیک نہ ہوا تو میکے سے واپس آنے والی بیوی کو کیا جواب دے گا؟ ”وہ تو میرا ہر جھوٹ پکڑ لیتی ہے اور سچ میں بول نہیں سکتا... تیرے بھی بائیں جبڑے پر چوٹ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں، میرا خیال ہے کہ میں گنڈیری نہیں کھا سکتا۔“

”تو سیدھا چل بھی نہیں سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”میں تشریف بھی نہیں رکھ سکتا۔“

رات ساڑھے بارہ بجے ہم نے واپس پہنچ کے روبی کو پوری رپورٹ دی۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا میرے ساتھ۔“

وہ مجھ پر خفا ہونے لگی۔ ”تم سے کیا میں نے کہا تھا کہ ادھر سے گزرو... عین اسی وقت!“

میں نے کراہ کے کہا۔ ”اس سے تو بہتر تھا کہ تم شادی کر لیتیں۔“

”اس جنگلی ریچھ کو دیکھ کے بھی تم یہ کہہ رہے ہو؟“ روبی نے رونے کی تیاری کی۔ ”اس سے تو بہتر تھا کہ تم مجھے مر جانے دیتے۔“

میں نے جل کے کہا۔ ”تیز گام کے بعد بھی کوئی گاڑی ضرور آئے گی صبح تک...“

”شانتی... شانتی!“ چمپو نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ”آپس میں لڑنے کے بجائے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اب کیا کریں... لیکن کیا اس سے بھی پہلے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم سب بھوکے لوگ کچھ کھا لیں... جو بھی ملے...“

”فریج میں کچھ بھی نہیں ہے۔“ روبی نے منہ پھلا کے کہا۔ ”لیکن میں دس منٹ میں پکا سکتی ہوں... چاول اور دال ہیں؟“

”ضرور ہوں گے... مگر دیکھو... خدا کے لیے کچن میں کوئی نشانی مت چھوڑنا... جو چیز جہاں سے اٹھاؤ وہیں رکھ دینا... بالکل صاف کر کے... دال چاول تو میں صبح لا کے پورے کر دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”شبِ عروسی میں کسی دلہن نے آج تک دال چاول نہیں پکائے ہوں گے... یہ واقعہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آسکتا ہے۔“

”بالے! وہ دلہن نہیں ہے... وہ صرف دلہن کے گیٹ اپ میں ایک لڑکی ہے۔“ چمپو نے کہا۔ ”سرخ عروسی جوڑا پہنے... ٹیکا جھومر اور سب الا بلا پہنے...“

”خاصا مہنگا زیور ہے... لاکھوں کا ہوگا۔“

”الو کے پٹھے... تیری نظر لڑکی پر کیوں نہیں جاتی... لڑکی لاکھوں میں ایک ہے... میں کہتا ہوں موقع ہے... رسک لے اور صبح نکاح پڑھوا لے... میں شرط لگاتا ہوں، وہ مان جائے گی۔“

”اور اس کے بعد میرے ابا اماں سے تو نمٹے گا؟ اپنی بیوی کے سامنے تو پتلون گیلی ہوتی ہے۔“

چمپو نے ایک چیخ ماری۔ ”ابے یہ کیا غضب کیا اس نے... میری بیوی کے سوتی کپڑے پہن لیے۔“

”اور کیا وہ لباسِ عروسی پہن کے کچن میں کام کرتی... ڈر مت... اسے پتا نہیں چلے گا... ایک رات ہی کی تو بات ہے۔“

وہ رو کے بولا۔ ”وہ دوسری عورت کی بو سونگھ لیتی ہے... بلا وجہ بھی...“

”آخر اتنا ہوّا کیوں بنا رکھا ہے تُو نے اپنی بیوی کو؟ وہ تجھے کھا تو نہیں جائے گی... دیکھ چمپو... جہاں خوف ہوتا ہے وہاں محبت نہیں ہوتی... خوف کا ردِ عمل نفرت ہے۔“

”بالے! یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ میں اس کی ناراضی سے ڈرتا ہوں۔ اس سے محبت کرتا ہوں اس لیے اسے ناراض

نہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں... لیکن تُو صبح اس لڑکی سے شادی کر لے تو میں نپولین کی طرح اس کے چاچا کے سامنے جا کے اور بینڈ بجا کے اعلان کرنے کے لیے تیار ہوں کہ بھتیجی فروش چاچے... اس نے تو اپنا گھر بسا لیا... چلو اب تم اس کا یہ گھر خالی کرو جس پر قبضہ جمائے بیٹھے ہو اور یہ اسٹور...“

میں نے اسے یاد دلایا۔ ”چمپو... مسئلہ میرے ماں باپ کا ہے۔“

”ابے چھوڑ... روز تیرے سے بھی گئے گزرے لونڈے کسی لونڈیا کو بھگا لے جاتے ہیں اور اس سے لو میرج کر لیتے ہیں۔ ماں باپ کا کیا ہے... دو چار دن اچھلتے ہیں... گھر سے نکال دیتے ہیں... اخبار میں عاق کرنے کا اشتہار بھی شائع کرا دیتے ہیں... سب بکواس... جب پتا چلتا ہے انہیں دادا گیری مل گئی ہے... خود دوڑے جاتے ہیں۔“

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”تو کہاں پہنچ گیا... کیا تو نہیں جانتا کہ میری لو میرج خالہ کی لڑکی سے طے ہے۔“

وہ ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا۔ ”لو میرج طے ہے؟ اس چھپکلی سے... اس لڑکی کا مقابلہ...“

چونکہ روبی دال چاول لے آئی تھی اس لیے چمپو وہ سب نہ کہہ سکا جو کہنا چاہتا تھا۔ میں دال چاول نہیں کھاتا... شیخ سعدیؒ نے ہند کے بارے میں لکھا تھا کہ عجیب لوگ ہیں... غلے سے غلہ کھاتے ہیں... اس کے باوجود میں نے دال چاول کی تعریف کی۔

چمپو نے مجھے گھور کے دیکھا۔ ”بالے! دال چاول کتنے ہی اچھے ہوں... قورمے بریانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے... جیسے رنگین تتلی کا مقابلہ کبھی چھپکلی سے نہیں کیا جا سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”اگر روبی کے چاچا نے پولیس میں رپورٹ لکھوا دی ہوگی... پھر؟“

چمپو نے مجھے بڑی مسرت سے مطلع کیا۔ ”پھر تو بھی اندر ہو جائے گا... حدود آرڈیننس اور اغوا کے کیس میں... انشاء اللہ!“

”میں اس کے رپورٹ لکھوانے سے نہیں ڈرتی۔“ روبی نے کہا۔

”اس کی ایک وجہ ہے... تم نے نہ کبھی تھانے کا نام سنا ہے... نہ کبھی وہاں کسی تفتیش کے لیے گئیں۔“

”ہاں... اس کے لیے جو تیرہ نمبر کا چھتر استعمال ہوتا ہے... اس کی بڑی شہرت سنی ہے... اس کے علاوہ...“

میں نے چمپو کو گھورا۔ ”خوامخواہ دہشت مت پھیلا... میری تو نوکری بھی جائے گی... میرا خیال ہے روبی... صبح میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں... ہم تمہاری ہر قسم کی قانونی مدد کے لیے تیار ہیں...“

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... میں نے طے کر لیا ہے... تم ساتھ دو یا نہ دو۔ مجھے اب نیند آ رہی ہے۔“ اس نے برتن اٹھائے۔ ”یہ میں صبح دھو دوں گی۔“

”او کے... تم جا کے دوسرے کمرے میں سو جاؤ... اندر سے کنڈی لگا لو... میں اور بالا یہاں سو جائیں گے۔“

”میں اکیلی کمرے میں نہیں سو سکتی... مجھے ڈر لگتا ہے... یہ بیڈ کافی چوڑا ہے... ہم تینوں سو سکتے ہیں۔“

چمپو نے پھر حلق سے چیخ جیسی آواز نکالی۔ ”تینوں... ناممکن... میرا مطلب ہے... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسے...“ اس نے کہا اور ایک کنارے پر کروٹ لے کر سو گئی۔ ہم دونوں بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے... پھر ہم نے درمیان میں گاؤ تکیہ رکھا... اور شرافت کی اس دیوار کے دوسری طرف دونوں لیٹ گئے... بالکل اسی طرح جیسے باٹا والے ایک ڈبے میں دو جوتے رکھتے ہیں۔ رات کو دو بار چمپو نے لات مار کے مجھے نیچے گرایا۔ پھر میں نیچے ہی سو گیا۔

صبح جاگتا کیا... میں پریشانی میں رات بھر ہی جاگتا رہا تھا... میں نے جتنا سوچا، مجھے اپنا انجام اتنا ہی بُرا نظر آیا۔ چمپو خراٹے لے رہا تھا اور وہ لڑکی بھی جس کروٹ پر لیٹی تھی اسی پر بے خبر پڑی تھی... یہ بہترین موقع تھا کہ میں روبی کو چمپو کے پاس چھوڑ کے نکل جاؤں... طویلے کی بلا بندر کے سر... بعد میں بیوی اس کے ساتھ کچھ بھی کرے۔

ابھی میں نے دروازے کے ہینڈل کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ چمپو بولا۔ ”دروازہ لاک ہے بالے۔“

میں نے مایوسی سے کہا۔ ”تُو بڑا کمینہ ہے چمپو... مجھے تو رات بھر پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہے۔“

اس نے کہا۔ ”شیر بن شیر!“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”شیر دال چاول نہیں کھاتے... کیا تُو کسی طرح معلوم نہیں کر سکتا کہ تھانے میں کیا رپورٹ لکھوائی گئی ہے؟“

”دیکھ... ایک عظیم فلمی قول ہے کہ جب جب جو جو ہونا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے... معلوم ہو جائے گا... جلدی... بس پھر جو ہوگا بھگت لیں گے۔ ویسے ہم تیرے ساتھ ہیں کوئی مائی کا لال تجھے ہاتھ بھی لگا سکتا ہے... اور پھر جب تُو نے کچھ کیا ہی نہیں...“

روبی ہماری باتوں کی آواز پر اٹھی اور مسکرا کے ایک انگڑائی لی تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ''بہت دن بعد سکون سے سوئی... میں اب ناشتا بناتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یار! یہ کیا چیز ہے؟ خدا کی قسم...'' میں نے کہا۔

''بڑی قسمت ہے... لے... تجھ پر آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ تیری جگہ میں ہوتا تو اپنی قسمت پر رشک کرتا۔''

''یہ بات اپنی بیوی سے کہنا۔'' میں نے ہنس کے کہا۔

ناشتا بھی ضروری تھا۔ ناشتے کے بعد چمپو نے بھی آفس نہ جانے کا اعلان کر دیا۔ پھر اس نے نہ جانے کس کس کو فون کیے اور ایک راستہ نکال لیا... آدھے گھنٹے میں میرے بدترین شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ روبی کے چچا نے لڑکی کے اغوا کی رپورٹ لکھوادی تھی۔

''راتوں رات پولیس نے چھاپا مار کے محلے کے چار نوجوان بھی اٹھا لیے جو زیادہ ہیرو ٹائپ تھے۔'' چمپو نے مجھے مطلع کیا۔

''انہوں نے اعترافِ جرم بھی کر لیا ہوگا... یہ تو یہاں ہوتا ہی رہتا ہے مگر اصل مسئلہ ہے مالِ مسروقہ کی نشان دہی... کیسے وہ بتا سکتے ہیں کہ چوری کا مال کہاں ہے۔'' میں نے روبی کی طرف دیکھا۔

''وہ تیرے پاس ہے... تو اصل مجرم قرار دیا جائے گا۔ اغوا کے علاوہ رات گزر جانے کے بعد تیرے خلاف حدود آرڈیننس کا کیس بھی بن گیا ہے... اس کی ضمانت نہیں ہوتی۔''

''چمپو! میرے ساتھ ساتھ تُو بھی پھنسے گا۔''

''افوہ... کوئی نہیں پھنسے گا... چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ... میں عاقل اور بالغ ہوں... اپنی مرضی سے آئی ہوں۔'' روبی نے کہا۔

''تم بے وقوف ہو... تھانے میں ایسی باتوں سے کوئی متاثر نہیں ہوتا۔ یہ تو اب پورا کیس بنے گا۔ میں رہوں گا حوالات میں... تم دارالامان میں۔ پھر ہمارا میڈیکل ہوگا... اخبار میں خبر اور تصویر چھپے گی، میری اور تمہاری... نوجوان لڑکی آشنا کے ساتھ گرفتار... میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا... نہ تفتیش، نہ بدنامی... تم واپس جاؤ۔''

''واپس جانے کی بات مت کرنا... میں الٹا تمہارے خلاف بیان دے دوں گی کہ اس نے ورغلایا تھا مجھے... شادی کا وعدہ بھی کیا تھا۔''

میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ''روبی... تم ایسا نہیں کر سکتیں اپنے محسن کے ساتھ۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں مجبوری میں سب کچھ کر سکتی ہوں... یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ یہ مجھے اپنے ایک دوست کے فلیٹ پر لے گیا تھا جہاں اس نے مجھے رات بھر رکھا۔''

''یہ بلیک میلنگ ہے روبی!''

چمپو نے دانت پیس کے میری طرف دیکھا۔ ''اور کر نیکی... اپنے ساتھ مجھے بھی مروایا۔''

روبی مسکرائی۔ ''میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میں یہ سب نہیں کروں گی، بس تم میرے واپس گھر جانے کی بات مت کرنا... مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔''

''اس کے بعد تم کیا کرو گی؟''

''یہ کیس دو چار ہفتے میں دب جائے گا۔ سب بھول جائیں گے روبی کو... سوائے اس نامراد دولہا کے جو اس وقت بھی اپنا سر پکڑے بیٹھا ہوگا... لیکن اسے بھی مجھ سے زیادہ اپنے دس پندرہ لاکھ کے نقصان کی فکر ہوگی جو وہ چاچا سے وصول کرے گا... میرے پاس جو زیور ہے... یہ کوئی دو لاکھ کی مالیت کا ضرور ہوگا... میں اسے بیچ دوں گی۔''

''اور دو لاکھ میں کوئی گھر خرید لو گی... ایک گاڑی... ضرورت کا سامان... اور باقی زندگی ہنسی خوشی گزارو گی۔'' میں نے طنز سے کہا۔

''افوہ... پوری بات تو سن لو میری... میں جعلی نام سے ایک نیا شناختی کارڈ بنوالوں گی اور ممکن ہوا تو ایک پاسپورٹ بھی... یہاں پیسا خرچ کر کے سب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد میں باہر نکل جاؤں گی... جیسے سب نکل جاتے ہیں... اعلیٰ تعلیم کے بہانے... تب تک میں کسی اسکول میں نوکری کر لوں گی۔''

اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں اکیلی عورت کے ساتھ ہر قدم پر کیا ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک ہوس پرست بے ضمیر اور ظالم معاشرے کا ضرور علم ہوگا جہاں لوگ چار پانچ سال کی بچی کو بربریت کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میرے ساتھ کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس نے یہ دنیا دیکھی ہی نہیں تھی... عورت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ چھت کا ہوتا ہے۔ وہ اکیلی کسی ہوٹل کے کمرے میں رہ کے دکھائے... کہیں کرائے پر ایک فلیٹ حاصل کر کے دکھائے۔

یہ بات طے تھی کہ ہم نے اسے واپس گھر جانے پر مجبور کیا تو وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے جس سے وہ خود تو خیر نقصان اٹھائے گی، اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دے گی۔ دوپہر کے وقت اماں کا فون آیا۔

''کیسا ہے تیرا دوست بیٹا؟''

میں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔ ''کون چمپو... یہ سامنے بیٹھا ہے۔'' میں بھول گیا کہ میں نے ایک دوست کے ایکسیڈنٹ کی بات کی تھی اور کہا تھا کہ میں حیدرآباد میں ہوں۔

''ارے باؤلا ہوا ہے... وہ جس کا حادثہ ہوا تھا... حیدرآباد میں؟''

میں نے تھوک نگل کے کہا۔ ''وہ... وہ تو آئی سی یو میں ہے... دراصل چمپو بھی آیا ہے نا میرے ساتھ... سامنے بیٹھا ہے۔''

''بالے! تجھے جانا ہی تھا تو خالہ کا برقع دے کر جاتا... وہ اپنے ساتھ کیوں لے گیا؟ وہ بے چاری گھر میں بند بیٹھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ان سے کہیں کہ اب چھوڑ دیں پردہ... کون دیکھے گا ان کی صورت۔''

اماں نے چلّانا شروع کر دیا۔ ''باؤلا ہوا ہے لڑکے... اللہ رسولؐ کا حکم ہے... خدا کو منہ دکھانا ہے قیامت والے روز۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا پھر ان سے کہیں کہ دوسرا برقع بنوالیں۔ وہ تو رہ گیا بس میں... پریشانی میں بھول گیا۔''

دوپہر کے وقت تک ہم نے روبی کو سمجھایا کہ جو کچھ وہ سوچ رہی ہے کتنا غیر عملی ہے، ایک کے بعد وہ دوسری بے وقوفی نہ کرے۔ ہم پر بھروسا کرے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کو زبردستی کی شادی سے بچانے کے لیے کیا ہو سکتا ہے اور اگر اسے لوٹ کے اپنے گھر نہیں جانا تو وہ بہ حفاظت کہاں رہ سکتی ہے۔

''پہلے ہم جا کے دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے... تمہارے گھر میں اور تھانے میں... تم دروازے بند کر کے بیٹھو... کسی فون کال کا بھی جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اپنا موبائل نمبر ہمیں دے دو... اور ہمارا تم لے لو... موبائل فون ہے نا تمہارے پاس؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''واپسی میں جاسوسی ڈائجسٹ ضرور لیتے آنا... اس میں احمد اقبال کی نئی کہانی آئی ہے۔''

میں نے دہاڑ کے کہا۔ ''پھر وہی احمد اقبال... اس کی فضول کہانیاں پڑھ پڑھ کے تم جیسی لڑکیاں خراب ہوتی ہیں۔ خبردار جو پھر میرے سامنے اس کا نام لیا۔ سب جھوٹ لکھتا ہے اور لکھنا اسے آتا کہاں ہے...''

چمپو نے کہا۔ ''وہ میں پرسوں ہی لایا تھا... میرے تکیے کے نیچے پڑا ہے... میری بیوی بھی اس کی فین ہے۔''

باہر آ کے میں نے چمپو سے سخت احتجاج کیا مگر اس نے الٹا میرا مذاق اڑایا اور کہا کہ خود مجھے سیدھا قلم پکڑنا نہیں آتا... اور وہ بڑا منحوس دن ہوگا جب کسی رسالے میں تیری کہانی شائع ہوگی... ہم بڑے ناراض سے تھانے میں داخل ہوئے لیکن محرر صاحب نے ہمیں مظلوم سمجھا۔ میں نے کہا کہ کل رات ایک شادی میں ہنگامہ ہوا اور کسی نے میری جیب کاٹ لی۔ مجھے اپنے شناختی کارڈ کے گم ہونے کی رپورٹ لکھوانی ہے۔

سو روپے نذرانہ وصول کر کے رپورٹ لکھتے ہوئے محرر نے کہا۔ ''سنا ہے ادھر دلہن بھاگ گئی تھی... یہ اسی شادی کی بات ہے نا؟''

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''سنا تو ہم نے بھی تھا کہ کوئی پکڑا گیا؟''

''ہاں... چار عاشق تھے لڑکی کے اسی گلی میں... مگر ان کے ماں باپ رات کو چھڑا کر لے گئے... اب بتاؤ پولیس کیا کرے؟''

میں نے یہ پوچھنا غیر اخلاقی سمجھا کہ کتنے پیسے دے کر... ہر ماں کی نظر میں اس کا بیٹا ہیرا ہوتا ہے جبکہ دنیا اسے کچرا سمجھتی ہے، ایسے قربانی کے بکرے کو بھی افضل نہیں سمجھا جاتا۔ ''مطلب یہ کہ دلہن نہیں ملی... کون لے گیا اسے؟'' میں نے پوچھا۔

''خصماں نوں کھا کے جو لے گیا۔ اب یہ تو روز کا کھیل ہے۔ کیبل اور فلموں نے اور کیا کرنا ہے... بے وقوف آ جاتے ہیں رپورٹ لکھوانے۔''

چمپو بولا۔ ''سنا ہے زبردستی اس کی شادی کر رہے تھے۔''

محرر روانی میں بولتا گیا۔ ''اصل معاملہ کچھ اور تھا... کڑی کے پیو نے... پیو بھی کدھر... چاچا نے دولہا سے چنگا بھلا مال کھایا تھا... وہ الگ رپورٹ لکھانے آیا تھا مگر ثبوت بھی تو ہو۔ ہم نے کہا جا یار کہیں اور شادی کر لے۔''

یہ کسی قدر اطمینان کی بات تھی کہ پولیس اس سارے معاملے کو قانونی طور پر سیریس نہیں لے رہی تھی۔ مالی طور پر ان کا سیریس ہونا ایک مختلف معاملہ تھا۔ یہ ان کے نزدیک معمولی روزمرہ کا واقعہ تھا جس میں فی الحال نامزد ملزم بھی کوئی نہیں تھا پھر تفتیش کا کیا سوال...؟ تفتیش صرف یہ ہو رہی تھی کہ روبی کے چاچا نے دولہا کو شادی کے نام پر جھانسا دے کر کیا وصول کیا اور اب گلوخلاصی کے لیے کتنا دے گا۔

میں نے چمپو کے ساتھ جائے واردات کا دورہ بھی کیا جہاں اب بھی پانی پت کی چوتھی لڑائی کے بعد کا سماں تھا۔ ڈیکوریشن والے اپنا سلامت رہ جانے والا سامان لے گئے تھے... سڑک پر ٹوٹے ہوئے برتنوں... بکھرے ہوئے کاغذی پھولوں اور ضائع کیے جانے والے کھانوں کے ڈھیر پڑے تھے جن کو کتے اور کوّے بڑی رغبت سے کھا رہے تھے۔ مجھے ایک ٹوٹا ہوا چشمہ... ایک چپل اور کسی کے منہ سے گر جانے والی ایک بتیسی بھی نظر آئی... میں نے اسے بلاوجہ اٹھالیا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ شامتِ اعمال مجھے دوسری بار اس طرف لے گئی تھی۔ گزشتہ رات میں پچھلی طرف کی گندی گلی سے گزرا تھا کیونکہ سامنے شامیانے قناتیں لگانے سے راستہ بند ہوگیا تھا۔ اب میں سامنے پکڑا گیا... اچانک ایک باریش شخص جس کی پیشانی پر دو گومڑ، ہیڈ لائٹس کی طرح روشن نظر آرہے تھے کیونکہ ان پر اس نے ہلدی چونا تھوپ رکھا تھا... میرے قریب السلام علیکم کہہ کر رک گیا۔

''ارے اپنے اقبال میاں... کیا آپ بھی...'' اس نے میرے ہاتھ میں موجود بتیسی کو اور پھر میرے منہ میں جھانک کے دیکھا۔ ''ابھی سے نقلی دانت...''

اب موصوف کا میں کیا تعارف کراؤں... اماں کی طرف کے ننھیالی رشتے سے وہ میرے ماموں بنتے تھے اور ابا کی طرف سے شاید میں ان کا ماموں... ان سے میری آخری ملاقات نہ جانے کب ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ یہاں... ماموں...''

اس نے کہا۔ ''میاں اسی گلی میں تو رہتا ہوں میں... کل شام تم سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔''

میں اچھل پڑا۔ ''مجھ سے...؟''

''ہاں بھئی... تم برقعے میں ایک خاتون کے ساتھ جارہے تھے۔ خالہ ہوں گی تمہاری شاید... وہ ادھر ہی آگے کہیں رہتی ہیں نا... میں نے سلام بھی کیا تھا اور جواب بھی دیا تھا تم نے... سناؤ اماں کا کیا حال ہے؟''

میں نے نظر بچا کے چمپو کو آنکھ ماری۔ ''ان کی کیا پوچھتے ہو ماموں؟ روتے روتے آنکھیں ہی جواب دے گئی ہیں... اس عمر میں یہ صدمہ۔''

وہ گھبرا کے بولے۔ ''کیوں... کیا ہوا... خیر تو ہے؟''

میں نے آہ بھری۔ ''خیر کہاں... جب سے ابا چھوڑ کے گئے ہیں۔''

وہ مزید اچھلے۔ ''ابا نے چھوڑ دیا... کیوں؟''

''اب تو چھ مہینے ہوگئے۔ وہ میری شادی میں ایک ڈانسر آئی تھی، اسی سے نکاح کرلیا لاہور جا کے... مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا شوق یہ گل کھلائے گا۔''

''توبہ توبہ... اس عمر میں... وہ تو ہوتی ہی ہیں حرافہ... مگر تم نے چپکے چپکے شادی کرلی... ہمیں بلایا تک نہیں... کب کی شادی؟''

میں نے پھر آہ بھری۔ ''ابا کی شادی چھ ماہ بعد ہوئی... میرا تو اب ایک بچہ بھی ہے آپ کی دعا سے۔''

وہ قطع تعلق کے احتجاجی انداز میں آگے بڑھ گئے۔ ویسے بھی ان سے ملاقات کہاں ہوتی تھی۔ اب نہ آتے تو کیا فرق پڑے گا۔

''یہ کیا ڈراما کیا تُو نے... اور کیوں؟'' چمپو بعد میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''اب یہ فون کرے گا اماں کو... ملنے تو جائے گا نہیں... کہے گا بالے میاں ملے تھے پھر افسوس کا اظہار کرے گا... پھر احتجاج کرے گا... گالیاں کھائے گا... پھر اماں مجھ سے پوچھیں گی... میں کہوں گا کہ پتا نہیں آپ کس کی بات کررہی ہیں... میں تو یہاں حیدرآباد میں بیٹھا ہوں... کوئی اور ملا ہوگا انہیں۔''

''تُو نے پھر کہانی بنالی ایک بے سرد پا... یہ نہیں چلے گی، شرط لگا لے مجھ سے۔''

آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ چمپو شرط ہار گیا۔ میرے اس ماموں یا بھانجے نے پانچ منٹ بعد ہی اماں کو فون کیا اور اماں نے اسے ایسی بے نقط سنائیں کہ یہ رشتہ ہی ختم ہوگیا۔ ''غضب خدا کا... ایسی منحوس باتیں نکال رہا تھا منہ سے... میں نے کہا کہ اندھی ہو تیری ماں... دوسری کرے تیرا باپ... تُو نشے میں تو نہیں تھا کم بخت!''

''وہ کسی اور سے ملے ہوں گے۔''

''اور کیا... کہنے لگا کہ رات ہی تو بالے میاں ملے تھے... برقعے میں کسی لڑکی کے ساتھ جارہے تھے... یہاں گلی میں ایک لڑکی بھاگی ہے گھر سے، وہی ہوگی... میں نے کہا کہ تیرے منہ میں خاک... بھاگے تیری بیوی۔''

ہمارا ہنس ہنس کے بُرا حال ہوگیا مگر چمپو کی یہ ہنسی ایک ہچکی میں بدل گئی جب فلیٹ کا دروازہ روبی نے نہیں، اس کی بیوی نے کھولا۔ ''تم...!''

''ہاں میں... نیچے سے کھی کھی کرتے آرہے تھے، اب کیا ہوگیا تم دونوں منکر نکیر کو؟ آؤ اندر آؤ۔''

چمپو کی تو وہ حالت تھی جو قسائی کو دیکھ کے بکرے کی ہو سکتی ہے مگر خود میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ''آپ... کب

آئیں... بھابی؟''

چمپو نے رو کے کہا۔ ''میں نے کہا تھا تجھ سے... ایسا ہی ہوگا۔ یہ چھاپا مار حسینہ یہی کرتی ہے۔''

اس نے کہا۔ ''تمہارے کرتوت جانتی ہوں نا... گھر آئی تو اندر سے یہ سوال جواب کرنے لگی کہ تم کون ہو... دروازہ ہی نہیں کھول رہی تھی... کہتی تھی کیا ثبوت ہے... پھر میں نے پڑوس کی مسز ٹنڈا والا کو بلایا۔''

''مسز ٹنڈا والا؟'' چمپو نے سر پکڑ کے کہا۔ ''گویا ساری بلڈنگ میں خبر نشر ہوگئی... وہ تو ہے بھی بی بی سی۔''

روبی نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے بھابی کو سب وضاحت کردی ہے۔''

ہم بیٹھ گئے۔ چمپو نے سکون کا سانس لیا لیکن اب ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ ''کیا پوزیشن ہے وہاں؟''

میں نے کہا۔ ''تھانے میں رپورٹ دونوں نے درج کرا دی ہے۔ پولیس نے شک میں جتنے ملزمان پکڑے تھے، رشوت لے کر سب چھوڑ دیے۔''

''اصل مجرم یہاں مزے سے بیٹھا ہے۔'' بھابی نے کہا۔ ''وہ تو مجھے اس لڑکی نے سب سچ سچ بتا دیا ورنہ تم دونوں ایک نمبر کے جھوٹے...''

''تمہارے یہ کپڑے... اس نے خود ہی نکال لیے تھے۔'' چمپو بولا۔

''تم میں عقل نہیں تھی۔ کوئی ڈھنگ کے نکال کر دیتے۔ آخر مہمان تھی یہاں... اس بے چاری نے کھانا بھی پکا کے رکھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چمپو بہت ڈر رہا تھا کہ آپ اسے ایک منٹ نہیں رہنے دیں گی اپنے گھر میں۔''

''بالکل... کھانا کھالو... پھر میں اسے واپس چھوڑ کے آتی ہوں... تم دونوں تو ہو حیدرآباد میں... یہی کہا تھا نا اماں سے؟''

''جی... مگر...''

''اگر مگر کچھ نہیں... میں کہوں گی کہ اس کی سہیلی ہوں میں... یہ رات میرے ہی گھر میں تھی... اب یہ زبردستی کی شادی والا معاملہ ختم... آپ اغوا کی رپورٹ واپس لیں۔''

روبی نے کہا۔ ''مگر میں واپس نہیں جاؤں گی۔''

''کیسے نہیں جاؤ گی... میں تمہیں اپنے گھر میں رکھنے کا خطرہ مول لوں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... کل کو تم مالک بن کے بیٹھ جاؤ پھر...''

میں نے احتجاج کیا۔ ''روبی ایسی لڑکی نہیں ہے۔''

''مگر میرا شوہر تو ایسا ہے۔'' اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ''اور اس کے ساتھ تھانہ کچہری کا ڈر... پولیس نے تمہیں یہاں سے برآمد کرلیا تو کیا ہوگا؟ محلے میں میری کیا عزت رہ جائے گی؟''

روبی کھانا چھوڑ کے احتجاجاً اندر چلی گئی۔

چمپو میں تو اتنی ہمت ہی نہیں تھی لیکن میں نے کہا۔ ''بھابی! آپ نے بہت زیادتی کی روبی کے ساتھ... ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔''

''اور جب ہم پر مصیبت آئے گی تو ہماری مدد کون کرے گا؟ وہ اس گھر پر ہاتھ صاف کر کے چمپت ہوگئی پھر...؟''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''ایسا سمجھتی ہیں آپ اسے... بڑے افسوس کی بات ہے... وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''اتنی اچھی ہے تو تم کرلو نا شادی اس سے... سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔ میں آج ہی تمہارا نکاح پڑھوانے کا بندوبست کردیتی ہوں۔''

یہاں آ کے چمپو کے ساتھ میری بولتی بند ہوگئی۔ تاہم پہلی بار میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک حل آیا۔ گڑبڑ یہ تھی کہ محاورے کے مطابق یہ اس کا عذاب اپنے سر لینے والی بات تھی۔ بندر کی بلا طویلے کے سر... اس کی مشکل ختم ہوجاتی اور میری مشکلات کا عذاب شروع ہوجاتا۔ وہ گڑھے سے نکل آتی اور میں کنوئیں میں سر کے بل گر جاتا۔

میں نے وہاں بیٹھ کے ٹھنڈے دماغ سے چمپو کی بیوی کو سمجھانے کی فضول کوشش کی مگر وہ اتنی گرم تھی کہ میری ہر دلیل جل کے راکھ ہوتی گئی۔ بالآخر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ٹھیک ہے... میں اسے کہیں اور لے جاتا ہوں... اب میں کوہِ ہمالیہ کی چوٹی پر جا بیٹھوں گا۔ بحرالکاہل کی تہ میں مگر یہاں نہیں رہوں گا۔''

بھابی نے مجھے یاد دلایا۔ ''مسئلہ تمہارے رہنے کا نہیں ہے۔''

میں نے سوچا، واقعی مسئلہ تو روبی کے رہنے کا ہے... وہ بھی عارضی طور پر... اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ روبی اپنے چچا کے خلاف حقوقِ انسانی اور خواتین کی حامی تنظیموں... پریس کلب اور سپریم کورٹ تک جاسکتی ہے۔

میرا خیال تھا کہ میرے دوست کم نہیں... یعنی وہ دوست جو ضرورت پڑنے پر کام آتے ہیں... پہلے میں نے اس کو فون کیا جو ٹاپ ٹین چارٹ میں چمپو کے بعد نمبر دو تھا۔ اس کے جواب سے مایوس ہو کے میں نے تیسرے سے مدد مانگی۔ پھر

چوتھے سے... وہ سب بہانے کرتے گئے۔ کچھ نے صاف بتا دیا کہ وہ کسی آدم خور شیر یا شاہ جنات کو تو گھر میں جگہ دے سکتے ہیں مگر اس لڑکی کو نہیں جس کی وجہ سے کل وہ گھر سے باہر اور پھر حوالات کے اندر نظر آئیں۔

اچانک مجھے اپنے باس کا خیال آیا۔ بے شک وہ ایک کالے بکرے جیسا تھا اور اس کی خوب صورت گائے جیسی بیوی کی جوڑی اس کے ساتھ بالکل میچ نہیں کرتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ کالے بکرے کو خدا نے سونے کا دل دیا ہے۔ (عام دل ہوتا تو اسے ایسی بیوی کہاں ملتی؟)۔ میں نے فوراً بہ قلم خود اس کی خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔

وہ اپنے آفس میں تھا اور جب اس نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے سب سچ سچ بتا دیا۔ ہنس ہنس کے اس کے آنسو نکل آئے۔ ''او مائی گاڈ... تم پر آسمان سے دلہن گری... اور تم پھر بھی لنڈورے پھر رہے ہو... بڑے ناشکرے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''سر! میری ایک منگیتر ہے... بے شک وہ چھپکلی ٹائپ ہے لیکن ہم پیدائش کے وقت منسوب ہوئے تھے اور میں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ مجھے قتل کر کے خودکشی کرلے گی۔ قاتلوں کی لائن میں اس کے اور میرے ابا بھی توپ تلوار لیے کھڑے ہیں۔''

باس نے کہا۔ ''او کے... او کے! تم اسے میرے گھر لے آؤ... تم دونوں میرے سرونٹ کوارٹر میں رہ سکتے ہو۔''

''دونوں؟ وہ تو ہم حوالات میں بھی رہ سکتے ہیں سر! آپ چند روز روبی کو رکھ لیں... راز داری سے۔''

باس کی خوب صورت بیوی نے کہا۔ ''میں اسے بہن بنا کے لاؤں گی اپنے شوہر کی... تم فکر مت کرو۔''

میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ دراصل چمپو کی بیوی کے رویّے نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ روبی پہلے ہی میرے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی تھی۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا کہ چمپو کی بیوی کو شرمندہ کر سکوں۔ لیکن میری ساری خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب گھر پہنچنے پر مجھے بتایا گیا کہ روبی تو چلی گئی۔

''چلی گئی... کہاں چلی گئی؟'' میں نے چلّا کے کہا۔

''چلاؤ مت۔ وہ اپنا پتا دے کر نہیں گئی... خاموشی سے نکل گئی۔'' چمپو کی بیوی نے کہا۔ ''ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔''

میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر اسے کچھ ہوا تو اس کی ذمے دار آپ ہوں گی... یومِ حشر میں آپ کا دامن تھام کے فریاد کروں گا۔''

''وہاں فریاد کرنے والے بہت ہوں گے... اس کا باپ... چچا... نہ ہونے والا شوہر... تم بھی لگ جانا لائن میں...''

میں بہت غصے میں نکلا اور سڑک پر پہنچ کے کھڑا ہوگیا۔ کسی شاعر نے کہا تھا... گیا ہے اونٹ کوئی اس طرف سے... کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی... روبی نے تو کوئی سراغ ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اچانک مجھے اس کے دیے ہوئے موبائل فون نمبر کا خیال آیا۔

خلافِ توقع اس نے کال ریسیو کرلی۔ ''کیا بات ہے؟''

میں نے کہا۔ ''روبی! کہاں ہو تم؟''

''میں پشاور جا رہی ہوں... اپنی ایک سہیلی کے گھر!''

''اکیلی؟'' میں نے چلّا کے کہا۔ ''میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں... مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟''

''تم فکر مت کرو... میں اس کے شوہر کے ساتھ جا رہی ہوں... اور ہاں، تمہاری خالہ کا برقع میرے پاس امانت ہے۔ تمہیں لوٹا دوں گی۔''

''بھاڑ میں گیا برقع!''

اس نے کہا۔ ''تم نے جہاں تک میری مدد کی اس کا شکریہ... تم بہت اچھے اور سچے آدمی ہو... لیکن بہت ڈرپوک ہو... بلکہ نامرد!''

میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی فون بند ہوگیا۔ اس کی تعریف نے میرا دل خوش کیا تھا تو آخری الفاظ نے میرے منہ پر جوتا کھینچ مارا تھا۔ میں نے پھر بار بار نمبر ملایا مگر اس نے جواب ہی نہیں دیا۔

اب شام بھی رات میں ڈھلنے لگی تھی۔ میں نے دوپہر سے اب تک دھکے کھائے تھے یا گالیاں... پیٹ خالی ہو تو دماغ نہیں چلتا... جیسے پیٹرول ٹینک خالی ہو تو گاڑی کا انجن نہیں چلتا۔ کوئٹہ مغلِ اعظم باغبان ہوٹل سے آدھا لیٹر چائے پیتے ہوئے میں نے اس کے مالک سے اس نام کی وجہ تسمیہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ دلیپ کمار اور امیتابھ بچن کی یہ دونوں فلمیں اسے اتنی پسند تھیں کہ صرف ایک کا نام کافی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''اس وقت یہاں سے کوئی گاڑی پشاور جاتی ہے؟''

''کیوں نہیں جاتا... ابھی خیبر میل لگے گا ڈائریکٹ پشاور۔''

ایک موہوم سی امید پر میں ریلوے پلیٹ فارم پر جا

بیٹھا۔ خیبر میل رات دس بجے جاتی تھی اور ابھی ساڑھے آٹھ ہوئے تھے۔ میں نے مسافر خانے کا چکر لگایا، زنانہ ویٹنگ روم میں جھانکا... ہر پلیٹ فارم کو دیکھا کہ کہیں خالہ کا برقع نظر آجائے۔

اب کچھ خالہ کے برقعے کے بارے میں... ایک تو اس کا رنگ سلیٹی ہے... لیکن اوپر نیچے کے سلیٹی رنگ میں فرق ہے۔ ہوا یوں کہ شاید بیس بائیس سال قبل جب انہیں یہ برقع شادی کے جہیز میں ملا تھا، انہوں نے ایک نئی دلہن کی طرح اٹھلا کے اپنے میاں سے گلہ کیا کہ اب تک وہ انہیں کہیں گھمانے نہیں لے گئے۔ خالو اس وقت بھی ایک سیانے شوہر تھے... وہ فوراً خالہ کو شاپنگ کرانے پرانی سبزی منڈی لے گئے... انہوں نے مہنگے بازار کا رخ کرنے سے گریز کیا۔

اب بہت لوگ جانتے ہوں گے کہ پرانی منڈی میں لاوارث گائیں اس طرح پھرتی نظر آتی تھیں جیسے یورپ کے کسی ساحل پر لباسِ قدرت میں فرنگی حسینائیں... یہ ٹنڈے کریلے کی شاپنگ میں مگن تھیں کہ ایک گائے ایسے ان کو چھوتی ہوئی گزری کہ برقعے کا اوپر والا حصہ اپنے ایک سینگ میں لے گئی۔ خالہ کے واویلے پر خالو بھی دوڑے اور دیگر رضا کار بھی۔ گائے بدحواس ہو کے بھاگی تو پکڑنے کی کوشش کرنے والا... کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا... جب بالآخر گائے گرفتار ہوئی تو خالہ کے برقعے کا پارٹ اس کے سر پر نہیں تھا۔

یوں اوپر والا حصہ نیا بنوا کے برقع پھر مکمل کیا گیا لیکن رنگ میں نمایاں فرق آگیا۔ مزید یہ کہ اس نئے حصے پر خالہ نے آنکھوں کے سامنے والے حصے میں سفید دھاگے سے نفیس جالی بنائی اور ہونٹوں کی جگہ ایک پھول کاڑھا... یوں یہ برقع لاکھوں میں ایک ہوگیا جو ہر جگہ آسانی سے پہچانا جاتا تھا۔

میں خالی الذہن بیٹھا تھا کہ اچانک فون بجنے لگا۔ یہ کال گھر سے آئی تھی۔ اماں نے کہا۔ ''بالے! کہاں ہے تو؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی اسپتال میں ہی ہوں۔''

جواب میں جیسے زنانہ گالیوں کی مشین گن چل گئی۔ ''مجھ سے جھوٹ بولتا ہے۔ کسی کی دلہن کو لے کر بھاگا ہے تو... تیرے ماموں کے بعد تیرے اس دوست کی بیوی نے مجھے بتایا...''

میں نے کچھ سنا کچھ نہیں سنا۔ بھانڈا پھوٹنے کے بعد یہ سب میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ فون پر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ فائدہ یہ ہوا کہ میرے دل سے اس دھماکے کا ڈر نکل گیا جس کے خیال سے میں کانوں میں انگلیاں دیے سر گھٹنوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

کوشش کر رہا تھا کہ پتلون گیلی نہ ہو۔ روبی کی بات مجھے گالی جیسی لگی تھی۔ نہ صرف یہ کہ میں بہادر ہوگیا بلکہ مرد بن گیا۔

میں نے کہا۔ ''اماں بعد میں بات کریں گے۔'' اور ان کی چیخ و پکار، کوسنوں اور دھمکیوں کی پروا کیے بغیر فون بند کر دیا۔ اسی وقت میں نے روبی کو دیکھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ خالہ کے برقعے کو دیکھا اور میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں ایک دم اٹھا اور پھر بیٹھ گیا کیونکہ روبی اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ سہیلی کا بے حد خطرناک اور خوں خوار قسم کا پٹھان شوہر بھی تھا۔ قد چھ فٹ... اس پر ایک فٹ کی پگڑی... چوڑائی میں مجھ سے دگنا... مونچھیں دونوں طرف ایک ایک بالشت... سب سے بڑھ کر یہ کہ سینے پر میگزین اور سائیڈ میں بے حد ڈراؤنا پستول... اور گلے میں نسوار!

اگر میں اس کے سامنے ہیرو بن کے جاتا اور کہتا کہ روبی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا تو وہ مسکرا کے مونچھیں ہلاتا، ریوالور اٹھاتا اور کہتا۔ ''خو، یارا جیسا تم بولتی...'' اور ڈز ڈز میرے دل کا خون کر کے میری لاش پر سے گزر جاتا... اور نسوار کھاتا رہتا۔

میں نے انہیں اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ ظاہر ہے روبی کی نظر اس بھیڑ بھاڑ میں مجھ پر نہیں پڑی۔ میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے قلی کے پیچھے ان کا تعاقب کرتا گیا۔ پھر مخالف سمت میں آنے والے ایک بھاگم بھاگ قلی نے غالباً میری ٹانگوں میں سے گزرنے کی کوشش کی۔ وہ بھی ایک بیگ اور بستر سمیت... یہی الزام گرنے کے بعد اس نے مجھ پر عائد کیا... بہرحال، بحث کا وقت نہ اس کے پاس تھا نہ میرے پاس۔

میرے اٹھنے اور پھر پیچھے جانے تک روبی غائب ہوگئی۔ خالہ کا ٹریڈ مارک برقع مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ خطرناک ریوالور اور مونچھ والا بھی مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اب میں نے طویل ٹرین کے ہر ڈبے کی ہر کھڑکی میں جھانکنا شروع کیا۔ یہ ایک مشکل اور وقت طلب کام تھا۔ مجھے گھبراہٹ یہ ہونے لگی تھی کہ کہیں روبی کے ملنے سے پہلے گاڑی نہ چل پڑے۔ خیر... میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ اب کراچی سے پشاور تک جانا پڑا تو جاؤں گا مگر وہ الزام دھو ڈالوں گا جو روبی نے مجھ پر لگایا تھا۔

اچانک خالہ کا برقع یوں نظر آیا جیسے گائے بھینسوں کے ریوڑ میں کوئی گھوڑی۔ یہ مثال اس لیے درست ہے کہ زنانہ ڈبے میں دیگر تمام برقعے یا تو... بھینس جیسے کالے تھے یا گائے جیسے سفید... شٹل کاک ٹائپ' سرمئی رنگ کا وہ ایک ہی

برقع تھا جس کی سفید جالی روشن لگتی تھی اور ہونٹوں پر پھول مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں رک گیا۔ روبی نے میرا مکھڑا ایک کھڑکی کے فریم میں ملاحظہ کیا لیکن کھڑکی کے ساتھ بیٹھی خاتون نے میری اشارے بازی پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا۔
''خانہ خراب ادھر سے دفع ہو جا...''

روبی میری طرف دیکھنے پر آمادہ ہی نہ تھی اور دیکھ چکی تھی تو میرے اشارے پر باہر آنے کے لیے تیار نہ تھی۔ جب گاڑی نے وسل دی تو میں نے چلّا کے کہا۔ ''روبی... میری بات سنو۔'' مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ دوسری وسل کے ساتھ گاڑی ہلی تو میں دوڑا اور ساتھ والے ڈبّے میں گھس گیا۔ وہاں روبی کی سہیلی کا شوہر اپنی بھیانک مونچھوں اور توپ جیسے ریوالور کے ساتھ موجود تھا۔ ریوالور ضرور درّے کا بنا ہوا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اس میں سے گولی کے بجائے گولہ نکلے۔

سر سے کفن کی جگہ پتلون کی بیلٹ کو ٹائٹ باندھ کے... کیونکہ میرے پیٹ میں گڑگڑ شروع ہو چکی تھی... میں نے مونچھ خان کی طرف پیش قدمی کی اور اس کے بالکل ساتھ جا بیٹھا۔ جنگی حکمتِ عملی میں نے طے کر لی تھی۔ ناگزیر حالات میں جان بچانے کے لیے میں اپنے قاتل سے ایسے چمٹ جاؤں گا کہ وہ اسلحہ نکالنے کے لیے حرکت بھی نہ کر سکے اور اس کی دونوں مونچھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں ایسے جکڑ لوں گا...

لیکن اس سے پہلے کہ میرے حلق سے آواز بھی نکلتی، ایک بے مروت قسم کا ٹکٹ چیکر نمودار ہو گیا... اس نے یہ عذر قبول نہیں کیا کہ میں ٹرین چلنے کے بعد پلیٹ فارم پر پہنچا تھا اور ٹرین سے تیز نہ دوڑتا تو یہیں رہ جاتا۔

''کیوں رہ جاتے... تم ٹرین سے تیز دوڑتے ہوئے پشاور تک سب سے پہلے پہنچ جاتے... ٹرین تو لیٹ بھی ہو جاتی ہے۔'' اس نے کسی مسخرے کی طرح کہا۔ ''پیسے نکالو۔''

میں نے مونچھ خان کے مسکرانے کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا پرس نکالا۔ اس میں میرا کریڈٹ کارڈ تھا جو ریلوے قبول نہیں کرتی... اے ٹی ایم کارڈ تھا جو ٹرین میں... بے مصرف تھا۔ میری جیب میں سے کُل کیش چار سو بیس روپے برآمد ہوا جو کُل کرائے کا نصف بھی نہیں تھا۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے علیحدگی میں بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سمجھ دار آدمی نظر آتا تھا۔

میں نے اسے بتایا۔ ''یہ خطرناک مونچھوں والا ایک بھولی بھالی لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے... وہ ساتھ والے زنانہ ڈبے میں ہے... میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔''

''لڑکی کا... ضرور کرو مگر ٹکٹ لے کر... ورنہ...''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے... حیدرآباد تک کا ٹکٹ بنا دو۔''

اتنی رقم بہرحال میرے پاس تھی۔ ٹکٹ چیکر مایوسی سے آگے بڑھ گیا لیکن اب مونچھ والے کے ساتھ ایک ڈاڑھی والا آ کے بیٹھ گیا تھا اور ان کے درمیان برادرانہ تعلقات بھی استوار ہو چکے تھے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اب میرے بیٹھنے کے لیے جگہ ہی نہ تھی اور کھڑے کھڑے میں روبی کے اغوا کنندہ سے خطاب کرتا تو وہ مداخلت برداشت نہ کرتا۔ وہ گولی سے مجھے گرا کے اپنے ہمسائے سے کہتا۔ ''معاف کرنا یار... ابھی آگے بولو تم کیا بات کرتا تھا۔''

اسی وقت بالٹی اٹھائے ٹھنڈی بوتل والا آواز لگاتا نمودار ہوا۔ ڈاڑھی نے مونچھ کو بوتل آفر کی۔ میں مہلت سے فائدہ اٹھا کے آگے نکل گیا اور اپنے پیپر ٹکٹ کے پیچھے لکھا۔ ''اگر تم حیدرآباد میں نہ اتریں تو میں پولیس لے کر آ جاؤں گا۔''

جب بوتل والا درمیانی راستے سے اگلے ڈبے میں جانے کے لیے میرے پاس سے گزرا تو میں نے ایک سو کا نوٹ اور وہ ٹکٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جس پر روبی کے نام پیغام لکھا ہوا تھا۔ پھر میں نے اسے خالہ کے برقعے کے بارے میں بتایا۔ ''وہ میری بیوی ہے مگر میں زنانہ ڈبے میں نہیں جا سکتا... یہ اسے دے دو۔''

ٹھنڈی بوتل والا معنی خیز انداز میں مسکرایا کہ ہمیں چکر دیتے ہو؟ مگر وہ میرا پیغام لے گیا... اب اصل سسپنس شروع ہوا۔ دو بار باتھ روم جانے سے پیٹ کی گڑبڑ تو ختم ہو گئی مگر دل کی حالت ایسی ہو گئی جیسے بند ہونے والا ہے... جیسے جیسے حیدرآباد قریب آتا گیا' میں نے ایک وظیفہ شروع کر دیا جو مجھے بنگالی بابا اصلی بنگال والے نے دیا تھا... گارنٹی کے ساتھ کہ محبوب آپ کے قدموں میں نہ ہو تو سوا روپیا واپس...

گاڑی حیدرآباد پر رکی تو رات کا ایک بجا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر ایسے کھڑا ہوا جیسے پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوں... اس وقت میرا دل دھڑکنا بند ہو چکا تھا۔ یہ دل ایک الٹی قلابازی لگا کے پھر دھڑکا جب میں نے خالہ کے برقعے کو پلیٹ فارم پر دیکھا۔ وہ مخالف سمت میں چل پڑی جدھر سے ٹرین آئی تھی۔ میں کانپتی ٹانگوں سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ آدھی رات کے بعد ایک اونگھتے ہوئے شخص نے میرا پیپر ٹکٹ روبی سے لے لیا اور یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ ایک کا ہے تو دو کیسے گزر رہے ہیں۔ اس نے فرض کر لیا ہوگا کہ میاں بیوی ہیں تو ٹکٹ بھی دو ہی کا ہوگا۔

حیدرآباد کے ریلوے اسٹیشن پر دن والا ازدحام نہیں تھا۔ یہ رات کی آخری ٹرین تھی۔ اب صبح آٹھ بجے سے پہلے کراچی کی طرف سے شالیمار کے سوا کوئی ٹرین نہیں آتی تھی... مسافر خانے میں قلی اور اسی نوع کے دیگر افراد پسرے پڑے تھے۔ دیوار کی طرف وہ دیہاتی خاندان کچھ سو رہے تھے کچھ جاگ رہے تھے جن کو صبح کی کسی ٹرین سے جانا تھا۔

روبی ایک دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑی ہوئی۔ ''اگر میں اپنی سہیلی کے گھر جانا چاہتی تھی تو تمہیں کیا تکلیف تھی؟''

''اس مونچھڑ خان کے ساتھ... جو شکل سے ہی اسمگلر، بردہ فروش، اجرتی قاتل اور... شریف آدمی کے سوا سب کچھ لگتا ہے۔''

''ڈر تو مجھے بھی لگ رہا تھا... مگر میں واپس نہیں جاسکتی... تمہارے اس دوست کی بیوی کو اپنے شوہر پر اعتبار نہیں... کیسی عورت ہے؟''

''وہ ڈریکولا ہے۔''

''اگر میں نہ اترتی... تو کیا تم سچ مچ پولیس کو لے آتے؟''

میں نے کہا۔ ''کم سے کم یہ بات سچ ہے... میں تمہارے ساتھ جیل جاسکتا ہوں... مگر تمہیں اس طرح کسی اجنبی کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''اجنبی کیا تم نہیں ہو میرے لیے...؟''

''اب تو نہیں رہا۔ اب بھی تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غالباً برقعے کی جالی کے پیچھے اس نے اعتراف میں نظر جھکالی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے کار کی ہیڈ لائٹس کو فل بیم سے ڈپ کر دیا ہو۔

''کم سے کم اچھے اور سچے ہونے کی سند مجھے حاصل ہے۔''

''دیکھو... میں نے دوپہر سے اب تک کچھ نہیں کھایا... میں بے ہوش ہو کے گرنے والی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''چلو یہاں سے نکلتے ہیں... معلوم ہے میری جیب میں کتنے پیسے تھے؟ چار سو بیس روپے... اب ایک سو بیس رہ گئے ہیں۔''

''تم کیا بلا ٹکٹ پشاور جاتے؟''

''مجھے ٹکٹ چیکر نے پکڑ لیا تھا... پھر مجھے حیدرآباد اترنے کی سوجھ گئی اور اللہ نے اسے وسیلہ بنا کے بھیج دیا... اس ٹھنڈی بوتل والے کو... مگر فکر کی کوئی بات نہیں... رکشا میں چلتے ہیں... راستے میں کوئی بینک ضرور آئے گا... میں اے ٹی ایم سے رقم نکال لوں گا۔''

اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ''پیسے میرے پاس بھی ہیں... لیکن ہم جائیں گے کہاں؟''

''ہوٹل... اور دیکھو... اگر تم نے خراب اداکاری کی نا تو آج کی رات ہی یہاں کے حوالات میں بسر ہوگی... ہم تم میاں بیوی ہیں... رائٹ؟ اور ہمیں... میرا مطلب ہے تمہیں... ایسا نظر بھی آنا ہے۔ شناختی کارڈ صرف میرا دیکھا جائے گا۔'' میں نے ایک رکشا روک لیا۔

پہلے اے ٹی ایم مشین سے دس ہزار نکلوا کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ دو منٹ بعد ہوٹل آگیا... ناواقفیت کی بنا پر میں نے رکشا لیا... ورنہ ہم پیدل بھی آسکتے تھے۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے ذرا مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''کوئی سامان نہیں... تو کوئی بات نہیں... ایک ہزار...''

میں سمجھ گیا کہ اسے کیا شک ہے لیکن ہوٹلوں میں سب چلتا ہے... یہ بحث کرنے سے کیا فائدہ کہ آدمی دنیا میں بھی خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ یہاں سے جاتا ہے۔ سکندر جب گیا دنیا سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ رات کے دو بجے کچن بند تھا۔ مجھے باہر سے کھانے پینے کے لیے لانا پڑا۔ اس نے مجھے چائے بھی پلاسٹک کی تھیلی میں دی مگر ساتھ دو پیپر کپ عنایت کر دیے۔

ہم دونوں کھانے پر... جو سندھی بریانی تھی... ایسے ٹوٹ کے پڑے کہ ایک دوسرے کی طرف بھی نہیں دیکھا... شیخ سعدیؒ نے بہت پہلے یہ دمشق میں دیکھا ہوگا... جبھی تو فرمایا تھا کہ ایسا قحط پڑا اس سال کہ لوگ عشق کرنا تک بھول گئے... کسی پنجابی شاعر نے کہا کہ... تاں پیٹ نہ پیٹھیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں...

میرا خیال ہے اخلاقاً ہم دونوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور کھانا بچ گیا ورنہ بھوک ابھی باقی تھی۔ پھر ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ اس نے زیور تو اتار دیا تھا لیکن باقی لباس وہی تھا۔ سرخ عروسی جوڑا... کام والا اور بہت بھاری دوپٹا...!

''صبح تم کپڑے بھی لے لینا۔'' بالآخر میں نے کہا۔ ''کب سے یہ پہنے ہوئے ہو... تم نے اچھا کیا اس کمینی عورت کے کپڑے چھوڑ دیے۔''

''صبح کیا ہوگا... ہم کہاں جائیں گے؟'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اب جہاں تقدیر لے جائے تمہارے ساتھ۔''

اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا نہیں... کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''میں نے غلط کہا تھا... تم بہادر بھی ہو۔''

''اُس وقت وہ غلط نہیں تھا... تم نے بہادر بنا دیا ہے... اب میں کسی سے نہیں ڈرتا... تمہیں ڈر نہیں لگتا مجھ سے؟''

وہ مسکرائی۔ ''لگتا ہے... کہیں چھوڑ کے نہ بھاگ جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا... اب تم بیڈ پر سو جاؤ... میں نیچے سو جاؤں گا۔''

''ہم کل بھی ایک بیڈ پر سوئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''کل ہمارے بیچ میں تیسرا شیطان نہیں تھا... چمپو تھا۔''

اچانک کسی نے زور زور سے دروازہ بجایا۔ ''دروازہ کھولو...'' روبی کا رنگ فق ہوگیا۔ ''یہ... پولیس...''

میں نے کہا۔ ''حوصلہ رکھو... میں سب ٹھیک کرلوں گا۔''

یہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کی ذلالت تھی۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں اور پھر وہی کیا تھا جو بعض ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ پولیس جان بخشی کا جو بھی نذرانہ وصول کرتی ہے، اس میں سے ہوٹل کے کلرک کو بھی حصہ مل جاتا ہے۔

آدھے منٹ سے کم میں روبی نے خالہ کا برقع پہن لیا اور کرسی پر بیٹھ گئی تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک سب انسپکٹر کے ساتھ آنے والے کانسٹیبل کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ کچھ اور سین دیکھنے کی امید رکھتے تھے۔ کوئی سنسنی خیز منظر... یک جان دو قالب والا!

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

انسپکٹر نے کہا۔ ''یہ خاتون کون ہیں؟''

''میری خالہ...'' میں نے اعتماد اور روانی سے کہا۔

روبی نے آواز بنا کر کہا۔ ''اے بیٹا تھانے دار... کیا ہو گیا... کوئی قتل؟''

تھانے دار نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''ہمیں کلرک نے کہا تھا کوئی لڑکی ہے... آپ نے اسے بیوی بتایا تھا۔''

''بلاؤ اس الو کے پٹھے کو۔'' میں نے بگڑ کے کہا۔ ''یہاں میرے سامنے آ کے کہے۔''

انسپکٹر پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔ یہ نہ میرے غصے کا کمال تھا اور نہ روبی کے سوال کا... یہ خالہ کے برقعے کا کمال تھا جو بائیس سال پرانا تھا اور نظر بھی آتا تھا... جو آج کی کوئی لڑکی پہن ہی نہیں سکتی تھی۔ کچھ دیر ہم سانس روکے بیٹھے رہے۔ پھر میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ ہم اتنا ہنسے کہ ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

صبح میری آنکھوں پر کھڑکی سے آنے والی دھوپ براہِ راست پڑی تو میری آنکھ کھلی۔ روبی دلہن بنی بے خبر سو رہی تھی۔ سچ مچ اس دلہن کی طرح جو اپنے دولہا کا انتظار کرتے کرتے حجلۂ عروسی میں تھک کے اور مایوس ہو کے احساسِ ندامت اور مجروح جذبات کے ساتھ بستر پر گر گئی ہو۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ یہ دوسری صبح تھی کہ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر کل کی صبح کے مقابلے میں آج کی صبح میں کوئی جادو تھا کہ میں مسحور سا کھڑا رہا۔ اتنی حسین وہ کل تو نہ تھی۔ یہ کسی میک اپ کا کمال نہ تھا۔ اس نے تو چوبیس گھنٹے سے منہ ہی نہیں دھویا تھا۔ پھر ایسا کیوں تھا؟

حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ کسی نے یہ فلسفیانہ صداقت رکھنے والا قول میرے کان میں یوں دُہرایا کہ میں چونک پڑا... مگر کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ تھی اور میں تھا... اور شاید محبت تھی... جو مجھے اس سے ہوگئی تھی... پتا نہیں کیسے... میرے نہ چاہنے کے باوجود!

اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ کمرے میں ایک دم اجالا بڑھ گیا پھر وہ مسکرائی۔ کمرا مزید روشن ہوگیا۔ وہ اٹھی اور اس نے ایک انگڑائی لی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے پوچھا اور میں نے جان لیا کہ اس سوال کو پوچھنے کا مقصد کیا ہے... اس کا جواب میں نے الفاظ میں نہیں دیا... میں نے اسے چوم لیا۔

ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے تو روبی نے کہا۔ ''بالے اب کیا ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''ہمارا نکاح اور کیا... اگر تمہیں منظور ہو۔''

وہ شرمائی۔ ''اور اس کے بعد؟''

''ولیمہ... اس کے بعد بچے... اس کے بعد... مگر اس سے پہلے ہمیں واپس جانا ہوگا... اپنی دنیا کے سامنے یہ اعلان کرنے کہ اب ہم ایک ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کرسکتی۔ میں محمد علی کی طرح ڈائیلاگ بھی بول سکتا ہوں... اگرچہ میری آواز وحید مراد جیسی ہے... کہ دنیا والوں... میں روبی سے پیار کرتا ہوں... جو اس پیار کی راہ میں آئے گا، فنا ہو جائے گا... ویسے وہ ڈائیلاگ بھی ہے... میں وہ بلا ہوں، شیشے سے جو پتھر کو توڑ دوں۔''

وہ متفکر ہوگئی۔ ''فلمیں بہت دیکھتے ہو تم... لیکن زندگی کوئی فلم نہیں ہے بالے... ایک بات..... نے نہیں بتائی تھی تمہیں... وہ جو ہے نا تمہارا رقیبِ روسیاہ۔ کالا ریچھ... وہ ایک دادا ہے۔''

میں اچھل پڑا۔ ''دادا... یعنی گرینڈ فادر... اس عمر میں تو لوگ باپ بھی بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔''

''اُفوہ... فلمی دادا... جیسے کہ ممبئی میں ہوتے ہیں...

بدمعاشوں کے اوپر بھائی... ان کے اوپر دادا... گرینڈ بدمعاش... جو کہتے ہیں فلاں کو خلاص کردو... وہ خلاص ہوجاتا ہے۔"

"دیکھو... مجھے اتنا دہشت زدہ مت کرو کہ میں نکاح سے قبل ہی تمہارا مرحوم شوہر ہوجاؤں اور تم ایک کنواری بیوہ بن جاؤ۔"

"میں سچ بتارہی ہوں... اس نے دھمکی دی تھی چچا کو... چچا لوٹا لے کر رات بھر باتھ روم کے چکر لگاتے رہے... کہتا تھا تمہاری بوٹیاں کاٹ کے قورمہ پکوادوں گا اور گدھوں کو کھلادوں گا۔"

میں نے کہا۔ "گدھے گوشت خور نہیں ہوتے... اس کی دھمکی بکواس ہے۔"

"افوہ... زیر کے ساتھ... وہ اڑنے والے گدھوں کی بات کررہا تھا... کیوں نہ ہم اس بار سچ مچ بھاگ جائیں... کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "دیکھو... میری نوکری ہے اور آج کل محبوبہ اور دلہن تو مل جاتی ہے، نوکری نہیں ملتی... پھر کالا بکرا... میرا مطلب ہے میرا باس بڑی چیز ہے۔"

"تمہارا باس ایک کالا بکرا ہے؟" وہ دم بہ خود رہ گئی۔

"وہ... ہم اسے پیار سے کہتے ہیں... اور وہ خوب صورت آسٹریلین گائے... اس کی بیوی..."

وہ اچھل پڑی۔ "اس نے ایک آسٹریلین گائے سے شادی کی ہے؟"

میں نے خفگی سے کہا۔ "آخر تم کیوں ثابت کررہی ہو کہ ہر خوب صورت لڑکی کا اوپر والا خانہ خالی ہوتا ہے... عقل یا حسن... اللہ ایک چیز دیتا ہے... بھئی وہ بیوی کو پیار سے جو چاہے کہے... ہرنی جیسی آنکھیں... مورنی جیسی چال... چیتے جیسی کمر... ایسی لڑکی ہوتی ہے کوئی؟ مگر شاعر جب حسن کی تعریف کرتے ہیں تو یہ محبوب کی صفات بتاتے ہیں۔"

"افوہ... کام کی بات کرو... کراچی آنے والا ہے۔"

"مطلب یہ کہ میں کسی دادا پردادا سے نہیں ڈرتا اور میرے باس کالے بکرے کا سالا یعنی آسٹریلین گائے کا بھائی..."

"وہ کیا ولایتی سانڈ ہے؟" وہ ہنسی۔

"وہ ایس پی ہے جس کے سامنے ولایتی سانڈ بھی کانپ اٹھے۔ ہم اس پر بھروسا کرسکتے ہیں۔ چلو، اب برقعے میں روپوش ہوجاؤ۔ چاند کو بادل میں چھپا لو..." میں نے رومانٹک ہوکے کہا۔

بس اڈے پر رکی تو میں مردوں کے ریلے میں اتر گیا جیسا کہ ہوتا ہے... خواتین نے انتظار کیا۔ میرے بس سے نیچے قدم رنجہ فرمانے کے دو منٹ بعد جب میں روبی کے خواتین کی قطار میں سے برآمد ہونے کا منتظر تھا، ایک بانس جیسے لمبے پتلے کانسٹیبل نے مجھے پکڑلیا... اس نے پیچھے سے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور کان خراب کرنے والی آواز میں چلّانے لگا۔

"سر! پکڑلیا... پکڑلیا مجرم کو۔"

نہ جانے کدھر سے اس جیسے دو اور برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک سر تھے کیونکہ ان کے کاندھے پر ایک پھول تھا۔

"اچھا... تو حیدرآباد فرار ہونے والا تھا یہ بدمعاش... لڑکی ملی؟"

ایک ہکلے نے جواب دیا۔ "لڑ... لڑ... لڑکی... تو نہیں..."

"دیکھو... وہ یہیں کہیں چھپی ہوگی۔ مسافر خانے میں دیکھو... عین وقت پر سوار ہونا چاہتی ہوگی... حلیہ یاد ہے نا؟"

ہکلا پھر بولا۔ "سر... لا... لا... لا..."

"ابے لا لا کرتا رہے گا... لال جوڑا ہے دلہنوں والا... اور شکل ملتی ہے رانی مکرجی سے۔"

"اسے تو میں نے دیکھا ہے۔" مجھے گرفتار کرنے والے نے مجھے ہکلے کے سپرد کیا۔ "دیکھنا بھاگ نہ جائے۔"

"بھا... بھا... بھاگے گا کیسے... ٹھا... ٹھا... ٹھا... سے گو... گولی..."

میں نے کہا۔ "اتنے فائر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کہیں نہیں بھاگ رہا ہوں... میں حیدرآباد سے آرہا ہوں... اکیلا ہوں۔"

سب انسپکٹر نے مجھے جھانپڑ مار کے سچ اگلوانے کا پروگرام ملتوی کردیا۔ "حیدرآباد سے آیا ہے... یا جارہا تھا لڑکی کے ساتھ؟"

"حد کرتے ہو جناب... یہ میرا ٹکٹ ہے... آپ بے شک بس کنڈیکٹر سے پوچھ لو۔"

دراصل میں نے دیکھ لیا تھا کہ روبی بس سے اتر کے خواتین کے ساتھ نکل گئی تھی اور اسے بچانے والا تھا پھر خالہ کا برقع۔

کنڈیکٹر صاحب کردار تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھ کے گواہی دی۔ "ہاں جی... یہ حیدرآباد سے آیا ہے۔"

سب انسپکٹر نے کچھ دیر سوچا۔ "تمہارا نام احمد اقبال ہے... وہی مشہور مصنف... جس کی کہانی نے میری ساس کو پاگل کردیا؟"

"کیا میں شکل سے رائٹر نظر آتا ہوں؟ میں اقبال احمد

ہوں مگر سب مجھے بالا کہتے ہیں۔" میں نے مظلوم صورت بنا کے کہا۔ "اور کیا وہ مشہور مصنف ایسی حرکت کرسکتا ہے؟"

"ایک خوب صورت رانی مکرجی ٹائپ دلہن کے ساتھ کوئی بھی فرار ہوسکتا ہے۔ میں آخری بار پوچھ رہا ہوں... وہ دلہن کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "میری ابھی شادی نہیں ہوئی... میں صرف دولہا ہوں... میں وہ چمن ہوں جس پر نہ آئی کبھی بہار۔"

"اسے تھانے لے چلو... پھر ہم سچ اگلوالیں گے۔"

پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کے میں نے ایک عقل مندی کی۔ میں نے کالے بکرے کو فون کردیا۔ "میں خالہ کے ساتھ حیدرآباد گیا تھا۔ پولیس نے بس سے اترتے ہی پکڑلیا ہے کہ تم ایک لڑکی کے ساتھ فرار ہورہے تھے۔"

ظاہر ہے کہ کالا بکرا ذہین تھا ورنہ میرا باس کیسے بن جاتا۔ اس نے کہا۔ "تم فکر مت کرو... میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

"مگر یہ لوگ تو مجھے اعترافِ جرم کرانے کے لیے تھانے لے جائیں گے۔ وہاں میرا دماغ ٹھیک کریں گے اور پتا نہیں کتنے اعضائے رئیسہ خراب کردیں گے۔"

"نہیں نہیں... کچھ نہیں ہوگا... یہ بتاؤ وہ کہاں ہے... تمہارے ساتھ؟"

"نہیں سر... یہی ایک اچھی بات ہے۔"

چھاپا مار پارٹی معلوم نہیں کیوں اور کس کے حکم پر اتنی مستعدی کا مظاہرہ کررہی تھی۔ شاید انہوں نے رات کو ٹرینوں پر بھی چھاپے مارے ہوں گے۔ ہم پہلے تو پکڑے نہیں گئے پھر حیدرآباد پر اتر کے لوٹ آئے... آگے جاتے تو شاید دھر لیے جاتے... ایک پارٹی کا بس کے اڈوں پر ہماری جستجو کرنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ پیچھے کوئی تگڑا ہاتھ ہے۔

جب پارٹی انچارج اے ایس آئی کو ہر جاسوس پولیس مین نے نیگیٹیو رپورٹ دی کہ سر دلہن تو کہیں نہیں ہے تو میرے دل کو بڑا سکون ملا۔ خالہ کے برقعے میں روبی نکل تو گئی تھی مگر آگے کیا ہوگا؟ میں نے خدا سے دعا کی کہ اللہ نے اسے جتنا حسن دیا ہے، اس کی زکوٰۃ کے برابر عقل عطا کر!

وہ گھڑی قبولیت کی ہوگی کہ روبی مجھ سے لاتعلق بنی وہاں سے کھسک گئی۔ خالہ کے بائیس سال پرانے برقعے میں کوئی رانی مکرجی یا کسی چاند سی دلہن کا تصور بھی کیسے کرتا؟ محفوظ جگہ کوئی نہیں تھی۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھ گئی اور اس نے چھپو کو فون کرکے ساری صورتِ حال بتادی۔ چھپو نے اسے کہا کہ بالے کو گولی مارو... میرا مطلب ہے اس کی فکر مت کرو...

اسے ہم بچالیں گے۔ تم سیدھی میرے گھر آجاؤ... تمہیں میری بیوی شوٹ نہیں کرے گی... اس نے ایسا ہی کیا مگر یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

پولیس پارٹی صرف مجھے تھانے لے گئی جو ایسا ہی تھا جیسے روبی کی برات دلہن کے بغیر لوٹی تھی۔ چور کے پاس سے مالِ غنیمت ہی برآمد نہ ہو تو اسے چور کیسے ثابت کیا جائے... پکڑا تو کسی راہ چلتے کو بھی جاسکتا ہے... تھانے میں مختلف خوں خوار شکلیں... آوازیں اور دھمکیاں دینے والے ہر قسم کے پولیس افسران نے مجھے ہر قسم کے نتائج کی دھمکی دی اور مجھے انجام سے ڈرایا مگر میں نے بھی کمال کردیا... میں مسکراتا رہا۔

پھر میرا باس کالا بکرا آگیا... اس وقت پولیس والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں نے گرفتاری کے فوراً بعد مجھ سے رابطے کا ذریعہ موبائل فون کیوں نہیں چھینا تھا۔ کالے بکرے نے سب سے پہلے اپنا تعارف کرایا کہ اس کی خوب صورت آسٹریلین گائے جیسی بیوی کا سانڈ بھائی ایک ایس پی ہے۔ وہ کراچی میں نہیں ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... "صدر ہر جا کہ نشیند صدر است" بکرا خاصا پڑھا لکھا ہے چنانچہ اچھی اردو میں فارسی بھی ڈال دیتا ہے۔

انسپکٹر نے جز بز ہو کے کہا۔ "آپ عربی شریف میں بات مت کرو۔"

میرے باس نے سمجھایا۔ "اس کا مطلب ہے... صدر جہاں بھی ہو، صدر ہی ہوتا ہے... چنانچہ ایس پی کراچی میں ہو یا لاڑکانہ میں... اس کی آواز پورے ملک میں کیبل نشریات کی طرح صاف سنی جاتی ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے جی... مگر اس کے خلاف پہلے دلہن کو اغوا کرنے کا کیس تھا۔"

"لاحول ولاقوۃ... میں نے آج تک ایک بھی دلہن اغوا نہیں کی ورنہ چار شادیاں کرچکا ہوتا... ایسی ایسی دلہنیں دیکھی ہیں..."

تھانے دار نے میز پر بید ماری۔ "روبینہ نام کی لڑکی کا نکاح طے تھا... کالا شاہ کے ساتھ!"

"کالا شاہ کاکو... جو لاہور کے پاس..."

"بکواس بند کر... کالا شاہ عرفیت ہے حاجی ابراہیم کی... بڑا بزنس ہے ان کا... سارا شہر جانتا ہے... پرسوں یہ نکاح سے دو گھنٹے قبل مسماۃ روبینہ کو اغوا کرکے لے گیا۔"

"یہ کیا فضول بات ہے... شادی کے گھر میں سے آج تک کوئی دلہن اغوا ہوئی ہے... گھر والے کیا افیون کھا کے سو رہے تھے؟ آپ ایسا کیوں نہیں بولتے کہ دلہن کسی کے ساتھ

فرار ہوگئی۔“

”وہ تمہارے ساتھ فرار ہوئی... رپورٹ ہے تمہارے خلاف۔“

”رپورٹ ہوتی کسی سیاست دان یا صدر کے خلاف تو کیا تم انہیں بھی گرفتار کر لیتے؟ تھانے دار صاحب! میں حیدرآباد میں تھا... اپنی خالہ کے ساتھ گیا تھا... ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا... آپ ریکارڈ چیک کرالیں۔ وہاں ایک سب انسپکٹر نے چھاپا بھی مارا تھا... نام تھا رستم خان... آپ ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک سے پوچھ لو۔“

کالے بکرے نے کہا۔”آپ تصدیق تو کرلیں پہلے... یہ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ۔“

”ابھی میں ان کے سامنے حیدرآباد کی بس سے اترا ہوں... ٹکٹ دکھایا ہے انہیں... کنڈیکٹر نے گواہی دی ہے۔“

تھانے دار چونکا۔”اور تمہاری خالہ... وہ کدھر گئی؟“

”ان کا بیٹا آیا تھا... انہیں لے گیا۔“

تھانے دار سوچ میں پڑ گیا... اور کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اسی وقت ایس پی کا لاڑکانہ سے فون موصول ہوگیا۔ وہ ایس ایچ او سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کی عدم موجودگی میں اس نے تفتیشی افسر سے صرف اتنا کہا کہ وہ زبردستی کسی بے گناہ کو ملزم نہ بنائے... اپنی کارکردگی دکھائے۔ ابھی تھانے دار اس وارننگ سے نہیں سنبھلا تھا کہ ایک وکیل نمودار ہوگیا جسے میں نام سے بھی نہیں جانتا تھا۔

”میرا نام علی احمد خورد ہے... ایڈووکیٹ۔“

تھانے دار نے اسے شک سے دیکھا۔”ان کے تو لمبے لمبے بال ہیں... کرد صاحب کے۔“

علی احمد خورد نے (جو بڑے کرد صاحب کے مقابلے میں بہ لحاظِ جسامت دگنا ضرور تھا) غرا کے کہا۔”میں نے خورد کہا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں... چھوٹا... وہ علی احمد کرد بہت بڑے وکیل ہیں۔“

”اچھا اچھا... ویسے چھوٹے علی احمد صاحب! تم دیکھنے میں تو اتنے چھوٹے نہیں لگتے... چھوٹے وکیل ہو؟“

”میں کرد صاحب کے مقابلے میں خورد ہوں... ویسے یہاں میرا اچھا بھلا نام ہے۔ میں اپنے موکل اقبال احمد کی طرف سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اسے یہاں کیوں بٹھا رکھا ہے؟“

”چلو جی... آپ کو اعتراض ہے تو کھڑا کر دیتے ہیں۔“

علی احمد خورد نے میز پر مکا مارا۔”اسے یہاں تھانے میں کیوں لایا گیا ہے آخر... لیکن پہلے میں وکالت نامے پر دستخط کرالوں۔“

”ضرور کراؤ... لیکن یہ سرکاری میز ہے۔ مکے مارنے سے میز ٹوٹ گئی تو سب کام فرش پر بیٹھ کے کرنے پڑیں گے۔“

میں نے علی احمد خورد کی ہدایات کے مطابق وکالت نامے پر دستخط کر دیے اور پوچھا۔”آپ کتنی سزا دلوا دیں گے مجھے؟“

وہ بولا۔”پہلے جرم تو کرو کوئی... پھر طے کرلیں گے۔“

میرے باس کالے بکرے نے کہا۔”یہ میرا لیگل ایڈوائزر ہے... میں بھی کوئی جرم کرنے سے پہلے اس کی ماہرانہ رائے لیتا ہوں... اسی لیے آج تک پکڑا نہیں گیا۔“

تھانے دار بولا۔”دیکھو جی... اس کے خلاف پرچہ کٹا ہے تو اسے ہم گرفتار بھی کریں گے اور اس سے تفتیش بھی ہو گی... کیا سمجھے؟“

علی احمد خورد مسکرایا۔”سب سمجھ گیا... مگر مغویہ دلہن تو اس سے برآمد نہیں ہوئی۔“

”آپ کہو تو وہ بھی برآمد کر کے دکھا دیں؟“

تھانے دار کے ماتحت نے سر ہلایا۔”ایک نہیں... دو... دو...“

”مجھے اپنے موکل سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔“ علی احمد خورد نے کہا اور اسے ایک ڈائری پیش کی۔”یہ ایک موکل تقسیم کر رہا تھا، میں آپ کے لیے بھی لے آیا۔“

تھانے دار کی بتیسی چمک اٹھی۔ اس نے ڈائری کو کھول کے بھی نہیں دیکھا۔ غالباً کسی خفیہ اشاروں کی زبان میں اس نے پیغام دے دیا تھا کہ خالی ڈائری بالکل خالی نہیں ہے۔ جب میں اور وکیل اکیلے رہ گئے تو اس نے کہا۔”اب بولو دلہن کہاں ہے؟“

”کون سی دلہن؟“ میں نے معصوم بن کے پوچھا۔

”دایہ سے پیٹ چھپاتے ہو... ہمیں سب پتا ہے۔“

میں نے کہا۔”پھر پوچھ کیوں رہے ہو... وہ حیدرآباد سے میرے ساتھ ہی بس سے آئی تھی... ساتھ بھی اتری تھی... پھر پتا نہیں کہاں نکل گئی؟“

”کیسے نکل گئی؟“

”یہ خالہ کے برقعے کا جادو ہے... وہ میری خالہ ہے۔“

”دلہن تمہاری خالہ ہے؟“ علی احمد خورد دم بہ خود رہ گیا۔

”میں برقعے کی بات کر رہا تھا... برقع اس کا ہے... اندر دلہن ہے... اس سے کہو کہ سیدھی کالے... میرا مطلب ہے، باس کے گھر چلی جائے۔“

باس مسکرایا۔”مجھے پتا ہے تم سب مجھے کالا بکرا کہتے ہو... کسی دن تم سب کا صدقہ کر دوں گا... کالے بکرے کب تک صدقہ ہوتے رہیں گے... مگر تمہاری وہ دلہن میرے گھر میں رہ سکتی ہے... جب تک چاہے... یہ وعدہ میں کر چکا تھا۔“

میں نے کہا۔”سر! آپ کا دل ہیرا ہے... گورے چہرے والوں کے دل کوئلہ ہوتے ہیں... مثلاً یہ امریکن۔“

”سیاست کی بات مت کرو۔“ علی احمد خورد نے کہا۔

”روبی... میرا مطلب ہے اس لڑکی سے جو دلہن کے گیٹ اپ میں بھاگی تھی، اس سے کہیے کہ برقع فوراً خالہ کو ارسال کرا دے... پھر خالہ سے کہیں کہ وہی برقع پہن کے مجھ سے ملنے آئیں... حوالات میں۔“

”اگر انہوں نے انکار کر دیا... پھر؟“

”کہنا اسے پھانسی ہونے والی ہے صبح... آخری بار مل آؤ... اگر وہ کہہ دیں کہ میرے ساتھ وہ حیدرآباد گئی تھیں... تو میں بچ جاؤں گا۔“

علی احمد خورد نے سر ہلایا۔”یہ میں کر سکتا ہوں۔“

سب انسپکٹر مونچھیں ہلاتا نمودار ہوا۔”چلو جی، بہت ملاقات ہوگئی... ہم بندے کو حوالات میں ڈالیں گے۔“

ذاتی تجربہ نہ ہونے کے باوجود میں نے سن رکھا تھا کہ ہر تھانے کے ڈرائنگ روم کی رات بڑی مؤثر ہوتی ہے۔ ایک رات میں شریف اور بدمعاش سب جرائم کا اعتراف کر لیتے ہیں جو انہوں نے کیے ہوں یا نہ کیے ہوں۔ اس سلسلے میں ایک سیاسی لطیفہ خاصی شہرت رکھتا ہے کہ پاکستان کے ایک وی وی آئی پی، کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنا سب کچھ مع گھڑی کے اتار کر سوئے (سرکاری بیان کے مطابق اکیلے) تو صبح سب کچھ پہن لیا سوائے گھڑی کے۔ وہ کہیں باتھ روم میں رہ گئی۔ وی وی آئی پی نے اپنی سیکیورٹی کو مطلع کیا اور دوسری گھڑی پہن کے کہیں میٹنگ میں چلے گئے۔ سارا دن مصروف رہے... اگلی صبح جب پھر باتھ روم جانے کا اتفاق ہوا تو گم شدہ گھڑی مل گئی۔ انہوں نے سیکیورٹی چیف کو بلایا اور کہا کہ بھئی وہ گھڑی مل گئی۔ سیکیورٹی چیف کی شکل پر بارہ بج گئے۔ اس نے کہا۔”سر! پھر ان چھ چوروں کے بارے میں کیا حکم ہے جنہوں نے رات بھر میں اعترافِ جرم کر لیا تھا اور ان سے گھڑی بھی برآمد کر لی گئی تھی؟“

تو ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہونے کے امکانات خاصے روشن تھے۔ ایک نئی صبح کے طلوع ہونے تک میں ایک کیا چھ دلہنوں کے اغوا کا اعتراف کر لیتا۔ میں نے اس خدشے کا علی احمد خورد پر اظہار کیا تو اس نے مجھے تسلی دی۔”تم سے تفتیش نہ کرنے کا معقول معاوضہ ادا کر دیا گیا ہے، چنانچہ تم فرش پر لمبی تان کے سوتے رہو۔“

تھانے دار نے کہا۔”کرد... میرا مطلب ہے خورد صاحب! اجازت ہو تو ہم ملزم کو ڈک دیں۔“

میں مطمئن تھا کہ میرے حق میں کالے بکرے جیسے باس کا... علی احمد خورد کا اور پیسے کا زور ہے چنانچہ جب بالآخر مجھے بھی عام مجرمان کے ساتھ حوالات میں تشریف رکھنے کی دعوت دی گئی تو میں سلاخوں والی کوٹھڑی میں بھی ایسے ہی داخل ہوا جیسے دولہا پھولوں کی لڑیوں سے بنے حوالات کی طرف حجلۂ عروسی میں جاتا ہے۔

دستور کے مطابق مجھ سے نقد رقم، موبائل فون اور گھڑی و دیگر سامان لے لیا گیا تھا۔ اس معاملے میں تمام تھانے والے بڑے اصول پرست ہیں۔ وہ یہ چیزیں واپس نہیں کرتے۔ حوالات میں اچھی خاصی محفل جمی ہوئی تھی۔

ایک باریش بزرگ بھوں بھوں کر کے رو رہے تھے۔ ان کا ترجمان ایک ٹپوری قسم کا نوجوان تھا جو تمام رات زیرِ تفتیش رہا تھا لیکن وہ اتنا تازہ دم لگ رہا تھا جیسے رات بھر جوتے نہیں یمنی بریانی کھاتا رہا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔”یہ بابا کیوں رو رہا ہے؟“

وہ ہنس پڑا۔”اس کی قسمت میں رونا ہے اسی لیے...“

میں نے کہا۔”آخر ایسا کیا جرم کیا ہے اس نے؟“

اس نے نشے والے سگریٹ کا ایک کش لیا۔”بابا کا آنکھ لڑ گیا تھا ایک بڈھی سے۔“

”اس عمر میں؟“ میں نے بے اختیار کہا۔

”اڑے کیسا بات کرتا ہے تی... بڈھا آدمی کا دل جوان ہے... اس نے شادی بنا لیا۔ اس پر پہلا والا بیوی نے لفڑا کیا کہ میرے سے کیوں نہیں پوچھا۔ اس کا کوئی تھا پولیس میں... ابی بڈھا ادھر نیں روتا پڑا ہے۔“

بڑے میاں نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔”یہ بے رحم لوگ ہمیں مار ڈالیں گے... ہم کیا کریں؟“

ٹپوری لونڈا ہنسا۔”اڑے بابا... وہی کر جو یہ بولتا ہے... دوسرا عورت کو چھوڑ دے...“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”کیسا نہیں ہو سکتا۔ ابھی اپن کو دیکھ... اپنی مرضی سے آتا ہے ادھر، اپنی مرضی سے جاتا ہے... کسی بیوی کی وجہ سے نہیں... بیوی تو اپن بوہت کیا... لیکن ایک ساتھ دو نہیں کیا۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔”اب تک کتنی شادیاں کر چکے ہو؟“

”جتنا بار محبت کیا... اتنا بار شادی بنایا۔ ابھی دل کا کیا کرے... آج اس پر آیا... کل کسی اور پر آ گیا... کیا سب سے شادی کرے؟ اس بڈھے بابا کی طرح ادھر بیٹھ کے قسمت کو روتا رہے؟ نہیں... اپن کو ایک سے محبت ہوا... شادی بنالیا... دوسری سے ہوا تو پہلی کا چھٹی!“

میں نے طنز سے کہا۔ ”یہ اچھی محبت ہے کہ ہر سال کسی سے ہو جائے۔“

”ابھی لیلیٰ مجنوں والا محبت کا زمانہ نہیں ہے... تم سال کا بولتا ہے، اگر ہر مہینے یا ہر روز ہو جائے تو دل پر کس کا اختیار ہے۔“

میں نے فلسفۂ عشق کے اس نئے مبلغ سے بحث کرنا لاحاصل جانا اور آنے والی رات کے بارے میں سوچتا رہا۔ رات کو چمپو میرے لیے کھانا لے کر آیا تو بار بار آہیں بھرتا رہا۔

”یار! شاعر نے غلط بولا تھا... وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ... ہونا یہ چاہیے... وجودِ زن سے ہے تقدیرِ کائنات میں جنگ... ٹفن کیریر کے اندر کھانے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔“ یہ اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے بھی رازداری سے پوچھا۔ ”کیا ہے... خودکشی کے لیے چوہے مار گولیاں؟“

”بالے... محبت نامہ ہے۔“ اس نے مجھے آنکھ ماری۔

”لیکن ایسے بند کیا ہے اس مفرور اور مغرور حسینہ نے کہ میں بھی نہیں پڑھ سکا۔“

”کیا وہ تیرے گھر میں ہے؟ تیری بیوی اسے ہلاک کر دے گی چمپو۔“

”وہ تیرے باس کے گھر میں ہے... مجھے اس نے فون پر حکم دیا تھا کہ کھانا لے جاؤ... پھر میرے سامنے ٹفن کیریر میں بریانی کے ساتھ محبت نامہ بھی رکھا۔“

میں نے کھانے سے پہلے پلاسٹک میں سیل بند کاغذ نکالا۔ روبی نے لکھا تھا۔

”بالے جی... مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم اس مشکل میں پڑے لیکن گھبرانا مت... ہر مشکل ہمت سے آسان ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اب مرد بنتے جا رہے ہو اور میرا یہ الزام غلط ثابت ہو گیا کہ تم ڈرپوک اور کم ہمت ہو۔ آج رات میں تمہارے لیے دعا کروں گی... ساری رات... تم نے میری مدد کی... اللہ ضرور تمہاری مدد کرے گا... تم میرے لیے دنیا سے لڑ رہے ہو... میرا بھی اب دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں... تم نے ایسے مجھے اپنا بنا لیا ہے کہ اور کوئی نہیں بنا سکتا... صرف تمہاری... روبی!“

بہ قول شاعر... پڑھ کے تیرا خط میرے دل کی عجب حالت ہوئی... اچانک میرے دل سے سارا خوف نکل گیا۔ میرا حوصلہ دوچند ہو گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روبی کے عشق نے مجھے یوں اپنے اندر سمو لیا جیسے پُرسکون خوب صورت جھیل کسی کشتی کو کھینچ لیتی ہے یا بپھرا ہوا سمندر کسی ٹائی ٹینک جیسے جہاز کو اپنی گہرائی میں اتار لیتا ہے۔

اور مزے لے کر بریانی کھاتے ہوئے میں نے سوچا... بہت کچھ سوچا۔ روبی کے حسن کی مقناطیسی توانائی کے بارے میں... اس کی مسکراہٹ کی تابکاری کے بارے میں... اس کے وجود کی نرمی اور جذبۂ عشق کی گرمی کے بارے میں... اس وقت کے بارے میں جو دور تھا... مگر بہت دور نہیں لگتا تھا۔ اس مشکل کے بارے میں جس کو بالآخر آسان ہونا تھا۔ ایک گھر کے بارے میں... اس گھر کے اندر روبی کے ساتھ گزرنے والی خمار آفریں راتوں کے بارے میں اور ان بچوں کے بارے میں جو کہیں عالمِ بے وجود میں ہماری طرف بڑی آس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں سو رہا تھا اور خواب میں دیکھ رہا تھا کہ میں گھر کے صحن میں کھڑا تھرتھر کانپ رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ روبی کے سامنے تو میرا پاجامہ گیلا نہ ہو... وہ میرے پیچھے چھپی ہوئی ہے کیونکہ اماں نے پاؤں سے جوتی اتار کے میزائل کی طرح داغی تھی۔ ”حرافہ... تیری چوٹی کاٹ کے ابھی باہر کرتی ہوں۔“ اور ابا دہاڑ رہے ہیں۔ ”ارے کوئی مجھے دادا میاں کی بندوق لا کے دو... گولی ہے اس میں... ستر سال بعد ایک سور کا شکار میں بھی کروں۔“ اور میں ممیا رہا ہوں... کسی بکری کی طرح... پیچھے سے روبی مجھے دھکیل رہی ہے... شیر بنو شیر... آخر میں کیا ہوں... بکری، سور یا شیر... آدمی کا بچہ بہرحال نہیں ہوں۔

ایک لات پڑنے سے میں جاگا اور گھڑی دیکھی۔

میرے سر پر جلاد صورت فرشتۂ اجل جیسے خوفناک سب انسپکٹر نے کہا۔ ”چل... تیری باری آ گئی۔“

کوئی درمیانی گالی قابلِ اشاعت نہیں چنانچہ ”خالی جگہ پُر کرو“ کی طرح کہانی کے ذہین قارئین اپنی مرضی اور پسند کے مطابق لکھ یا پڑھ سکتے ہیں۔

میں نے برہمی سے کہا۔ ”کہاں... اور جگانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“

اس نے میرے بال پکڑ کے کھینچے اور کھڑا کر دیا۔ ”ابھی تجھے پکی نیند سلاتے ہیں... چل ذرا بیڈ روم میں۔“

میرا سارا اعتماد اور غرور کا نشہ ہرن ہو گیا جو مجھے سفارش

اور رشوت کی بنیاد پر ہو گیا تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی بات غلط ہو گئی تھی۔ یہ بات مجھے کمرائے تفتیش میں پہنچ کے سمجھ میں آئی۔ وہاں ایک جوان شخص کو ایسے اتارا جا رہا تھا جیسے عیدِ قرباں پر قسائی ذبح کیے ہوئے بکرے کو کھال اتارنے کے بعد کسی چوکھٹ یا درخت کی شاخ میں بندھی رسّی سے اتارتا ہے۔ اس کے جسم پر کچھ نہیں تھا سوائے ان ضربات کے نشانات کے جو تفتیش کے دوران آئے تھے۔ بیدوں کے لمبے لمبے نیل... سگریٹوں سے جلائے جانے کے زخم... پھٹی کھال سے رسنے والے خون کے داغ!

تفتیش کا عذاب برداشت کرنے والے کو مردہ سمجھ کے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن وہ بے ہوش تھا۔ تفتیش کرنے والوں میں سے کسی نے کہا کہ باہر لے جا کے پانی ڈالو اس پر... مکر کر رہا ہے سالا... ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔

مجھے یقین تھا کہ اس نوجوان کی جگہ لٹکنے سے پہلے ہی میرے اندر جمع سارا پانی ٹانگوں پر بہہ جائے گا۔ ادھر پیٹ کے اندر کی حالت زیادہ ابتر تھی اور کچھ دیر پہلے کھائی گئی بریانی بھی باہر نکلنے کے لیے زور لگا رہی تھی لیکن بس ایک خیال تھا جو کسی آوازِ بازگشت کی طرح مجھے حوصلہ دے رہا تھا۔ روبی کے خط کا ایک ایک جملہ میری طاقت بن رہا تھا۔

حیرانی مجھے اس وقت ہوئی جب لوہے کی ایک کرسی پر مجھے تشریف رکھنے کے لیے کہا گیا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ یہ بھی آلاتِ تشدد میں شامل ہو گی اور برقی رو گزارنے کے لیے کام آتی ہو گی... مگر پھر دوسری شریفانہ کرسی لا کر سامنے رکھی گئی اور ایک شخص سگریٹ کا دھواں چھوڑتا اندر آیا۔ اس کی چال ڈھال، کھال اور بال سب میں بدمعاشی کی بدصورتی تھی۔ اس کا رنگ ایسا تھا کہ وہ کانگو چلا جاتا تو افریقی اسے بڑی خوشی سے اپنے ملک کی شہریت دیتے۔ اس کو شترمرغ کے پروں کا لباس پہنا کے اس رقص میں شامل کر لیتے جو فلموں میں دکھایا جاتا ہے... کسی سفید چمڑی والے کو دیگ میں ڈال کے سوپ بناتے وقت...

وہ بلاشبہ چھ فٹ کا تھا۔ اس کے بال مکرانیوں جیسے سخت چھوٹے اور گھنگریالے تھے۔ اس کی جلد بھی ڈارک بلیک تھی۔ ناک ایسی تھی کہ خوفناک لگتی تھی۔ اس کا پیٹ ایک وسیع نصف دائرے کی صورت میں باقی جسم سے آگے بڑھا ہوا تھا۔

”تم جانتے ہو میں کون ہوں؟“ اس نے کچھ دیر مجھے گھورنے کے بعد سگریٹ کو فرش پر مسل دیا۔

میں نے کہا۔ ”میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔“ اور نفی میں سر ہلا دیا۔

”میں رحیم بخش ہوں۔“ یہ اعلان کر کے اس نے انتظار کیا۔

میں نے اب بھی کسی شناسائی کا اعتراف نہیں کیا حالانکہ میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ یہاں ملزم کے سامنے مدعی کے سوا کون آ سکتا ہے۔

وہ خفگی سے بولا۔ ”میں وہی ہوں جس کی بیوی کو تم بھگا کر لے گئے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”پرائی بیویوں میں اگر کوئی ہے تو صرف ایشوریا رائے۔“

میرے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ پڑا۔ ”روبی کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”روبی غالباً ایک قیمتی لال پتھر ہوتا ہے۔“

اس نے میرے منہ پر دوسرا جھانپڑ رسید کیا۔ ”تیری یہ ساری جواں مردی ابھی نکل جائے گی... میں چاہتا نہیں کہ تیرا بھی وہی حشر ہو جو ابھی تو نے دیکھا... اور تیری ماں بھی تجھے ایسے ہی روئے۔“

اب باہر سے کسی عورت کے دھاڑیں مار مار کے رونے اور کوسنے کی آواز آنے لگی تھی۔ ”ارے تھانے دار! تیرا جوان بیٹا ٹرک کے نیچے آ جائے... تو کینسر سے مرے... تیری بیوی کو ٹی بی ہو... تو نے میرا جوان بیٹا مار ڈالا۔“

میرا دل بیٹھ گیا۔ وہ نوجوان مکر نہیں کر رہا تھا۔ سچ مچ مر چکا تھا۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا... علی احمد خورد نے کرد جیسے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا تھا...

میں نے کہا۔ ”رحیم بخش! یہ سب بے کار ہے... مار پیٹ کر کے تم میری لاش تو حاصل کر سکتے ہو، مرضی کا جواب نہیں لے سکتے۔“

”تم کو پتا ہے میری کتنی بے عزتی ہوئی ہے... لڑکیوں کی مجھے کوئی کمی نہیں... نہ تمہیں ہو گی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تم مجھے بات کرنے کا موقع دو گے...؟“

”بولو۔“ اس نے دوسرا سگریٹ جلا لیا۔

میں نے کہا۔ ”رحیم بخش! یہ عزت کا نہیں ضد کا معاملہ بنا لیا ہے تم نے۔“

”بکواس مت کرو... سارا زمانہ ہنس رہا ہے مجھ پر... تھو تھو کر رہا ہے کہ وہ لڑکی مجھ پر تھوک کے بھاگ گئی۔“

میں نے کہا۔ ”تم اس سچ کو مان کیوں نہیں لیتے کہ وہ تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔“

”اس کی کیا اوقات ہے کہ میری پسند کے سامنے انکار

کرے... ایک معمولی یتیم لڑکی... اتنی عزت مل رہی تھی اسے... اور اتنی دولت۔''

میں نے کہا۔'' کچھ لوگ پاگل ہوتے ہیں... صرف محبت کو اہم سمجھتے ہیں۔ تم نے اور اس لڑکی کے چاچا نے خوامخواہ اس کے ساتھ زبردستی کرنی چاہی... مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا کوئی پندرہ لاکھ کا نقصان بھی ہوا... دس لاکھ کے قریب اس کے چاچا کو معاف کیے... باقی شادی کا خرچہ سارا تم نے کیا... اگر وہ پورا ہو جائے...''

''میں لعنت بھیجتا ہوں پندرہ لاکھ پر...'' وہ چیخ کے بولا۔''میری سارے شہر میں رسوائی ہوئی ہے۔ شادی تو میں اسی سے کروں گا... تمہیں اتنی پسند ہے تو دوسرے دن لے جانا... میں طلاق دے دوں گا۔''

میں نے خون کو اپنے سر میں چڑھتا محسوس کیا مگر پھر پیچھے سے میرے دماغ کے اندر روبی نے سرگوشی کی۔ ''ایزی... ایزی... ضبط سے کام لو... تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو۔''

میں نے کہا۔''اگر وہ لڑکی مان جائے تو میں اعتراض کرنے والا کون ہوں.. دو دن پہلے تک نہ وہ میرا نام جانتی تھی، نہ میں اس کے نام سے واقف تھا۔''

ایک دم میرے منہ پر تھپڑ پڑا۔''جھوٹ... یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی کچھ دیر میں تم سچ اگل دو گے۔''

میں نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا۔''تم ماننے والے نہیں ہو ورنہ میں کہتا کہ قرآن لے آؤ... میں اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''جھوٹے حلف اٹھانے والے بعد میں خدا سے بھی جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم مجبور تھے... جان بچانے کے لیے حلف اٹھایا... تم دونوں کا پرانا چکر تھا... کب سے جانتے تھے تم ایک دوسرے کو؟''

میں نے کہا۔''میں جانتا ہوں کہ تم کیا کوئی بھی یہ بات نہیں مانے گا... مگر حقیقت یہی ہے کہ سامنے سے سڑک بند تھی... شامیانہ لگا ہوا تھا... اس لیے میں پیچھے والی گندی گلی سے گزر رہا تھا۔ میں اوپر بھی نہیں دیکھ رہا تھا ورنہ شاید بچ جاتا... روبی نے باتھ روم کے روشن دان کی جالی کاٹی اور باہر کودی تو مجھ پر گری... تم جا کے دیکھ سکتے ہو کہ وہ روشن دان کتنا بڑا ہے اور جالی کٹی ہوئی ہے یا نہیں... وہ مجھ پر نہ گرتی تو گٹر کے ڈھکن پر گرتی اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی... کم سے کم وہ بھاگنے کے قابل نہ رہتی... اس نے مجھ سے کہا کہ میری شادی زبردستی کی جا رہی ہے... میری مدد کرو۔''

''اور تو اسے بھگا کے لے گیا؟''

''ہاں... گلی کے آخر تک... پھر وہ پتا نہیں کہاں گئی۔''

''تیرے اپنے ایک رشتے دار نے تجھے دیکھا تھا۔ لڑکی برقعے میں تھی۔ وہ برقع کہاں سے آیا؟''

''وہ لڑکی نہیں تھی... وہ خالہ کا برقع تھا۔ میں واپس دینے جا رہا تھا۔ وہ تھوڑا آگے رہتی ہیں اور جس شخص نے روبی کو میرے ساتھ دیکھا... وہ تو عینک کے بغیر اپنی بیوی کو نہ پہچانے، خالہ کا برقع تو اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔''

اس نے کھڑے ہو کے میرے منہ پر تابڑ توڑ کے مارے... گالیوں کے ایک آبشار میں جو اس کے منہ سے بہہ رہا تھا، اس نے مجھے مار مار کے نیچے گرا دیا۔ پھر وہ مجھے پاؤں سے ٹھوکریں مارتا رہا۔''کتے... تو اسے حیدرآباد لے گیا... رات بھر عیاشی کی اس کے ساتھ... میں تیری بہن کو اٹھوا دوں گا۔''

میں نے اپنے سکون میں فرق نہیں آنے دیا۔''تم کچھ بھی کر سکتے ہو... مجھے یہاں قتل کرا سکتے ہو... پولیس کے ہاتھوں... اور شاید تم ایسا ہی کرو گے... پولیس کا کچھ نہیں بگڑے گا... وہ ایک بیان جاری کر دیں گے کہ ملزم نے حوالات میں اپنی شلوار کے ازار بند سے لٹک کر خودکشی کر لی۔ ایسے بیانات وہ جاری کرتے رہتے ہیں اور احمقانہ حد تک ناقابل یقین ہونے کے باوجود سچ تسلیم کیے جاتے رہے ہیں... مگر مجھے مار کے یا مروا کے تم کیا حقیقت کو بدل دو گے؟ میری بہن تو پہلے ہی نہیں... تم کیا اٹھاؤ گے؟''

اس نے مجھے ایک اور گالی دی اور ایک لات ماری۔ ''کون سی حقیقت کو رو رہا ہے تو...؟''

''یہی کہ وہ میرے ساتھ حیدرآباد نہیں گئی تھی... میں خالہ کے ساتھ گیا تھا اور انہی کے ساتھ آیا... تم چاہو تو مجھے اور خالہ کو حیدرآباد لے چلو... وہاں چشم دید گواہ ہیں... ایک ہوٹل کا منیجر ہے... اور ایک سب انسپکٹر... اس نے میرے ساتھ کمرے میں خالہ کو دیکھا تھا۔''

''اور اگر یہ جھوٹ ثابت ہوا تو؟''

''جھوٹ سچ سے تمہیں کیا... تم ہر حال میں اپنی کرو گے... ایک بے گناہ کو مار کے بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''چل، بلا اپنی خالہ کو... جھوٹے کو میں اس کے گھر تک پہنچاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اٹھ کے چلا گیا... چند منٹ بعد وہی خوں خوار سب انسپکٹر پھر نمودار ہوا۔ اس نے میرا موبائل میرے ہاتھ میں دیا۔''بلا اپنی خالہ کو...''

میں نے چھپو کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ بالآخر چھپو

نے ہی کہا۔ ''بالے... اگر تو چھوٹ گیا سالے تو کیا ضروری ہے کہ شریف جوڑوں کو فون کر کے رنگ میں بھنگ ڈالے۔''

میں نے کہا۔ ''سوری چمپو... رنگ اور بھنگ دونوں کے لیے کافی رات پڑی ہے... لیکن پہلے میری وصیت سن لے... کوئی پتا نہیں صبح دیکھنا میرے نصیب میں ہو نہ ہو... اسی وقت خالہ سے کہہ کہ وہ اپنا برقع پہن کے تھانے پہنچ جائیں... اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہیں تو ان کو میرے ساتھ حیدرآباد جانا ہوگا تاکہ وہاں ہوٹل کا منیجر ان کو شناخت کرے کہ میرے ساتھ کوئی روبی نہیں... بلکہ میری خالہ تھی... اور ایک پولیس سب انسپکٹر بھی جس نے چھاپا مارا تھا۔''

غالباً اس کی بیوی نے میرے دخل در معقولات پر احتجاج کرتے ہوئے چمپو کو لات مار کے بیڈ سے نیچے گرا دیا تھا۔ درمیان میں چمپو کی ''بائے'' کے علاوہ جو آوازیں مجھے پس منظر میں سنائی دیں، وہ افسوسناک بلکہ شرمناک تھیں۔

تاہم چمپو نے ایک دوست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بیوی کی ناراضی قبول کی اور یہ بھی سمجھ لیا کہ معاملہ کیا ہے... احمق سب انسپکٹر یہ نہیں سمجھا کہ خالہ کے بجائے میں نے چمپو کو فون کیوں کیا... میں خالہ کو فون کرتا تو کچھ نہ ہوتا... رات کو وہ ریسیور نیچے کر کے سوتی تھیں کیونکہ کافی عرصے سے کوئی لڑکا آدھی رات کو فون کر کے ان سے سوال کرتا تھا۔ ''بڈھا گھر پر ہے؟''

چمپو جسے میں اس دن تک جورو کا غلام نمبر ون (اب میں ہوں) سمجھتا تھا اور اس کے مقابلے میں گیدڑ کو زیادہ نڈر... ایک حقیقی دوست ثابت ہوا۔

تو میرا فون بھی بڑے غلط وقت پر موصول ہوا تھا۔ چمپو کے پاس اچھی خاصی ذاتی عقل بھی ہے چنانچہ اس نے کیس کو سمجھ لیا۔ اس نے خالہ کی نفسیات کو ذہن میں رکھا اور بات کچھ اس انداز میں کی کہ خالہ نے فوراً رختِ سفر باندھ لیا... یعنی اپنا شہرۂ آفاق تاریخی برقع اوڑھ لیا۔ چمپو نے کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ بھانجے کو بچانا ہے تو بس چلو ورنہ ادھر اذان کی آواز بلند ہو گی، ادھر میری روح کو عالمِ بالا کی فلائٹ پر ایسے روانہ کر دیا جائے گا جیسے امریکن شٹل ڈسکوری کو خلا میں بھیجا جاتا ہے۔ وہ تو واپس آجاتی ہے... لیکن میں نہیں آؤں گا۔

آٹھ آٹھ آنسو نی آنکھ بہاتی خالہ نے راستے بھر آیت الکرسی کے علاوہ تمام دافعِ بلیات وظائف کا ورد کیا۔ جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو... ایک بار انہوں نے رازداری سے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ یہ وظیفہ ان کے کیس میں ذرا مؤثر ثابت نہیں ہوا تھا اور ان کی شادی خالو سے ہو گئی تھی۔ چمپو نے ایک اور شان دار جھوٹ سے میری اماں کو بھی قائل کر لیا تھا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں چنانچہ وہ میری فکر نہ کریں... ایک ماں کی فطری جبلت کے باعث وہ پھر بھی رات بھر مضطرب رہیں اور سو نہ پائیں۔

خالہ نے تھانے میں ایک سین یہ کیا... انہوں نے پہلے تو روبی کے نامزد مگر ناکام امیدوار برائے اسامیٔ شوہر کے لتے لیے کہ فلاں نہیں فلاں... تجھے میرا معصوم اور فرشتہ سیرت بھانجا ہی ملا تھا یہ الزام لگانے کے لیے... اللہ حشر والے دن تیری خصوصی چھترول کرے... پھر اسی قسم کی نیک خواہشات کا اظہار انہوں نے تفتیشی افسر کے لیے بھی فرمایا۔ خالہ کی یہ اشتعال انگیز نشریات برقعے کے اندر سے اسی طرح جاری رہی جیسے سوات میں مولانا ریڈیو کی ایف ایم نشریات... تھانے دار ان کو روکنے میں حکومت کی طرح ناکام رہا۔ وہ خالہ کے برقعے میں گھستا تو اس پر چادر اور چار دیواری کی پامالی کا کیس بنتا۔

بالآخر میں نے ہی خالہ کا سوئچ آف کیا... اس ڈر سے کہ تھانے دار بہر حال، تھانے دار ہوتا ہے۔ بُرا وقت ہو تو وہ حاکموں کی بولتی بھی بند کر دیتا ہے۔ اب صبح ہونے کو تھی... رحیم بخش اپنی بات کہہ کے پھنس گیا تھا... اسے اپنی گاڑی میں ہمیں حیدرآباد لے جانا پڑا۔

ڈرائیونگ خود رحیم بخش نے کی۔ تفتیشی افسر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے پیچھے خالہ کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا لیکن اس طرح کہ میرے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ زنجیر کے دوسرے سرے کو تھانے دار نے اپنی پیٹی سے منسلک کر رکھا تھا۔ غالباً رحیم بخش نے اسے میری طرف سے محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔ جو برات کے گھر سے دلہن کو اٹھا کے بھاگ جائے... فلمی زبان میں بیاہ کے منڈپ سے... اس کا کیا بھروسا کہ خالہ کے ساتھ چلتی گاڑی سے کود کے فرار ہو جائے۔

خالہ کو خاموش رکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا فی زمانہ سرکار کے لیے الیکٹرانک میڈیا کے جانبازوں کی زبان بندی کرنا... چمپو کے سمجھانے... میرے ہاتھ جوڑنے اور تھانے دار کے غرانے کے باوجود انہیں موقع مل جاتا تھا کہ وہ میری بغل میں کہنیاں مار مار کے اور دانت پیس پیس کے مجھے دھمکیاں دیتی رہیں کہ گھر چل، میں کیسے اپنی جوتی سے تیرا قیمہ کرتی ہوں اور پھر سل بٹے پر پیس کے تیرے شامی کباب بناتی ہوں اور شیر کو کھلاتی ہوں.. شیران کے پالتو اور بلی کو دیکھ کر بھی دم دبا لینے والے ـــ کتے کا نام تھا جو ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھونکنے کے فرض سے بھی دست بردار ہو چکا تھا۔ اس بے ضرر خدا ترس مخلوق نے شاید کبھی اپنی کسی بیوی کو پیار سے کاٹا ہو تو الگ بات ہے... غصے میں اور ڈیوٹی سمجھ کے کسی چور ڈاکو سے بھی بداخلاقی نہیں کی تھی۔

اب یہاں چمپو کے ایک اور کارنامے کا ذکر نہ کرنا دوستی کا حق ادا نہ کرنے والی بات ہوگی۔ موقع پاتے ہی اس نے حیدرآباد کے ہوٹل کلرک کو فون پر ساری صورتِ حال سمجھا دی تھی اور حلف اٹھا کے کہا تھا کہ اس نے ہماری مرضی کے مطابق ڈائیلاگ بولے تو اسے خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ ہوٹل میں چھاپا مارنے والے سب انسپکٹر سے بھی بات کر لے... مسلمان کی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہم اس کا بھی دل خوش کر دیں گے۔ بعد میں کمال ڈھٹائی اور کمینگی سے کام لیتے ہوئے چمپو نے ان دونوں کو پانچ پانچ روپے دینے کی کوشش کی اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا... کیونکہ اس حسنِ سلوک کا وہ عادی تھا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے نوجوان نے ایسی شان دار اداکاری کا مظاہرہ کیا کہ شاہ رخ خان دیکھتا تو اداکاری چھوڑ دیتا۔ اس نے خالہ کا برقع دیکھتے ہی بڑی برخورداری سے دانت نکال کے کہا۔ ''ارے خالہ... آپ!'' اور فوراً کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔

اگر وہ مجھے پہچاننے پر ایسی ہی گرم جوشی دکھاتا تو شاید تفتیشی افسر کو شک گزرتا کہ ہوٹل میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک کلرک سب کی صورت کیسے یاد رکھ سکتا ہے؟ مگر خالہ کا برقع نادر چیز تھا۔ شاید دنیا میں اپنی نوعیت کا اکلوتا برقع جس کے نقاب پر ہونٹوں کی جگہ ایک پھول بنا ہوا تھا۔ علامتی طور پر کہ ان کے ہونٹوں سے.. بات نکلے تو پھول جھڑتے ہیں... حقیقت بہر حال، اس کے برعکس تھی۔

تھانے دار نے اسے روک لیا۔ ''تم جانتے ہو اس بندے کو؟''

اس نے مجھے غور سے دیکھ کے سر ہلایا۔ ''خالہ کے ساتھ آپ ہی تھے نا؟ نام تو دیکھنا پڑے گا لیکن یہ خالہ کے ساتھ ایک رات ہوٹل میں رکے تھے۔''

''تو خالہ کو کیسے پہچان گیا؟'' رحیم بخش نے شک سے کہا۔

''میں خالہ کو نہیں ان کے برقعے کو پہچان سکتا ہوں۔ لاکھوں میں ایک ہے... بلکہ ایک ہی ہے... پھر انہوں نے مجھے ڈانٹا بھی تھا... کمرے میں جائے نماز نہیں تھی... میں لے کر گیا تو اس وقت یہ برقعے میں نہیں تھیں۔''

میں کاؤنٹر کلرک کی نیکی پر دم بہ خود رہ گیا۔ اس نے جو جھوٹ بولا وہ سچ سے افضل تھا۔ اجنبی ہونے کے باوجود اس نے اپنی گواہی سے مجھے بچا لیا اور اس کی وجہ بنا خالہ کا برقع!

''الزام''

شکیلہ: کیا یہ درست ہے کہ تم نے امجد سے شادی صرف اس لیے کی ہے کہ اس کے دادا اس کے لیے ڈھیر ساری دولت چھوڑ کر مرے تھے؟

ثمینہ: بالکل غلط... اگر دادا کے بجائے کوئی اور بھی امجد کے لیے اتنی دولت چھوڑ کر مرتا تب بھی میں اس سے شادی کر لیتی۔

اب گواہ نمبر دو کو بلوایا گیا... ظاہر ہے انعام کے لالچ میں اس نے بھی آتے ہی پہلے خالہ کو سلام کر کے پوچھا۔ ''کیسی ہو خالہ... تمہارا برقع تو اب قومی عجائب گھر میں رکھنے کے لائق ہو گیا ہے۔''

''ارے چل ہٹ... اپنی اماں کا برقع رکھ عجائب گھر میں... میں تو اسی میں رخصت ہو کے آئی تھی۔''

''اور اسی میں جاؤ گی۔'' تفتیشی افسر نے اپنا غصہ نکالنے کے لیے کہہ دیا۔ جواب میں اس نے بھی یہی مشورہ سنا کہ اپنی اماں سے جا کے یہی بات کہنا... وہ بہت خوش ہوں گی۔

بہ ظاہر میرے خلاف کیس کے غبارے کی ہوا نکل گئی تھی۔ تھانے دار نے رجسٹر میں میرا نام، شناختی کارڈ نمبر اور میرے دستخط سب کی تصدیق کر لی تھی اور یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو دن پہلے کی تاریخ میں یہ بوگس انٹری تھی۔ چمپو اپنی کار میں کچھ دیر بعد پہنچا تو اس نے دونوں گواہان کو پانچ پانچ روپے کا نیا نوٹ دیتے ہوئے شاباش بھی دی اور جب انہوں نے اسے دھوکا قرار دیا تو چمپو اپنی بات پر اڑ گیا کہ کیا میں نے انعام کی رقم کا ذکر کیا تھا؟ انعام تو انعام ہوتا ہے... رشوت میں دیتا نہیں کیونکہ لینے والے کے ساتھ دینے والا بھی جہنمی بنتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ اب واپسی پر مجھے بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا جائے گا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ... تھانے دار نے خالہ کو ٹال دیا کہ آپ چلو... آپ کا ہونہار بھانجا بھی آجائے گا... بس تھوڑی سی ضابطے کی کارروائی باقی رہ گئی ہے۔

چمپو ایسے نمودار ہوا جیسے ابھی سیدھا گھر سے آرہا ہو حالانکہ وہ سائے کی طرح حیدرآباد تک ہمارے پیچھے لگا رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ تھانے میں قانون کی عمل داری نہیں تھی۔ تھانے داری تھی یا رحیم بخش کی داداگیری... وہ رات بھر کی خواری سے زیادہ اپنی ناکامی پر جھنجلایا ہوا تھا اور گھر جاتے جاتے حکم دے گیا تھا کہ ابھی مجھے سرکاری مہمان رکھا جائے۔ سیدھی انگلیوں سے دیکھ لیا... اب ٹیڑھی انگلیوں سے آج

رات گھی نکالیں گے۔

چمپو کا رنگ اڑا ہوا دیکھ کر میں نے بہت سے غلط مطلب نکالے۔ ایک یہ کہ وہ بھی تھک گیا ہے۔ تھانے میں ویسے بھی سب کا رنگ اڑ جاتا ہے... گلاب ہو تو موتیا نظر آئے... سورج کو ڈک دیا جائے تو چاند کی طرح لگے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وہ گھر گیا ہو تو بیوی نے چمٹا بیلن جیسے زنانہ آلاتِ تشدد دکھا کے پوچھا ہو کہ ''چنا کتھے گزاری یا رات وے...'' اور پھر آخری فیصلہ سنا دیا ہو کہ اب جاؤ... اسی کے ساتھ زندگی بھی گزارو۔

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ چمپو اپنی بیوی سے میرے لیے ناشتا بنوا کے لایا تھا۔ اس نے پہلے اعلان کیا۔ ''بالے... اب میری بیوی بھی تیری طرف دار ہوگئی ہے۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''وہ کیسے چمپو...؟ یہ تو معجزہ ہوگیا۔''

چمپو نے سر کھجایا۔ ''وہ دراصل... میں نے ایک چھوٹا سا جھوٹ بولا... کہ یہ جو احمد اقبال ہے نا... جس کی تم چھت کے پنکھے سے بھی بڑی فین ہو... یہ اپنا بالا ہی ہے... اقبال احمد اصل نام ہے... قلمی نام احمد اقبال رکھ لیا ہے۔''

میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''چمپو... جس دن حقیقت پتا چلی... وہ تجھے طلاق دے دے گی۔''

اس نے بڑے یقین سے کہا۔ ''نہیں... وہ مجھے اپنے ابّا سے ذبح کرا دے گی... لیکن تیرے لیے ایک بہت بری خبر ہے۔''

''کیا روبی نے اس حبشی دادا سے نکاح منظور کرلیا... مجھے بچانے کے لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا؟''

''بالے! تو بے سروپا کہانیاں بنانے سے باز آجا... تیری کہانی کبھی شائع نہیں ہوگی... ابے وہ حبشی دادا... اس کا قتل ہوگیا۔''

میں ایک دھماکے سے پٹاخے کی طرح اچھل کے حوالات کی چھت تک گیا... ''قتل... یعنی مرڈر... یہ کیسا مذاق ہے؟''

''بالے! قتل کون کرتا ہے مذاق میں... یہ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔''

''تو کہاں سے سن کے آیا ہے؟ چنڈو خانے سے تیرے دماغ پر بیلن یا چمٹے کی چوٹ کا اثر تو نہیں؟''

''اپنی بکواس بند کر... میں بھی رات بھر اور آج واپسی تک تیرے پیچھے آیا ہوں... یہاں ہم سب کی منزل بدل گئی۔ میں اپنے گھر گیا، رحیم بخش اپنے گھر... اور تو یہاں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں رک گیا... میں نہایا اور کپڑے بدلے اور جھوٹ بول کے بیوی سے تیرے لیے ناشتا بنوایا۔ اس میں گھنٹا بھر لگا ہوگا۔ اب واپس ادھر آرہا تھا تو راستے میں کیا دیکھا کہ رحیم بخش کی کوٹھی پر پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہیں... اور ایک ایمبولینس... تجھے معلوم ہے اس کی کوٹھی راستے میں پڑتی ہے... دروازے پر کافی لوگ تھے... انہوں نے بتایا کہ رحیم بخش کو کسی نے قتل کردیا... میں بولتے بولتے رہ گیا کہ ابھی گھنٹا بھر پہلے تو وہ میرے ساتھ حیدرآباد سے آیا ہے۔''

''یہ کس نے کیا چمپو؟''

''بالے! مجھے پتا ہوتا تو پولیس کو نہ بتا دیتا... میرے سامنے اس کی لاش نکال کے ایمبولینس میں رکھی گئی۔ پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے گئے ہوں گے... بس اتنا پتا چلا کہ کسی نے چھرا گھونپ دیا اور بھاگ گیا... اس سے زیادہ خود پولیس کو پتا نہیں... نہ گھر والوں کو۔''

اگرچہ یہ ہر لحاظ سے میرے لیے خوش خبری تھی مگر میری بھوک مرگئی۔ ''یہ تو بہت برا ہوا چمپو۔''

''ابے تجھے تو خوش ہونا چاہیے... خس کم جہاں پاک!''

''یار! سمجھا کر... اگر اس ملک میں قانون کا راج ہوتا تو میں کیوں فکر کرتا... لیکن اندھیر نگری چوپٹ راج ہو تو پھر ہاتھ اپنے گلے کی طرف جاتا ہے۔ یہ لوگ پھانسی کا پھندا میرے ہی گلے میں ڈالیں گے کہ بالکل فٹ بیٹھ رہا ہے... قاتل مل جائے تب بھی...''

''اتنا مایوس مت ہو... ہم تجھے کچھ نہیں ہونے دیں گے... ابھی وہ علی احمد خورد آئے گا... نام اس کا علی احمد کلاں ہونا چاہیے تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تو نے بتایا اسے؟''

''میں کیا بتاؤں... ابھی ایک گھنٹے میں سارے چینل دکھا رہے ہوں گے... نیچے پٹی چل رہی ہوگی... حاجی رحیم بخش کا قتل۔''

''وہ حاجی بھی تھا؟''

''پتا نہیں... مگر یہ ایسے ہی ہوتے ہیں... حاجی داؤد ابراہیم... حاجی چھوٹا شکیل... تو چپ کر کے تماشا دیکھ... آج تجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں گے... تیری ضمانت ہو جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کہاں ہے؟... روبی جو مجھے لے ڈوبی۔''

''وہ روپوش ہے... سرکاری طور پر... ورنہ وہیں ہوگی جہاں تو نے اسے چھوڑا تھا۔''

''چمپو... آخر رحیم بخش کو کس نے قتل کردیا؟''

''بہت سوچ بچار، غور و خوض اور دماغ لڑانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں بالے... کہ یہ کام کسی قاتل کا ہے۔''

میں نے اسے گالی دی اور وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ چمپو بڑا ظرف رکھتا ہے۔ آپ اسے چکنا گھڑا بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ سب اس کی بیوی کی عملی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اس کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میرے حق میں حالات بدلنا شروع ہوئے... بالکل اسی طرح جیسے کسی ڈکٹیٹر کے مرنے کے بعد ملک کی زیرِ عتاب پارٹی کے اسیروں کے لیے جیل حکام کا رویہ بدل جاتا ہے۔

پہلے مجھے حوالات سے نکال کے ڈیوٹی افسر کے کمرے میں کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ پھر میرا موبائل فون... گھڑی اور پرس واپس کیے گئے... گھڑی کے اندر مشین تھی مگر موبائل فون کی بیٹری اور پرس میں رقم نہیں تھی... پھر بھی میں نے منافقت سے مسکراتے ہوئے تھینک یو کہا۔ اس کے بعد علی احمد خورد اپنے چھ فٹ قد اور عظیم توند کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے بڑے جارحانہ انداز میں بڑی بے خوفی سے یہ بریکنگ نیوز دی کہ اللہ نے اسے اٹھا لیا جو تجھے اٹھانے کی بات کرتا تھا۔

تھانے والے بے خبر نہیں تھے مگر انہوں نے یہ اطلاع مجھے دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ جو میرے لیے خوش خبری تھی، وہی ان کے لیے بری خبر تھی۔ چھوٹے بڑے تمام مجرم ان کی پارٹی سمجھے جاتے ہیں... رحیم بخش تو ان کا لیڈر شمار ہوتا تھا۔

ہم علی احمد خورد کی گاڑی میں کورٹ گئے۔ راستے میں اس نے تھانے دار کو خوش کیا اور خوش ہو کے تھانے دار نے مجھے ہتھکڑی نہیں لگائی۔ جو سوال میں نے چمپو سے کیا تھا، وہی علی احمد خورد سے کیا۔

''کس نے مارا... یار! ایسے لوگوں کے دوست بھی دشمن ہی ہوتے ہیں... اور یہ سب مارے بھی اسی طرح جاتے ہیں... ہم تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ جہنم رسید ہوا مگر دیکھنا... یہاں اس کی تدفین میں کیسے کیسے شرفاء آتے ہیں اور کیسے کیسے علما اس کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا کے دعا کرتے ہیں... سوئم اور جہلم کی دیگ تناول فرمانے کے بعد...''

میں نے اسے بیک ویو مرر میں آنکھ ماری۔ ''اپنا باس کالا بکرا تو ٹھیک ہے؟''

علی احمد خورد سمجھ گیا۔ ''ایک دم رائٹ... ڈبری ٹائٹ... ہیپی ڈے اینڈ نائٹ...''

معاملات پہلے ہی طے پا چکے تھے۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا... تو الو کیا کرتے اور الو کے پٹھے کس کی شہ پر میرے خلاف فیصلہ دیتے۔ میری صرف پچاس ہزار میں شخصی ضمانت ہوگئی جو ایک بار پھر چمپو نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے فوراً جمع کرادی۔ بعد میں اس نے رازداری سے بتایا۔ ''بیوی نے یہ پیسے احمد اقبال کی ضمانت کرانے کے لیے ہنسی خوشی دیے تھے... جب اسے پتا چلے گا بالے کہ تو وہ نہیں... صرف اقبال احمد ہے تو کیا ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''بتاؤں تیری شہادت کے بعد کیا ہوگا؟ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا۔''

عدالت کے باہر آنے کے بعد میں نے پولیس سے رخصت لی۔ ''پھر ملیں گے اگر خدا لایا... ابھی تو تمہاری حسرتِ تفتیش دل میں ہی رہ گئی۔''

علی احمد خورد نے تھانے دار کے کندھے پر دوستانہ بے تکلفی سے ہاتھ رکھا۔ ''تھانے دار صاحب... بڑا افسوس ہے، یہ کل کا لونڈا تمہیں چکر دے گیا۔ دلہن کو اسی نے اغوا کیا تھا... تم شرط لگا لو۔''

تھانے دار کی مونچھیں کانپنے لگیں۔ ''تم شرط ہٹاؤ... پھر دیکھو ہم دلہن برآمد کرتے ہیں یا نہیں۔''

چمپو فوراً مجھے بھگا لے گیا۔ ان میں شرط لگ جاتی تو مارا میں جاتا۔ راستے میں اس نے مجھے سمجھایا۔ ''بالے... اپنے علامہ صاحب جو تیرے ہم نام تھے... انہوں نے کیا فرمایا تھا؟ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں پہلے ہی فیل ہو جانا بہتر سمجھتا ہوں۔''

''میرا مطلب تھا... تو تھانے میں تفتیش سے بچ گیا... تیری ضمانت بھی ہوگئی... لیکن گھر میں تیرے والد محترم پاپوش بکف بیٹھے ہیں کہ تو لوٹے تو تجھے زدوکوب فرما کے سرفراز کریں۔''

''پھر میں کیا کروں؟ سر پر موٹر سائیکل سواروں والا کنٹوپ پہن کے جاؤں؟''

چمپو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اب فرضِ ثانی ہیں تیری خالہ کی باجی... جو اتفاق سے تیری اماں کہلاتی ہیں... خالہ کے برقعے کا کیس انہی کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ ایک جذباتی تقریر ان کی ہوگی۔ اس کی فکر نہ کرنا... اللہ نے آخر دو کان کس لیے دیے ہیں... ایک سے سن کے دوسرے سے اڑا دو... عزت آنی جانی چیز ہے۔''

چمپو مجھے گھر کے دروازے پر گرا کے ہوا ہوگیا۔ میرے حال کی لمحہ بہ لمحہ خبر مختلف ذرائع سے گھر بھی موصول ہورہی تھی۔ اب جو میں نے اندر قدم رنجہ فرمایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری خبر لینے والوں کا جلسۂ عام ہو رہا ہے اور سب گویا ٹوٹ

پڑنے کے لیے تیار ہیں... میں نے کہا۔ ”حضرات و خواتین... لائن بنائیے... باری باری آئیے۔“

اب یہ ایک لطیفہ ہے کہ کسی شخص کے پاس بولنے والا طوطا تھا۔ اسے سینما میں ٹکٹ بیچنے کی نوکری مل گئی۔ اس زمانے میں پرانی فلم پر لوگ ٹوٹ کے پڑتے تھے اور ٹکٹ کے لیے گھمسان کا رن پڑتا تھا۔ اس شخص نے طوطے کے پنجرے کو کھڑکی پر رکھ دیا۔ طوطا سب کو ڈانٹ لگاتا رہتا۔ ”قطار بنائیے... باری باری آئیے... قطار بنائیے... باری باری آئیے۔“

ایک دن طوطا پنجرے سے نکل کر فرار ہو گیا اور جنگل میں پہنچ گیا۔ وہاں طوطوں کی بستی میں اس کی آنکھ ایک شادی شدہ طوطی سے لڑ گئی۔ وہ دونوں فرار ہوئے اور پکڑے گئے۔ طوطے کے لیے سزا تجویز ہوئی کہ ہر طوطا اور طوطی اس کے سر پر ایک ایک ٹھونگ مارے یہاں تک کہ وہ گنجا ہو جائے... جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو کچھ بدنظمی ہو گئی... طوطا چلّانے لگا۔ ”قطار بنائیے، باری باری آئیے... قطار بنائیے... باری باری آئیے۔“

بالآخر خالہ کو ہی مجھ پر رحم آیا۔ انہوں نے کہا۔ ”ہائے ہائے، بچہ دو دن جوتے کھا کے آیا ہے، پہلے اسے کچھ کھانے کو تو پوچھ لو... خالی گالیاں کھا کے تو پیٹ نہیں بھرے گا بے چارے کا۔“

اس پر حالات کچھ قابو میں آئے تو اماں نے بھی کہا۔ ”اجی ہم کیا کہہ رہے ہیں... یہ بتائے اس نے دلہن کو کیوں اغوا کیا تھا؟“

”بتا تو رہا ہے۔“ خالہ نے کہا۔ ”تم نہ یقین کرو تو اور بات ہے۔“

”لو... یہ ہوا ہے کہیں کہ کسی پر اوپر سے دلہن کود جائے اور کہے مجھے بھگا کے لے چلو۔“

ابا نے دہاڑ کے کہا۔ ”اور یہ بھگا لے جائے... ایسا فرماں بردار یہ ہمارا تو کبھی نہ تھا۔“

خالہ نے آہ بھری۔ ”بھائی جی! زمانہ بدل گیا ہے... لڑکے اب بیویوں کے غلام ہوتے ہیں... ماں کو نہیں پوچھتے۔“

”خیر، اب ہمیں سچ سچ بتا دے کب سے چل رہا تھا یہ چکر؟“

”میں نے کہا۔ ”قسم خدا کی اماں...“

اماں نے پھر جوتی سنبھالی۔ ”جھوٹی قسمیں کھائے گا تو اللہ کا عذاب نازل ہوگا کم بخت!“

ابا نے کہا۔ ”اور آخر تم نے اسے رکھا کہاں ہے... ہمیں بتا دو... ہم واپس پہنچا دیں گے اسے اپنے گھر۔“

میں نے کہا۔ ”وہ... کالے بکرے کے گھر میں ہے۔“

وہ دم بہ خود رہ گئے۔ ”تم نے دیکھا جی... اسے شرم نہیں آتی ہم سے مذاق کرتے ہوئے۔“

لیکن اس رات میری چھپو کی بیوی سے بات ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”لو جی احمد اقبال صاحب... جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔“

میں نے کھنکھار کے کہا۔ ”بھابی... وہ دراصل... میں...“

اس نے کہا۔ ”اب آپ دھڑلے سے ملو... اب کس کا ڈر... وہ جو آپ کی کہانی تھی...“

میں نے ہکلا کے کہا۔ ”کہانی... میری تو ایک سو ایک کہانیاں چھپے بغیر واپس آگئیں... شاید زندگی کی یہ کہانی بھی...“

اس نے چلّا کے کہا۔ ”کیا مطلب؟ چھپو نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے... کہ تم احمد اقبال ہو... چھپو... ذرا ادھر آؤ...“ وہ چلّانے لگی تو میں نے فون بند کر دیا۔

تاہم ایک بات میرے دل کو لگی تھی کہ... پیار کیا تو ڈرنا کیا اور اب کس کا ڈر... میں نے اپنے باس کے گھر فون کرنے کا سوچا پھر ارادہ بدل دیا اور بہ قلم خود حاضر ہو کے روبی کو سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا۔ آخر یہ اسی کا خط تھا جس کے ہر لفظ نے مجھے بُرے وقت میں حوصلہ دیا اور اسی کی دعائیں ہوں گی جن کے قبول ہونے کی وجہ سے میں تھانے میں الٹا نہیں لٹکایا گیا اور چھتر ول سے بچا۔

روبی گھر میں اکیلی تھی کیونکہ میرا باس کالا بکرا آفس میں تھا اور اس کی آسٹریلین گائے جیسی حسین بیوی علامہ اقبالؒ کے فرمان پر عمل کرنے کے لیے کسی بیوٹی پارلر گئی ہوئی تھی... گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر... میں اندر گیا اور سیدھا روبی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

کچھ دیر ہم سکتے کی کیفیت میں بت بنے ایک دوسرے کو گھورتے رہے... پھر میں نے کہا۔ ”روبی... میں آگیا۔“

اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔ ”اب آئے ہو کمینے... میں کب سے راہ دیکھ رہی ہوں... علی احمد خورد نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم رہا ہو گئے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے معاف کر دو... دوسرے تھانے سے مجھے اب رہائی ملی ہے۔“

”کون سا دوسرا تھانہ؟“

”وہ... جہاں اب تمہیں جانا ہوگا... تمہاری سسرال...“

روبی مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اتفاق سے قدرت نے مجھے بھی بہت رقیق القلب بنایا ہے اور خوب صورت لڑکیوں کی حسین آنکھوں سے گرتے موتی دیکھ کے تو میرا دل طائر بسمل ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی روتے ہوئے کہا۔ ”جانم... اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔“

”میں یہاں کب تک رہ سکتی ہوں بالے؟“

”دیکھو... میرے گھر سے ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد آئے گا... تمہیں واپس اپنے گھر لے جانے کے لیے۔“

”میرا گھر اب وہی ہوگا... جو تمہارا گھر ہے۔“

میں نے اسے سمجھایا۔ ”ہاں... بالکل ہوگا... لیکن درمیان میں... کچھ وقت تو لگے گا... میں اپنے والدین کو قائل کروں گا... پھر وہ پیغام لے کر آئیں گے اور تمہیں دلہن بنا کے گھر لے جائیں گے... تب تک تم کہاں رہو گی؟“

”میں یہیں رہوں گی۔“ روبی نے اعلان کیا۔ ”اپنے منحوس بچا کے گھر میں نہیں جو مجھے اس کالے دیو کے ہاتھ بیچ رہا تھا۔“

”مگر وہ تو مر گیا۔“

”مر گیا؟... کب؟... تم جھوٹ بولتے ہو... کل تو وہ زندہ تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری مسکراہٹ کی قسم... اسے کسی نے قتل کر دیا آج صبح... کیا تم نے ٹی وی نہیں دیکھا آج؟“

”افوہ! دیکھا کیوں نہیں... مگر وہ بند تھا۔“

”بے وقوف لڑکی... خبریں دیکھو... تمہیں یقین آجائے گا۔“

اس نے اندر جا کے ٹی وی چلایا۔ کچھ دیر بعد اس میں نیچے مختصر خبروں کی پٹی چلنے لگی... اس میں رحیم بخش کے قتل کی خبر بھی تھی۔

”اتنی اچھی خبر تم نے آتے ہی سب سے پہلے کیوں نہیں سنائی تھی؟ واقعی اللہ بڑا کارساز ہے... لیکن اس سے میرے فیصلے میں تبدیلی نہیں آسکتی... میں لوٹ کے اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔“

ضد کی تین اقسام کو ناقابلِ علاج بتایا جاتا ہے۔ راج ہٹ یعنی بادشاہ کی ضد... بال ہٹ یعنی بچے کی ضد اور تریا ہٹ یعنی عورت کی ضد... اس تیسری قسم کی ضد سے شوہروں کا واسطہ پڑتا ہوگا مگر میں ابھی اس عہدے پر فائز ہی کہاں ہوا تھا۔

ابھی میں روبی کو سمجھا ہی رہا تھا کہ اس کی نند آگئی... یعنی کالے بکرے کی شریکِ حیات گائے... اس نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ روبی کو بہن بنا کے گھر میں رکھے گی... اپنے شوہر کی بہن! وہ عقل مند عورت تھی، جانتی تھی کہ اپنی بہن بنایا تو وہ سالی آدھی گھر والی کہلائے گی اور کچھ پتا نہیں عرب کا اونٹ بن جائے کہ پناہ دینے والا باہر ہو... نند بنانے میں کوئی رسک نہیں تھا۔

اس نے بھی میرے دلائل کو مسترد کر دیا۔ ”روبی عاقل و بالغ ہے، یہاں رہے یا کہیں اور... مثلاً تمہارے گھر میں۔“

میں نے ہکلا کے کہا۔ ”م... میرا... میرا کون سا گھر ہے؟“

”بھئی جہاں چاہو گھر لے لو... شہر میں گھروں کی کوئی کمی ہے؟ خرید نہیں سکتے تو کرائے پر لے لو... پھر روبی کو لے جاؤ۔“

”روبی کو لے جاؤں... ایسے ہی؟“ میں نے کہا۔

”ایسے ہی کیا مطلب؟ آخر یہاں کیسے لائے تھے؟ بھگا کے لائے تھے نا... میں یہ نہیں کہہ رہی کہ یہاں سے بھی بھگا کے لے جاؤ۔“

میں نے احتجاج کیا۔ ”خدا کی قسم بھابی... یہ مجھے بھگا کے لائی تھی... میں نہیں لے گیا تھا اپنی مرضی سے۔“

”افوہ... تو اب اپنی مرضی سے لے جاؤ۔“ روبی نے جھلّا کے کہا۔

”یعنی... پھر تھانے کے حوالات میں لیٹ جاؤں... اپنی مرضی سے... خود پر اغوا کا کیس بنوا لوں؟“

بھابی نے کہا۔ ”تم گدھے ہو... لڑکی کیا کہہ رہی ہے تم کیا سمجھ رہے ہو... بھئی وہ اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ بھاگنے کے لیے راضی ہے... سیدھے کورٹ جاؤ اور شادی کر لو... اللہ اللہ خیر سلا۔“

”کورٹ؟“ میں نے تھوک نگل کے کہا۔ ”یعنی سول میرج...“

”ہاں... تم دونوں عاقل و بالغ ہو... علی احمد خورد...“

میں چلّایا۔ ”یہ ناممکن ہے... میرے اپنے مجھے قتل کر دیں گے... جن سے خون کا رشتہ ہے، وہی میرا خون کر دیں گے۔“

”اچھا بیٹھو... چلّاؤ نہیں... کچھ سوچتے ہیں۔“ روبی کی بھابی نے کہا۔ ”شادی کے دس طریقے ہیں۔ تمہیں روایتی شادی کرنی ہے... بینڈ باجے، سہرے گھوڑے والی... او کے... اپنے اماں ابا سے کہو... روبی کے بھائی سے روبی کا

ہاتھ مانگ لیں... پیغام لے کر یہاں آئیں... ہم منظور کریں گے... برات یہاں آئے گی... رخصتی یہیں سے ہوگی۔''

''بالکل ٹھیک۔'' روبی نے جوش سے کہا۔

میں نے کہا۔ ''تم تو کچھ شرم حیا کرو... آخر تمہارے بیاہ کی بات ہو رہی ہے۔''

''افوہ... بیاہ میں شرم کی کون سی بات ہے... یہ تو سنت ہے... جب رشوت لینے والوں اور ہر قسم کا غلط کام کرنے والوں کو شرم نہیں آتی...''

میں واک آؤٹ کر گیا کیونکہ میں کسی مباحثے میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ اماں ابا کو روبی کے گھر بھیجنا اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا کشمیر کے معاملے میں بھارت کو قائل کرنا۔ ان کو باس کے گھر بھیجنا دگنا مشکل کام تھا... اماں تو ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔ ''کیا مطلب؟ وہ اپنے گھر سے بھاگ کے وہاں بیٹھ گئی ہے... اس کالے بکرے کے گھر... اور ہم اسے وہاں سے لائیں... اس سے آسان ہے ہم تجھے بھی گھر سے نکال دیں... پھر دونوں جہاں سینگ سمائیں جاؤ...''

کورٹ جا کے سول میرج کرنا تو بالکل ہی ناممکن تھا۔ اس بارے میں سوچ کے ہی میری حالت بری ہونے لگتی تھی۔ بلاشبہ اس لیڈی ٹارزن کے مقابلے میں جس نے شکار پر اتنی بلندی سے چھلانگ ماری تھی... میں ایک ڈرپوک شخص تھا... ایسے مشکل وقت میں چمپو ہی میرے کام آتا تھا مگر اب اس کے گھر میں کس منہ سے جاتا... اس کی بیوی کے ساتھ دھوکا چمپو نے کیا تھا... میں نے کبھی نہیں کہا تھا کہ میں احمد اقبال ہوں۔

چمپو مجھ سے باہر ملا اور ہم نے مل کے ایک پلان بنایا۔ ہم روبی کے چچا کے گھر گئے۔ وہ ایک ڈاڑھی دار اور صاف سر والا شخص تھا۔ لگتا تھا اس کے سر کے بال چہرے پر نکل آئے ہیں۔ وہ اپنے جنرل اسٹور کے کاؤنٹر پر ایسے اداس بیٹھا تھا جیسے قبرستان میں کسی ٹھنٹھ پر الّو!

چمپو نے کہا... ''ہم مبارک باد دینے آئے تھے... اللہ نے تمہاری دونوں مشکلات آسان کر دیں... رحیم بخش کا قتل ہو گیا... روبی بھاگ گئی۔''

وہ بھونے جانے والے پوپ کورن کی طرح اچھلنے لگا۔ ''اس کی مبارک باد تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو آخر تم...؟''

چمپو نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تو تمہاری بھتیجی کو چاہتا ہے اور میں... سچ پوچھو تو چاہتا ہوں کہ تم چھوڑ دو...''

وہ گول گول دیدے گھمانے لگا۔ ''کیا چھوڑ دوں؟''

میں نے کہا۔ ''بہت کچھ... مثلاً اپنی بھتیجی کی جان... اس کا مکان اور یہ دکان اور... یہ جہان!''

''چلو چلو... بھاگو یہاں سے... آ گئے خدائی فوج دار بن کے۔''

ہم نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ''جانا تم کو ہے ڈیئر چاچا حق مار خان... یہ سب چھوڑ کے...''

وہ لال پیلا ہو گیا۔ ''اگر تم نہ گئے تو میں پولیس کو بلاتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''پولیس کو تو بلانا ہی پڑے گا... اچھا ہے یہ کام بھی تم خود کر لو... وہ تو اب اس دنیا میں رہا نہیں جس کے بل پر تم اینٹھتے تھے... اس کا مال کھا کے اپنی یتیم بھتیجی اسے بیچ رہے تھے۔''

چمپو بولا۔ ''پھر اب ہم سے بات کر لو... دینی ہے کہ تھانے جانا ہے... یہ ساری پراپرٹی اور دکان... جو روبی کی ہے... گھر سے اسے بھاگنا پڑا... اس نے ہمیں تمام اختیارات دے کر بھیجا ہے کہ تم سے جیسے چاہیں ڈیل کریں اور ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' چمپو نے ایک دم کاؤنٹر پر یوں مکّا مارا کہ وہ اچھل پڑا۔ ''قانونی بھی اور غیر قانونی بھی۔''

''جاؤ جو کرنا ہے کرو...'' وہ بولا۔

چمپو نے کہا۔ ''پھر وہی بات... جانا تم کو ہے چاچا خوامخواہ... لیکن پہلے یہ تو سن لو کہ ہم خود کیا کر سکتے ہیں... ہم یہ کر سکتے ہیں کہ دروازہ بند کر کے باہر تختی الٹی کر دیں... اوپن کے بجائے کلوز سامنے آ جائے... پھر اندر ہم تمہارا مونڈن کریں۔''

''تمہارا سر مونڈ دیں... ڈاڑھی مونڈ دیں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر منہ پر اَن مٹ کالی سیاہی مل دیں اور سر پر سفید پینٹ کر کے لکھ دیں ''ذلیل نمبر ون'' یا ''غاصب... یتیم کا حق مارنے والا...''

اب چمپو نے بات ایسے آگے بڑھائی جیسے قوالی میں ایک کے بعد دوسرا قوال بول اٹھتا ہے... ''لیکن ابھی تم ہم سے ایک ڈیل کر و تو بہت فائدے میں رہو گے۔''

اس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔ ''کیسی ڈیل؟''

میں نے کہا۔ ''چمپو... یہ بندہ ڈیل کرنا چاہتا ہے... اسے بتا ہم کیا چاہتے ہیں۔''

چمپو نے کہا۔ ''تمہاری یتیم بھتیجی جسے تم فروخت کر رہے تھے، بہت فراخ دل ہے... وہ تمہیں معاف کر سکتی ہے... وہ جو تمہارا قرض خواہ تھا جسے تم اپنی بھتیجی دے کر قرض معاف کرانا چاہتے تھے... اسے تو اللہ نے اٹھا لیا روبی کے مفاد میں...

لیکن فائدہ تمہیں بھی ہوا... اس طرف سے تم بے فکر ہو گئے کہ اب قرض کسی کا نہیں دینا۔

''میدانِ حشر کا حساب بعد میں...''

''اب رہی تمہاری یتیم بھتیجی... وہ تمہیں بے گھر اور بے آسرا نہیں کرے گی... اگر تم چند آسان شرائط پر ہم سے ابھی معاہدہ کر لو...''

وہ ہکلانے لگا۔ ''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔''

چمپو بولا۔ ''میں آسان زبان میں سمجھاتا ہوں۔ تمہاری بھتیجی اس وقت ہے کالے بکرے کے گھر میں... وہ کہنے کو کالا بکرا ہے مگر اس کا صدقہ نہیں ہو سکتا... وہ خود تمہارے سارے خاندان کا جھٹکا کر دے... بڑا ظالم بکرا ہے... وہ دولہا کا مددگار ہے... میرا مطلب ہے نیا دولہا... جو میرے ساتھ ہے۔''

چمپو نے میری طرف اشارہ کیا تھا۔ ''روبی یہ گھر اور دکان سب تمہیں دے سکتی ہے... تمہارے نام کر دے گی... اگر...''

''اگر کیا...؟'' وہ بے چینی سے بولا۔

''تم اس کے ساتھ کی جانے والی تمام زیادتیوں کے بعد اس کے ساتھ ایک نیکی کرو۔''

''وہ... وہ میری بھتیجی ہے... میں اس سے معافی بھی مانگ سکتا ہوں... وہ کیا چاہتی ہے؟ لیکن پہلے وہ گھر تو آئے۔''

''آ جائے گی... آ جائے گی... جلدی کیا ہے... مگر اس کے آنے کے بعد یہ ہوگا کہ ایک بزرگ پارٹی تمہارے گھر آئے گی... جو اس نئے دولہا کے والدین کے علاوہ خالہ اینڈ خالو پر مشتمل ہوگی... وہ روبی کے لیے پیغام دیں گے اور تم اسی طرح منظور کرو گے جیسے روبی کے حقیقی والدین ہوتے تو رخصت کرتے... آنسو بہاتے...''

''چمپو! مجھ پر رقت طاری ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور اسی طرح عزت سے اور دھوم دھام سے رخصت کرو گے جیسے اس کے مرحوم والدین کرتے۔''

''چمپو! میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔''

چمپو نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''مت رو بالے... اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں... بڈھا مان جائے گا۔''

بڈھا واقعی مان گیا۔ اس نے کہا کہ جیسا تم چاہتے ہو اور روبی چاہتی ہے... ویسا ہی ہوگا... اس نے حلفیہ بیان کے لیے قرآن بھی منگوانا چاہا مگر ہم نے منع کر دیا کہ ہم اعتبار کرنے والے لوگ ہیں اور وعدہ خلافی کرنے والوں سے بعد میں بھی نمٹ سکتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے چاچا خوامخواہ سے کہا۔ ''آج سے تم میرے سسر مقرر کیے جاتے ہو۔'' اور اس سے پُرجوش مصافحہ کیا۔

وہ چلّایا۔ ''ہائے... کیا میری انگلیاں توڑو گے۔''

پھر میں نے اسے گلے لگایا۔ ''اب ہم رشتے دار ہیں۔''

جب میں نے اسے چھوڑا تو اس کی سانس رکنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں اور اس پر نزع کا عالم طاری لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ چمپو بھی اسی طرح اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتا، وہ بھاگ گیا اور خود کو ایک اسٹور میں بند کر لیا۔ اندر سے وہ کچھ کہہ رہا تھا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

اس رات ہم نے خود کو کالے بکرے کے گھر دعوت پر مدعو کیا... بے شک کالے بکرے نے ہمیں بن بلائے مہمان قرار دیا مگر اس کی آسٹریلین گائے جیسی حسین بیوی کا دل اس سے بڑا تھا... جیسا کہ گائے کا بکرے کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ روبی نے باس اور ملازم کے درمیان دوری ختم کرنے میں یقیناً اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز... اور پھر ایک ساتھ کھانے کی میز پر بھی بیٹھے۔

''اب تم اس مصیبت کو میرے گھر سے لے جاؤ۔'' اس نے ہماری رپورٹ سننے کے بعد روبی کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی بیوی نے اسے ملامت بھری نظر سے دیکھا۔ ''تمہیں اپنی بہن کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔''

''اتنی ہی ہمدردی ہے تو اسے اپنی بہن کیوں نہیں بنایا؟''

''میں کوئی رسک لینے والی بیوی نہیں ہوں... لیکن میرا خیال ہے کہ اب میں ایسا کر سکتی ہوں۔''

چمپو نے کہا۔ ''ابھی ہم ان کی خانہ آبادی کے منصوبے کا دوسرا مرحلہ ڈسکس کریں گے۔''

''تم نے بُرے وقت میں میری مدد کی باس... اس کے لیے میں تمہارا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔''

کالے بکرے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''بُرا وقت تو آئے گا بچے شادی کے بعد... ابھی بہت خوش ہو رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم پھر میری مدد کرو گے... جیسے میرا خرچ دگنا ہوگا تو میری تنخواہ بھی دگنی کر دی جائے گی۔''

باس کا منہ ایسا ہو گیا جیسے کھانے میں اس کے سامنے

کا کروچ کا سوپ رکھ دیا گیا ہے جس میں چھپکلی تیر رہی ہے... لیکن اس کی حسین اور فراخ دل بیوی نے کہا۔ ''کیوں نہیں... آخر تم ان کے بہنوئی بن جاؤ گے۔''

پھر بند کمرے میں ایک سیشن ہوا جس میں ہم نے روبی کو اپنی حکمتِ عملی سمجھائی اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ جذباتی اداکاری کی اہمیت واضح کی۔ ''محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔'' میں نے کہا۔

چمپو بولا۔ ''یہ ہم نہیں کہتے... عقل مندوں نے کہا ہے۔''

''ہاں... تمہارے پاس عقل کہاں؟'' روبی نے طنز سے کہا۔

میں نے اس کی گستاخی کو نظر انداز کر دیا کیونکہ ابھی تک میں اس کے مجازی خدا کے عہدے پر فائز نہیں ہوا تھا۔ ''جھوٹ اور دھوکا... منافقت اور عیاری... محبت اور جنگ میں سب جائز ہے... اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں... وہ محبت بھی ہے اور جنگ بھی!''

اس کے بعد میں نے روبی کے سامنے ایک فلمی قسم کی جذباتی تقریر کی جس میں اسے بتایا کہ میری محبت کیا ہے... کیسی ہے... کتنی ہے... اور اب اس کے بغیر میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بے شک جب تک وہ مجھ پر نازل نہیں ہوئی تھی اور آسمان سے نہیں ٹپکی تھی، میں ایک پتھر تھا جو جینے کا مقصد نہیں رکھتا یا کراچی کی ٹریفک کے ازدحام میں چک جھمرہ کا گدھا تھا جسے نہ اپنی منزل کا پتا ہو نہ راہ کا... وغیرہ وغیرہ۔

یہ جذباتی بلیک میلنگ تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ کسی بھی لڑکی کا محبت کے نام پر کس طرح استحصال کیا جا سکتا ہے۔ ایک لڑکی کے پاس دو میں سے ایک چیز ہو سکتی ہے... یا حسن یا عقل... اور چونکہ روبی خطرناک حد تک حسین ہے، اس لیے اس کے خوب صورت چہرے کے سب سے اوپر والے حصے میں (جو گھٹاؤں جیسے سیاہ ریشمی بالوں میں روپوش ہے) کچھ بھی نہیں ہوگا۔

روبی میری اسٹریٹجی کو نہ سمجھ سکی اور جذباتی سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ گئی... اس نے میری بات مان لی اور ابتدائی اعتراضات سے دست بردار ہو گئی۔ اسی روز وہ اپنے چاچا کے گھر لوٹ گئی لیکن اب اس کی واپسی ٹارزن کی واپسی تھی... یا ہمایوں کی واپسی جو ایک بار شکست کھا کے ایران بھاگ گیا تھا اور وہاں سے امداد لے کے لوٹا تو پھر ہندوستان کی حکومت حاصل کر لی۔ اب روبی نے اپنے گھر اور جائداد کے مالک جیسا اقتدار حاصل کیا... اور جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا... خبیث چاچا اینڈ چاچی نے مگرمچھ کے آنسو بہائے اور اپنے سابقہ رویے پر شرمندگی کا اظہار بھی کیا۔ آئندہ اپنی محبت کا یقین بھی دلایا۔ تاہم روبی کو یقین تھا کہ اندر وہ اپنی تقدیر کو اور مجھے... سب کو کوس رہے ہوں گے۔

روبی کو شرع اور قانون کے مطابق محبوبہ سے منکوحہ کا درجہ دلانے کا دوسرا مرحلہ بھی خیر و خوبی سے مکمل ہو گیا تو میرے لیے تیسرا مشکل ترین مرحلہ شروع ہوا جو اپنے اماں ابا کو راضی کرنے کا تھا کہ وہ میرے لیے روبی کا ہاتھ مانگنے جائیں... اس میں میری جان جانے کے احکامات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا... اماں کی طرف سے زنانہ لغت کی بہترین گالیاں... خاندانی قسم کے کوسنے... کچھ بے ضرر سی مادرانہ بددعائیں مثلاً یہ کہ تو پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گیا، شامل تھیں... لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ زنانہ آلاتِ حرب مثلاً بیلن استعمال کر جاتیں... ابا کی طرف سے قوی امید تھی کہ وہ شیر کی طرح دہاڑیں گے... گالیاں دیں گے... اور میں نے جواب میں کچھ کہا... مثلاً انہیں احساس دلایا کہ وہ مجھے نہیں خود کو گالیاں دے رہے ہیں... تو اپنے نقشِ مبارک سے میرے سرِ عزیز کو سرفراز کریں گے۔

آخر میں وہ اعلان کر دیں گے کہ مجھے عاق کیا جاتا ہے چنانچہ میں اسی وقت گھر سے نکل جاؤں... وہ مجھ پھر مار دوا پی کے عالمِ فانی سے جا سکتے ہیں مگر روبی کے گھر نہیں جا سکتے۔ ایسی لڑکی کو بہو بنانے کا سوچنا گناہِ کبیرہ ہوگا جو چھت سے کسی پر کود جائے پھر اسے بھگا لے جائے اور چاہے کہ اس گھر کی بہو بن جائے... استغفراللہ... اس دن قیامت آجائے گی جس دن روبی نے اس گھر میں بہو بن کے قدم رکھا۔

نہ چمپو اس کیس میں میری مدد کر سکتا تھا اور نہ علی احمد خورد... غالباً علی احمد کرد بھی یہ کیس ہار جاتا اور جوتیاں بغل میں دبا کے اس کورٹ سے فرار ہو جاتا... لیکن جیسا کہ عام عقیدہ ہے... روبی کا... میرا جوڑا آسمان پر بن چکا تھا اور وہ اتری بھی آسمان سے ہی تھی... چنانچہ خود اللہ میاں نے میری مشکل آسان کرنے کے لیے دو فرشتوں کو بھیجا... ان میں سے ایک تھی چمپو کی ظالم زوجہ... اور دوسری کالے بکرے کی گوری گائے!

انہوں نے اماں ابا کو ایسا گھیرا کہ نہ اماں کا خاندانی کوسنوں کا اسٹاک کام آیا، نہ ابا کی گالیوں کا... میں بات کر کے چارپائی کے نیچے گھس گیا اور وہیں لیٹا مذاکرات کو آگے بڑھتا سنتا رہا... ابا نے لاکھ کہا کہ تو ذرا باہر نکل... اور اماں نے بھی خاصا واویلا کیا مگر میں نے ڈھٹائی پر کمر باندھ لی تھی۔

بالآخر میری حمایت پر کمربستہ نیک دل خواتین اماں ابا کو خاموش کرانے اور پھر قائل کرنے میں کامیاب رہیں۔ اس میں سب سے زیادہ ایک دلیل نے کام کیا کہ لڑکا لڑکی عاقل و بالغ ہیں... یہ تو بالے میاں کی عین سعادت مندی ہے جو آج کل کے لونڈوں میں نہیں پائی جاتی۔ ورنہ وہ چاہیں تو آج اور ابھی عدالت میں شادی کر کے کہیں بھی ہنسی خوشی رہ سکتے ہیں... بلکہ بغیر شادی کے بھی ہنسی خوشی رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے ولایت کے بے حیا معاشرے میں مشترکہ خاندان کے بارے میں بتایا تو اماں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور ابا کے حلق سے لاحول تک نہ نکل سکی۔

اب تیسرا مرحلہ آسان ہو گیا تھا۔ اماں ابا دل پر پتھر رکھ کے اپنی خودی کو اولاد کی محبت میں نیچا کر کے اور مظلوم چہرہ بنا کے روبی کا ہاتھ مانگنے ایسے گئے جیسے زندہ مار دینے کی مجبوری میں کوئی طالبان لیڈر شیو کرانے حجام کی دکان پر جائے... مذاکرات کے لیے جانے والے اس وفد میں دونوں خواتین بھی شامل تھیں۔ چمپو کی سنگ دل بیوی اور میرے باس کالے بکرے کی حسین آسٹریلین گائے جیسی شریکِ حیات!

مذاکرات تو کامیاب ہونا ہی تھے۔ آخری فیصلہ کن ڈراما روبی نے کیا۔ یہ ڈراما چمپو نے لکھا... پروڈیوس اور ڈائریکٹ کیا تھا۔ روبی ہماری مشرقی روایات کے مطابق سر جھکائے... لجاتی شرماتی چائے کی ٹرالی کے ساتھ آئی۔ اس نے بہت انکساری سے سلام کیا (جس کا اماں ابا نے کوئی جواب نہیں دیا)۔ اس نے چائے بنا کے حسبِ روایت اماں... پھر ابا اور پھر دیگر شرکائے محفل کو پیش کی۔

پھر وہ دھڑام سے اماں کے قدموں میں گر گئی اور اماں کے سنبھلنے سے پہلے اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اماں کے ہاتھ سے کپ گرا۔ خود ان پر کپکپی طاری تھی۔ وہ ہکلاتی رہ گئیں۔ ''ہائے لڑکی... یہ کیا ہے... اری کچھ بول... توبہ توبہ... کیا ہو گیا میری بچی...''

روبی نے اسکرپٹ کے مطابق ہچکیوں میں بولنا شروع کیا کہ وہ ایک یتیم بے سہارا لڑکی ہے جس پر اپنوں نے بڑا ستم کیا۔ اسے کبھی ماں باپ کی محبت نہیں ملی۔ اگر وہ اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیں تو وہ تمام عمر ان کے پاؤں دھو دھو کے پیے گی... ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھے گی... ان کی بیٹی بن کے دکھائے گی۔

یہ ڈراما اس ایٹم بم کی طرح تھا جس نے جنگِ عظیم میں جاپان کی مزاحمت کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ اماں کے جذبات کا دھارا ایک دم مخالف سمت میں ہو گیا۔ ابا کا تو یہ حال تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے جا سکتے تھے۔ قصہ مختصر... ابا نے روبی کو اٹھا کے گلے لگایا، اپنے پاس بٹھایا... اس کے آنسو پونچھے اور اسے گلے لگا کے کہا کہ آج سے تم ہماری بیٹی ہو... اللہ نے دیر سے دی مگر دی۔

ظاہر ہے اس کے بعد میں بھی چارپائی کے نیچے سے نکل آیا اور میں نے بھی اماں ابا کے سامنے سر جھکا دیا اور جوتی ان کے ہاتھ میں دے کے کہا کہ ماریئے... آپ کا مجرم میں ہوں... مگر بساط الٹ چکی تھی... کھیل ختم ہو گیا تھا... سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنی عیاری اور ماں باپ کی سادگی پر خود اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی مگر دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے... ماں باپ اپنی اولاد کی خاطر استحصال کا شکار ہوتے ہیں... جانتے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے... پھر بھی دعا ہی دیتے ہیں... پیار ہی دیتے ہیں۔

یہ اس واقعے کے ایک ماہ بعد کی بات ہے جب میں نے حجلۂ عروسی میں ایک حقیقی دولہا کی طرح قدم رکھا اور وہاں روبی کو اصلی دلہن کی طرح بیٹھا پایا۔ اس کے بعد نہ کہنے کو کچھ تھا نہ سننے کو... اور تھا تو وہ بیان نہیں کیا جا سکتا... چمپو کا خیال ہے کہ احمد اقبال بیان کر سکتا تھا مگر اقبال احمد...

رات کے کسی جاں فزا لمحے میں روبی سے میں نے کہا۔ ''تم میری زندگی میں آؤ گی... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا... اور یہ مشکل آسان ہوگی رحیم بخش کے جہنم رسید ہونے سے۔''

روبی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بالے... تمہیں معلوم ہے اس کو کس نے قتل کیا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو خود رحیم بخش ہی بتا سکتا تھا۔''

روبی نے کہا۔ ''میں نے۔''

میں نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی۔ ''کس نے؟''

وہ اٹھ بیٹھی۔ ''میں نے قتل کیا تھا اسے۔''

ہنس ہنس کے میرا برا حال ہو گیا۔ ''مجھے ضرور قتل کیا تھا تم نے۔''

وہ بہ دستور سیریس رہی اور مجھے دیکھتی رہی۔ ''اس رات میں سوئی نہیں تھی... تمہارے باس کے گھر میں... وہ سمجھ رہے تھے میں سو گئی ہوں... جب وہ خود سو گئے تو میں کھڑکی کے راستے باہر نکلی... میرے پاس ایک چھری تھی جو میں نے کچن سے لی تھی۔''

وہ ایسے بول رہی تھی جیسے ہپناٹائز کیے ہوئے لوگ بولتے ہیں اور میں سانس روکے سن رہا تھا۔ میں پلک جھپکانا بھی بھول گیا تھا۔

''میں پیچھے کی طرف سے رحیم بخش کی کوٹھی میں کودی۔ دیوار پھاند کے... ایک کھلی کھڑکی سے اندر گئی۔ وہ اکیلا رہتا تھا، یہ مجھے معلوم تھا۔ اس کا گارڈ مین گیٹ پر ہوتا ہے۔ میں

دبے پاؤں اندر چلی گئی اور اسے تلاش کرتی رہی۔ پہلے وہ کسی سے فون پر بات کرر ہا تھا۔ درمیان میں پیتا بھی جار ہا تھا۔ میں دم سادھے کھڑی رہی... پتا نہیں کتنی دیر تک... بالآخر وہ اٹھا اور اپنے بیڈ روم کی طرف گیا... اس کے نوکر بھی لائٹس بجھا کے چلے گئے... پھر میں نے جھانک کے دیکھا... اس کے بیڈ روم میں نائٹ لیمپ جل رہا تھا... وال کلاک میں صبح کے پانچ بجے تھے۔ وہ چت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھی... دروازے کو میں نے اپنے پیچھے بند کر دیا تھا۔ میں نے اخبار میں لپٹی ہوئی چھری نکالی اور ایک دم اس کے حلق پر چلا دی... اس کی آواز تک نہیں نکلی... مگر وہ اچھلا اور تڑپا... اس کے خون کا ایک فوارہ تھا جو اوپر گیا... میں نے خود کو اس سے بچایا... اور کھڑی دیکھتی رہی... مجھے بہت سکون حاصل ہو رہا تھا... اس نے دنیا کے ساتھ جو کیا سو کیا... اس نے مجھے اور سب سے زیادہ تمہیں تکلیف پہنچائی... وہ اژدہا تھا... فرعون تھا... یا شیطان تھا... میں نے اسے مار دیا... ورنہ... ورنہ وہ مجھے مار دیتا... تمہیں مار دیتا... اگر وہ زندہ رہتا تو ہم کیسے ملتے... ہم زندہ ہی نہ رہتے... اس کا تو بس یہی ایک طریقہ تھا... میں ذرا دہشت زدہ نہیں تھی... وہ چند منٹ میں ساکت ہو گیا... میں نے چھری کو اخبار کے کاغذ سے پکڑا تھا کہ اس پر میری انگلیوں کے نشان نہیں ہو سکتے تھے۔ میں جس راستے سے گئی تھی، اسی سے واپس لوٹ آئی... میرے بیڈ روم کی کھڑکی کھلی تھی... اندر جا کے میں نے کھڑکی بند کی اور سو گئی... جب بھابی نے مجھے جگایا... کھلے دروازے سے اندر آ کے... تو میں واقعی سو رہی تھی... انہوں نے پوچھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے نا... آج اتنی دیر تک کیوں سو رہی ہو... میں عام طور پر سات بجے اٹھ جاتی تھی... بھابی آٹھ نو بجے اٹھتی تھیں... اس روز بھابی نے جگایا تو گیارہ بج رہے تھے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی خاموش لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد روبی نے کہا۔ ''تم سمجھ رہے ہو... میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔''

''پھر کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا تھا... اگر میں یہ کہانی لکھ کے بھیج دوں تو ضرور شائع ہو جائے گی۔''

وہ ہنسی اور اس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''پہلے بھی تم ایسی ہی بے سروپا کہانیاں ارسال کرتے رہے ہو... سنو... وہ جاسوسی کا نیا شمارہ آ گیا ہے... اس میں...''

میں نے گرج کے کہا۔ ''بیگم... ایک بات کان کھول کے سن لو... آئندہ اس گھر میں جاسوسی یا سسپنس نام کا کوئی رسالہ نہیں آئے گا... اور اگر تم نے غلطی سے بھی نام لیا نا اس کا...''

گربہ کشتن روزِ اوّل... یہ شبِ عروسی میں ضروری ہے... لیکن حجلۂ عروسی میں بلی ہی نہ آئے... پھر؟

☆☆☆

اب پیارے قارئین... آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا مسئلہ کیا ہے... اور میں نے آپ کو آسمان سے بھینس گرنے کا واقعہ کیوں سنایا تھا... بعض اوقات مسیحائی اتنی بے بنیاد لگتی ہے کہ اس پر کوئی یقین کر ہی نہیں سکتا۔

صبح میں جس مارننگ شو میں اپنی پیاری اور اکلوتی بیوی روبی کے ساتھ جاؤں گا... اس کی میزبان ایک پٹاخہ قسم کی ماڈل بھی ہے... وہ بڑے ٹیڑھے سوال کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ مہمانوں سے سچ اگلوا لے... نہ میں کوئی اہم شخصیت ہوں... مثلاً ایکٹر... نہ روبی کوئی مشہور چیز ہے... اس شو کے بعد ہو جائے تو اور بات ہے۔ اصل میں ہماری کمپنی نے جس کا مالک وہی کالا بکرا ہے... اس شو کو اسپانسر کیا ہے... باس کا حکم ہے کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ جاؤں... ورنہ مجھے نکال دیا جائے گا... اس نے میری تنخواہ تو شادی سے پہلے ہی دگنی کر دی تھی۔

شو میں جس قسم کے سوالات پوچھے جائیں گے وہ مجھے پہلے سے معلوم ہیں... نمونہ ملاحظہ ہو...

میزبان: آپ کو اپنی بیوی کی کیا بات سب سے اچھی لگتی ہے؟

میرا جواب: بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

میزبان: اور سب سے بُری عادت؟

جواب: اس کو آتا ہے پیار پر غصہ مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

میزبان: ان کا اسٹار کیا ہے؟

جواب: اسٹار... آج کل حمل ہے...

سوال: آپ کی میرج ارینج تھی... یا لو میرج...

بس یہی وہ سوال ہے جس کے جواب میں مجھے جھوٹ تو بولنا ہی پڑے گا... اگر میں سچ بولوں اور کہوں کہ نہ ارینج، نہ لو... دلہن مجھ پر آسمان سے گری تھی... وہ بھینس والی اسٹوری پھر پڑھیے اور سوچیے کہ میرا انجام کیا ہو گا... میں پاگل خانے جانا نہیں چاہتا۔

ایک لڑکی کے بہیمانہ قتل سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی

کسی کام کا شوقین ہونا اچھی بات سہی ...مگر بسا اوقات اس شوق کی دل داریاں کسی اور جہاں کی سیر کرادیتی ہیں ...ایک ایسے ہی فوٹو گرافر کا قصہ جو اچانک ہی ایک ناگہانی افتاد کی نذر ہوگیا ...

عین موقع پر

آصف ملک

بین ہیزڈ ایک فوٹو گرافر تھا۔ اس کا کام اور زندگی کا مقصد تصویریں اتارنا تھا۔ وہ سارا دن گھومتا رہتا جہاں اسے کوئی اچھا منظر نظر آتا یا اس میں کوئی خاص بات محسوس ہوتی، وہ اس کی تصویر لے لیا کرتا۔ وہ تاریک راتوں میں نکل جاتا اور اسے کچھ اچھے ''منظر'' مل جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سارا دن گھومنے کے باوجود اسے کوئی اچھا منظر نہیں ملتا تھا۔

فوٹو گرافی سے اس کی دلچسپی کا آغاز اس وقت ہوا جب اس کی بارھویں سالگرہ والے دن اس کے باپ نے اسے ایک کیمرا تحفے میں دیا۔ بین نے اس کی مدد سے تصویریں لیں تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کے اندر ایک فوٹو گرافر کی فطری صلاحیت ہے۔ وہ عام سے مناظر میں ایسے زاویے تلاش کر لیتا جو اسے خاص بنا دیا کرتے۔ پندرہ برس کی عمر میں اس کی کھینچی گئی تصویر نے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا ... وہ برف باری کے دنوں میں شکاگو کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک بوڑھا بے گھر شخص ایک دکان کے شیڈ تلے اخبارات اوڑھے ٹھٹھرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا صرف چہرہ اخباروں کے ڈھیر سے باہر تھا۔ بین نے جب اس کی تصویر لی تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ کسی مقابلے میں پہلا انعام حاصل کر لے گی۔

ہائی اسکول کے بعد اس نے فوٹو گرافی کی تعلیم حاصل

کرنے کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا اور گریجویشن مکمل کرنے کے بعد اس نے ایک رسالے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا لیکن جلد اس نے ملازمت چھوڑ کر فری لانس فوٹوگرافی شروع کردی۔ اس میں اسے آمدنی بھی زیادہ ہوتی تھی۔ پھر وہ تخلیقی کام بھی کرسکتا تھا۔

فوٹوگرافی سے منسلک ہوئے اسے سات سال ہو چکے تھے اور اب وہ امریکا بھر میں جانا جاتا تھا۔ ایک مہینے بعد اس کی ایک نمائش ہونے والی تھی۔

اس دن بین انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن میں تھا۔ اس نے اپنی نمائش کا ایک حصہ انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن کا بھی رکھا تھا۔ شکاگو کے مرکزی ریلوے اسٹیشن میں کئی منزلیں تھیں جن میں ٹرینوں کے لیے پلیٹ فارم تھے۔ وہ اس وقت سب سے نیچے والے لیول پر تھا۔ رات بارہ بجے یہاں سناٹا تھا اور ٹرینوں کا شور بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ٹرینیں کم ہو رہی تھیں۔ بین کا کیمرا ایک ڈوری کی مدد سے اس کے ہاتھ سے بندھا ہوا تھا۔ وہ کسی منظر کی تلاش میں تھا۔ اچانک اوپر سے آتے تین سیاہ فام نوجوانوں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ انہوں نے سردی کی مناسبت سے موٹے ہڈ اپر پہن رکھے تھے۔ ان کے انداز واطوار بتا رہے تھے کہ وہ آوارہ گرد ہیں اور ممکن ہے جرائم پیشہ بھی ہوں۔ بین نے دوسرے لیول سے ان کی تصویریں اتارنا شروع کیں۔ وہ سیڑھیوں سے آخری لیول کی طرف آرہے تھے۔ اس لیول کے پلیٹ فارم سے نواحی علاقوں کی طرف جانے والی ٹرین ملتی تھی۔ ان کا پیچھا کرنے کے لیے بین تیزی سے دوسرے لیول پر آیا کیونکہ وہ جن سیڑھیوں سے آخری لیول پر جا رہے تھے، وہ کسی اور پلیٹ فارم تک لے جاتی تھیں۔ بین بھاگتا ہوا جب اس لیول کی آخری سیڑھیوں تک پہنچا تو اس نے دیکھا۔ تینوں سیاہ فاموں نے سیڑھیوں کے درمیان ایک لڑکی کو گھیر رکھا تھا اور اس کو ہراساں کر رہے تھے۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں ان سے التجا کر رہی تھی کہ وہ اسے جانے دیں۔

''بے بی! ہم تم کو کچھ نہیں کہیں گے۔'' ایک سیاہ فام نے اس کی گردن پر چاقو رکھ دیا۔ بین ان کی تصویریں لینے لگا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ لڑکی پر کیا گزر رہی ہے۔

''ابھی تم ہمارے ساتھ ٹرین میں چلوگی اور ہم کسی ایسے ڈبے میں تمہارے ساتھ کچھ پُرلطف وقت گزاریں گے جہاں کوئی اور نہ ہو۔''

''نہیں۔'' لڑکی کراہی۔ وہ سفید فام اور بہت کم عمر تھی۔ شاید سولہ یا سترہ برس...

''اگر تم انکار کروگی تو ہم یہیں تمہاری گردن کاٹ کر ڈال جائیں گے۔'' چاقو تھامے سیاہ فام نے سفاکی سے کہا۔

''نہیں۔'' لڑکی مزاحمت کر رہی تھی اور واضح طور پر وہ ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ بین نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس کا ضمیر اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ لڑکی کے تحفظ کے لیے کچھ کرے۔

لڑکی اب رو رہی تھی۔ وہ تینوں کے سامنے بالکل بے بس تھی۔ بین نے آواز دی۔ ''ہے... چھوڑ دو اسے۔''

چاقو والے سیاہ فام نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر لڑکی کو چھوڑ کر اس کی طرف آنے لگا۔ بین ہر قدم پر اس کی تصویریں لے رہا تھا۔ ساتھ وہ بولتا بھی جا رہا تھا۔ ''شاندار... بہت اچھے... ہاں ذرا چہرہ اوپر کرنا... ہاں اور اوپر آؤ... ذرا اور اوپر۔'' اب سیاہ فام اس سے صرف چند سیڑھیاں نیچے تھا۔ بین نے بولنا جاری رکھا۔ ''یہاں رک جاؤ... منہ اوپر کرو۔''

سیاہ فام نوجوان اسے سرد نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور وہ اس کے استعمال کا ماہر تھا۔ جیسے ہی اس نے مزید اوپر چڑھنے کا ارادہ کیا، بین نے ہاتھ سے تمہیں بائیں جانب اوپر کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک ویڈیو کیمرا لگا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''تم اس میں ریکارڈ ہو چکے ہو۔ اب اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو زیادہ سے زیادہ کل تک پولیس تمہیں گرفتار کرلے گی۔''

سیاہ فام سیڑھی چڑھ کر اس کے برابر میں آگیا۔ بین کا دم خشک ہونے لگا۔ اگرچہ اس نے اچھی دھمکی دی تھی لیکن وہ کسی بات کی پروا کیے بغیر اسے مار سکتا تھا۔ سیاہ فام کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''چھوڑ دو اسے آجاؤ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔''

''شکریہ۔'' بین نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔'' سیاہ فام نے دھیمے لہجے میں کہا اور اس کے قریب سے ہو کر چلا گیا۔ اس کے ساتھی بھی لڑکی کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لڑکی کچھ دیر سہمی ہوئی کھڑی رہی پھر اوپر آئی۔ اس نے بین سے کہا۔

''تمہارا شکریہ۔ اگر تم نہ آتے تو یہ نہ جانے میرے ساتھ کیا کرتے...''

''کوئی بات نہیں۔'' بین بولا۔ لڑکی واقعی حسین تھی اور اسے اتنے قریب سے دیکھنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔

''لیکن پھر بھی شکریہ۔'' لڑکی نے کہا اور اچانک بین کو پیار کرلیا۔ پھر شرماتے ہوئے مسکرائی اور تیزی سے

سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ اس نے مڑتے ہوئے بین کی طرف دیکھا تو اس نے بے ساختہ اس کی تصویر لے لی۔ پھر وہ تیزی سے نیچے اترا۔ اسی دوران میں ٹرین آچکی تھی۔ دروازہ کھلنے پر لڑکی نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا اور ٹرین میں داخل ہوگئی۔ بین نے گہری سانس لی اور اوپر آگیا۔ جس وقت لڑکی ٹرین میں سوار ہو رہی تھی تو بین نے اس کی تصویر اتارنے کی کوشش کی لیکن عین موقعے پر انکشاف ہوا کہ ریل ختم ہوگئی ہے۔ لڑکی کا چہرہ بہت فوٹو جینک تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ کاش چند شاٹس اور لے لیتا۔

بین اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو رات گہری ہو چکی تھی لیکن اس نے سوچا کہ تصویریں ڈیولپ کرکے ہی سوئے گا۔ سیاہ فام غنڈوں، لڑکی کی تصویروں کا نتیجہ بہت اچھا رہا تھا۔ کام کرکے وہ سونے کے لیے لیٹا تو پھر اس کی آنکھ ڈور بیل کے مستقل بجنے سے کھلی۔ اس وقت کون آگیا؟ اس نے سوچا لیکن جب گھڑی پر نظر گئی تو وہ چونک گیا۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''پولیس۔'' باہر سے آواز آئی۔ ''دروازہ کھولو۔''

اس نے دروازہ کھول دیا اور دو پولیس آفیسر اس سے اجازت لیے بغیر اندر آگئے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''بین ہیزڈ؟''

''ہاں، میں ہی ہوں۔''

''کل رات تم شکاگو کے سینٹرل ریلوے اسٹیشن کے اندر تھے؟''

''ہاں، میں وہاں تھا۔'' بین نے اقرار کیا۔ ''لیکن خیریت، کیا میرا وہاں جانا کسی قسم کا جرم ہے؟''

''مسخرہ پن مت کرو۔'' سوال کرنے والے آفیسر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''معاملہ ہومی سائڈ کا ہے۔ کل رات اس اسٹیشن سے جانے والی بارہ پندرہ کی ٹرین میں ایک لڑکی کا قتل ہوا ہے۔''

''میرے خدا! کہیں اس نے سرخ اسکرٹ اور گلابی بلاؤز تو نہیں پہن رکھا تھا؟'' بین نے بے ساختہ پوچھا۔

''ہاں تم جانتے ہو اسے؟''

''کل رات میں نے اسے کچھ بدمعاشوں سے بچایا تھا۔'' بین نے بتایا۔ لیکن پولیس والے اس کی بات سے زیادہ متاثر نظر نہیں آئے۔

''پھر تم اس کے پیچھے گئے تھے؟''

''ہاں، میں اس کے پیچھے... گیا تھا۔'' بین نے اقرار کیا۔ ''لیکن میں صرف اس کے چند شاٹس لینے گیا تھا۔''

''تم نے شاٹس لیے؟''

''نہیں، بدقسمتی سے عین موقعے پر میری فلم کا رول ختم ہوگیا۔ اس لیے میں صرف ٹرین میں سوار ہوتے دیکھ کر واپس آگیا۔''

''اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم واپس آگئے تھے؟''

اب بین کو اندازہ ہوا کہ معاملہ اس کے اندازے سے زیادہ خراب ہے، اب تک تو وہ اسے سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ ''آفیسر! کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''اس کی معقول وجہ ہے۔ تم اس کے پیچھے گئے اور اس کے چند منٹ بعد لڑکی قتل کردی گئی۔ پندرہ منٹ بعد اگلے اسٹیشن پر اس کی لاش برآمد ہوگئی۔ اس ٹرین میں اس اسٹیشن سے صرف لڑکی اور تم سوار ہوئے تھے۔''

''یہ غلط ہے، میں اس میں سوار نہیں ہوا تھا۔'' بین نے انکار کیا۔ پھر اسے خیال آیا۔ ''ایک منٹ... تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ میں رات کے وقت اسٹیشن پر موجود تھا؟''

''اسٹیشن میں تیسرے لیول میں جانے والی سیڑھیوں کے اوپر لگے کیمرے سے۔'' پولیس افسر نے جواب دیا۔

''تب کیمرے نے مجھے واپس جاتے ہوئے بھی ریکارڈ کیا ہوگا۔''

اس بار پولیس آفیسر نے کسی قدر تاخیر سے جواب دیا۔

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورس | ایئر ہوسٹیس | ہوم اکنامکس | بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ | ایئر ٹکٹنگ | بوتیک فیشن | آلو سرسنگ
ریڈیو ٹی وی وی سی آر ٹیکنیشن | الیکٹریشن | ڈرافٹس مین | ڈرائیونگ میکینک
اسکول ٹیچنگ میتھڈ | صحافت | فوٹوگرافی | انٹیریئر ڈیکوریشن
امپورٹ ایکسپورٹ | شمسی تعاملی | مہر سازی | سلمنگ بیوٹی | حکمت | اردو
موٹر سائیکل مرمت | لائبریرین | کمپیوٹر | کوکنگ بیکنگ | لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (ہیلتھ) | میڈیکل ایڈ | آئل پینٹنگ | ڈیزل میکینک
پولٹری ڈیری فارمنگ | نیوز رپورٹر | فلاور میکنگ | پبلک ہیلتھ انجینیئر
اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او، اسلام آباد

''نہیں کیونکہ ان میں چند منٹ کے لیے کوئی خرابی آئی تھی اور کیمرے اس دوران میں بند رہے تھے۔''

''اب یہ میرا قصور تو نہیں ہے۔'' بین بولا۔ ''میں نہ تو ٹرین میں سوار ہوا اور نہ میں نے اس معصوم لڑکی کو قتل کیا ہے۔ آخر تم ان تین سیاہ فام بدمعاشوں کو کیوں نہیں دیکھ رہے جنہوں نے لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''ہم ان سے بھی بات کر چکے ہیں۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے لڑکی کو نہیں روکا۔''

''وہ کیمرے کی حد سے محفوظ تھے۔'' بین نے سر ہلایا۔ ''لیکن تم نے چاقو والے کو مجھے دھمکاتے تو دیکھا ہوگا؟ میں نے ان کو روکنے کی کوشش کی تھی۔''

''ویڈیو میں وہ تم سے بات کرتا نظر آرہا ہے لیکن اس کے ہاتھ میں چاقو نظر نہیں آیا۔''

''وہ اس نے چھپا لیا تھا۔'' بین نے کہا۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس لڑکی کو ان لوگوں سے بچایا تھا۔''

''اس بات کا کوئی گواہ نہیں ہے اور لڑکی کے ساتھ نظر آنے والے واحد فرد تم تھے۔ وہ تینوں اوپر چلے گئے تھے جبکہ لڑکی کے پیچھے تم گئے تھے۔''

''کیا تم مجھے گرفتار کر رہے ہو؟''

''نہیں لیکن تمہیں پولیس اسٹیشن چل کر ہمارے کچھ سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔''

''وہ تم یہاں بھی پوچھ سکتے ہو، کیا تمہارے پاس وارنٹ ہے؟''

''نہیں... لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے' اگر تم نے تعاون نہیں کیا تو وارنٹ بھی آجائے گا۔''

''اور یہ مت سمجھنا کہ تم اپنی پوزیشن سے کوئی فائدہ اٹھا سکو گے۔'' دوسرے پولیس آفیسر نے اسے خبردار کیا۔

بین کو ان کے ساتھ جانا پڑا۔ وہاں اس کے فنگر پرنٹ لیے گئے.... اور ساتھ ہی اس کا جسمانی معائنہ ہوا۔ بین نے احتجاج کیا اور جب اس نے دھمکی دی کہ یا تو اسے چھوڑ دیا جائے یا اسے وکیل سے رابطہ کرنے کی اجازت دی جائے' تب کہیں جا کر اسے جانے کی اجازت ملی لیکن کیس کے افسر جاسوس براؤن نے اسے خبردار کیا۔

''تم بغیر اطلاع کے شہر چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔''

انہوں نے اس کا سیل نمبر بھی لے لیا تھا اور اسے موبائل آن رکھنے کے لیے کہا.... کیونکہ پولیس کو کسی وقت اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ بین محسوس کر رہا تھا کہ وہ خاصی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ پولیس اسٹیشن سے نکلتے ہی اس نے سب سے پہلے اپنے ایک دوست کلٹ جیسن سے رابطہ کیا۔ وہ ایک نجی جاسوس ایجنسی چلا رہا تھا۔

''میرے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔'' بین نے اسے بتایا۔

کلٹ نے کہا۔ ''میرے دفتر آجاؤ۔''

''نہیں' کہیں باہر ملو۔''

کلٹ نے اسے ایک ریستوران کا بتایا۔ ''میں بیس منٹ میں وہاں ہوں گا۔''

بین اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ کلٹ کچھ دیر بعد آیا۔ اس نے اپنا کوٹ برابر والی نشست پر رکھا۔ ''آج غضب کی سردی ہے۔''

''میں پولیس اسٹیشن سے آرہا ہوں۔'' بین نے اسے آگاہ کیا۔ ''انہوں نے میرے فنگر پرنٹ بھی لیے ہیں۔''

''کیوں؟'' کلٹ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

بین نے اسے گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ بتایا اور یہ بھی کہ پولیس اس پر شک کر رہی ہے۔

کلٹ نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ ''لیکن ان کے پاس تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن دوست' میں ایک مشہور آدمی ہوں اور مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں پولیس ذرا زیادہ مستعدی کا ثبوت دے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی کوئی نوبت نہ آئے۔ ورنہ تم جانتے ہو میرا کیریئر بھی ختم ہو سکتا ہے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''اپنی بے گناہی کا ٹھوس ثبوت!'' بین نے کہا۔

کلٹ سوچ میں پڑ گیا۔ بین نے اس کے اور اپنے لیے کافی کا آرڈر دیا۔ انہوں نے خاموشی سے کافی پی اور کلٹ نے کہا۔ ''مجھے پہلے ان سیاہ فاموں کی تصویریں دکھاؤ۔''

''وہ میرے فلیٹ میں ہیں۔''

''تو چلو۔'' کلٹ کھڑا ہو گیا۔

''مگر اس کا فائدہ؟ قتل انہوں نے نہیں کیا ہے۔ وہ میرے سامنے اوپر چلے گئے تھے اور پھر کوئی نیچے نہیں آیا تھا۔ اس فلور تک جانے کے لیے صرف یہی سیڑھیاں ہوتی ہیں۔''

''اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' کلٹ نے کہا۔ ''ابھی تو تم مجھے ان کی تصویریں دکھاؤ۔''

بین اسے اپنے فلیٹ لے آیا اور اسے ان تینوں بدمعاشوں کی تصاویر دکھائیں۔ ایک تصویر میں وہ تینوں نمایاں تھے۔ کلٹ نے ایک تصویر اپنے پاس رکھ لی۔ اس دوران میں بین نے ٹی وی لگایا۔ ایک چینل سے اس قتل کے بارے میں خبر نشر ہو رہی تھی۔ لڑکی کا نام این اسٹیروٹ تھا اور

وہ ایک ایوننگ کالج کی طالبہ تھی۔ کالج کے بعد وہ ایک بار میں کام کرتی تھی اور بارہ بجے اپنی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اس ٹرین سے گھر جاتی تھی۔ اس کا باپ ایک انشورنس ایجنٹ تھا اور این اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ این کی ماں چند سال پہلے ایڈز کے مرض میں ہلاک ہو گئی تھی۔

تفصیل کے مطابق این حسبِ معمول بارہ پندرہ والی ٹرین سے گھر کے لیے روانہ ہوئی لیکن جب ٹرین بارہ بج کر تیس منٹ پر اگلے اسٹیشن پر رکی تو وہاں سے سوار ہونے والے ایک نائٹ گارڈ نے فوراً ہی لاش دیکھ لی تھی۔ مکین شمٹ نامی اس شخص نے ٹرین چلنے سے پہلے ہی ڈرائیور کو بتا دیا تھا۔ جس کے بعد ٹرین کو وہیں روک دیا گیا۔ پولیس نے ضروری کارروائی کر کے لاش کو اسپتال روانہ کر دیا۔ لڑکی کو کسی تیز دھار والے آلے سے بے دردی سے ذبح کیا گیا تھا اور یقیناً اس نے مرنے سے پہلے خاصی مزاحمت کی تھی.... کیونکہ ڈبے میں کئی جگہ خون پھیلا ہوا تھا اور پولیس کو قدموں کے نشانات بھی نظر آئے تھے۔ البتہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ قاتل ایک تھا یا کئی تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق این کا قتل بارہ بج کر بیس سے تیس منٹ کے درمیان ہوا تھا۔ اس کا لباس سلامت تھا اور کسی نے اس کے ساتھ زیادتی کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا پرس غائب تھا۔ اس سے شبہ تھا کہ یہ کام کسی لٹیرے کا بھی ہو سکتا ہے۔

خبر میں کسی مشکوک شخص کا ذکر بھی تھا لیکن اس کے بارے میں بتایا نہیں گیا تھا۔ بین نے سکون کا سانس لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس اس کے بارے میں زیادہ مشکوک نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ اس پر لگنے والا ممکنہ الزام بھی غلط ثابت ہو۔ اسی وجہ سے اس نے کلٹ سے رابطہ کیا تھا۔ کلٹ نے اس سے کہا۔ ''اگر اب پولیس تم سے رابطہ کرے تو اس سے پورا تعاون کرنا اور اسے وکیل وغیرہ کی دھمکی مت دینا، ورنہ معاملہ پریس تک چلا جائے گا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' بین نے سر ہلایا۔ ''صبح میں حواس میں نہیں تھا۔''

''دوسرے تم بلاوجہ گھر سے نہیں نکلو گے۔ اگر سیاہ فام بدمعاش اتنے ہی خطرناک ہیں تو تمہیں بھی ان سے خطرہ ہو سکتا ہے۔''

بین کو سیاہ فام کی دھمکی یاد تھی۔ اس وقت اس نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ تو اس کے سامنے پلیٹ فارم سے جا چکے تھے۔ بین کا ذہن ان تینوں کو قاتل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

کلٹ نے جاسوسی سے متعلق کورس کر رکھا تھا لیکن اس کا تعلق پولیس یا میرین سے نہیں تھا۔ کلٹ کو پیشہ ور نجی جاسوس بننے کا شوق تھا۔ دس برس بیشتر وہ اس شعبے میں آیا تھا اور اب اس نے اپنا ایک نام بنا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے پاس کام کی کمی نہیں تھی۔ اسے دفتر میں ایک سیکریٹری کے ساتھ ایک جاسوس اور رکھنا پڑا تھا۔ راجر البتہ روایتی جاسوس تھا یعنی پولیس سے ریٹائرڈ تھا۔ وہ زیادہ ذہین نہیں تھا اور کلٹ کی گائیڈ لائن کے مطابق کام کرتا تھا۔ دفتر پہنچتے ہی کلٹ نے راجر کو سیاہ فاموں والی تصویر دی۔

''ان کے بارے میں معلوم کرنا ہے' پولیس میں ان کا کیا ریکارڈ ہے؟'' کلٹ نے کہا۔ ''جلد از جلد معلوم کرنا ہے۔''

راجر فوری طور پر اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔ راجر کا کلٹ کو ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر اسے پولیس ریکارڈ سے کوئی کام ہوتا تو وہ آسانی سے ہو جاتا تھا۔ راجر کے پرانے تعلقات تھے اور اس کے لیے کچھ بھی معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد راجر نے اسے فون کیا اور بتایا کہ جونز اور اس کے دونوں ساتھی فریڈر اور ایرک کے خلاف کوئی درجن بھر کیس ہیں اور یہ تینوں ہی دو سے تین سال کی قید کاٹ چکے ہیں۔ کیس چوری، ڈکیتی، مار پیٹ، تشدد، آبروریزی اور اقدامِ قتل کے تھے۔ صرف جونز پر چھ مقدمات تھے۔ جونز وہی تھا جس نے بین کو دھمکی دی تھی اور وہی ان تینوں کا سرغنہ تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز سینٹرل ریلوے اسٹیشن ہی تھا۔ دو بار ریلوے پولیس انہیں گرفتار کر چکی تھی۔

رپورٹ سن کر کلٹ نے راجر سے کہا۔ ''ان کا اتا پتا کیا ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' راجر نے جواب دیا۔ ''ان کے گھر کے پتے ہیں لیکن یہ عام طور سے وہاں نہیں پائے جاتے۔''

''ان کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ یہ کہاں رہتے ہیں؟''

''میں کوشش کرتا ہوں باس۔''

لیکن رات گئے تک راجر کی رپورٹ یہ تھی۔'' ان کا کوئی سراغ نہیں لگا ہے اور راجر اب دفتر نہیں آئے گا۔ کلٹ نے کہا۔ ''او کے برخوردار' عیش کرو۔''

اگلے دن کلٹ اپنے گھر سے نکلا تو دفتر جانے کے بجائے وہ سینٹرل ریلوے اسٹیشن آگیا۔ صبح کے اوقات میں وہاں بے پناہ رش تھا لیکن کلٹ کے خیال میں کسی جگہ کا معائنہ کرنے کا سب سے مناسب وقت وہی ہوتا ہے جب

وہاں رش ہو۔ اس طرح آدمی کسی کی نظر میں نہیں آتا۔ اس نے آخری لیول پر جا کر پہلے اس پلیٹ فارم کا معائنہ کیا۔ اس پلیٹ فارم تک آنے کے لیے صرف ایک زینہ تھا اور اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر نہیں جا سکا کیونکہ اس کے لیے ٹکٹ لازمی تھا۔ پلیٹ فارم تک جانے والے راستوں پر ایسی رکاوٹیں تھیں جو مشین پر ٹکٹ رکھنے سے کھلتی تھیں۔ اگرچہ یہ رکاوٹیں بہت آسانی سے پھلانگی جا سکتی تھیں مگر ایسا کرنے کی صورت میں نگرانی پر مامور گارڈ حرکت میں آجاتا تھا۔ کلٹ کو اس بات سے ایک خیال آیا۔ اس نے راجر کو فون کیا۔

''پلیٹ فارم پر ایک گارڈ ہوتا ہے جو بنا ٹکٹ کے جانے والوں کو روکتا ہے۔ اس کے بارے میں پولیس کا کیا بیان ہے؟''

''کوئی بیان نہیں ہے کیونکہ یہ گارڈ صرف بارہ بجے تک ہوتا ہے اس کے بعد پلیٹ فارم پر کسی کی ڈیوٹی نہیں ہوتی ہے۔'' راجر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''جس وقت این پلیٹ فارم پر آئی تو وہاں کوئی گارڈ نہیں تھا اس لیے کسی کو نہیں معلوم کہ اس پلیٹ فارم سے کوئی اور ٹرین میں سوار ہوا تھا یا نہیں۔''

''ان تینوں کے بارے میں معلوم کیا کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟''

''میں ابھی اسی مہم پر نکل رہا ہوں۔'' راجر نے بتایا۔

''ایک چیز اور معلوم کرنا، قتل والی رات کچھ دیر کے لیے ریلوے اسٹیشن کے کیمروں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ صرف لیول تھری کے پلیٹ فارم کے کیمرے نے کام کرنا چھوڑا تھا یا دوسرے کیمرے بھی بے کار ہو گئے تھے۔''

''میں معلوم کرلوں گا لیکن شام تک معلوم ہو سکے گا۔''

''کوئی بات نہیں لیکن بات پوری معلوم کرنا۔'' کلٹ نے اس سے کہا۔ فون بند کر کے وہ اوپر آیا۔ اس نے ان سیڑھیوں کو دیکھا جہاں سے بین نے ان تینوں کی تصاویر لی تھیں۔ کلٹ نے سیکیورٹی کیمرا دیکھا۔ اس کی حد سے بچ کر کسی طرح بھی نیچے جانا یا نیچے سے اوپر آنا ممکن نہیں تھا۔ کلٹ کو معلوم تھا کہ ان کیمروں کی نگرانی ایک مخصوص جگہ سے کی جاتی ہے اور وہیں ان کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ لیول تھری کے دوسرے پلیٹ فارم پر آیا۔ اس کا راستہ بالکل الگ تھا اور اس کی لائن بھی بالکل الگ تھی یعنی بارہ پندرہ والی لائن سے الگ تھی۔ کسی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس لائن پر اتر کر دوسرے پلیٹ فارم تک آجائے۔

کلٹ واپس دفتر آیا اور اس نے اپنے کمپیوٹر پر سب سے پہلے شکاگو کے سینٹرل ریلوے اسٹیشن کا نقشہ نکالا۔ اس نے لیول تھری کے تینوں پلیٹ فارمز کا معائنہ کیا۔ یہ تینوں پلیٹ فارم کوئی سو فٹ لمبے تھے اور تینوں کی لائنیں مختلف تھیں۔ اگر کوئی کسی ایک پلیٹ فارم کی لائن پر اتر کر دوسرے پلیٹ فارم تک آنا چاہتا تو ایک تو اسے بہت طویل سفر کرنا پڑتا اور دوسرے اسے جگہ جگہ گزرتی ٹرینوں سے واسطہ پڑتا۔ اکثر جگہوں پر سرنگ اتنی تنگ تھی کہ وہاں سے کوئی ٹرین گزرتی تو کسی کے لیے صرف کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں رہتی۔ اس میں حادثے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ اس لیے کلٹ نے یہ امکان مسترد کر دیا کہ قاتل دوسرے پلیٹ فارم سے اتر کر لائن سے یہاں تک آیا اور این والی ٹرین میں سوار ہو کر اسے قتل کر دیا۔

وہ اب تک اس امکان پر غور کر رہا تھا کہ جونز، فریڈر اور ایرک کسی طریقے سے ٹرین پر سوار ہوئے تھے اور انہوں نے این کو قتل کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے بین کو پھنسانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ راجر شام کو دفتر آیا تو اس نے دونوں کام کر لیے تھے۔ اس نے کلٹ کو رپورٹ دی۔

''یہ تینوں بدمعاش ساتویں شاہراہ کی ایک عمارت میں رہتے ہیں۔ وہاں انہوں نے ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔'' راجر نے پتا اس کے سامنے رکھا۔

''کیمروں کے بارے میں کیا معلوم کیا ہے؟''

''پولیس کے مطابق صرف لیول تھری پلیٹ فارم کے کیمرے کسی نامعلوم وجہ سے پندرہ منٹ کی ریکارڈنگ نہیں کر سکے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے باقی کیمرے ٹھیک کام کر رہے تھے۔''

اس بات نے کلٹ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اگر تمام کیمرے مسئلہ کرتے تو اسے اتفاق کہا جا سکتا تھا لیکن صرف لیول تھری کے کیمرے خراب ہونا کسی سازش کی نشان دہی کر رہا تھا۔ بین نے بتایا تھا کہ اس نے این اور ان سیاہ فاموں کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا اس لیے کسی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کلٹ شام کو دفتر سے اٹھ رہا تھا کہ بین آندھی کی طرح اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ کلٹ نے اسے دیکھا۔

''خیریت تو ہے نا؟''

''نہیں۔'' وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ ''بات نہ جانے کیسے پریس تک جا پہنچی ہے اور وہ میرے گھر کا گھیراؤ کیے بیٹھے ہیں۔ خوش قسمتی سے میں گھر سے باہر تھا اس لیے بچ گیا ورنہ ابھی تو میں گھر سے بھی نہیں نکل سکتا تھا۔''

''اس بات کو عیاں تو ہونا ہی تھی یا پھر خود پولیس والوں نے بتا دی ہوگی۔ پریس کے وظیفہ خوار ہوتے ہیں۔''

''لگتا ہے میرا کیریئر تو ختم ہو جائے گا۔'' بین مایوسی سے بولا۔ ''ابھی مجھے نمائش کے منتظم کا فون آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ فوری طور پر نمائش اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دو جب تک یہ معاملہ کلیئر نہ ہو جائے۔ تم نے اب تک کیا کیا ہے؟''

''آج اور کل جو میں نے معلوم کیا ہے، اس کے مطابق اگر یہ قتل تم نے نہیں کیا ہے تو تمہارے خلاف سازش ہوئی ہے۔''

''میں نے قتل نہیں کیا ہے۔'' بین خفگی سے بولا۔

''تب یہ سازش ہے۔ کسی طریقے سے کیمرے عین اس وقت بند کر دیے گئے جب کوئی سیڑھیوں سے آرہا تھا یا جا رہا تھا۔ اس کا گزرنا اور تمہارا واپس آنا ریکارڈ نہیں ہو سکا۔''

''لیکن کوئی کیمرے کس طرح بند کر سکتا ہے؟''

''یہی تو مجھے معلوم کرنا ہے۔'' کلٹ کھڑا ہو گیا۔ ''آج رات میں ریلوے اسٹیشن میں گزاروں گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ گھر تو جا نہیں سکتا اور کسی ہوٹل میں بھی نہیں رک سکتا۔ ممکن ہے رات تمہارے گھر گزاروں...''

''کیوں نہیں لیکن پہلے ہم کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھائیں گے۔'' کلٹ نے کہا اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔ کلٹ بین کو ایک ریستوران میں لایا۔ انہوں نے بوتھ لیا تھا تاکہ بین بلاوجہ کسی کی نظر میں نہ آئے۔ کھانے کے دوران بین مستقل اپنے مستقبل کے لیے پریشان تھا۔ وہ بار بار کلٹ سے کہہ رہا تھا کہ اصل مجرم نہ پکڑے گئے تو وہ تباہ ہو جائے گا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' کلٹ نے اسے یقین دلایا۔ ''اب ایسا بھی نہیں ہے کہ تم کو محض شک کی بنا پر الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیا جائے۔''

''لیکن میرا کیریئر تو تباہ ہو جائے گا۔''

کلٹ اس سے متفق نہیں تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ بین کو صرف تسلی دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اسے عملی طور پر کچھ کرنا ہوگا۔ کھانے کے بعد انہوں نے ڈرنک لی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے نکل آئے۔ کلٹ نے اپنی کار کا رخ ریلوے اسٹیشن کی طرف موڑ دیا..... دس منٹ بعد وہ وہاں تھے۔ بین نے اس سے کہا۔ ''پولیس نے یہ بات ضرور معلوم کی ہوگی کہ کیمرے کس طرح بیکار ہوئے تھے۔''

''ہاں، یہ معلوم کیا ہے... اسے بھی کچھ نہیں معلوم۔''

''یعنی کیمرے کسی نامعلوم وجہ سے خراب ہوئے تھے؟''

''لفظ خرابی درست نہیں ہے، اصل میں کیمروں نے عارضی طور پر کام روک دیا تھا۔''

وہ لیول تھری تک آئے۔ ریلوے اسٹیشن میں پبلک ایریا محدود تھا لیکن کام والا علاقہ بہت بڑا تھا۔ کلٹ نے کہا۔ ''ہم اب رات کو آئیں گے۔ جب بیشتر ملازمین اور سیکیورٹی والے جا چکے ہوتے ہیں، تب ہم پتا چلانے کی کوشش کریں گے کہ سیکیورٹی کیمروں کے سامنے سے گزرے بغیر کوئی کیسے نیچے جا سکتا ہے۔''

''کسی طریقے سے یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ ان کیمروں کے جنکشن باکس کہاں ہیں؟''

''مشکل ہے کیونکہ اس قسم کی چیزیں بہت خفیہ رکھی جاتی ہیں۔'' کلٹ نے نفی میں سر ہلایا۔

بین نے اصرار کیا۔ ''پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔''

کلٹ نے سوچا۔ ''ٹھیک ہے، ہم کسی انٹرنیٹ کیفے سے ٹرائی کرتے ہیں۔''

وہ ریلوے اسٹیشن کے ساتھ ایک انٹرنیٹ کیفے تک آئے۔ انہوں نے ایک بوتھ لیا اور اندر آ گئے۔ بین دونوں کے لیے کافی لینے چلا گیا۔ کلٹ نے انٹرنیٹ پر ریلوے اسٹیشن کا تھری ڈی نقشہ نکالا اور اس میں سیکیورٹی کیمروں کے پوائنٹ چیک کرنے لگا۔ اسے سیکیورٹی کیمروں کے پوائنٹ تو مل گئے لیکن جب اس نے جنکشن باکس کی جگہ معلوم کرنا چاہی تو اسے بنا اتھارٹی کے بتانے سے انکار کر دیا گیا۔ یہاں سے مایوس ہو کر اس نے بجلی کے تاروں کا نقشہ معلوم کیا تو وہ اسے مل گیا۔ یہ دوسرے لیول پر ایک سرنگ میں تھا اور اس میں داخلے کا راستہ بھی واضح کیا گیا تھا لیکن ظاہر ہے وہاں ہر ایرا غیرا اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا۔ کلٹ نے اسے ذہن نشین کر لیا۔ بین آیا تو اس نے اسے اس سرنگ کے بارے میں بتایا۔

''ہم وہاں کیسے داخل ہوں گے؟''

''یہ تو وہیں جا کر پتا چلے گا۔'' کلٹ نے جواب دیا۔

بارہ بجے کے قریب وہ انٹرنیٹ کیفے سے نکلے اور ریلوے اسٹیشن میں آئے۔ اب وہاں ہجوم نہیں تھا اور بہت کم لوگ نظر آرہے تھے۔ یہی کام کا وقت تھا۔ بین، کلٹ سے پیچھے تھا۔ اس کی نظریں اردگرد دیکھ رہی تھیں۔ ایک گیلری سے گزرتے ہوئے اسے تین ہڈ والے اپر پوش نظر آئے۔ جب تک وہ کلٹ کو متوجہ کرتا، وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''وہ دیکھو، وہی تینوں...''

''کہاں ہیں؟'' کلٹ نے پوچھا۔

''اس گیلری سے اندر گئے ہیں۔'' بین نے اشارے

سے بتایا۔

''کیا تم نے ان کے چہرے دیکھے تھے؟''

''نہیں لیکن مجھے یقین ہے یہ وہی ہیں۔'' بین نے کہا۔ ''تم جانتے ہو ایک فوٹو گرافر عام آدمی سے بہتر مشاہدہ رکھتا ہے۔''

بین کی اس بات نے کلٹ کو قائل کرلیا۔ وہ اس گیلری کی طرف بڑھے۔ ان کو خاصا گھوم کر جانا پڑا تھا۔ اب وہ تینوں ہڈپوش نظر نہیں آرہے تھے۔ بین چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس جگہ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ لیکن گیلری میں اس طرح پھیل کر آجا رہے تھے کہ ان کے درمیان کسی کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔

''اس طرف۔'' کلٹ نے ایک راستے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اس طرف آئے تو راستے کے شروع میں وارننگ تھی کہ یہ عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ کلٹ نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ اتنی جلدی گیلری کراس نہیں کر سکتے اور نیچے کا پورا ہال بھی نظروں میں ہے اس لیے یقیناً وہ اسی طرف گئے ہیں۔''

''لیکن یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔'' بین ہچکچایا۔

''ابھی کوئی نہیں ہے اگر کسی نے روکا تو ہم غلطی کا بہانہ کردیں گے۔'' کلٹ بولا۔ مجبوراً بین کو اس کی بات ماننا پڑی۔ وہ اس راستے پر ہو لیے۔ ذرا آگے جا کر ان کو پتا چلا کہ وہ اس لیول کے سروس ایریا میں گھس آئے ہیں کیونکہ یہاں اس قسم کے بورڈ لگے تھے کہ کس کمرے میں کیا ہے۔ ابھی وہاں کوئی نہیں تھا۔ کلٹ کمروں کے دروازے چیک کرنے لگا۔ مگر وہ سب لاک تھے۔ لیکن ایک کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھل گیا۔

''یہ کھلا ہے۔'' کلٹ نے سرگوشی میں کہا۔

''ہم دروازے دیکھنے نہیں ان تینوں کی تلاش میں آئے ہیں۔'' بین نے اسے یاد دلایا۔

''مجھے شبہ ہے وہ یہیں کہیں آئے ہیں اور اس کمرے کا دروازہ کھلا ہے تو دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ ہم یہاں سے کچھ چرا کر تو نہیں لے جائیں گے۔''

بین نے سر ہلایا۔ ''دیکھ لو کہیں مجھ پر ایک کیس اور نہ بن جائے۔''

''فکر مت کرو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں مختلف قسم کا سامان رکھا تھا لیکن آدمی کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ لمبا ہال نما کمرا تھا جس میں دیواروں کے ساتھ ریکس پر سامان رکھا تھا۔ کلٹ ریکس کا معائنہ کرنے لگا۔ بین نے دبی زبان میں کہا۔

''یہاں کوئی نہیں اور اب یہاں سے نکلو کوئی آگیا تو مصیبت آجائے گی۔''

''کوئی نہیں آئے گا۔'' کلٹ نے اسے تسلی دی۔ وہ اب ریکس کو ہلا کر دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' بین پریشان ہو رہا تھا۔

کلٹ نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔ وہ کونے کی طرف بڑھا جہاں ایک خستہ حال اور ٹوٹا پھوٹا ریک رکھا تھا۔ اس پر کوئی سامان نہیں تھا۔ کلٹ نے اسے ہلایا تو وہ بڑی آسانی سے ایک طرف سرک گیا۔ بین نے پھر مداخلت کی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ یہاں کسی سامان چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس بار کلٹ بھنا گیا۔ ''کیا تم کچھ دیر چپ نہیں رہ سکتے؟''

کلٹ نے ریک کو مزید سرکایا۔ حتیٰ کہ اس کے پیچھے کی دیوار نظر آنے لگی۔ کلٹ نے اپنی جیب سے ایک پنسل ٹارچ نکالی اور اسے روشن کر کے دیوار کو دیکھا۔ فوراً اسے وہ رخنہ نظر آگیا جو اس ریک کے پیچھے تھا۔

''یہاں ایک راستہ ہے۔'' اس نے آہستہ سے بین کو بتایا۔ ''اب بلا ضرورت بات مت کرنا اور نہ زور سے بولنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بین نے سر ہلایا۔ ''لیکن تمہیں شک کیسے ہوا کہ یہاں کوئی راستہ ہے؟''

''راستے کا تو نہیں پتا لیکن یہ ریک مجھے مشکوک لگا۔ فرش پر دیکھو اس کے بار بار سرکانے سے مستقل نشان پڑ گیا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اسے ہٹا کر دیکھا۔''

کلٹ ریک کے پیچھے گھسا اور اس رخنے تک آیا۔ اس نے اندر روشنی ڈالی تو سامنے ایک دیوار تھی اور ایک پتلا سا راستہ دائیں طرف جاتا نظر آیا۔ یہ شاید کوئی پرانی تعمیر تھی جس کے سامنے یہ نئی تعمیر کی گئی تھی۔ شکاگو کا یہ سینٹرل ریلوے اسٹیشن ایک صدی سے زیادہ پرانا تھا۔ کلٹ اندر گھسا اور اس کے پیچھے بین بھی آگیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔ اگر ان کے پاس ٹارچ نہ ہوتی تو ان کو کچھ نظر نہ آتا۔ وہ آہستہ آہستہ سرکتے رہے پھر ایک کھلی راہداری میں جا نکلے لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی یہ ریلوے اسٹیشن کا موجودہ حصہ نہیں۔ وہاں ہر طرف ملبا بکھرا ہوا تھا۔ بجلی کے تار لٹک رہے تھے لیکن بجلی نہیں تھی۔ کلٹ نے آہستہ سے کہا۔

''یہ شاید ریلوے اسٹیشن کا پرانا حصہ ہے۔''

بین پریشان تھا۔ ''ٹھیک ہے لیکن ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

کلٹ نے اسے گھورا۔ ''تم اپنی عقل شاید باہر بھول آئے ہو۔ ہم ان تینوں کا پیچھا کرتے آئے ہیں اور مجھے شبہ ہے کہ وہ یہیں آئے ہیں۔''

''لیکن وہ یہاں نظر نہیں آرہے ہیں۔''

''ہمیں آگے جا کر دیکھنا ہوگا۔''

وہ راہداری کے دوسرے سرے کی طرف بڑھے۔ ان کو ہر طرف بکھرے ملبے سے بچ کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اچانک بین کا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور ایک ٹن شور مچاتا آگے گیا۔ کلٹ نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ ''اس پر آنے والے مہینے کی ایکسپائری ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے حال میں ہی یہاں پھینکا گیا ہے۔''

کلٹ کی بات درست جان کر بین بھی محتاط ہوگیا اور اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک جگہ پڑا چھوٹا سا زنگ آلود فولادی پائپ اٹھا لیا۔ راہداری کے سرے پر ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ انہوں نے اسے کھولا تو سامنے ان کو ایک متروک ریلوے سرنگ نظر آئی۔ متروک اس طرح سے کہ اس کی پٹڑی اکھڑی ہوئی تھی اور لائن پر ملبا بکھرا ہوا تھا۔ کلٹ اور بین باہر آئے۔ سرنگ بھی تاریک تھی۔ بین نے تشویش سے کہا۔

''اگر ہمارا سامنا ان لوگوں سے ہوگیا تو؟''

''ہم نے خود کو چھپانا ہے۔'' کلٹ بولا۔ ''سامنے آنے سے معاملہ خراب ہو جائے گا۔''

وہ روشنی میں ملبا دیکھ کر چل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کو ایک جگہ لوہے کا جنگلا نظر آیا۔ اس کے دوسری طرف کچھ تھا۔ کلٹ نے روشنی ڈالی تو اسے بہت سارے برقی باکس اور فیوز نظر آئے۔ ''میرا خیال ہے یہاں کیمروں کا جنکشن باکس موجود ہے۔''

''اسے کھولا بھی جا سکتا ہے۔'' بین نے جنگلے کا معائنہ کیا۔ ''صرف چار اسکرو نکالنے ہوں گے۔''

کلٹ نے غور کیا۔ ''یعنی اگر وہ یہاں آئے اور انہوں نے جنگلا ہٹا کر کیمروں کے جنکشن باکس کو کھولا اور لیول تھری کے کیمروں کے کنکشن کچھ دیر کے لیے منقطع کر دیے۔''

''وہ کون؟'' بین نے بے خیالی میں کہا۔ ''سیاہ فام؟''

''بالکل وہی۔''

''لیکن وہ ٹرین میں کس طرح سوار ہوئے؟''

''آؤ، اب یہ بھی دیکھتے ہیں۔''

وہ متروک ریلوے سرنگ میں مزید آگے بڑھے۔ یہ خاصی بڑی تھی۔ بین نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم لیول تھری کے پلیٹ فارمز کی طرف جا رہے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' کلٹ نے کہا۔ وہ ٹارچ سے پوری سرنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی محدود تھی اور اسے کسی بڑی ٹارچ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ بین بھی سرنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اب وہ کلٹ سے متفق تھا اور اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، اس پرانی سرنگ سے نئی سرنگ میں جانے کا کوئی راستہ ہوگا؟''

''بالکل... اور مجھے اسی کی تلاش ہے۔ اگر اس سرنگ سے نئی سرنگ میں جانے کا راستہ نہیں ہے تو مجھے تمہاری بے گناہی ثابت کرنے میں ناکامی ہوگی۔ اس لیے دعا کرو کہ راستہ ہو اور ہمیں مل جائے۔''

بین سمجھ گیا اس لیے وہ تن دہی سے کلٹ کے ساتھ تلاش کا کام کرنے لگا۔ ان کی زیادہ توجہ دیواروں پر تھی۔ پہلے بھی ان کو دیوار پر جنگلے کے عقب میں جنکشن باکس کا سراغ ملا تھا۔ فرش کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔ چلتے چلتے اچانک ہی بین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اگر اس نے پٹڑی کا سہارا نہ لیا ہوتا تو اس گڑھے میں جا گرتا۔ کلٹ نے جلدی سے اسے اوپر کھینچ لیا۔ پھر گڑھے میں روشنی ڈالی۔

''یہ کیا ہے؟''

بین نے بھی جھانکا۔ ''میرا خیال ہے یہ کوئی راستہ ہے۔ میں اتر کر دیکھتا ہوں، تم مجھے ٹارچ پکڑانا۔''

بین نیچے اترا، کلٹ نے اوپر سے اسے ٹارچ دی۔ بین نے سرنگ کا معائنہ کیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہ کوئی راستہ تھا جو آگے جا رہا تھا۔ اس نے کلٹ سے کہا۔ ''راستہ ہے، اسے دیکھنا چاہیے۔''

کلٹ بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے بین سے ٹارچ لے کر روشنی آگے ڈالی۔ ''ہاں راستہ لگ رہا ہے۔''

اس راستے کا خاتمہ ایک جالی پر ہوا اور جب انہوں نے اسے اٹھا کر ایک طرف کیا اور دوسری طرف نکلے تو وہ ایک ریل سرنگ میں کھڑے تھے اور ذرا دور ایک پلیٹ فارم کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ بین پُرجوش انداز میں بولا۔ ''میں شرط لگا سکتا ہوں کہ یہ وہی پلیٹ فارم ہے جس سے بارہ پندرہ والی ٹرین گزرتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کلٹ کے بجائے کسی اور نے جواب دیا۔ ''اور بارہ پندرہ والی ٹرین آنے والی ہے۔''

کلٹ نے پلٹ کر روشنی ڈالی تو پرانی سرنگ سے نکلنے والے راستے پر اسے تینوں سیاہ فام نظر آئے، وہ تینوں ہی چاقوؤں سے مسلح تھے اور ان کے تیور خطرناک لگ رہے تھے۔ ''تو تم تینوں اس سرنگ سے یہاں آئے اور ٹرین میں سوار ہو

کرلڑکی کو قتل کر دیا۔''

''ہاں۔'' جونز نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''اور اب تم دونوں کی باری ہے۔''

بین کا دم خشک ہوگیا۔ ''تم ہمیں بھی قتل کر دو گے؟''

''نہیں' تم لوگ ابھی آنے والی ٹرین کے نیچے آکر مرو گے۔ یہاں ٹرین سے بچنے کی جگہ نہیں ہے۔''

جونز ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سرنگ بہت تنگ تھی اور وہ کسی صورت ٹرین کی ٹکر سے نہیں بچ سکتے تھے۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ واپس پرانی سرنگ میں گھس جاتے یا پلیٹ فارم پر چڑھ جاتے لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ اسی لمحے ٹرین انتہائی تیز رفتاری سے دوسری طرف کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور اس کا اگلا سرا پلیٹ فارم سے ذرا آگے نکل آیا اور پلیٹ فارم کی طرف جانے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ٹرین صرف ایک منٹ کے لیے رکتی تھی۔۔ اور ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

دوسری طرف جونز اور اس کے ساتھی ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ان کو سرنگ میں واپس جانے کے لیے ان سے لڑنا پڑتا اور وہ نہتے تھے جبکہ ان تینوں کے پاس چاقو تھے۔ جونز ہنسا۔ ''آؤ دوست' کیا جان بچانے کی کوشش نہیں کرو گے؟''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ بچ جاؤ گے؟'' کلٹ نے ہراساں ہوئے بغیر کہا۔ اس نے پریشان بین کا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ سے اسے لے کر پیچھے ہٹنے لگا۔

''ہاں' ہم پھر بچ جائیں گے اور تم لوگ مارے جاؤ گے۔'' جونز بولا۔ ''وہ ٹرین چلنے والی ہے۔''

واقعی ٹرین چلنے والی تھی۔ کلٹ نے بین سے آہستہ سے کہا۔ ''جیسے ہی میں کہوں ٹرین کی طرف بھاگنا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے، خودکشی کرنا چاہتے ہو۔'' بین بھنا گیا لیکن اس نے آواز آہستہ ہی رکھی۔

''جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرنا۔'' کلٹ بدستور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ان کو پیچھے جاتے دیکھ کر جونز کسی قدر فکر مند ہوگیا اور وہ سرنگ والے راستے سے آگے آگیا۔

''تم لوگ کس فکر میں ہو؟'' اس نے دریافت کیا۔

اسی وقت ٹرین نے آہستہ سے حرکت شروع کی۔ کلٹ نے پلٹ کر دیکھا اور چلایا۔ ''بین بھاگو، ٹرین پر سوار ہو جاؤ۔''

بین بھاگا، کلٹ اس کے ساتھ تھا۔ الیکٹرک ٹرین کی رفتار سیکنڈوں میں بڑھتی ہے۔ جب تک وہ ٹرین کے اگلے سرے تک پہنچے، اس کی رفتار کوئی دس کلومیٹر فی گھنٹا ہو چکی تھی۔ بین بڑی مشکل سے اس کے پائدان پر چڑھا اور کلٹ تو ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اگر بین اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو وہ پہیوں کے نیچے آچکا ہوتا۔ اس کے پائدان پر آتے آتے ٹرین کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔

جونز کو کلٹ کا مقصد بھانپنے میں ذرا دیر ہوئی۔ جب وہ دونوں بھاگے تو وہ بھی بے ساختہ ان کے پیچھے بھاگا۔ اسے اپنی حماقت کا دیر سے احساس ہوا اور اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ پرانی سرنگ کے راستے سے کوئی بیس گز آگے نکل آیا تھا اور جب ٹرین نے رفتار پکڑی اور کسی درندے کی طرح جونز کی طرف لپکی تو وہ پلٹ کر بھاگا۔ لیکن اسے سرنگ میں داخل ہونا نصیب نہیں ہوا، ٹرین اسے روندتی ہوئی گزر گئی۔ اس کی آخری چیخ بہت بھیانک تھی اور اس کے خون کے چھینٹے اڑ کر ان لوگوں تک آئے تھے۔

☆☆☆

بین اور کلٹ پلیٹ فارم پر بیٹھے تھے۔ اس سے کچھ دور جونز کے ساتھی فریڈر اور ایرک ہتھکڑیوں میں جکڑے پولیس کی نگرانی میں تھے۔ ریلوے لائن سے جونز کے جسم کے ٹکڑے اٹھائے جا رہے تھے۔ ایک پولیس آفیسر نے بین اور کلٹ کے بیانات لے لیے تھے۔ ایرک نے پولیس کو بتا دیا کہ این کا قتل جونز نے کیا تھا اور وہ اس خفیہ سرنگ کے راستے پلیٹ فارم تک آئے تھے۔ اپنی آمد کو چھپانے کے لیے انہوں نے فریڈر کو سرنگ میں چھوڑا تھا اور اس نے عین اس وقت کیمرے بے کار کر دیے جب وہ پلیٹ فارم میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ ایک اور ڈبے میں سوار ہوئے اور پھر اس ڈبے میں آئے جس میں این بیٹھی تھی۔ جونز اتنے طیش میں تھا کہ اس نے جاتے ہی این پر چاقو سے حملہ کیا اور اس کی گردن کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد وہ اگلے اسٹیشن پر اتر گئے اور این کی لاش دریافت ہونے سے پہلے وہاں سے نکل گئے۔

کچھ دیر بعد جونز کی لاش وہاں سے لے جائی جا رہی تھی۔ بین نے کلٹ سے کہا۔ ''اگر تم بروقت فیصلہ نہ کرتے تو اس وقت اس کی جگہ ہم دونوں کی لاشیں جا رہی ہوتیں۔''

''ہاں بس اچانک ہی یہ ترکیب میرے ذہن میں آگئی اور ہماری بچت ہوگئی۔'' کلٹ مسکرایا اور کھڑا ہوگیا۔ ''میرا خیال ہے اب تمہیں میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بین بھی جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ ''بالکل ہے' آج رات میں سکون سے سونا چاہتا ہوں اور اگر گھر گیا تو میڈیا والے مجھے سونے نہیں دیں گے۔''

''تو پھر چلو دوست! مجھے بھی بہت...... نیند آرہی ہے۔'' کلٹ نے کہا اور دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

★

ملین ڈالر

رضوانہ منظر

بعض لوگ برسوں ساتھ رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا آپس میں تعلق نہیں بن پاتا ...اور وہ مجبوری کی زنجیر میں بندھ کر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں ...ایک ایسی ہی لڑکی کا المیہ جو ایک ناپسندیدہ تعلق جوڑنے پر مجبور تھی۔

طویل انتظار کے بعد ملنے والے تحفے کا مختصر جگہ دلچسپ و سنسنی خیز قصہ

کسی گم شدہ فرد کو قانونی طور پر مردہ قرار دینے کے لیے حکام کو عام طور پر پانچ سال درکار ہوتے ہیں۔ کنساس میں یہی قانون ہے۔ اگر مجھے اس کا علم پہلے سے ہوتا تو شاید میں دولت کے حصول کے لیے کسی مختلف راہ کا انتخاب کرتی۔

دراصل جو ہوا، وہ اچھا ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں، میں نے جو کچھ کیا وہ بُرا نہیں تھا اور اب بائیس برس کی عمر میں، میں اپنی وراثت اور بیمہ کی پیاری سی رقم سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے تیار ہوں۔

اپنی شادی کی رات ہی میں نے اپنے اسی سالہ شوہر کو اس کے گنجے سر میں پیچھے سے ایک ہی گولی مار کر اس وقت قتل کر دیا تھا جب وہ شاور لے رہا تھا۔

اس کام کے لیے طویل انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی... مجھے بھرپور موقع اور صحیح وقت مل رہا تھا تو پھر انتظار کیوں کرتی؟

نالی میں اس کے خون کے چھینٹوں کو بہانا کتنا آسان رہا تھا! اپنی کورٹ شپ کے دوران میں نے ارل کی دست درازیوں اور زیادتیوں کو خوب برداشت کیا تھا۔ وہ میری درگت بنا کر رکھ دیتا تھا۔

لیکن اب اس کا معاوضہ میں نے بہ طور اپنی آزادی پا لیا تھا۔ البتہ اپنی نئی دولت ملنے کی توقع میں، میں نے ارل کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ ٹین ایجرز کے ساتھ بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ پورے منظر کی پیش بینی کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اب لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ درپیش تھا اور میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

لاش کو دفن کر دوں؟

کوئی جاسوس یا ٹوہ لینے والا اناڑی پن سے تیار کردہ قبر کا کھوج لگا سکتا تھا۔

لاش کو دریا برد کر دوں؟

جنوری میں دریا کا پانی جم سکتا تھا یا پھر اس کی لاش پھول کر یا ابھر کر پانی کی سطح پر آسکتی تھی۔ ایسے واقعات کے متعلق میں کئی بار پڑھ چکی تھی۔

ارل دبلا پتلا منحنی ٹائپ کا آدمی تھا۔ سو میں نے اس کی گرم اور بے لباس لاش ایک بڑے سے ٹرنک میں ٹھونس دی۔ مجھے اس کام میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ پھر میں نے لاش کے اوپر بہت سے کمبل رکھ دیے اور ٹرنک کو اوپر تک خاندانی پرانی تصویروں سے بھر دیا۔ ساتھ ہی تیز بو والی کافور کی بہت سی گولیاں ٹرنک میں ڈال دیں تاکہ بدبو دب جائے۔

پھر دو پہیوں والی ایک ہاتھ گاڑی کو استعمال میں لاتے ہوئے میں نے ٹرنک کو اس پر رکھا اور گاڑی کو دھکیل کر اپنی مشن ہلز اسٹیٹ کے ناقابلِ استعمال کیرج ہاؤس میں لے گئی۔ میں نے ٹرنک وہاں اتار دیا۔

ارل کی غیر حاضری پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ وہ ایک ریٹائرڈ انویسٹمنٹ کونسلر تھا اور جب ہم شادی کر رہے تھے تو اس نے ہر ایک کو یہی بتایا تھا کہ ہم فوراً ہی ہنی مون پر چلے جائیں گے اور کئی ماہ تک سفر کرتے رہیں گے۔

میں نے وہ تمام پلان کینسل کر دیے اور کی ویسٹ گیسٹ ہاؤس میں سردیوں کے لیے اپنے اور ارل کے نام سے ایک اپارٹمنٹ بک کرالیا۔

کی ویسٹ کا جزیرہ جیو اور جینے دو والی جگہ ثابت ہوئی۔ وہاں کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کسی نے بھی میرے شوہر کی عدم موجودگی یا میرے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

اگر کوئی ہمارے کنساس کے مینشن پر فون کرتا تو اسے ایک ریکارڈ شدہ پیغام سننے کو مل جاتا تھا کہ ہم لوگ اپنی تنہائی اور دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپریل تک کی ویسٹ جزیرے پر ہی رہیں گے۔

میرا خیال تھا کہ اگر کیرج ہاؤس میں رکھے ہوئے ٹرنک کی وجہ سے وہاں کوئی ناگوار بو بس گئی ہوگی تو اس وقت تک لازمی ختم ہو جائے گی۔

اس کے باوجود بھی گھر لوٹنے کے بعد میں نے ایک ہفتے کے لگ بھگ خود کو غیر نمایاں ہی رکھا۔ صرف میری آنٹی میگی مجھے مستقل فون کرتی رہی۔

ایک روز جب میں نے گھنٹی بجنے پر فون اٹھایا تو مجھے ان کی گمبھیر آواز سنائی دی۔

''مونیکا!'' انہوں نے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم گھر لوٹ آئی ہو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور اتنے بڑے مکان میں تنہا رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ میں یہاں کنساس سٹی کے ایک ایسے گھر میں منتقل ہونا چاہتی ہوں جہاں ہر قسم کی معاونت اور مدد ملتی ہے۔''

''یہ تو بہت ہی مناسب بات لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اسسٹڈ لیونگ ہوم کہاں ہے؟''

''میرا نام شیڈی پائنز نامی لیونگ ہوم میں درج ہوا ہے لیکن میں اپنا تمام فرنیچر وہاں نہیں لے جا سکتی۔ اس میں خاندانی یادگاری فرنیچر بھی ہے اور نادر فرنیچر بھی۔ میں وہ تمام فرنیچر وقت آنے پر تمہیں اور ایلفی کو ترکے میں دینا چاہتی ہوں۔''

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ میں وہ خاندانی کاٹھ کباڑ نہیں لینا چاہتی تھی اور مجھے شک تھا کہ شاید میرا کزن ایلفی بھی اسے لینے کی ہامی نہیں بھرے گا۔

ایلفی غیر اخلاقی طریقے استعمال کرنے والوں کی وکالت کیا کرتا تھا۔ وہ ان قابلِ نفرت لوگوں کی نمائندگی کرتا تھا جو قانونی مدد کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور اس کی گزر بسر جونسن کاؤنٹی کے ٹیکس گزاروں کے اخراجات میں سے ہوتی تھی۔

میں بچپن ہی سے ایلفی سے نفرت کرتی تھی، جب وہ مینڈک اور چھوٹے سانپ لے کر میرا پیچھا کیا کرتا تھا اور صرف اس وقت باز آتا تھا جب میں اسے بوسہ لینے کی اجازت دے دیتی تھی۔ اس کے رال ٹپکتے ہونٹوں کا تصور ذہن میں آتے ہی مجھے کپکپی آگئی۔

''مونیکا... مونیکا! کیا تم لائن پر ہو؟'' آنٹی میگی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''ہاں... آنٹی میگی! میں لائن پر ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے میرا فرنیچر کسی صاف ستھرے خشک اسٹوریج یونٹ میں ٹرک کے ذریعے منتقل کرنے کے انتظامات میں میری مدد کرو۔'' آنٹی میگی نے کہا۔

''آپ ایلفی سے کیوں نہیں کہتیں؟'' میں نے کہا۔ ''وہ جانتا ہے کہ اس قسم کے قانونی معاملات کس طرح سے نمٹائے جاتے ہیں۔''

میں نے بہانہ بناتے ہوئے یہ ذمے داری قبول کرنے سے گریز کیا تو بالآخر وہ ایلفی کو فون کرنے پر رضامند ہو گئی۔

اپریل کے اوائل میں، میں پولیس ہیڈ کوارٹرز جا پہنچی۔ میں نے اپنے سنہری بال پونی ٹیل کی شکل میں باندھے ہوئے تھے تاکہ چہرے پر معصومیت نظر آئے اور ساتھ ہی میں نے بہت سی کچی پیاز بھی چھیلی تھی تاکہ آنکھوں سے یہ ظاہر ہو کہ میں خوب روتی رہی ہوں۔

پولیس ہیڈ کوارٹرز میں مجھے خاصی دیر انتظار کرنا پڑا تب کہیں ایک کلرک نے مجھے سارجنٹ بیلے کے کیوبیکل میں پہنچا دیا۔ کمرے میں سگار کی بو پھیلی ہوئی تھی جس سے میری طبیعت متلانے سی لگی لیکن میں اس لحیم شحیم شخص کو دیکھ کر اداس انداز میں مسکرا دی جو ایک اسٹیل کی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے اپنا مسئلہ اس کے روبرو بیان کر دیا۔

''آپ نے آخری مرتبہ اپنے شوہر کو کب دیکھا تھا؟'' سارجنٹ بیلے نے سوال کیا۔

''کل شام۔'' میں نے اپنی سسکی دباتے ہوئے کہا۔ ''وہ معمول کی شام کی سیر کے لیے گھر سے نکلے تھے لیکن پھر لوٹ کر نہیں آئے۔''

''آپ نے انہیں تلاش کیا؟''

''میں نے سب جگہ تلاش کیا۔ میں گھنٹوں انہیں ڈھونڈتی رہی لیکن وہ کہیں نہیں ملے۔''

اسی سہ پہر سارجنٹ بیلے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ارل کو تلاش کرنے ہماری اسٹیٹ پر آیا۔ وہ اسے ہر جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر جب سارجنٹ بیلے اور اس کا پارٹنر چیک کرنے کے لیے کیرج ہاؤس میں داخل ہوئے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پھیپھڑے آگ سے بھرے ہوئے غبارے ہوں۔

بے شک انہوں نے وہ ٹرنک بھی کھول کر دیکھا لیکن تصویروں اور کمبلوں کے ڈھیر اور کافور کی گولیوں کی تیز بُو نے انہیں ٹرنک کا ڈھکن جلد ہی بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

بعد میں انہوں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ارل شاید اپنی مرضی سے مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے ایک غم زدہ بیوہ کا کردار... بہ حسن و خوبی ادا کیا۔ ارل کی گم شدگی کے بعد کے ابتدائی چند ہفتوں تک میں سیاہ لباس پہنتی رہی۔

مجھے ذہنی آزمائش کے اس کھیل میں خوب مزہ آرہا تھا۔

لیکن قانون بہرحال، قانون ہے۔

جائداد کے تصفیے کے لیے مجھے برسوں انتظار کرنا تھا اور کیرج ہاؤس میں ارل کی لاش کی موجودگی سے مختلف واہمے مجھے نروس... کر دیتے تھے۔

میں نے اپنے مالی معاملات ارل کے بااعتماد وکیل کے سپرد کر دیے تھے اور کئی ماہ تک میں نے اپنی زندگی ایسی مصروفیات کے لیے وقف کر دی جو کہ میرے شان دار مستقبل کے لیے مجھے پہلے سے تیار کر دیتی۔ میں نے ایک ہیلتھ کلب میں تیراکی سیکھ لی تاکہ جب میں فلوریڈا منتقل ہو جاؤں تو کی ویسٹ کے پانیوں کا بھرپور لطف لے سکوں۔

میں نے نیلسن گیلری سے پینٹنگ کا کورس بھی کر لیا۔ ایک غم زدہ، نوجوان آرٹسٹ سے زیادہ پُرکشش اور کون دکھائی دے سکتا ہے؟

میں نے ڈانس بھی سیکھ لیا... بال روم اور جاز دونوں ہی۔ اور کھانا پکانے اور ڈرنکس مکس کرنے کی تربیت بھی حاصل کر لی۔

پھر میں نے ایک اور آئیڈیے سے لطف لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے آنٹی میگی کو فون کیا۔

''اگر آپ اب بھی اپنے فرنیچر کو اسٹور کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں تو اب میرے پاس فرصت ہے اور میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔'' میں نے آنٹی سے کہا۔

''ڈیئر چائلڈ!'' آنٹی کی آواز سریلی ہو گئی۔ ''میں تمہاری ممنون ہوں کہ اپنے غم کے وقت میں بھی تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔ ایلفی نے میری مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے، سو مجھے تمہاری پیش کش بہ خوشی قبول ہے۔ میری طرف سے تم یہ انتظامات کر لو۔ شیڈی پائنز میں ایک سوئٹ کھل گیا ہے۔ اگر میں اسی ہفتے وہاں رہائش اختیار کر لوں تو وہ میرا ہوگا۔''

سو میں نے آنٹی میگی کے لیے ایک اسٹوریج یونٹ کرائے پر حاصل کر لیا۔ میں نے یہ فیصلہ کرنے میں ان کی مدد کی کہ وہ کون سا سامان اپنے ساتھ لے جائیں اور کون سا سامان اسٹور میں رکھوا دیں۔

جب بار برداری کرنے والی کمپنی کے ٹرک آگئے تو میں نے چپکے سے ان سے اپنے کیرج ہاؤس سے وہ ٹرنک بھی اٹھوا دیا اور اسے آنٹی میگی کے سامان کے ساتھ کرائے کے اسٹوریج یونٹ میں منتقل کرا دیا۔

آنٹی میگی کی عمر اس وقت پینسٹھ برس ہو چکی تھی۔ البتہ وہ پوری طرح صحت مند تھیں اور اپنی تندرستی کا بھرپور لطف اٹھا رہی تھیں۔ وہ میرے اندازے کے مطابق مزید بیس برس تک زندہ رہ سکتی تھیں۔ یقینی طور پر جب تک ان کی موت واقع ہوگی، لوگ ارل کو بھول چکے ہوں گے۔ ان کے مرنے کے بعد جب ان کے سامان کی تلاشی لی جائے گی تو پولیس یہی شبہ کرے گی کہ آنٹی میگی نے کسی کو قتل کر کے اس کی لاش ٹرنک میں چھپا دی تھی۔

لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا... کیونکہ اس وقت تو وہ خود بھی مر چکی ہوگی۔

جب میرا انتظار کا قانونی وقت اختتام کو پہنچ گیا تو ارل کے وکیل نے مشن ہلز اسٹیٹ کی فوری فروخت میں میری مدد کی۔ اب ترکے میں ملنے والی ہر شے آسانی کے ساتھ میری

دسترس میں تھی۔ اسی وکیل کی معاونت سے مجھے ملین ڈالرز کی انشورنس پالیسی کی رقم بھی مل گئی۔

ارل مجھے ہمیشہ اپنی 'ملین ڈالرز بے بی' کے نام سے پکارا کرتا تھا۔

کی ویسٹ، فلوریڈا جاتے ہوئے راستے بھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھائی رہی۔

کی ویسٹ میں، میں نے سمندر کے عین مقابل اونچے مقام پر ایک کونڈومنیم خرید لیا جس کے ساتھ ہی ایک پرائیویٹ ساحل بھی تھا۔

اب میں ہر روز تیراکی کیا کرتی تھی اور ساحل پر پینٹنگ سے بھی لطف اندوز ہوتی تھی۔ میں نے وہاں کی انسان دوست تنظیموں میں شمولیت اختیار کرلی تھی اور فیاضی سے انہیں عطیات دیا کرتی تھی۔ میں نے قریبی پڑوسیوں کو کاک ٹیل پر مدعو کرنا شروع کردیا۔ یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی کہ جب آپ قدرے دولت کی نمائش کریں تو دوست بنانا کتنا آسان ہوجاتا ہے۔

جوناتھن میری زندگی میں اچانک ہی وارد ہوا تھا۔ واہ... کیا پُرکشش مرد تھا! اس نے میرے ارل کے ساتھ گزارے تلخ اور بُرے وقت کی تلافی کردی۔ ہم اکٹھا وائن پیتے، ڈنر کرتے اور راتیں رنگین بناتے تھے۔

ہم نے ابھی اپنی منگنی کا اعلان کیا تھا اور شادی کی تاریخ طے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ ایلفی اچانک ٹپک پڑا۔

میں اس وقت ساحل پر اپنا ایزل سجائے پینٹنگ میں مگن تھی۔ وہ میرے برابر میں آکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں، مونیکا!''

ایلفی میں رتی برابر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی چپڑے ہوئے بال، وہی موٹی سی توند...! ہمیشہ کی طرح شکن آلود سوٹ، دھبے لگی ہوئی ٹائی اور گھسے ہوئے جوتے۔ نہ جانے کیوں اس میں سے ہمیشہ عجیب سی بو آیا کرتی تھی جو اس وقت بھی میری ناک میں چبھ رہی تھی۔

''بولو!'' میں نے کہا۔ میں چاہ رہی تھی کہ کوئی ہمیں اکٹھا نہ دیکھ لے اسی لیے اس سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتی تھی۔

''گزشتہ ہفتے کار کے ایک حادثے میں آنٹی میگی کا انتقال ہوچکا ہے۔'' ایلفی نے بتایا۔

میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے اس خبر سے شاک پہنچا ہو۔

میرا فوری دھیان اس ٹرنک کی جانب گیا تھا جس میں، میں نے ارل کی لاش چھپائی تھی۔

اب اس ٹرنک کا کیا بنے گا؟ میں نے اس کے اتنی جلدی کھولے جانے کے متعلق کوئی پلان نہیں بنایا تھا۔ میرے پیٹ میں اس طرح مروڑ اٹھنے لگا جیسے کوئی اسے مٹھیوں میں بھینچ رہا ہو۔

''تم مجھے صرف یہ بتانے کے لیے اتنی دور سے یہاں آئے ہو؟'' میں نے قدرے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ ان کی موت کا تمہیں کوئی افسوس نہیں ہوا۔'' ایلفی نے کہا۔ ''اور مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ اس صورت حال نے میرا دل باغ باغ کردیا ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' مجھے اپنے حلق میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں بہ مشکل تمام یہ الفاظ ادا کرپائی۔

''مجھے ان کے سامان میں ایک ٹرنک بھی ملا ہے۔'' ایلفی کی آواز میں انکشاف کا عنصر شامل تھا۔

میرا ہاتھ کانپ گیا اور میرا پینٹ برش میرے ہاتھ سے نیچے ریت پر گر گیا لیکن میں خاموش کھڑی رہی۔

''میں نے اس ٹرنک کو ہم دونوں کی خاطر سنبھال کر رکھ لیا ہے، مونیکا!'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے اسے ایک محفوظ مقام پر رکھ دیا ہے کہ شاید مجھے اس کی ضرورت پیش آجائے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا لبادہ اور جوتے اتار کر ایک طرف پھینک دیے۔ اب وہ سبز پولکا ڈاٹ کی اسپیڈو پہنے میرے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے پلٹ کر ایک اچٹتی نگاہ میرے ساحلی کونڈومنیم پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں کی ویسٹ کے جزیرے پر رہنے کا عادی ہوجاؤں گا۔ ہاں، میرا خیال ہے کہ ہم دونوں بے حد اطمینان اور سکون کے ساتھ رہیں گے۔''

آنسوؤں سے میری آنکھیں جلنے لگیں۔

ایلفی نے اپنے ننگے پیر سے میرے پینٹ برش کو ریت پر کیا رگڑا کہ میرے سارے خواب، میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔

''کیا مجھے اب بھی مینڈک اور سانپوں کا سہارا لینا پڑے گا؟'' ایلفی نے میری جانب قدم بڑھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ بچپن کی طرح اب بھی اس کے ہونٹوں سے رال ٹپک رہی تھی۔

میں نے بے بسی سے رونا شروع کردیا۔

جیسیکا اونگھ رہی تھی جبکہ میش جاگنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ وہ گزشتہ سات گھنٹے سے مسلسل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ بروقت نکل گئے ورنہ پولیس انہیں گرفتار کرلیتی۔ خوش قسمتی سے میش صبح سویرے عین اس وقت باہر نکلا جب پولیس کی گاڑیاں آرہی تھیں اور اس نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ فوری طور پر جیسیکا کو لے کر فرار ہوگیا۔ وہ اٹلانٹا سٹی سے بھاگے تھے اور اب ریاست عبور کرکے ٹینیسی میں آگئے تھے۔ اس کے باوجود میش مضطرب تھا۔ اس کا ارادہ مغربی ریاستوں کی طرف جانے کا تھا جو جارجیا سے بہت دور تھیں اور اس کے خیال میں وہاں وہ پولیس کی پہنچ سے دور ہوتے۔

''پلیز! کہیں رک جاؤ۔'' جیسیکا نے منمنا کر کہا۔

''میں نیند سے مر رہی ہوں۔''

''ہمارا جارجیا سے دور نکل جانا ضروری ہے۔ ہماری کار کی تلاش کی اطلاع ٹینیسی میں بھی پولیس کو دے دی گئی ہو

شکار اور شکاری کے مابین کھیلے جانے والے کھیل کا خونی ماجرا

ہر شخص اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق منصوبہ بندی کرتا ہے ...لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر کام ہمیشہ آپ کی سوچوں کے مطابق تکمیل پائے ...کچھ اسی تناظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ کتھا ...جہاں ہر شخص اپنے تئیں ماہرِ فن تھا

سوا سیر

مریم کے خان

گی۔آج شام تک ہم ٹینیسی کراس کرلیں گے اور رات کو کہیں رکیں گے۔''

''اچھا، کہیں کسی ویرانے میں رک جاؤ۔'' اس نے التجا کی۔''اس طرح تو تم کہیں حادثہ کردو گے۔''

میش نے سوچا اور جیسیکا کی بات مان لی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے چند لمحے کے لیے نیند کا جھونکا سا آیا تھا اور وہ ڈرائیونگ سے غافل ہوگیا تھا۔ اس نے کار دائیں طرف نظر آنے والے جنگل کی طرف موڑ لی۔ وہ یہاں آرام سے کچھ وقت گزار سکتے تھے اور کوئی انہیں ہائی وے سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے احتیاطاً کار کی نمبر پلیٹ بدل دی تھی لیکن پھر بھی اسے دھڑکا لگا تھا کہ کہیں پولیس انہیں روک نہ لے۔ اس نے درختوں کے درمیان کار روکی۔ یہاں سایہ تھا ورنہ کھلے میں تو بہت گرمی تھی۔ جولائی کا مہینا وسطی امریکا میں ہمیشہ اذیت ناک حد تک گرم ہوتا ہے۔

میش اور جیسیکا نے ایک بینک میں چوری کی تھی۔ جیسیکا وہاں پر کام کرتی تھی اور میش اس کا محبوب تھا۔ اوائل جوانی سے وہ جرم کی دنیا میں تھا اور جب اس کی جیسیکا سے دوستی ہوئی تو وہ اس کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ لیکن ایک موقعے پر اسے پتا چل ہی گیا۔ میش کو حیرت ہوئی جب جیسیکا نے اس بات پر کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے میش سے کہا۔''میں یہ جانتی ہوں کہ تم میرے محبوب ہو۔ تم کیا کرتے ہو اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔''

پھر میش کو پتا چلا کہ وہ بینک میں کتنی اہم جگہ کام کرتی ہے۔ وہ وہاں پر کیش لاکر روم میں لانے اور لے جانے کی ذمے دار تھی۔ اگرچہ اس کام کے دوران بینک کے دو افسران بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے لیکن کیش نکالنے اور رکھنے کا سارا کام وہی کرتی تھی۔ لاکر کھولنے اور بند کرنے کی ذمے داری ان افسران کی تھی۔ میش نے جیسیکا سے کہا۔

''اگر تم کسی طرح معلوم کرلو کہ لاکر کس طرح کھولا جاتا ہے تو ہم وہاں سے لاکھوں ڈالرز نکال سکتے ہیں۔''

''میں کیسے معلوم کروں؟'' جیسیکا نے سادگی سے کہا۔

''تم غور کرنا کہ تمہارے افسران کس طرح سے لاکر کھولتے ہیں۔''

''چابیوں سے!'' اس نے سادگی سے بتایا۔

''کیا تم ان چابیوں کا نمونہ لے سکتی ہو؟''

''وہ کیسے؟'' جیسیکا پریشان ہوگئی۔''نہیں، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔''

میش نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔''کیا چابیاں انہی کے پاس ہوتی ہیں؟''

''نہیں، شام کو جانے سے پہلے وہ چابیاں منیجر کو دے دیتے ہیں اور وہ انہیں اپنے سیف میں رکھ کر جاتا ہے۔''

''منیجر کا سیف کس طرح کھلتا ہے؟''

''نمبر سے!''

''تم اس کا نمبر حاصل کرسکتی ہو؟''

لیکن جیسیکا اس قسم کے معاملات میں کوری تھی اس لیے میش نے فیصلہ کیا کہ وہ خود یہ کام کرے گا۔ اس نے جیسیکا کی مدد سے بینک کا سارا سیکیورٹی سسٹم معلوم کیا اور ایک رات وہ دونوں وہاں گھسے۔ میش سارا سامان لے کر گیا تھا۔ انہوں نے کیمرے ناکارہ کیے اور پھر گیس کٹر سے منیجر کی تجوری کاٹ کر چابیاں نکالیں۔ اس کے بعد کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ لاکر سے انہیں کوئی ساڑھے سات لاکھ ڈالرز ملے تھے۔ میش اور جیسیکا نے رقم سمیٹی اور وہاں سے رفوچکر ہوگئے۔ وہ اپنی اپنی رہائش پہلے ہی چھوڑ چکے تھے اور انہوں نے شہر میں ایک اور جگہ فرضی نام سے رہائش اختیار کرلی تھی۔ بینک سے وہ سیدھے اسی جگہ گئے۔

انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کچھ عرصہ وہ یہاں خاموشی سے گزاریں گے اور پھر مغربی ریاستوں میں سے کسی ایک کا رخ کریں گے۔ وہاں پر وہ اس رقم سے کوئی کام کرسکتے تھے اور اس کے بعد شادی کرکے اپنا گھر بسا لیتے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب حالات ٹھنڈے پڑ جائیں تو وہ یہاں سے نکلیں گے اور مغرب کی طرف جائیں گے لیکن اس سے پہلے ہی پولیس نے نہ جانے کس طرح ان کا سراغ لگا لیا تھا۔ ساڑھے سات لاکھ ڈالرز سوٹ کیس میں رکھے تھے۔ انہوں نے وہ لیے اور وہاں سے فرار ہوگئے۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ بھی اپنے ساتھ لانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ راستے میں وہ صرف ایک جگہ کھانا لینے اور کار میں گیس ڈلوانے کے لیے رکے۔ اصل میں وہ جس گیس اسٹیشن پر رکے تھے وہاں پر ایک فاسٹ فوڈ شاپ بھی تھی۔ اس سے انہوں نے کھانے پینے کا سامان لے لیا۔

درختوں کے درمیان کار روک کر میش نے پہلے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ یہاں لوگوں کی آمدورفت تو نہیں۔ جب اسے اطمینان ہوگیا تو وہ بھی کار کی فرنٹ سیٹ پر لیٹ کر سو گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ چار گھنٹے بعد دوبارہ روانہ ہو جائیں گے۔ مزید پانچ چھ گھنٹے سفر کرکے وہ ٹینیسی بھی کراس کر جاتے اور پھر کسی موٹیل میں رک کر آرام کرسکتے تھے۔ اس نے موبائل پر الارم لگا لیا تھا اس لیے اس کی آنکھ کھل بھی گئی۔ جیسیکا بے خبر سو رہی تھی۔ میش کو

بھوک لگ رہی تھی اس لیے روانہ ہونے سے پہلے اس نے بسکٹ کا ایک ڈبا کھولا اور جوس کی مدد سے انہیں حلق سے اتارنے لگا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور باہر ہائی وے پر آگیا۔ سورج ڈھلنے سے گرمی میں کسی قدر کمی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر پوری رفتار سے کار کو چلانا شروع کردیا۔ البتہ وہ حدِ رفتار کا خیال بھی رکھ رہا تھا۔ وہ بلاوجہ پولیس کو اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جیسیکا کی آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی اور وہ ٹینیسی کراس کرکے ریاست میسوری میں داخل ہوگئے تھے۔''کیا ہم محفوظ ہوگئے ہیں؟'' اس نے میش سے پوچھا۔

''محفوظ تو ہم اس وقت تک نہیں ہوسکتے جب تک کوئی دوسری شناخت اختیار کرکے کہیں اور آباد نہیں ہو جاتے۔'' میش بولا۔''اب ایسا کرو کہ تم ڈرائیونگ پر آجاؤ، میں بہت تھک گیا ہوں۔''

جیسیکا اس کی جگہ آگئی۔ وہ اس وقت ایک ویران سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ میش کو یہاں بہت سے موٹیل اور سروس اسپاٹ ملے...... اس نے جیسیکا سے کہا۔''اگر کوئی اچھا موٹیل نظر آئے تو رک جانا۔''

میش عقبی سیٹ پر لیٹ گیا۔ جیسیکا ڈرائیونگ کرتی رہی۔ کوئی دو گھنٹے بعد اسے ایک موٹیل نظر آیا۔ تاریکی میں اس کا سائن چمک رہا تھا۔ اس نے میش کو آواز دی۔''اے... ایک موٹیل آگیا ہے۔''

میش سیٹ پر سے اٹھا۔ اتنی دیر میں جیسیکا نے کار موٹیل کی پارکنگ میں روک دی۔ اندر ایک بےزار سا کلرک موجود تھا۔ اس نے ان سے کوئی شناختی چیز نہیں مانگی، بس ستر ڈالرز نقد لے کر انہیں کمرا دے دیا اور ساتھ ہی مطلع کیا کہ اس وقت کھانے کو کچھ نہیں ہے، انہیں صبح ہی ناشتے میں کچھ ملے گا لیکن انہیں بھوک نہیں تھی۔ راستے میں انہوں نے جو لیا تھا وہ اتنا تھا کہ وہ رات تک کھاتے رہے اور باقی خراب ہو جانے کے بعد پھینک دیا۔ کمرا عام سا تھا لیکن بستر آرام دہ تھا اور انہیں اسی کی ضرورت تھی۔ دونوں بے خبر سو گئے۔ صبح میش کی آنکھ کھلی تو جیسیکا نہا رہی تھی۔ اس کے بعد میش نے غسل کیا اور تازہ دم ہوگیا۔ کپڑے ان کے پاس بس یہی تھے جو انہوں نے پہن رکھے تھے اس لیے مجبوری تھی۔ ناشتا کرکے انہوں نے کلرک سے کسی گاڑیوں کے شوروم کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اسی ہائی وے پر آگے ایک شوروم ہے۔

میش نے اس شوروم سے ایک وین خریدی۔ اس نے اپنی کار بیچنے کی حماقت نہیں کی تھی کیونکہ اسی کی مدد سے ان کا

ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

صرف 600 روپے سالانہ بینک ڈرافٹ، پے آرڈر یا منی آرڈر کے ذریعے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نام مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کردیں اور 12 ماہ اپنے گھر کی دہلیز پر اپنی پسند کا پرچہ رجسٹرڈ ڈاک سے وصول کرتے رہیں۔
600 روپے فی پرچہ کے حساب سے آپ ایک سے زائد پرچوں کے لیے یکمشت رقم بھیج کر طویل مدت کے لیے بے فکر ہو سکتے ہیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

اگر آپ کو پرچوں کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے تو مندرجہ ذیل فون نمبر پر رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس: 0301-2454188

سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ جیسیکا کی تصویر پولیس کے پاس تھی اور میش کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس لیے جیسیکا کا حلیہ بدلنا بھی ضروری تھا۔ راستے میں آنے والے ایک سپر اسٹور سے میش نے اپنے اور جیسیکا کے لیے کپڑے اور دوسرا سامان لیا۔ اس نے بعض ایسی چیزیں بھی خریدیں جو ان کے کام آسکتی تھیں۔ وہ وین ڈرائیو کر رہا تھا اور جیسیکا کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ ایک مناسب مقام پر اس نے وین کچے کی طرف موڑ لی۔ یہاں اسے بلندی سے ایک جھیل کی جھلک دکھائی دی۔ جھیل ویران جگہ پر تھی یعنی وہ بنا کسی مداخلت کے اپنا کام کر سکتے تھے۔

پہلے میش نے کار کو خالی کیا اور اس میں اپنی موجودگی کے سارے نشان مٹائے اور پھر اسے ایک ڈھلان والی جگہ لا کر اس کے ہینڈ بریک چھوڑ دیے۔ کار آہستہ آہستہ ڈھلان پر چلتی ہوئی پانی میں اتر گئی اور ذرا دیر بعد وہ پانی میں غائب ہو چکی تھی۔ میش نے ہاتھ جھاڑے۔ ''چلو، چھٹی ہوئی۔ اب کوئی کار کی مدد سے ہمیں تلاش نہیں کر سکتا۔''

''لیکن میری صورت تو ٹی وی پر دکھائی جا رہی ہوگی۔'' جیسیکا بولی۔

''اس کا بھی علاج ہے میرے پاس۔'' میش نے کہا۔ ''لیکن پہلے ہمیں خود کو صاف ستھرا کرنا ہوگا۔''

انہوں نے جھیل میں تیراکی کی اور میش نے شیو بنایا۔ میش نے بال کاٹنے والی قینچی بھی لی تھی۔ اس کی مدد سے اس نے جیسیکا کے بالوں کی کٹنگ کی اور انہیں شولڈر کٹ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے بالوں میں رنگ کیا اور انہیں لائٹ براؤن سے ریڈ گولڈن کر دیا۔ اس سے جیسیکا کی صورت میں خاصی تبدیلی آئی تھی۔ میش نے اس کے لیے اسٹائلش قسم کے سن گلاسز بھی لیے تھے۔ اسے پہننے کے بعد جیسیکا اپنی تصویر سے بہت حد تک مختلف نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے نئے کپڑے پہنے اور جب تیار ہو کر روانہ ہوئے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی نیا جوڑا ہنی مون منانے جا رہا ہے۔

''اب ہم کہاں جائیں گے؟'' جیسیکا نے پوچھا۔

میش نے سپر اسٹور سے ایک نقشہ بھی لیا تھا۔ اس نے نقشہ ڈیش بورڈ پر پھیلایا اور ریاست کولوریڈو کے جنوب مغرب میں واقع ایک چھوٹے سے علاقے میسن پر انگلی رکھی۔ ''اس جگہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے سنا ہے یہ بہت اچھا پکنک اسپاٹ ہے اور لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں لیکن مقامی طور پر زیادہ آباد نہیں ہے۔''

جیسیکا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں لیکن اس کے بارے میں، میں وہاں پہنچ کر ہی بتاؤں گا۔'' میش نے وین اسٹارٹ کی اور وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کولوریڈو کے جنوبی علاقے میں خوش نما چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جو آگے جا کر جنوب کی خشک اور چٹیل چٹانوں سے مل جاتا ہے۔ اس علاقے میں جھیلیں ہیں اور چھوٹے چھوٹے دریا ہیں۔ جنگل ہیں اور ایسے میدان ہیں جن میں تا حدِ نگاہ پھول اور سبزہ ہے۔ موسمِ گرما میں جب اردگرد کے چٹیل پہاڑ اور میدان گرمی سے تپنے لگتے ہیں تو وہاں کے لوگ ان پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور سیاحوں کی آمد سے ان پہاڑوں میں رونق ہو جاتی ہے اور بے شمار ریزورٹس کا کاروبار چلتا ہے۔ ان میں ایک ریزورٹ میلینا کا تھا۔ اس کا نام بھی میلینا ریزورٹ تھا۔ اس جگہ کو میلینا اور اس کا شوہر کارلن مل کر چلا رہے تھے مگر ان کے حالات زیادہ اچھے نہیں تھے۔ کسی زمانے میں جب انہوں نے یہاں ریزورٹ قائم کیا تھا تو یہاں ایک بہت خوش نما سی جھیل تھی لیکن چند سال پہلے زیادہ بارش ہونے سے اس جھیل کا ایک حصہ ٹوٹ گیا اور اس کا پانی بہہ گیا۔ اب اس میں بہت تھوڑا سا پانی رہ گیا تھا اور جو لوگ اس جھیل کی وجہ سے یہاں آتے تھے، انہوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر اس علاقے میں پانی کی کمی سے سبزہ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا اور موسمِ گرما میں دھول اڑنے لگتی تھی۔ ظاہر ہے، دھول مٹی سے بے زار لوگ یہاں آنا کیوں پسند کرتے؟

ان کا بزنس محدود ہوتا جا رہا تھا اور اس سال تو انہیں خسارہ ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا واحد ملازم بھی فارغ کر دیا تھا اور سیزن کے بعد ان کے پاس ریزورٹ میں مرمت کا کام کرانے کی رقم بھی نہیں رہی تھی۔ اس صبح وہ اداس بیٹھے تھے کیونکہ سیزن میں بھی ان کے پاس ایک بھی گاہک نہیں تھا اور درجن سے زیادہ کمرے مکمل طور پر خالی پڑے تھے۔ ناشتے کی میز پر میلینا نے کارلن کو بتایا۔ ''ہمیں بجلی کا بل ادا کرنا ہے جو کافی زیادہ ہے۔''

''مجھے لگ رہا ہے کہ ہمیں یہ جگہ بیچنا پڑے گی۔'' کارلن نے سرد آہ بھری۔ وہ تقریباً پچاس برس کا گنجا اور مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ اس کے مقابلے میں میلینا پینتالیس برس کی ہو کر بھی بہت حسین اور کم عمر لگتی تھی۔

''ہم نے اس جگہ کتنی محنت کی ہے۔'' میلینا افسردہ ہو

گئی۔ ''کارلن! کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا بزنس پھر سے چل پڑے؟''

''اس کی ایک ہی صورت ہے کہ جھیل دوبارہ پہلے جیسی ہو جائے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے، اس کا ٹوٹا ہوا کنارہ پھر سے نہیں بن سکتا۔''

''نہیں، بن تو سکتا ہے لیکن اس کے لیے بہت سارے سرمائے کی ضرورت ہے۔'' کارلن نے بتایا۔ اسی لمحے اس کی نظر ریزورٹ کے مین گیٹ سے اندر آنے والی وین پر مرکوز ہو گئی۔ وین ہوٹل کی عمارت کے سامنے رکی اور اس سے ایک نوجوان جوڑا اترا۔ میلینا جلدی سے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔

''خوش آمدید!'' اس نے مسکرا کر کہا۔

نوجوان جواباً مسکرایا۔ ''ہمیں یہاں ایک کمرا مل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں، اندر آؤ۔'' میلینا ان دونوں کو لاؤنج میں لائی۔ ''ہمارا ڈبل بیڈ لگژری روم خالی ہے۔ تم لوگ دیکھ لو تو وہ بک کر دیتی ہوں۔''

''ہم زیادہ کرایہ نہیں دے سکتے۔'' لڑکی جلدی سے بولی۔

''تم بہت پیاری ہو... تمہارا نام کیا ہے؟''

جیسیکا شرما گئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے میش جلدی سے بولا۔ ''سارا... اس کا نام سارا ہے اور میں مَیش مچل سن ہوں۔ ہم میاں بیوی ہیں۔''

''مجھے میلینا کہتے ہیں اور یہ میرا شوہر کارلن ہے۔ یہ ریزورٹ ہم مل کر چلا رہے ہیں... اور تم کرائے کی فکر مت کرو۔ ہم بہت مناسب کرایہ لیتے ہیں۔''

کارلن نے اندازہ لگایا۔ ''شاید تم لوگ ہنی مون منانے نکلے ہو؟''

''ہاں، ہم ہنی مون منانے کے لیے یہاں آئے ہیں۔'' میش نے جلدی سے کہا۔

میلینا انہیں کمرا دکھانے لے گئی۔ وہ انہیں پسند آیا اور کرایہ بھی مناسب لگا۔ کمرا بک کرا کے وہ سامان اندر لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میلینا نے کارلن سے کہا۔ ''ایک بات ہے، مجھے یہ میاں بیوی نہیں لگ رہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' کارلن بولا۔ ''ان کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

''وہ تو کرتے ہیں لیکن پھر بھی یہ مجھے میاں بیوی نہیں لگتے، ان کا انداز تو الگ ہی ہوتا ہے۔''

اندر کمرے میں جیسیکا سامان نکال کر الماری میں رکھ رہی تھی۔ اس نے میش سے کہا۔ ''ہمیں یہ کمرا بہت کم کرائے پر نہیں مل گیا؟''

''میرا اندازہ ہے کہ ان کا بزنس نہیں چل رہا ہے۔ ورنہ اس وقت سیزن ہے اور ریزورٹ کو مکمل طور پر نہیں تو کم سے کم معمول کے مطابق بھرا ہونا چاہیے تھا اور یہاں پارکنگ خالی پڑی ہے۔''

جیسیکا نے سامان رکھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ ''واہ...! کتنا خوبصورت منظر ہے۔''

میش اس کے برابر میں آیا اور عقب سے اس کے گرد بازو حمائل کر دیے۔ ''ہاں لیکن جھیل میں پانی بہت کم ہے۔''

''آؤ، دیکھ کر آتے ہیں۔'' جیسیکا بولی۔

انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور باہر آئے۔ وہ ڈالرز والے سوٹ کیس سے بے پروائی نہیں برت سکتے تھے۔ پہلے جھیل کی سطح یقیناً بلند تھی کیونکہ اس کے کنارے بوٹ ہاؤس تھا اور اب پانی اس بوٹ ہاؤس اور اس کے تختوں سے کوئی تیس فٹ نیچے چلا گیا تھا۔ میش نے جھیل کے ٹوٹے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ دیکھو... اس وجہ سے جھیل میں پانی جمع نہیں ہو پاتا۔''

''ہاں، پچھلے دنوں پورے وسطی امریکا میں بہت بارشیں ہوئی ہیں۔ اگر یہ کنارہ نہ ٹوٹا ہوتا تو اس وقت جھیل پانی سے بھری ہوتی۔'' جیسیکا بولی۔ ''شاید اسی وجہ سے ان کا بزنس نہیں چل رہا۔ جھیل ختم ہوئی تو لوگوں نے آنا بند کر دیا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' عقب سے میلینا کی آواز آئی۔ وہ ان سے کچھ دور کھڑی تھی۔ ''اس جھیل نے خشک ہو کر ہمیں برباد کر دیا۔ لوگ اسی کی وجہ سے یہاں آتے تھے اور جب یہ نہیں رہی تو لوگوں نے بھی یہاں آنا چھوڑ دیا۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' میش نے کہا۔ ''یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟''

''زیادہ بارش کے بعد جھیل اوورفلو ہو گئی تھی اور اس کا یہ کنارہ ٹوٹ گیا۔'' میلینا انہیں بتانے لگی۔ ذرا سی دیر میں وہ ان سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ ان سے دوپہر کے کھانے کا پوچھنے آئی تھی۔ انہوں نے اپنی پسند بتائی تو میلینا نے دعویٰ کیا۔ ''تم لوگ میرے ہاتھ کے بنے کھانے کھا کر کبھی نہیں بھولو گے۔''

میلینا کھانا بنانے چلی گئی اور کارلن انہیں ریزورٹ کی سیر کرانے لگا۔ میش کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اتنی اچھی جگہ صرف جھیل کے ختم ہونے سے برباد ہو رہی تھی۔

☆☆☆

جارج نے سڑک کے کنارے اس بورڈ کو دیکھا۔

''میلینا ریزورٹ۔'' اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اس کے ساتھ جوشیو اور میگنا تھی۔ وہ تینوں جرائم پیشہ تھے اور ابھی دو دن پہلے انہوں نے ایک جوڑے کو ہائی وے پر لوٹنے کے دوران مزاحمت کرنے پر ہلاک کر دیا تھا۔ مرد کو جارج نے گولی ماری تھی اور اس کی ساتھی عورت کو میگنا نے شوٹ کر دیا تھا۔ سفاکی میں وہ اپنے ساتھی لڑکوں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ وہ آوارہ گرد تھے اور گزشتہ دو سال سے ایک ساتھ تھے۔ پہلے ان کا ایک ساتھی مارکر بھی تھا لیکن وہ ایک ڈکیتی کے دوران مارا گیا تھا۔ تینوں کی عمریں بائیس سے پچیس برس کے درمیان میں تھیں۔ اپنے تازہ جرم کے بعد انہوں نے کچھ عرصے کے لیے کہیں چھپ جانا مناسب سمجھا کیونکہ ہائی وے پولیس ذرا شدت سے حرکت میں آگئی تھی اور ان کی تلاش جاری تھی اس لیے وہ اس علاقے کی طرف آنکلے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ہزاروں سیاحوں کی موجودگی میں کوئی خاص طور سے ان پر توجہ نہیں دے گا۔ میگنا نے تائید کی۔ ''یہیں چلتے ہیں۔''

جارج نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔ یہ ایک کھٹارا سی فورڈ کار تھی اور خاصا پرانا ماڈل تھا۔ چلنے کے دوران اس کے مختلف حصوں سے آوازیں آتی تھیں۔ لوٹ کے مال سے انہیں تقریباً دو ہزار ڈالرز ملے تھے۔ اگر انہیں اس سے زیادہ رقم ملتی تو وہ اس علاقے سے دور کہیں چلے جاتے۔ پارکنگ میں انہوں نے کار روکی۔ وہیں ایک وین کھڑی تھی جو ان کی کار سے ہزار درجہ بہتر حالت میں تھی۔ جوشیو نے سیٹی بجائی۔

''وین اچھی ہے کیا خیال ہے؟''

''ابھی تو ہم رکنے آئے ہیں۔'' جارج اترتے ہوئے بولا۔ ''بعد میں دیکھیں گے۔''

میگنا نے نیچے اتر کر دیکھا۔ ''یہاں ویرانی ہے۔ لگتا ہے ان لوگوں کا بزنس اچھا نہیں چل رہا۔''

''اچھی بات ہے، زیادہ بھیڑ مسئلہ کرتی ہے۔'' جارج عمارت کی طرف جانے لگا، وہ اس کے پیچھے آئے۔ میلینا کاؤنٹر پر کھڑی تھی اور اس نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ آنے والے تینوں افراد اچھے نہیں ہیں لیکن وہ بہرحال گاہک تھے۔ اس نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔

''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

جارج نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم خدمت کرنے کی عمر سے تقریباً گزر چکی ہو۔ بہر حال، ہمیں دو کمرے چاہئیں... ایک سنگل اور ایک ڈبل!''

میلینا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت کارلن وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے برداشت سے کام لیا۔ ''کمرے ہیں، تم لوگ کتنے دن ٹھہرنا پسند کرو گے؟''

''یہ ہم نے ابھی طے نہیں کیا ہے۔'' میگنا آگے آکر بولی۔

''او کے! تب تم دو دن کا کرایہ ادا کر دو، باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

جارج نے اسے کرایہ ادا کیا اور اپنے نام لکھوا دیے جو جعلی تھے۔ میلینا نے ان سے ڈرائیونگ لائسنس طلب نہیں کیا تھا ورنہ انہیں اور کوئی جھوٹ بھی بولنا پڑتا۔ میلینا انہیں کمرے دکھانے لائی۔ یہ سامنے کی طرف والے سستے کمرے تھے۔ اس نے کھانے کے بارے میں پوچھا۔

''ہمیں کھانے کے لیے نہیں، پینے کے لیے کچھ چاہیے۔'' جارج نے اشارہ کیا۔

''سوری! آج کل بار بند ہے۔ تم لوگوں کو کمرے میں مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، تب ایک اسکاچ وھسکی بھیج دینا۔''

جارج نے اسے رقم دی۔ میلینا کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ ''یہ جگہ اچھی ہے۔ اگر ہمیں زبردستی بھی کرنا پڑی تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

جوشیو آہستہ سے بولا۔ ''کیا خیال ہے، جاتے ہوئے ان پر بھی ہاتھ صاف نہ کر جائیں؟''

''نہیں، جب تک کوئی بڑا چانس نظر نہ آئے، کوئی حرکت نہیں کرنی ہے۔'' جارج سخت لہجے میں بولا۔ ''میں پولیس کو متوجہ کرنے والا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔''

''میں ذرا ہوٹل کا معائنہ کر آؤں۔'' میگنا بولی اور باہر نکل گئی۔ جارج نے کمرے میں رکھا ٹی وی آن کر لیا۔ جب میلینا انہیں وھسکی دینے آئی تو ٹی وی پر ہائی وے پر قتل ہونے والے جوڑے کے بارے میں بتایا جارہا تھا۔ پولیس اب تک ان کے قاتلوں کو تلاش نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

''تم لوگ جھیل کے اس کنارے کو دوبارہ تعمیر کیوں نہیں کر لیتے؟'' میش نے کارلن سے کہا۔

''ضرور کر لیتا اگر میرے پاس دو لاکھ ڈالرز ہوتے۔'' کارلن نے جواب دیا۔ ''اگر اس وقت ہمیں جھیل کی اہمیت کا درست اندازہ ہو جاتا تو ہم کہیں نہ کہیں سے دو لاکھ ڈالرز کر

لیے لیکن بعد میں حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ بینکوں نے بھی قرض دینے سے انکار کر دیا۔''

''تم نے کہیں اور سے سرمایہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''اصل میں اس علاقے میں سرمایہ کاروں کے پاس سرمایہ لگانے کے لیے ریزورٹس کم نہیں ہیں جو منافع میں چل رہے ہیں اس لیے کوئی اس ڈوبتے ہوئے ریزورٹ میں سرمایہ کیوں لگائے گا؟''

وہ لوگ ابھی جھیل کے پاس تھے کہ انہیں ہوٹل کی طرف سے ایک نوجوان اور دل کش لڑکی آتی نظر آئی۔ کارلن خوش ہو گیا۔ ''لگتا ہے تم لوگوں کا آنا ہمارے لیے خوش قسمتی بن گیا ہے۔''

''ہائے!'' لڑکی پاس آکر بولی۔ ''مجھے جولی کہتے ہیں۔ ہم ابھی ہوٹل میں آئے ہیں۔''

''ہائے!'' میش بولا۔ اس پر جیسیکا نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ اسے یہ لڑکی اپنے اطوار سے آوارہ لگ رہی تھی۔ کارلن بولا۔

''خوش آمدید... میں کارلن ہوں میلینا کا شوہر!''

میگنا نے دلچسپی سے میش کو دیکھا پھر لہراتی اور بل کھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ جیسیکا نے اسے زیر لب گالی دی۔ کچھ دیر بعد میلینا نے دوپہر کا کھانا تیار ہونے کا اعلان کیا تو وہ اندر آگئے۔ کھانا واقعی لاجواب تھا۔ کھانے کے بعد میش اور جیسیکا آرام کرنے چلے گئے۔ کارلن نے میش سے کہا کہ وہ شام کو اسے نزدیکی جنگل میں چکور دکھانے لے جائے گا۔ جیسیکا سو رہی تھی اس لیے میش خود باہر چلا گیا۔ شام ہونے پر موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ اتفاق سے دو پارٹیاں اور آگئی تھیں اور کارلن مصروف تھا اس لیے اس نے معذرت کر لی۔

''میں کل ضرور چلوں گا۔'' اس نے میش سے کہا۔ انہوں نے پہلے ہی ہفتے بھر رکنے کا اعلان کر دیا تھا۔ ''ابھی تو تم خود گھوم پھر کر دیکھ لو۔''

میش جھیل کی طرف آیا۔ ایک طرف سے نیچے اترنے کا راستہ تھا۔ وہ نیچے تک آیا تو اسے شفاف نیلگوں پانی اتنا اچھا لگا کہ اس نے کپڑے اتار کر ایک طرف رکھے اور مختصر نیکر میں پانی میں کود گیا۔ پانی سرد اور گدگدانے والا تھا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ کوئی اور بھی اوپر سے نیچے آیا ہے اور جب جھیل میں چھپا کا ہوا تو وہ چونکا، کوئی پانی میں کودا تھا۔ اس نے پر تجسس نظروں سے اس دائرے کی طرف دیکھا جو پانی میں بن گیا تھا لیکن اس جگہ کے بجائے میگنا اچانک اس کے پاس

بیرونِ ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ، ماہنامہ سسپنس

ماہنامہ پاکیزہ ، ماہنامہ سرگزشت

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک میل
اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ایشیا، یورپ اور افریقہ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرِ سالانہ 4500 روپے یا 65 امریکی ڈالر

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرِ سالانہ 5500 روپے یا 80 امریکی ڈالر

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، درج ذیل پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرونِ شہر ادائیگی کی صورت میں کوریئر چارجز اور بینک کمیشن کے 600 روپے اور بیرونِ ملک ادائیگی والے ڈرافٹ وغیرہ پر اس مد میں 20 امریکی ڈالر کا اضافہ کرلیں

رابطے کے لیے

ثمر عباس: 0301-2454188

یا

بدرالدین سرکولیشن منیجر
فون نمبر 5802552,5804200(21)(92)
فیکس نمبر 5802551 (21)(92)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
E-MAIL :JDPGROUP@HOTMAIL.COM

سے نکلی تو وہ بری طرح بدک گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔ ''تم ڈر گئے؟''

''نہیں تو...'' میش جھینپ گیا اور پھر یہ محسوس کر کے کسی قدر بدحواس ہو گیا کہ میکنا کا بھرپور جسم لباس کی قید سے آزاد ہے۔ اس نے جلدی سے کنارے کا رخ کیا۔ میکنا نے عقب سے پکارا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''میں کافی دیر سے تیر رہا تھا، اب تھک گیا ہوں۔'' میش نے مڑے بغیر جواب دیا۔ وہ کنارے پر چڑھا اور جلدی جلدی اپنے کپڑے پہننے لگا۔

☆☆☆

جیسیکا کی آنکھ کھلی تو میش کمرے میں نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر باہر آئی۔ پھر اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ جھیل کی طرف آئی، تب اس نے میش کو کنارے پر جلدی جلدی لباس پہنتے دیکھا اور پھر اس کی نظر جھیل میں تیرتی جولی پر گئی۔ اس نے لباس نہیں پہن رکھا تھا۔ جیسیکا کو لگا جیسے اس کے اندر کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی ہو۔ وہ جلدی سے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ غصے سے بند کیا اور اوندھے منہ بستر پر گر کر رونے لگی۔ اس دوران میں اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی لیکن اس نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کے کچھ دیر بعد دوبارہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اسے میش کی آواز سنائی دی۔

''دروازہ کیوں کھلا ہے؟''

جیسیکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اوندھے منہ لیٹی رہی۔ اسے ایک لمحے کو خیال آیا کہ جب میش اب آیا ہے تو کچھ دیر پہلے دروازہ کھلنے کی آواز کہاں سے آئی تھی؟ لیکن غصے میں اس نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ میش پریشان ہو کر اس کی طرف آیا۔ ''جیسیکا! کیا بات ہے، تم ٹھیک ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے برہمی سے کہا۔ ''تم کہاں تھے؟''

''میں باہر تھا لیکن تم نے دروازہ کیوں کھلا چھوڑا ہے؟'' میش برہمی سے بولا۔ ''یہ بالکل غیر محفوظ ہے۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔'' جیسیکا اٹھ بیٹھی۔ ''تم مجھے سوتا چھوڑ کر نکل گئے اور اس ذلیل لڑکی کے ساتھ تیرا کی کر رہے تھے۔''

میش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ''جیسی... تم نے جو دیکھا، وہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''اب تم میری آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلاؤ گے؟'' جیسیکا زہریلے لہجے میں بولی۔

''کیا تم میری بات بھی نہیں سنو گی؟'' میش نے چلا کر کہا۔ اسے غصہ آ گیا تھا۔ جیسیکا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

جارج بوتل ختم کر کے اس کا سرور لے رہا تھا۔ جوشیو اور میکنا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اچانک ہی جوشیو اندر آیا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر جارج چونک گیا۔ ''کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہوا ہے؟''

''نہیں۔'' جوشیو اس کے پاس آیا۔ ''میرے پاس ایک بڑی خبر ہے۔''

''کیا خبر ہے؟'' جارج دوبارہ لیٹ گیا۔

''یہ جو جوڑا یہاں ٹھہرا ہوا ہے، اس کے پاس بہت بڑی رقم ہے۔''

''کتنی رقم ہے؟'' جارج نے اب بھی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

''لاکھوں ڈالرز... میں نے خود دیکھا ہے۔''

اس بار جارج چونک گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

جوشیو جلدی جلدی بتانے لگا۔ وہ باہر نکلا تھا۔ کچھ دیر گھومتا رہا اور پھر کمرے کی طرف آ رہا تھا کہ اس نے جیسیکا کو اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر جاتے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ میش پہلے ہی باہر ہے۔ اس نے سوچا کہ ایک نظر کمرے پر ڈال لے، ممکن ہے کوئی کام کی چیز مل جائے۔ وہ اندر گھسا اور اس نے جلدی جلدی کمرے کی تلاشی لینا شروع کی۔ پہلے اس نے درازیں دیکھیں پھر الماری کا جائزہ لیا لیکن اسے کہیں بھی رقم یا کوئی قیمتی چیز نظر نہیں آئی۔ وہ مایوس ہو کر جانے والا تھا کہ اسے ایسے ہی خیال آ گیا اور اس نے بستر کے نیچے دیکھ لیا۔ اسے وہاں پر ایک سوٹ کیس نظر آیا۔ اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ لاک تھا۔ پھر اس نے اپنے پاس موجود ایک تار کی مدد لی۔ جوشیو تار اور مڑے ہوئے کلپ کی مدد سے کوئی بھی تالا کھول لیا کرتا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے تالا کھول لیا اور یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ سوٹ کیس اوپر تک نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

اچانک اسے دروازے پر آہٹ سنائی دی تو اس نے پھرتی سے سوٹ کیس بند کر کے واپس نیچے کیا اور کسی کو اندر آتے محسوس کر کے خود بھی بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ اس نے پیروں سے اندازہ لگایا کہ لڑکی اندر آئی تھی اور بستر پر گر کر رونے لگی تھی۔ اس کی گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی تھیں۔ جوشیو ہمت کر کے نکلا اور پھر کمرے سے نکل بھاگا۔ باہر آتے ہی

اس نے لڑکے کو اپنے کمرے کی طرف آتے دیکھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ لڑکے نے اسے اپنے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔

جارج نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اس میں سے آدھی بوتل تم نے پی ہے... کہیں یہ اسی کا نتیجہ تو نہیں ہے؟''

جوشیو قسمیں کھانے لگا کہ اس نے سچ کہا ہے اور اس نے خود اپنی آنکھوں سے نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس دیکھا ہے۔ اس میں ساری سو اور پچاس ڈالرز کے نوٹوں والی گڈیاں تھیں اور ان کی تعداد کسی طرح بھی سو سے کم نہیں ہے۔ جوشیو نے کہا۔ ''میری بات کا یقین کرو۔''

جارج کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ ہمارے دن بدلنے والے ہیں۔''

''کاش! میں وہ سوٹ کیس لانے میں کامیاب ہو جاتا۔''

''اگر تم ایسا کرتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔ اس وقت ایسے کسی کام کا نتیجہ یہ نکلتا کہ شک سیدھا ہم پر جاتا۔ پولیس آ جاتی اور ہمارا پول کھل جاتا۔''

''تب ہم کیا کریں... وہ سوٹ کیس کس طرح حاصل کریں؟''

''صبر سے میرے دوست!'' جارج نے اسے تسلی دی۔ ''ہم یہ کام آرام سے کریں گے۔ ابھی تو ان لوگوں کی نگرانی کرو۔''

کچھ دیر بعد میکنا بھی آ گئی اور جوشیو نے اسے بتایا تو وہ بھی پُرجوش ہو گئی۔ اس نے جارج سے کہا۔ ''ہمیں آج رات ہی یہ کام کرنا چاہیے۔''

''ابھی نہیں، ہوٹل میں کچھ لوگ اور بھی آ گئے ہیں۔''

''نہیں، وہ عارضی طور پر آئے تھے۔ اب واپس جا رہے ہیں۔'' میکنا نے بتایا۔

''پھر بھی ہمیں رات تک دیکھنا چاہیے۔''

ان کے درمیان طے ہوا کہ اگر رات تک کوئی اور نہیں آیا تو وہ کارروائی کر کے رقم والا سوٹ کیس لے کر فرار ہو جائیں گے۔ میکنا نے مشورہ دیا۔ ''انہیں قتل کر دیتے ہیں۔''

''نہیں، اس میں خطرہ ہے۔'' جارج نے اختلاف کیا۔ ''ہم انہیں باندھ کر ڈال جائیں گے۔''

☆☆☆

میش بڑی مشکل سے جیسیکا کو منا پایا تھا۔ اس نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس نے جو دیکھا تھا، اس میں سراسر ہاتھ اس لڑکی کا تھا۔ جیسیکا نے اسے گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال لی۔ اس نے میش سے کہا۔ ''اگر یہ لوگ مزید یہاں ٹھہرے تو ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔''

''میں تو مستقل یہاں رہنے کا سوچ رہا ہوں۔'' میش بولا تو جیسیکا چونک گئی۔

''کیا مطلب؟''

''دیکھو، ان لوگوں کو رقم کی ضرورت ہے۔ اگر یہاں رقم لگ جائے اور جھیل پھر سے بن جائے تو ریزورٹ چل سکتا ہے کیونکہ یہ موقعے کی جگہ ہے۔ ہم یہاں محفوظ بھی رہیں گے اور کمائی کا ایک ذریعہ بھی بن جائے گا۔''

جیسیکا کو بھی یہ خیال اچھا لگا۔ جگہ تو اسے بھی پسند آئی تھی اور اس سے قبل ایک بار وہ بھی ایک موٹیل میں کام کر چکی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ کام کتنا نفع بخش ہے لیکن اس لڑکی کا سوچ سوچ کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ آخر اس نے کیا سوچ کر میش کو رجھانے کی کوشش کی تھی۔ میش نے اسے تسلی دی۔

''یہ لوگ جلد یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ ہماری سرمایہ کاری قبول کر لیں گے؟''

''اس وقت یہ اتنی مشکل میں ہیں کہ شیطان بھی پیش کش کرے تو یہ اس کی پیش کش بھی قبول کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے، تب تم ان سے بات کر کے دیکھو۔''

شادی کے چھ ماہ بعد میاں بیوی میں پہلا جھگڑا ہوا۔ غصے سے بے قابو ہو کر شوہر نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا پہلا گھونسا رسید کیا۔ اتفاق سے پادری صاحب وہاں سے گزر رہے تھے انہوں نے کھڑکی سے گھونسا پڑتے دیکھا تو فوراً دوڑے بیچ بچاؤ کے لیے۔

شوہر نے دیکھا کہ پادری صاحب گھر میں آ گئے ہیں تو سنبھل کر اس نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا گھونسا نمبر دو رسید کیا اور گرج دار آواز میں بولا۔ ''اب بھی چرچ جانے سے انکار کرو گی؟''

نماز کے بعد ایک نوجوان اللہ کے حضور ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''یا اللہ تو نے لڑکیوں کو پیدا کیا۔ واہ واہ، تیری اس حسین تخلیق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ تو نے لڑکیوں کو نرم و نازک جسم دیے، واہ واہ۔ زبان تیری تعریف سے قاصر ہے۔ تو نے لڑکیوں کو پُراسرار اور پرکشش آنکھیں عطا کیں۔ واہ واہ، قربان جاؤں تیری بخشش و عطا کے... مگر اللہ، اے اللہ، تو نے لڑکیوں کو زبانیں مرحمت فرمائیں۔ آہ آہ، لڑکیوں نے ان زبانوں سے اپنی ساری دلکشی اور رعنائی کو ملیامیٹ کر ڈالا ہے۔''

جیسیکا بولی۔ ''اور ہاں... اس سوٹ کیس کو کسی جگہ محفوظ کر دینا چاہیے۔ اسے یہاں رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں ابھی جا کر کارلن سے بات کرتا ہوں۔ ممکن ہے، ان کا کوئی سیف ہو جس میں یہ چیزیں رکھتے ہوں۔''

کارلن اسے لان میں درختوں کی چھٹائی کرتا نظر آیا۔ میش نے اس سے پہلے سیف کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں، سیف ہے۔ کیا تم نے کوئی چیز رکھوانی ہے؟''

میش نے ہچکچا کر جواب دیا۔ ''ہاں، ہمارے پاس ایک سوٹ کیس ہے، وہ رکھوانا ہے۔''

''ایک منٹ... میں یہ کام کرلوں پھر چلتے ہیں۔''

''کیا تمہارے پاس کوئی ملازم نہیں ہے؟''

''دو سال پہلے تک ہمارے پاس تین ملازم تھے لیکن جیسے جیسے حالات خراب ہوتے گئے، ہم انہیں فارغ کرتے رہے۔ اب کوئی ملازم نہیں ہے۔'' کارلن نے ٹھنڈی سانس لی۔

اپنا کام کر کے کارلن اس کے ساتھ اندر آیا۔ میش جا کر سوٹ کیس لے آیا تھا۔ کارلن نے سوٹ کیس لے کر اسے اپنے دفتر میں موجود سیف میں رکھ دیا اور اسے رسید دے دی کیونکہ میش نے اسے صرف سوٹ کیس دیا تھا، رقم کا نہیں بتایا تھا اس لیے اس نے صرف سوٹ کیس کی رسید دی تھی۔ میش کو یہ لوگ ایسے نہیں لگ رہے تھے جو اپنے گاہکوں کو دھوکا دیں۔ اس نے کارلن سے کہا۔ ''میں تم سے کچھ کاروباری گفتگو کرنا چاہتا ہوں، کون سا وقت زیادہ موزوں رہے گا؟''

کارلن نے اسے غور سے دیکھا۔ ''میں رات گیارہ بجے تک فارغ ہو جاتا ہوں لیکن اگر تم اس ریزورٹ کے متعلق کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو اس کی اصل مالک میری بیوی ہے۔ میں صرف اس کا شریک کار ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تب میں تم دونوں سے بات کرنا چاہوں گا۔'' میش نے جواب دیا۔

''تم دونوں رات کو ہمارے پورشن میں آجانا۔'' کارلن بولا۔ ''بزنس کی بات بھی ہو جائے گی اور ایک ایک کپ چائے بھی پی لیں گے۔''

''میں اور جیسیکا آئیں گے۔'' میش نے اس کی دعوت قبول کرلی۔

وہ لاؤنج میں آگیا جہاں میلینا دن میں آنے والے گاہکوں کے کھانے کے حساب کتاب میں الجھی ہوئی تھی۔ یہ لوگ بس دن کے لیے آئے تھے۔ اس نے میش سے رات کے کھانے کا پوچھا۔

''کوئی ہلکی پھلکی چیز بنا لینا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے اور جیسیکا دونوں کو رات بھاری کھانے کی عادت نہیں ہے۔''

''چائنیز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اچھا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن میں شوق سے نہیں کھاتا... البتہ جیسیکا شوق سے کھاتی ہے۔''

''بس تو میں نوڈلز سوپ اور میکرونی بنالوں گی۔ مجھے بھی آسانی رہے گی۔ اب کام کرنے کی عادت نہیں رہی ہے۔ زیادہ لوگ آجائیں تو تھک جاتی ہوں۔''

میش مسکرایا۔ ''لیکن آج رات ہم تمہارے ہاں گیارہ بجے چائے پر مدعو ہیں۔''

''کیا کارلن نے دعوت دی ہے؟ وہ چائے بہت اچھی بناتا ہے۔''

''ہاں لیکن دعوت اس نے نہیں دی ہے۔ باقی بات وہ تمہیں بتائے گا۔'' میش نے کہا اور کمرے کی طرف چل پڑا۔ اسے راہداری میں میکنا نظر آئی اور وہ اسے دیکھ کر نشیلے انداز میں مسکرائی لیکن وہ اسے نظرانداز کر کے کمرے میں آگیا۔ جیسیکا بیڈ پر لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ میش اس کے پاس بستر پر گر گیا۔

''میں نے کارلن سے بات کرلی ہے۔''

''اس کا کیا ردِعمل ہے؟''

''اس نے ہمیں رات کو چائے پر بلایا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ تقریباً راضی ہے۔'' جیسیکا یقین سے بولی۔ پھر اس نے جوش سے کہا۔ ''میش! اگر ہماری بات ہوگئی تو ہم اسی جگہ اپنا گھر بنالیں گے۔''

میش مسکرایا۔ ''میں نے جگہ بھی سوچ لی ہے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر!''

ان کے پاس دولت تھی اور وہ مستقبل کے خواب دیکھنے کی استعداد رکھتے تھے۔ نو بجے میلینا نے انہیں کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ وہ ڈائننگ روم میں آگئے۔ میلینا نے چائنیز بھی بہت اچھا بنایا تھا۔ انہوں نے رغبت سے کھایا اور اس کے بعد انہوں نے شیری منگوائی۔ میلینا کے پاس شراب کا اچھا ذخیرہ تھا۔ دس بجے وہ کمرے میں واپس آگئے۔ جیسیکا نے زیادہ پی لی تھی اور اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے میش سے کہا۔ ''ایسا کرو تم چلے جانا لیکن جو بات بھی کرنا پوری ہوشیاری سے کرنا۔ انہیں ہمارے ماضی کے بارے میں کچھ پتا نہ چلے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' میش نے کہا اور وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھنے لگا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ کمرے سے نکلا۔ اس نے کمرا لاک کر دیا تھا۔ وہ میلینا اور کارلن والے پورشن میں آیا۔ وہ ہوٹل کے دائیں جانب اپنے تین کمروں کے پورشن میں رہتے تھے اور اس کا راستہ لاؤنج میں ڈیسک کے عقب سے بھی نکلتا تھا اور باہر لان میں بھی ایک دروازہ کھلتا تھا۔ میش، ڈیسک والے راستے سے ان کے پورشن میں پہنچا۔ کارلن اسے اپنے سٹنگ روم میں لے آیا۔ اس نے چائے تیار کرلی تھی اور اسے بسکٹ کے ساتھ سرو کی۔

''میرے آباؤ اجداد لندن سے آئے تھے اور چائے نوشی ہمارے خمیر میں شامل ہے۔''

کچھ غیر متعلقہ باتوں کے بعد میش کام کی بات کی طرف آیا۔ ''میں تمہارے اس ریزورٹ میں سرمایہ لگانا چاہتا ہوں۔''

میلینا اور کارلن دونوں سنجیدہ تھے۔ میلینا نے کہا۔ ''اور اس کے عوض تمہاری کیا شرائط ہوں گی؟''

''کچھ نہیں۔'' میش نے سادگی سے کہا۔ ''میں جتنا سرمایہ لگاؤں گا، اس کا تم لوگ مجھے نفع دو گے اور میں جتنا کام کروں گا اس کا معاوضہ دو گے۔''

کارلن اور میلینا نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں سرمایہ لگاؤں گا اور ہم طے کرلیں گے کہ تم مجھے اس پر سال میں اتنا نفع دو گے۔ میں اور جیسیکا یہاں کام بھی کریں گے۔ اس کا تم لوگ ہمیں معاوضہ دینا۔''

''تم کتنا چاہتے ہو سال میں؟''

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کو کتنی رقم کی ضرورت ہے؟''

''ہمیں تین لاکھ ڈالرز درکار ہیں۔'' میلینا بولی۔

''اب دیکھو، تمہیں کوئی بینک یا کوئی سرمایہ کار یہ رقم نہیں دے رہا ہے لیکن میں دے رہا ہوں اس لیے میں نفع زیادہ لوں گا۔''

میلینا اور کارلن کے چہرے اتر گئے۔ میلینا نے آہستہ سے پوچھا۔ ''تم کتنا نفع لو گے؟''

''نو فیصد!'' میش نے کہا۔ ''ہر سال شرح منافع میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔''

کارلن نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ''تم نو فیصد مانگ رہے ہو، ہم تو بینک کو دس فیصد دینے کو تیار تھے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ میں کم مانگ رہا ہوں۔'' میش نے کہا۔ ''لیکن اس کے ساتھ میری ایک شرط ہے۔''

آغازِ محبت

ایک عورت سے اس کی سہیلی نے پوچھا۔ ''یہ تو بتاؤ پہلے پہل اپنے دوسرے شوہر سے ملاقات کیسے ہوئی۔''

عورت نے جواب دیا۔ ''بڑا رومانی انداز تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ سڑک پار کر رہی تھی کہ اتنے میں ایک کار بڑی تیزی سے میرے شوہر کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ کر رک گئی۔ یہ میرے دوسرے شوہر کی کار تھی۔ اور وہی لمحہ ہماری دوستی اور محبت کا آغاز بن گیا۔''

پانچ دن

ایک نئی نویلی دلہن سے اس کی سہیلی نے پوچھا۔ ''تمہارے پریتم سوتے میں خراٹے لیتے ہیں یا نہیں۔''

دلہن نے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں۔ ابھی ہماری شادی کو پانچ ہی دن تو ہوئے ہیں۔''

''دیکھا، تم نے شرط لگا دی نا۔'' میلینا چمک کر بولی۔

''ہاں لیکن اس شرط کا بزنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اور وہ شرط کیا ہے؟''

''شرط یہ ہے کہ تم ہمارے ماضی کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' میش نے سنجیدگی سے کہا۔

کارلن اور میلینا چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

جارج، جوشیو اور میکنا تیار تھے۔ ان کے پاس تین عدد پستول اور ایک شاٹ گن تھی۔ اگرچہ شاٹ گن کی ضرورت نہیں تھی لیکن انہوں نے اسے بھی نکال لیا تھا۔ جارج نے ان سے کہا۔ ''ہم ان سب کو باندھ کر ڈال دیں گے لیکن اس طرح کہ کوئی انہیں کھول نہ سکے۔''

''انہیں کسی کمرے میں بند کر دیتے ہیں۔'' میکنا نے تجویز دی۔ ''تاکہ اگر یہ خود کو کھول لیں، تب بھی باہر نہ جاسکیں۔''

''اگر ہمیں چوبیس گھنٹے مل جائیں تو ہم یہاں سے کوئی بارہ سو میل دور جاسکتے ہیں۔'' جوشیو نے کہا۔

''ہم یہاں سے نیویارک جائیں گے۔'' جارج بولا۔

وہ انتظار کر رہے تھے کہ بارہ بجیں تو وہ اپنی کارروائی شروع کریں۔ انہیں علم نہیں تھا کہ میش، کارلن اور میلینا کے پورشن میں ہے۔ بارہ بجتے ہی وہ کمرے سے نکلے اور میکنا نے میش اور جیسیکا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ

بار دستک دینے پر اندر سے جیسیکا نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' میگنا نے جواب دیا۔

جیسیکا کا دماغ میگنا کی آواز سن کر آؤٹ ہوگیا تھا کہ اس کی یہ جرأت... وہ غصے سے بھنا کر اٹھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تو فوراً ہی ایک پستول اس کے سینے سے آلگا۔ میگنا مسکرا رہی تھی۔ ''آواز نہ نکلے۔'' وہ بولی اور اسے اندر دھکیل دیا۔ وہ تینوں اس کے پیچھے گھس آئے تھے۔ جارج نے کمرا دیکھا اور بولا۔

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

''وہ باہر گیا ہے۔'' جیسیکا بولی۔ اس اچانک افتاد نے اسے پریشان کردیا تھا۔ ''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

جوشیو نے پہلے باتھ روم میں دیکھا پھر بیڈ کے نیچے جھانکا اور بدحواس ہوکر بولا۔ ''سوٹ کیس یہاں نہیں ہے۔''

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں انہوں نے سارا کمرا کھنگال لیا تھا، سوٹ کیس وہاں نہیں تھا۔ جارج نے جیسیکا کی طرف دیکھا۔ ''سوٹ کیس اور وہ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم... سوٹ کیس بھی وہی لے گیا ہے۔''

جارج نے جوشیو سے کہا۔ ''جا کر ان کی گاڑی چیک کرو۔''

جوشیو نے جا کر دیکھا اور آکر رپورٹ دی۔ ''گاڑی تو موجود ہے... دوسری گاڑی بھی کھڑی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ اسی ریزورٹ میں ہے۔'' جارج نے کہا۔ ''تم شرافت سے بتاؤ گی یا ہمیں کسی اور طریقے سے پوچھنا پڑے گا؟''

میگنا نے ناقابلِ بیان الفاظ میں بتایا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کرسکتے تھے۔ جیسیکا نے نفرت سے اسے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس پر جارج نے اس کا منہ دبایا اور پشت سے پکڑ کر اس کا بازو بے دردی سے مروڑ دیا۔ وہ کراہی اور مچلنے لگی۔ اگر اس کا منہ کھلا ہوتا تو اس کی چیخیں سارے ریزورٹ میں گونج رہی ہوتیں۔ جارج نے آرام سے کہا۔ ''اگر تم جواب دینے کے موڈ میں ہو تو سر ہلا دو ورنہ میں تمہارا یہ بازو کہنی سے الگ کردوں گا۔''

جیسیکا نے جواب میں جلدی سے سر ہلایا۔ جارج نے اسے چھوڑا تو وہ بازو تھام کر کراہنے لگی۔ میگنا نے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''جلدی بول کتیا... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

وہ کراہی۔ ''سوٹ کیس ہوٹل کے سیف میں ہے اور میش، میلینا اور کارلن سے ملنے گیا ہے۔''

''تم کیوں نہیں گئیں؟'' میگنا نے پھر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''اسے لے چلو... اگر اس کی بات غلط نکلی تو وہیں اس کی...'' میگنا نے پھر غلیظ زبان استعمال کی۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے۔ ایک بار کھل کر سامنے آنے کے بعد انہیں کسی کا خوف نہیں تھا۔ ان کے پاس ہتھیار تھے اور وہ سب سے نمٹ سکتے تھے۔ کم سے کم ان کا خیال یہی تھا۔

☆☆☆

کارلن اور میلینا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہم اس بارے میں آپس میں مشورہ کرسکتے ہیں؟'' کارلن نے کہا۔

''ضرور کرو لیکن تم ابھی... اور نہ ہی بعد میں ہمارے بارے میں کوئی سوال کرسکتے ہو۔'' میش نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''کیا ہمارے درمیان تحریری معاہدہ ہوگا؟'' میلینا نے پوچھا۔

''بالکل... اس کے بغیر کام کیسے چلے گا؟'' میش کھڑا ہوگیا۔ ''میں ذرا باہر اپنی کار دیکھنے جارہا ہوں۔ تم بتادو کہ میں کتنی دیر میں آجاؤں؟''

''دس منٹ میں!'' کارلن بولا۔

میش سر ہلاتا ہوا ان کے پورشن سے باہر نکل گیا۔ اس نے جا کر اپنی وین کے پاس ایک سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا کہ اگر یہ لوگ مان گئے تو وہی اس معاہدے کا اہل ہوگا کیونکہ جیسیکا کا نام بینک ڈکیتی کے سلسلے میں آچکا تھا اور آج اس کی تصویر بھی ٹی وی پر آچکی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ بہت پرانی تصویر تھی اور اس کے عام حلیے سے بھی آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ بدلے حلیے میں تو وہ بہت مشکل سے بہ حیثیت جیسیکا کے پہچانی جاتی۔ وہ بھی اگر کوئی اسے جیسیکا کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش کرتا تو... اس نے جیسیکا کا نام سارا اچل سن لکھوایا تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے سوچتا اور ٹہلتا رہا۔ رات بہت خوش گوار تھی۔ دوسری سگریٹ کے بعد اس نے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے باہر آئے ہوئے بیس منٹ ہوئے تھے۔

وہ اندر آیا اور ڈیک والے دروازے سے اندر جانے لگا تو اسے اندر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ ''وہ حرامزادہ کہاں ہے؟''

''ہمیں نہیں معلوم۔'' کارلن کی خوف زدہ آواز آئی۔

''وہ شاید باہر کہیں گیا ہے۔''

''اسے جہنم میں ڈالو۔'' میش نے جارج کی آواز سنی۔ ''ہمیں وہ سوٹ کیس چاہیے جو اس نے تمہارے پاس سیف میں رکھوایا ہے۔''

''وہ ہمارے پاس اس کی امانت ہے۔'' کارلن نے کہا۔ ''ہم کسی صورت تمہیں نہیں دے سکتے۔''

''بکواس مت کرو۔'' جوشیو نے کہا۔ ''سوٹ کیس ہم لے لیں گے... تم کیوں بلاوجہ مرنا چاہتے ہو؟''

''کارلن... میش کہاں ہے؟'' جیسیکا کی کراہتی آواز آئی جیسے وہ تکلیف میں ہو۔ میش نے تڑپ کر اندر جانا چاہا لیکن پھر وہ رک گیا۔ یہی عقل مندی تھی۔ وہ لوگ یقیناً مسلح تھے ورنہ اتنے لوگوں کو اتنی آسانی سے کیسے قابو کرلیتے؟ وہ پلٹ کر تیزی سے باہر آیا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن آزاد رہ کر وہ ان لوگوں کے خلاف کچھ نہ کچھ کرسکتا تھا۔ ہوٹل میں وہ اسے آسانی سے تلاش کرلیتے۔ یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔ وہ حیران تھا کہ ان لوگوں کو سوٹ کیس اور اس میں موجود رقم کا علم کس طرح ہوا؟ اس نے تو کارلن اور میلینا کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ان لوگوں نے کارلن سے سوٹ کیس نکلوالیا تو ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ وہ یقیناً یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ انہیں روکنے کے لیے کیا کرسکتا ہے۔

☆☆☆

جارج، کارلن اور میلینا کے پاس میش کو نہ پا کر تشویش زدہ ہوگیا تھا۔ اس نے جوشیو اور میگنا سے کہا۔ ''جا کر اسے تلاش کرو اور اگر وہ مزاحمت کرے تو اسے اڑا دینا۔''

''نہیں۔'' جیسیکا چلائی۔

''بہت درد ہے اس کا۔'' میگنا نے زہریلے لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ جوشیو اس کے پیچھے تھا۔

جارج نے اپنا پستول لہرایا اور کارلن سے کہا۔ ''اگر تم نے میرے دس گننے تک سوٹ کیس نکال کر میرے حوالے نہیں کیا تو سب سے پہلے میں تمہاری بڑھیا کا خاتمہ کروں گا۔''

''خدا کے لیے...'' جیسیکا نے کہنا چاہا۔

''ایک... دو... تین...'' جارج نے گننا شروع کردیا۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' کارلن بولا۔

''چار... پانچ... چھ...''

''پلیز!'' میلینا نے کہا۔ ''یہ ہمارے پاس امانت ہے۔''

''سات... آٹھ... نو...''

''او کے... او کے!'' کارلن نے ہار مان لی۔ ''میں سوٹ کیس دیتا ہوں تمہیں لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔ سیف میرے دفتر میں ہے۔''

''تو چلو وہاں۔'' جارج نے میلینا کے سر پر پستول رکھ دیا۔ ''کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ یہ جان سے جائے گی۔''

''میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔'' کارلن دکھی لہجے میں بولا۔ اس نے جیسیکا کی طرف دیکھا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری امانت کی حفاظت نہیں کرسکا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' جیسیکا نے کہا۔ ''کوئی چیز انسان کی جان سے بڑھ کر اہم نہیں ہوتی۔''

کارلن نے دفتر میں آکر سیف کھولا تو جارج بہت چوکنا ہوگیا...... وہ میلینا کے عقب میں تھا تاکہ کارلن سیف سے کوئی ہتھیار حاصل کر بھی لے تو اس کے خلاف استعمال نہ کرسکے لیکن اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے سوٹ کیس نکال کر جارج کے سامنے رکھا تو اس نے حکم دیا۔

''اسے کھولو۔''

''اس کی چابی میش کے پاس ہے۔'' کارلن بولا۔

اتنے میں میگنا واپس آگئی تھی۔ اس نے جارج کو بتایا۔ ''وہ یہاں..... کہیں نہیں ہے۔ جوشیو اسے باہر تلاش کر رہا ہے۔''

اس دوران میں جارج نے سوچ لیا تھا کہ ان تینوں کا کیا کرنا ہے۔ وہ انہیں دفتر کے برابر والے کمرے میں لایا۔ یہ اسٹور روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا اور اس میں آمد و رفت ..... کے لیے صرف ایک کمرا تھا۔ دروازہ بھی مضبوط تھا۔ وہ اسے آسانی سے نہیں توڑ سکتے تھے۔ جارج کے اشارے پر وہ خاموشی سے اندر چلے گئے۔ جارج نے دروازہ باہر سے بند کیا اور میگنا سے کہا۔ ''اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''پہلے رقم تو دیکھ لو۔''

''وہ ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی یہاں سے نکلنا چاہیے۔ یہ جوشیو کہاں مر گیا ہے؟''

☆☆☆

جوشیو لان میں تھا اور خاموشی سے میش کو تلاش کر رہا تھا۔ پہلے اس نے پارکنگ میں دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب وہ لان میں تھا۔ اس وقت وہ ایک جھاڑی کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اچانک اس کے سر سے کوئی چیز ٹکرائی اور وہ زمین پر گر گیا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن اسے تارے ضرور نظر آگئے تھے۔ میش نے آرام سے اس کے ہاتھ سے پستول لیا اور رینچ پانا ایک طرف پھینک دیا۔

''شکریہ دوست!'' میش نے کہا۔ ''اب تم آرام کرو۔'' اس نے کہتے ہوئے جوشیو کے سر پر پستول کا دستہ رسید کیا تو اس بار وہ بے ہوش ہو گیا۔

میش دوبارہ جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جتنا ان لوگوں سے دور رہے گا، اتنا ہی محفوظ رہے گا۔ اسے جیسیکا کے ساتھ میلینا اور کارلن کی فکر بھی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ انہیں مار نہ ڈالیں لیکن ابھی وہ اندر جا کر ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ پستول حاصل کرنے کے بعد وہ زیادہ پُراعتماد ہو گیا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ ''ابھی تم لوگوں کو پتا نہیں ہے کہ تمہارا پالا کس سے پڑا ہے۔''

☆☆☆

جوشیو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ جارج نے میکنا سے کہا۔ ''ہمیں خود چل کر دیکھنا ہوگا۔''

وہ سوٹ کیس سمیت باہر نکلے۔ پارکنگ خالی تھی... یعنی وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ جارج نے دبی زبان میں پہلے جوشیو کو آوازیں دیں اور پھر گالیاں دیں کہ وہ نہ جانے کہاں مر گیا ہے۔ جارج نے سوٹ کیس اپنی کار کی ڈکی میں رکھا اور میکنا سے کہا۔ ''تم یہاں رکو اور ہوشیار رہنا۔ میں اس گدھے کو تلاش کر کے آتا ہوں۔''

''دیر مت کرنا... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' میکنا نے بے تابی سے کہا۔ جارج سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میکنا کو اس سوٹ کیس کا خیال آیا۔ اس میں لاکھوں ڈالرز کی رقم تھی۔ اس کی نیت خراب ہونے لگی۔ اسے خیال آیا کہ وہ اگر کار لے کر نکل جائے تو یہ ساری رقم اکیلی اس کی ملکیت ہوگی۔ ورنہ جارج اس رقم پر قابض ہو جائے گا اور یہ اس کی مرضی ہوگی کہ وہ ان لوگوں کو اس میں سے کیا دیتا ہے۔ برابر کے حصے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کار کی چابی جارج کے پاس تھی لیکن اس کی ایک چابی میکنا کے پاس بھی ہوتی تھی اور اس بات کا جارج کو بھی علم نہیں تھا۔ میکنا نے وہ چابی نکالی اور کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن سیلف گھمانے پر کچھ نہیں ہوا۔ وہ بار بار کوشش کرتی رہی۔ آخر اس نے اتر کر بونٹ ہٹایا اور یہ دیکھ کر اس کا غصے سے بُرا حال ہو گیا کہ ڈسٹری بیوٹر کی تاریں غائب تھیں۔ وہ وین کی طرف لپکی اور اس کا بونٹ کھولا۔ اس کے ساتھ بھی یہی کام ہوا تھا۔ میلینا کی پک اپ بھی بنا تاروں کے بے کار کھڑی تھی۔ وہ اب کسی گاڑی میں یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اس نے ڈکی کھولی۔ وہ سوٹ کیس لے کر یہاں سے پیدل نکل جانا چاہتی تھی لیکن جب اس نے ڈکی کھولی تو اس میں سوٹ کیس نہیں تھا۔ میکنا کے منہ سے گالیاں نکلنے لگیں۔ جب وہ گاڑیوں کے بونٹ اٹھا کر دیکھ رہی تھی تو اس دوران میں کوئی سوٹ کیس نکال کر لے گیا تھا۔

اچانک اسے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ اوندھے منہ ڈکی میں جا گری۔ اس کا سر چکرا رہا تھا پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

جارج محتاط انداز میں جوشیو کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ لان میں تھا۔ ایک جھاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا تو یہ کوئی انسان تھا۔ وہ اسے کھینچ کر روشنی میں لے آیا۔ جوشیو کو بے ہوش دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا پستول بھی غائب تھا۔ یعنی ان کا دشمن اب مسلح ہو چکا تھا۔ اس نے جوشیو کو ہوش میں لانے کی کوشش شروع کی اور اسے لان میں لگے پانی کے نلکے تک لے گیا اور اس کا سر نل کے نیچے کر کے پانی کھول دیا۔ جوشیو کو مکمل طور پر ہوش میں آنے میں دس منٹ لگے اور اس نے جارج کو خود پر گزرنے والی بپتا سنائی۔

''پستول اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔'' جارج نے تشویش سے کہا۔ ''اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

وہ جوشیو کو لے کر پارکنگ میں آیا۔ وہاں اسے میکنا نظر نہیں آئی۔ اس نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ ''میکنا... تم کہاں ہو؟''

لیکن میکنا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ جوشیو خوف زدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ کہاں مر گئی؟''

''میں اسے یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔'' جارج بھی خوف زدہ تھا اور چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو نہتوں پر اکڑتے تھے لیکن جب ان کا مقابلہ کسی مسلح دشمن سے ہوتا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ اس وقت ان کا یہی حال تھا۔ انہیں پتا تھا کہ اب ان کے دشمن کے پاس ہتھیار آ گیا ہے اور پھر میکنا بھی غائب تھی۔ اس کے حوالے سے بھی خدشات تھے۔ جوشیو نے آہستہ سے کہا۔

''جارج! ہمیں اب یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔''

''لیکن میکنا...''

''مجھے لگ رہا ہے کہ اس کے ساتھ بھی کچھ ہوا ہے ورنہ وہ کہاں جا سکتی ہے؟ اور اس سے پہلے کہ دشمن ہم پر کوئی اور وار کرے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

جارج نے اس سے اتفاق کیا اور کار اسٹارٹ کی۔ پارکنگ سے نکلتے ہی اس نے ایکسلریٹر دبایا اور وہاں سے ہر ممکن تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ سوٹ کیس کے مقابلے میں اسے میکنا کی خاص پروا نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس دولت ہو گی تو اسے میکنا جیسی دس لڑکیاں مل جائیں گی بلکہ اب تو اسے اپنے ساتھ بیٹھا ہوا جوشیو بھی کھٹک رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھی وہیں رہ جاتا تو کیا بُرا تھا... ساری دولت اکیلے اس کے حصے میں آتی... لیکن یہ دولت تو ابھی بھی اس کے حصے میں آ سکتی تھی۔ اس نے سوچا۔

ہائی وے پر آنے کے بعد اس نے ایک سنسان سڑک پکڑ لی تھی۔ ''اس پر پولیس سے سامنا ہونے کا امکان کم ہے۔'' وہ بولا۔

رات کے تین بج رہے تھے اور کوئی ڈھائی گھنٹے بعد صبح کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ جارج نے کار سڑک سے اتار کر ایک جگہ روک دی۔ اس نے جوشیو سے کہا۔ ''اب ذرا سوٹ کیس دیکھتے ہیں کہ اس میں کتنی رقم ہے۔''

جوشیو خوش تھا۔ وہ نیچے اترا اور ڈکی کی طرف آیا تھا کہ اسے عقب سے پستول کا گھوڑا چڑھانے کی آواز آئی۔ وہ ایک لمحے کو ساکت ہو گیا اور پھر اس نے آہستہ سے جارج کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ پستول کا رخ اس نے جوشیو کی طرف کر رکھا تھا۔ وہ بولا۔ ''مجھے افسوس ہے جوشیو لیکن میں اس دولت میں کسی اور کو حصے دار نہیں بنا سکتا۔''

جوشیو کا پستول وہیں رہ گیا تھا اور اب اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اس لیے وہ اچانک ہی بھاگا۔ وہ موت سے بچنا چاہتا تھا لیکن عقب سے آتی گولی کی رفتار اس سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ گولی اس کی پشت میں اتر گئی اور وہ زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ جارج کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا اور جب جوشیو ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے کار کی ڈکی کا رخ کیا اور خوش کن خیالات کے ساتھ ڈکی کھولنے لگا۔

☆☆☆

جیسیکا، میلینا اور کارلن اس کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ میلینا نے کارلن کو دروازے کے ساتھ زور آزمائی سے روک دیا تھا۔ ''یہ بہت مضبوط ہے۔ ہم سے نہیں ٹوٹے گا۔''

''میش کہاں ہے؟'' جیسیکا نے سوال کیا۔

''وہ باہر گیا تھا۔'' میلینا بولی۔

''اگر وہ آزاد ہے تو ان لوگوں کی خیر نہیں ہوگی۔'' جیسیکا پہلی بار مسکرائی۔ ''وہ اس کے بارے میں جانتے نہیں ہیں۔''

''وہ تین ہیں اور پوری طرح مسلح ہیں۔'' کارلن نے اسے یاد دلایا۔

''مجھے بھی معلوم ہے لیکن میں نے کہا نا کہ وہ میش کو نہیں جانتے۔''

باہر خاموشی تھی اور کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ پھر سناٹے میں کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ کارلن بولا۔ ''یہ ان بدمعاشوں کی کھٹارا کار کی آواز ہے۔''

جیسیکا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اسے خیال آیا کہ اگر وہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں تو میش کہاں ہے؟ کہیں اسے کوئی نقصان تو نہیں ہوا ہے؟ وہ خود پر ضبط کرنے لگی۔ میلینا نے اس کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا۔ اس نے جیسیکا کو گلے سے لگا کر تسلی دی۔ ''فکر مت کرو... میش ٹھیک ہوگا۔''

اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور دروازہ کھلا۔ جیسے ہی میش کی صورت نظر آئی، جیسیکا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور میش کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں۔'' میش مسکرا رہا تھا۔ سوٹ کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''باہر آ جاؤ... خطرہ ٹل گیا ہے۔''

''وہ چلے گئے؟'' کارلن نے پوچھا۔

''ہاں، وہ چلے گئے۔ بہت ساری خوش فہمیاں اور ایک بہت بڑا سرپرائز لے کر!'' میش ہنسا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ دونوں سوٹ کیس کے لیے کار کی ڈکی کھولیں گے اور اس میں سوٹ کیس کے بجائے اپنی ساتھی کو بندھا پائیں گے تو ان کے دل پر نہ جانے کیا گزرے گی۔ وہ اس وجہ سے بھی خوش تھا کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا تھا اور پولیس کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ کارلن اور میلینا اس سے پوچھ رہے تھے کہ اس نے کس طرح ان مسلح بدمعاشوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا... مگر وہ انہیں ٹال رہا تھا۔

ایک سال بعد میش اور جیسیکا ریزورٹ میں باقاعدہ پارٹنر بن گئے۔ انہوں نے پانی سے بھر جانے والی جھیل کے دوسرے کنارے پر اپنا خوب صورت سا ہٹ بنا لیا تھا۔ جھیل دوبارہ اپنی حالت میں آ جانے سے اور ریزورٹ میں نئی تبدیلیوں کے بعد بزنس پھر سے چمک اٹھا تھا۔ میلینا اور کارلن ان کے آنے سے بہت خوش تھے لیکن وہ آج تک نہیں جان سکے کہ میش اور جیسیکا کہاں سے آئے تھے اور ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی تھی؟ ان کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ وہ ان کے لیے رحمت کے فرشتے بن کر آئے تھے۔

آنکھوں کی زبان سے دل کی دہلیز پر رقم ہونے والے گلاب واقعات جو کبھی نہیں مرجھاتے

ریت کا دریا

اقبال کاظمی

تیسری قسط

کائنات کل میں دولت میں ایسا طلسم ہے جو گہرے جذبات یا اتھاہ گہرائیوں میں موجزن محبت ...... کی طاقت کو بھی اپنے سحر میں مقید کرلیتی ہے ۔ اس کے سامنے کوزے سے سمندر تک ہر شے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ۔ ایک بڑے مالیاتی ادارے کے مالک کی زندگی کے گمشدہ اوراق...... جس کے ایک ایک ورق میں ان گنت کہانیاں پنہاں تھیں ۔

عرصہ دراز کے بعد آپ کے پسندیدہ مصنف کی پراثر کاوش اولین صفحات کی سوغات

گگن دیپ اور قبیلے کے سردار میں میٹنگ جاری تھی جبکہ ندیم ان سے کچھ دور درخت کے نیچے بیٹھا خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی باتوں کا ایک بھی لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سردار باتیں کرتے ہوئے بار بار آسمان پر گھرے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔

بستی میں ایک نئے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آرہے تھے۔ جانوروں کا شکار کرنے والا گروہ نیزے، تیر اور کمانیں درست کررہا تھا۔ مچھلیوں کے شکاری اپنے جال چیک کررہے تھے۔ نوعمر لڑکیاں اپنے جھونپڑوں کے سامنے صفائی کررہی تھیں۔ بعض عورتیں جنگل کے دوسری طرف کھیتوں میں سبزیاں وغیرہ لانے کے لیے تیار ہورہی تھیں اور کچھ عورتیں چولھوں کے سامنے بیٹھی کھانا تیار کررہی تھیں۔

گگن دیپ اور سردار کی میٹنگ بالآخر ختم ہوگئی اور گگن دیپ وہاں سے اٹھ کر ندیم کے قریب آگئی۔

''سردار کا خیال ہے کہ بہت زبردست طوفان آنے والا ہے۔'' گگن دیپ نے کہا۔ ''وہ کہتا ہے کہ تم لوگ جاسکتے ہو لیکن وہ کسی گائیڈ کو تمہارے ساتھ نہیں بھیجے گا۔''

''کیا ہم کسی گائیڈ کے بغیر منزل تک پہنچ سکیں گے؟'' ندیم نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' قریب بیٹھا ہوا جیوی جلدی سے بول پڑا۔ ندیم نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ خاموش ہوگیا۔

''بہت خطرناک ہوگا۔'' گگن دیپ بولی۔ ''سیلابی موسم میں قریب قریب بہنے والے دریا آپس میں مل جاتے ہیں اور بھٹک جانے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے موسم میں تو قبیلے کے ماہی گیر بھی راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ پچھلے موسموں میں کئی آدمی کھو چکے ہیں جن کا آج تک پتا نہیں چل سکا۔''

ندیم کے کندھے جھک گئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر اس قدر شدید قسم کی بیزاری طاری ہوئی تھی۔ مچھروں نے کاٹ کاٹ کر اس کا جسم چھلنی کردیا تھا۔ وہ اس مہم سے ہی بیزار ہوگیا تھا اور اپنے آپ میں شدید تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ جہاں زندگی ہو... زندگی کے ہنگامے ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کا یہ مشن بری طرح ناکام ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ سلطان اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہ پاکر پریشان ہورہا ہوگا۔

''میں جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا ہوں۔'' ندیم نے گگن دیپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''واپسی میں پہلے ہی غیر معمولی تاخیر ہو چکی ہے۔ میری طرف سے کوئی اطلاع نہ پاکر میرے دفتر والے پریشان ہورہے ہوں گے۔''

گگن دیپ نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اگر ممبئی میں ندیم کے دفتر کے کچھ لوگ پریشان ہورہے تھے تو اسے کیا پروا ہوسکتی تھی۔

''کیا ہم کوئی بات کرسکتے ہیں؟'' ندیم نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے اس بچی کی تدفین میں شرکت کے لیے دوسری بستی جانا ہے۔'' گگن دیپ نے جواب دیا۔ ''تم بھی چلو،

راستے میں باتیں کرلیں گے۔''

ندیم فوراً ہی تیار ہوگیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ دوسری بستی کی طرف چل پڑے۔ سب سے آگے لاکو تھا۔ اس کے پیچھے گگن دیپ، اس کے بعد ندیم اور آخر میں جیوی تھا جو ان سے خاصے فاصلے پر تھا۔ بستی سے کچھ آگے وہ اس زمین پر پہنچ گئے جہاں پہلے کاشت ہوتی تھی لیکن اب جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

''انگامی قبیلے کے لوگ بڑی محنت سے کھیتی باڑی کے لیے چھوٹے چھوٹے پلاٹ تیار کرتے ہیں۔'' گگن دیپ نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے برابر پہنچ چکا تھا۔ ''لیکن چند سال بعد ہی زمین پیداوار دینا بند کردیتی ہے اور وہ اس جگہ کو چھوڑ کر آگے جنگل میں کاشت کے لیے مزید زمین تیار کرتے ہیں۔ پھر کچھ سالوں بعد پہلی زمین دوبارہ کاشت کے قابل ہوجاتی ہے تو یہ وہاں لوٹ آتے ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ زمین ان کے لیے زندگی کی شہ رگ کا درجہ رکھتی ہے۔''

ندیم 'ہوں ہاں' کرتا ہوا اس کے ساتھ چلتا رہا۔ راستے کے دائیں طرف تین عورتیں زمین پر کیاریاں بنارہی تھیں۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرادیں۔

''یہاں عورتوں کو بھی سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔'' گگن دیپ نے کہا۔ ''بنجر زمین کو کاشت کے قابل بنانا انتہائی محنت طلب کام ہے۔''

''مجھے تو یہ اسی طرح کام کرتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔'' ندیم نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے کہ بس انہیں اسی طرح محنت کرتے ہوئے دیکھتا رہوں۔''

گگن دیپ نے اسے گھورا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، گھٹن میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ ندیم پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا... کہاں پیدا ہوئے تھے؟ کہاں...''

''بے کار ہے۔'' ندیم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا کروگی سُن کر؟''

''کم آن ندیم!'' گگن دیپ بولی۔ ''تم مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے نا... ہمارا سفر کم سے کم آدھے گھنٹے کا ہے۔ باتوں میں اچھا وقت کٹے گا۔ اپنے بارے میں بتاؤنا کچھ۔''

''میں بنگلور میں پیدا ہوا تھا۔ پندرہ سال کا تھا کہ والدین میں طلاق ہوگئی۔ مقامی کالج سے گریجویشن کیا پھر ممبئی آکر لا کالج میں داخلہ لے لیا۔ باقی زندگی ممبئی ہی میں گزری۔''

''بچپن کیسا گزرا؟'' گگن دیپ نے پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''اس زمانے میں لوگوں کو فٹ بال کا کریز تھا۔ میں بھی فٹ بال کا کھلاڑی بننا چاہتا تھا لیکن مجھے ٹھیک سے کک لگانی بھی نہیں آتی تھی۔ فٹ بال کا خیال ذہن سے نکال کر وکیل بن گیا۔ خیر، تم اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتانا پسند کروگی؟''

''کیوں نہیں... لیکن میرا بچپن زیادہ خوش گوار نہیں تھا۔'' گگن دیپ نے کہا اور ندیم یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ کیا واقعی اس عورت کو زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں ملی؟

راستہ اب گھنی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ ندیم کے ذہن میں اچانک ہی سانپوں کا خیال اُبھر آیا۔ اس کی نظریں بے اختیار گگن دیپ کے پیروں کی طرف اٹھ گئیں اور یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس نے لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔

''بچی کو جس سانپ نے کاٹا تھا وہ کس قسم کا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''بیا۔'' گگن دیپ نے جواب دیا۔ ''لیکن گھبراؤ نہیں۔ تم نے بوٹ پہن رکھے ہیں۔ بیا بہت چھوٹا سانپ ہے اور ٹخنوں سے نیچے ہی کاٹتا ہے۔''

''لاکو ننگے پیر ہے... کیا اسے خطرہ نہیں؟'' ندیم بولا۔

''وہ آنکھیں کھول کر چلتا ہے۔'' دیپ نے جواب دیا۔ ''اس میں شبہ نہیں کہ بیا خطرناک سانپ ہے لیکن بروقت علاج ہوجائے تو جان بچ سکتی ہے۔ میرے پاس مار گزیدگی کے انجکشن تھے مگر ختم ہوچکے ہیں۔ اگر کل وہ انجکشن میرے پاس ہوتے تو وہ بچی اس طرح بے بسی سے موت کے منہ میں نہ جاتی۔''

''اگر تمہارے پاس بہت ساری دولت ہو تو تم مار گزیدگی کے بہت سارے انجکشن خرید سکتی ہو۔ تم ضرورت کی لاتعداد دواؤں کا ذخیرہ کرسکتی ہو۔ دیبور گڑھ آنے جانے کے لیے ایک خوب صورت موٹر بوٹ بلکہ لانچ بھی خرید سکتی ہو۔ یہاں تم ایک شان دار چرچ، بہت بڑا کلینک اور اسکول بھی بناسکتی ہو... اور...''

گگن دیپ ایک جھٹکے سے رک کر مڑ گئی۔ ندیم اس طرح خاموش ہوگیا جیسے کسی کھلونے میں چابی ختم ہوگئی ہو۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ گگن دیپ کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''میں نے دولت کمانے کے لیے کچھ

نہیں کیا اور جس شخص نے وہ دولت جمع کی تھی اسے میں نہیں جانتی۔ مجھ پر رحم کرو۔ آئندہ یہ ذکر مت کرنا۔'' گگن دیپ کے الفاظ اگرچہ سخت تھے لیکن اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات نہیں تھے۔

''کسی کو دے دینا... خیرات کردینا۔'' ندیم بولا۔

''جو چیز میری نہ ہو، اسے کسی کو دینے یا خیرات کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔''

''وہ ساری دولت ضائع ہوجائے گی۔'' ندیم بولا۔ ''کروڑوں روپے وکیل کو جائیں گے اور جو باقی بچے گا، وہ تمہارے بہن بھائیوں کے ہاتھ لگ جائے گا۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ وہ مردار خور گدھ ہیں۔ انہیں اتنی دولت مل گئی تو وہ اپنے آپ کو مزید تباہ کرلیں گے اور جو کچھ وہ خرچ نہیں کرسکیں گے، وہ اپنی آنے والی نسل کے لیے چھوڑ جائیں گے اور وہ نسل بھی تباہ ہوجائے گی۔''

گگن دیپ نے اس کی کلائی پکڑ لی اور آہستہ سے دباتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولی۔ ''مجھے ان کی پروا نہیں لیکن میں بہر حال، ان کے لیے دعا کرسکتی ہوں۔''

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر پھر آگے چلنے لگی۔ لاکو بہت آگے نکل چکا تھا اور جیوی اتنا پیچھے رہ گیا تھا کہ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر مڑ کر گنجان درختوں میں داخل ہوگئے۔ درختوں کے جھنڈ کے دوسری طرف وہی ندی گھوم کر سامنے آگئی تھی۔ اس طرف ندی کے کنارے پر بڑے بڑے چٹانی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ یہاں ہوا میں بھی قدرے خنکی تھی۔

''کچھ دیر یہاں بیٹھ کر آرام کرلیتے ہیں۔'' گگن دیپ ندی کے کنارے پر بیٹھ گئی اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ ''یہ پانی پہاڑوں سے آتا ہے۔ تم اسے بلا جھجک پی سکتے ہو۔''

ندیم بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور چلو سے پانی پینے لگا۔ پانی شفاف، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

''یہ میری پسندیدہ جگہ ہے۔'' گگن دیپ نے بتایا۔ ''میں نہانے کے لیے روزانہ یہاں آتی ہوں اور یہیں بیٹھ کر عبادت بھی کرتی ہوں۔''

ندیم نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے گگن دیپ کو دیکھتا رہا۔ گگن دیپ نے جوتے اور موزے اتار کر پیر پانی میں ڈال دیے۔ ندیم نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ دونوں اس وقت اکیلے تھے۔ لاکو یا جیوی کا دور دور تک نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

''میرا بچپن ایک چھوٹے سے قصبے میں گزرا تھا۔''

''عالمِ خواب''

ایک خاتون نے حیرت سے دوسری خاتون سے پوچھا۔

''یہ تم آنکھیں بند کیے آئینے کے سامنے کیوں کھڑی ہو؟''

''میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میں سوتے میں کیسی لگتی ہوں۔'' دوسری خاتون نے جواب دیا۔

''خوش لباس''

ایک لڑکی نے اپنے منگیتر کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''سوٹ تو تم نے بہت اچھا پہن رکھا ہے۔''

''تمہیں پسند آیا؟'' منگیتر نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... لیکن یہ تو بتاؤ کہ ناپ دینے کے لیے تم نے کسے بھیجا تھا؟''

گگن دیپ بتانے لگی۔ ''میرا رضاعی باپ قصبے کے چرچ میں پادری تھا۔ قصبے کے ساتھ... ایسی ہی ایک ندی تھی اور ایسی ہی چٹانیں تھیں۔ میں روزانہ وہاں جاکر اسی طرح پانی میں پیر لٹکائے گھنٹوں بیٹھی رہا کرتی تھی۔''

''کیا تم کسی سے چھپنے کے لیے وہاں جایا کرتی تھیں؟''

''کبھی کبھی۔''

''اور اب...'' ندیم بولا۔ ''اب بھی تم ان تاریک جنگلوں میں چھپی ہوئی ہو۔''

''نہیں... تمہارا خیال غلط ہے۔'' گگن دیپ نے کہا۔ ''اب میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے کہ مجھے چھپنے کی ضرورت پڑے۔ میں بالکل مطمئن اور پُرسکون ہوں۔ مجھے کوئی بے چینی نہیں ہے۔ میں نے برسوں پہلے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ میری راہنمائی کررہا ہے۔ تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ میں تنہا ہوں۔ وہ قدم قدم پر میرے ساتھ ہے۔ وہ میرے خیالات اور میری ضروریات سے واقف ہے۔ مجھے پریشانیوں سے بچانے والا بھی وہی ہے۔ میں اس دنیا میں بالکل مطمئن اور پُرسکون ہوں۔''

''مجھے یہ سب کچھ سُن کر حیرت ہورہی ہے۔'' ندیم بولا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ بات ساری ذہنی اور قلبی سکون کی ہے۔'' گگن دیپ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''رات کو تم نے کہا تھا کہ تم بہت کمزور ہو۔ اس کا مطلب بتانا پسند کروگے؟''

ندیم کو ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں اپنے معالج چیٹر جی کی بات یاد آگئی۔ اس نے ایک موقع پر کہا تھا کہ کسی سے بات کرلینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور غبار چھٹ

جاتا ہے۔

''میں شراب اور منشیات کا عادی ہوں۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ ''پچھلے دس سال میں کم از کم چار مرتبہ موت کے منہ میں جا چکا ہوں۔ اس مہم پر آنے سے پہلے بھی چار مہینوں تک ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں رہ چکا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ شراب اور کوکین سے دور رہ سکتا ہوں یا نہیں۔ چار مہینے پہلے جب میں ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں زیرِ علاج تھا، میں نے اپنے دیوالیے کی درخواست داخل کروائی تھی۔ انکم ٹیکس کے کیسز میں بھی بری طرح پھنسا ہوا ہوں۔ پچاس فیصد چانس یہ ہے کہ مجھے سزا ہو جائے گی اور میرا وکالت کا لائسنس بھی منسوخ کر دیا جائے گا۔ دو بیویوں کی طلاق کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے میرے بچوں کے ذہنوں میں بھی میرے خلاف نفرت کا زہر بھر دیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' ندیم کو یہ سب کچھ بتانے میں کوئی شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔

''کوئی اور خاص بات؟'' گگن دیپ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں... میں کم از کم دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کر چکا ہوں۔ ایک مرتبہ اگست میں جب مجھے علاج کے لیے کھنڈالا کے ری ہیبلی ٹیشن سینٹر بھیج دیا گیا تھا اور دوسری مرتبہ دیبور گڑھ میں۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ کرسمس کی رات تھی۔''

''دیبور گڑھ میں؟'' گگن دیپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں... میں نے ہوٹل کے کمرے میں رات کو اتنی شراب پی لی تھی کہ میرے زندہ بچ جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا اور مجھے یہ سب کچھ بتاتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔''

''اگر تم سچے دل سے خدا سے دعا مانگو تو تمہاری پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔'' گگن دیپ نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اس کا طویل لیکچر شروع ہو گیا۔ ندیم آنکھیں بند کیے سنتا رہا۔ اس کے کانوں میں صرف آواز آ رہی تھی۔ سریلی، شیریں اور پُرسکون آواز... الفاظ کو سمجھنے کی اس نے کوشش ہی نہیں کی۔

''آج رات۔'' گگن دیپ آخر میں کہہ رہی تھی۔ ''آج رات پھر میرے پاس آ جانا، میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔''

''دعا سے کیا ہوتا ہے؟'' ندیم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''مایوس نہ ہو۔'' گگن دیپ نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہیے۔''

لیکن وہ اٹھے نہیں۔ پانی کی مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھتے رہے۔ ندیم کا ہاتھ اب بھی گگن دیپ کے ہاتھ میں تھا۔

''میرا خیال ہے تم جاؤ۔ میں جیوی کے ساتھ بستی واپس چلا جاؤں گا۔'' ندیم بولا۔

''اگر تم ساتھ چلتے تو ہمیں گھنٹوں باتیں کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔'' گگن دیپ نے کہا۔

''نہیں، میں اس بچی کی لاش نہیں دیکھ سکوں گا۔'' ندیم نے کہا۔

''اوہ... ٹھیک ہے۔'' گگن دیپ نے کہا اور جوتے پہننے لگی۔

اس وقت لاکو بھی کہیں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ گگن دیپ اس کے ساتھ چل پڑی اور کچھ ہی دیر بعد وہ جھاڑیوں کی آڑ میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

جیوی ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا۔ ندیم نے اسے جگایا اور وہ دونوں گاؤں کی طرف واپس چل پڑے۔

☆☆☆

قبیلے کا سردار کوئی اچھا ماہرِ موسمیات ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے بادلوں کو دیکھ کر زبردست طوفان کی پیش گوئی کی تھی لیکن طوفان نہیں آیا۔ البتہ دو تین مرتبہ ہلکی بارش ضرور ہوئی تھی۔ ہر مرتبہ بارش کے بعد بادل چھٹ جاتے، تیز دھوپ نکل آتی اور حبس بڑھ جاتا تھا لیکن بستی والوں کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ندیم زندگی کی یکسانیت سے اکتا گیا تھا۔ ہر نیا دن پہلے دن کی طرح گزر جاتا۔ صدیوں سے یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ندیم اپنے جھونپڑے کے سامنے یا کسی اور جگہ درخت کے نیچے بیٹھا ننگ دھڑنگ قبائلیوں کو دیکھتا رہتا۔ بستی کی کچھ عورتیں اب اس سے مانوس ہو گئی تھیں۔

اس روز گگن دیپ دوسری بستی گئی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی تقریباً تین گھنٹوں بعد ہوئی۔ وہ سردار سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ندیم کے پاس آ گئی۔ وہ بری طرح تھکی ہوئی تھی اور آرام کرنا چاہتی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے جھونپڑے کی طرف جانے لگی تو ندیم اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے گگن دیپ پیروں پر نہیں چل رہی بلکہ ہوا میں تیر رہی ہو۔

اس ایک ہفتے کے دوران جیوی بڑی گہری نظروں سے گگن دیپ اور ندیم کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک دوسرے سے ان دونوں کا رویہ دیکھ کر اسے کسی گڑبڑ کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ گگن دیپ جس طرف جاتی، ندیم کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ اس روز بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ گگن دیپ بستی میں اِدھر اُدھر آ جا رہی تھی اور ندیم کی نظریں بھی اس کے ساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں۔

گگن دیپ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو ندیم سو گیا۔ اس کے علاوہ اور کام ہی کیا تھا۔ دو گھنٹوں بعد قبائلی مردوں کا ریسلنگ کا پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ اس کے بعد کھانا اور پھر اندھیرا۔

شور کی آواز سے ندیم جاگ گیا۔ قبیلے کے مرد میدان کے وسط میں مرکزی جھونپڑے کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ کوئی اپنے بدن کی مالش کروا رہا تھا اور کوئی ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہا تھا۔ ایک دوسرے کو للکارا جا رہا تھا، کئی پہلوان تو ندیم کو بھی للکار رہے تھے۔ وہ فحش قسم کے اشارے کرتے ہوئے اشتعال دلا رہے تھے۔ ندیم ان میں سے کسی کے چیلنج کو قبول کر کے اپنی ہڈیاں نہیں تڑوانا چاہتا تھا۔ وہ وہاں سے پیچھے کھسکنے لگا۔ جیوی بھی اس صورتِ حال سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ بھی پیچھے ہٹنے لگا اور پھر گگن دیپ ہی نے انہیں اس صورتِ حال سے نجات دلائی۔ وہ انہیں وہاں سے نکال لے گئی اور وہ دیر تک ایک درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز سہ پہر کا وقت تھا۔ ندیم کی نظریں گگن دیپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ صبح دوسری بستی گئی تھی اور دوپہر کو واپس آنے کے بعد پھر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ ندیم اس کے انتظار میں دیر تک اپنے خیمے کے سامنے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر بستی سے نکل گیا۔ اس کا رخ اس ندی کی طرف تھا جہاں وہ گگن دیپ کے ساتھ کئی مرتبہ جا چکا تھا۔

چٹانی پتھروں کے قریب رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک پتھر کے اوپر سے گھومتے ہوئے وہ جیسے ہی ندی کی طرف آیا، اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ گگن دیپ ندی کے شفاف پانی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا بدن پانی میں جھلملا رہا تھا۔ ندیم کو دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ایسا غالباً غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ ندیم کو اپنا سانس سینے میں رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''اوہ!'' گگن دیپ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''وہ... میرے کپڑے ادھر پھینک دو۔''

ندیم جیسے اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ پلک جھپکے بغیر گگن دیپ کو دیکھتا رہا اور جب وہ دوبارہ قدرے اونچی آواز میں بولی تو ندیم گڑبڑا سا گیا۔ اس نے قریب ہی جھاڑیوں پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر گگن دیپ کی طرف اچھال دیے اور رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو رہی تھی۔

''اب تم میری طرف دیکھ سکتے ہو۔''

گگن دیپ کی آواز سن کر وہ مڑا۔ اس کے دل کی دھڑکن اب بھی بے قابو ہو رہی تھی۔ گگن دیپ کپڑے پہن چکی تھی۔ تاہم اس کے بالوں سے دھاروں کی صورت میں بہنے والا پانی اس کے کپڑوں کو تر کر رہا تھا۔ وہ دونوں ندی کے کنارے پر ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے۔ ندیم بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اچھا ہوا جو تم اس روز میرے ساتھ دوسری بستی نہیں گئے تھے۔'' گگن دیپ نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' ندیم نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''قبائلیوں کی ہر بستی میں اپنا ایک ڈاکٹر ہوتا ہے جسے شیلون کہا جاتا ہے۔'' گگن دیپ نے کہا۔ ''یہ شیلون جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ روحوں کو بلانے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔''

''اوہ! وچ ڈاکٹر۔'' ندیم بولا۔ ''ایسے وچ ڈاکٹر تو افریقہ کے جنگلوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں، میں نے بہت پڑھا ہے۔ یہ ایک طرح سے قبائلیوں کے روحانی پیشوا بھی ہوتے ہیں۔''

''شیلون کو تم وچ ڈاکٹر ہی کہہ سکتے ہو۔'' گگن دیپ بولی۔ ''یہ لوگ روحوں کو بلانے کے شعبدے دکھاتے...... ہیں اور اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ یہ شیلون ان جنگلوں میں میرے سب سے بڑے حریف ہیں اور وہ بھی مجھے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہیں۔ وہ میرے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور مجھے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے خیال میں، میں قبائلیوں کو گمراہ کر رہی ہوں۔ وہ سردار کو بھی میرے خلاف بہکانے کی کوشش ...... کرتے ہیں کہ مجھے یہاں سے نکال دیا جائے۔'' وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''دریا کے دوسری طرف ایک بستی میں، میں نے ایک اسکول کھول رکھا تھا جہاں اس بستی کے لوگوں کو لکھانے پڑھانے کے علاوہ مسیحیت کی تعلیم بھی دیتی تھی۔

ایک سال پہلے اس بستی میں تین آدمی ملیریا سے مر گئے۔ مقامی شیلون، سردار کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ یہ تباہی میرے اسکول کی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔ سردار نے میرا وہ اسکول بند کرا دیا۔''

ندیم خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ قبائلی پُرامن اور پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں کسی بیرونی حملہ آور کا خطرہ نہیں تھا لیکن اندر ہی اندر ایک دوسرے کے خلاف اس قسم کی سازشیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

''آئش نامی اس بچی کے والدین میری کوششوں سے عیسائی مذہب اختیار کر چکے ہیں اور اس عقیدے پر ان کا یقین بہت پختہ ہے۔'' گگن دیپ کہہ رہی تھی۔ ''اس بستی کے شیلون نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے کہ وہ بچی کو مرنے سے بچا سکتا تھا لیکن اس کے والدین نے اسے (شیلون کو) علاج کا موقع نہیں دیا۔ اس روز اس شیلون نے وہاں ہنگامہ مچا دیا تھا۔ ادھر بچی کی آخری رسومات ادا ہو رہی تھیں اور ان کے جھونپڑے کے سامنے شیلون نے اپنے چند غنڈوں کے ساتھ اپنا مخصوص قبائلی رقص شروع کر دیا تھا۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ غم زدہ والدین کا کیا حال ہوا ہوگا۔''

بات کرتے ہوئے گن دیپ کی آواز بھرّا گئی اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکی۔ ندیم اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگا۔ عورت کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کی اپنی حالت غیر ہو جاتی تھی۔

''سوری ندیم۔'' گگن دیپ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''میری وجہ سے تمہیں بھی...''

''کوئی بات نہیں۔'' ندیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

بستی کی طرف سے شور سنائی دینے لگا۔ شاید بستی کے مردوں میں ریسلنگ شروع ہو چکی تھی۔ ندیم کو جیوی کا خیال آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ کہیں جیوی ان لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم لوگوں کو واپس چلے جانا چاہیے۔'' گگن دیپ نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اب وہ اپنی کیفیت پر قابو پا چکی تھی اور اس کا لہجہ بھی کنٹرول میں تھا۔

''کیا؟'' ندیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں... جتنی جلد ممکن ہو سکے۔'' گگن دیپ نے کہا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' ندیم نے اسے گھورا۔ ''یہاں سے جانا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن دو تین گھنٹوں میں اندھیرا ہونے والا ہے... ایسی بھی کیا پریشانی ہے؟''

''پریشانی کی وجہ ہے۔'' گگن دیپ نے جواب دیا۔ ''صبح میں دوسری بستی گئی تھی۔ وہاں ایک آدمی کو ملیریا ہو گیا ہے اور یہ موذی مرض بڑی تیزی سے پھیلتا ہے۔''

''میں نے یہاں آنے سے دو دن پہلے کلوروکوئن کی گولیاں لے لی تھیں اور میرے خیال میں مچھروں کا زہر مجھ پر اثر نہیں کرے گا۔'' ندیم نے جواب دیا۔

''کیا تمہارے پاس کلوروکوئن کی گولیاں موجود ہیں؟'' گگن دیپ نے پوچھا تو ندیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی ندیم۔'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تم صورتِ حال کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر ملیریا کے اس مریض کا انتقال ہو گیا تو بات بگڑ جائے گی۔ شیلون کو کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس لیے تم لوگوں کا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' وہ ایک بار پھر چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی پھر کہنے لگی۔ ''سردار نے آج صبح سویرے دو آدمی دریاؤں کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے بھیجے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق دو تین گھنٹوں تک کچھ مشکل پیش آئے گی۔ اس کے بعد کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ تین آدمی دو کشتیوں پر تمہارے ساتھ جائیں گے۔ میں لاکو کو بھی تمہارے ساتھ کر دوں گی تاکہ اس کے توسط سے بات چیت میں آسانی رہے۔ اگر تم دریائے نارا تک پہنچ جاؤ تو برہم پترا تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

''اور یہ دریائے نارا یہاں سے کتنی دور ہے؟'' ندیم نے پوچھا۔

''تقریباً چار گھنٹے کے فاصلے پر... اس سے آگے چھ گھنٹے برہم پترا تک پہنچنے میں لگیں گے۔ تم لوگ بہاؤ کی طرف سفر کرو گے اس لیے ہو سکتا ہے کم وقت لگے۔'' گگن دیپ نے کہا۔

''لگتا ہے تم نے یہ پروگرام پہلے ہی سے بنا رکھا تھا۔'' ندیم نے اسے گھورا۔

''مجھ پر یقین کرو ندیم۔'' گگن دیپ نے کہا۔ ''ملیریا بہت موذی مرض ہے۔ میں دو مرتبہ اس کا شکار ہو چکی ہوں اور دوسری مرتبہ تو موت کے منہ سے لوٹ کر آئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ شیلون... تمہارے حوالے سے مجھے اس کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگتے۔''

''اور تم؟'' ندیم بولا۔

''میری فکر مت کرو۔ میں اپنا بچاؤ کر سکتی ہوں۔'' گگن دیپ نے جواب دیا۔

ندیم کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ گگن دیپ نے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مہذب دنیا سے ہزاروں میل دور جنگلوں میں رہ رہی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ فیروز باہمن کی چھوڑی ہوئی دولت سے جو جھگڑے پیدا ہوں گے ان سے نمٹنے میں برسوں لگ جائیں گے۔

''کیا ہم ان کے بارے میں کوئی بات کر سکتے ہیں؟''

ندیم نے قمیص کے اندر سے کاغذات والا پیکٹ نکال لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' گگن دیپ نے گہرا سانس لیا۔ ''تم اتنی دور سے آئے ہو۔ میں تمہاری خاطر ان کے بارے میں کچھ بات کر سکتی ہوں۔''

''شکریہ۔'' ندیم نے کہتے ہوئے پہلے فیروز باہمن کی وصیت والا کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

گگن دیپ وصیت نامہ پڑھنے لگی۔ شکستہ ہینڈ رائٹنگ کی وجہ سے اسے کچھ دشواری پیش آ رہی تھی لیکن بہر حال، وہ اس تحریر کو پڑھنے میں کامیاب ہو گئی۔

''کیا اس کی کوئی قانونی حیثیت ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے ندیم کی طرف دیکھا۔

''سو فیصد۔'' ندیم نے سر ہلایا۔ ''اسے ہر لحاظ سے قانونی تحفظ حاصل ہے۔''

گگن دیپ ایک بار پھر وصیت پڑھنے لگی۔ ندیم ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا ہو جاتا اور اسے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا۔ چاہے وہ خشکی پر ہو یا پانی میں... لیکن بہر حال وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔

''فیروز باہمن نے اس وصیت میں اپنے دوسرے بچوں کا خیال نہیں رکھا۔'' گگن دیپ نے کہتے ہوئے ندیم کی طرف دیکھا۔

''تمہیں بھی ان کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔'' ندیم بولا۔ ''ویسے بھی میرا خیال ہے کہ فیروز باہمن ایک اچھا باپ نہیں تھا۔''

''مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میری رضاعی ماں نے مجھے میرے باپ کے بارے میں بتایا تھا۔'' گگن دیپ بولی۔ ''میں اس وقت سات سال کی تھی۔ میرے رضاعی باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ فیروز باہمن نے کسی طرح مجھے تلاش کر لیا تھا اور میری رضاعی ماں کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ مجھے لے کر اس کے پاس چلی آئے۔ اس وقت میری رضاعی ماں نے مجھے میرے اصل ماں باپ کے بارے میں بتایا تھا لیکن مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ میں نے تو انہیں کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ میری حقیقی ماں نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی تھی اور میرا باپ بھی بلڈنگ سے چھلانگ لگا کر مر گیا۔ کیا ان کی یہ کمزوری میرے اندر بھی آ سکتی ہے؟''

''نہیں... تم ان سے زیادہ بہادر اور مضبوط ہو۔'' ندیم بولا۔ ''لیکن فیروز باہمن سے تمہاری ملاقات کب ہوئی تھی؟''

''اس بات کو ایک سال گزر گیا تھا۔'' گگن دیپ نے کہا۔ ''فیروز باہمن اور میری رضاعی ماں کے بیچ ٹیلی فون تک دوستی ہو گئی تھی اور ماں اس کی باتوں سے متاثر ہو چکی تھی۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آ گیا۔ ماں نے کیک اور چائے سے اس کی تواضع کی اور کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔

''وہ میرے کالج کے اخراجات کے لیے پیسے بھیجتا رہا اور جب میں بڑی ہو گئی تو وہ مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں اس کی کسی کمپنی میں ملازمت کر لوں۔ وہ اپنے آپ کو باپ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے اس سے نفرت ہو رہی تھی۔ پھر میری ماں مر گئی اور دنیا میرے لیے اندھیر ہو گئی۔ میں نے اپنا نام تبدیل کر کے میڈیکل اسکول میں داخلہ لے لیا اور فیروز باہمن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی لیکن میں اس کے لیے ہمیشہ دعا کرتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے بھول چکا ہے۔''

''لیکن وہ تمہیں نہیں بھولا۔'' ندیم نے جواب دیا۔ پھر اس نے دوسرے کاغذ نکال کر گگن دیپ کی طرف بڑھا دیے۔

دیپ نے بڑے محتاط انداز میں ان کاغذات کو پڑھا پھر بولی۔ ''میں کسی کاغذ پر دستخط نہیں کروں گی۔ مجھے دولت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ کاغذات اپنے پاس رکھ لو اور دعائیں پڑھ پڑھ کر ان پر پھونکتی رہو۔''

''تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟'' گگن دیپ نے اسے گھورا۔

''نہیں، میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' ندیم کراہا۔

''میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی لیکن تم سے ایک درخواست ضرور کروں گی۔ کسی کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔ پلیز! مجھے برباد مت کرنا۔ میں پُرسکون رہنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن تمہیں بھی کچھ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔'' ندیم نے کہا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" گگن دیپ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بات بالکل سیدھی سی ہے۔" ندیم بولا۔ "اگر تم یہ وصیت قبول کرلو تو دنیا کی امیر ترین عورت بن جاؤ گی۔ دوسری صورت میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ وصیت میڈیا کے لیے موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے۔ کوئی اخبار، ریڈیو، ٹی وی اور میگزین ایسا نہیں جس میں اس خبر کو اہمیت نہ دی جاتی ہو۔ ان سب کو تمہاری تلاش ہے۔"

"لیکن وہ لوگ مجھے کیسے تلاش کر سکتے ہیں؟" گگن دیپ بولی۔

"اچھا سوال ہے۔" ندیم نے کہا۔ "فیروز باہمن کے کاغذوں سے ہمیں تمہارا سراغ مل گیا تھا اور میں تم تک پہنچ گیا لیکن کوئی اور تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اور تم کسی کو میرے بارے میں بتاؤ گے نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ میں محفوظ ہوں۔" گگن دیپ نے کہا۔ "تم مجھے لوگوں سے بچاؤ گے ندیم... کسی کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ یہ میرا گھر ہے... یہ میرے لوگ ہیں۔ میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اب میں یہاں سے بھاگ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتی۔ وعدہ کرو ندیم... پلیز!"

"ٹھیک ہے۔" ندیم نے گہرا سانس لیا۔ "مجھ سے تمہارے لیے جو ہو سکا کروں گا۔"

گگن دیپ بستی کی طرف دیکھنے لگی۔ بہت سے لوگ بستی سے نکل کر دریا کی طرف جانے والے راستے پر جا رہے تھے۔ سب سے آگے سردار تھا، اس کے پیچھے اس کی بیوی۔ ایک درجن قبائلی، ان کے پیچھے جیوی اور جیوی کے پیچھے کم از کم ... دس ننگ دھڑنگ عورتیں۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ وہ لوگ دریا کی طرف جا رہے ہیں۔" گگن دیپ نے کہا۔

"کیا اندھیرے میں سفر محفوظ رہے گا؟" ندیم بولا۔

"سردار اپنے تین بہترین ماہی گیر تمہارے ساتھ بھیج رہا ہے۔ خدا تمہاری حفاظت کرے گا اور میں بھی تمہارے لیے دعا کرتی رہوں گی ندیم... ہر روز... ہر وقت... تم بہت اچھے آدمی ہو۔"

"مجھ سے شادی کرو گی؟" ندیم نے کہا۔

"نہیں۔" گگن دیپ نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا حرج ہے؟" ندیم بولا۔ "میں تمہاری دولت کا خیال رکھوں گا اور تم ان وحشی قبائلیوں کا خیال رکھنا۔ ہم یہیں کہیں بہت بڑا جھونپڑا بنا لیں گے اور ان قبائلیوں کی طرح بےلباس گھوما پھرا کریں گے۔"

گگن دیپ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ندیم بھی قہقہے میں شامل ہو گیا۔ اس دوران سردار پتا نہیں کس طرف سے گھومتا ہوا جھاڑیوں سے نکل کر ان کے سامنے آگیا۔ ندیم اس کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ غبار کی ایک لہر سی اس کے سینے میں دوڑ گئی۔ دماغ بھی سُن ہونے لگا۔ ندیم نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ اس نے گگن دیپ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

وہ لوگ دریا پر آگئے۔ ندیم کی آنکھوں کے پپوٹے دکھ رہے تھے اور کہنیوں کے جوڑوں میں بھی ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

لگتا تھا جیسے پوری بستی دریا کے کنارے پر جمع ہو گئی ہو۔ وہ لوگ انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ کئی آدمی دریا کے پایاب پانی میں اُتر گئے تھے۔ ان کی موٹر بوٹ اور درختوں کے کھوکھلے تنوں سے بنی ہوئی کشتیوں پر سامان لادا جا رہا تھا۔ ننگ دھڑنگ بچے اور عورتیں ان کے گرد جمع تھے۔ ندیم کبھی گگن دیپ کی طرف دیکھتا اور کبھی نظریں چرا کر ان عورتوں کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ گگن دیپ اس کی اس کیفیت پر مسکرا رہی تھی۔ ندیم نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ "شکریہ!"

"کس بات کا شکریہ؟" گگن دیپ بولی۔

"مجھے مایوس کرنے کا۔" ندیم نے کہا۔

"تم بہت اچھے آدمی ہو ندیم۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن مجھے اس دولت کی یا کسی کی پروا نہیں ہے۔ پلیز! تم واپس مت آنا اور اپنا خیال رکھنا۔"

تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ لاکو اور اس کے ساتھی اپنی کشتیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ جیوی بھی اپنی بوٹ میں بیٹھ کر چپو سنبھال چکا تھا۔

"سوچ لو گگن دیپ۔" ندیم بوٹ میں سوار ہوتے ہوئے بولا۔ "ہم اپنا ہنی مون دیبور گڑھ میں منائیں گے۔"

"گڈ بائے ندیم... واپس جا کر اپنے آدمیوں کو بتا دینا کہ تم مجھے تلاش نہیں کر پائے۔" گگن دیپ نے کہتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

قبائلیوں کی دونوں کشتیاں بہت آگے نکل چکی تھیں۔ جیوی نے چپو چھوڑ کر انجن اسٹارٹ کیا اور بوٹ کو ان کے پیچھے دوڑا دیا۔ دریا کا موڑ گھومتے ہوئے ندیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ سب لوگ ابھی تک کنارے پر کھڑے تھے اور گگن دیپ ہاتھ ہلا رہی تھی۔ ندیم نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔

سورج گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن ندیم کو پسینا آ رہا تھا۔ اسے اپنی گردن پر کیچوے رینگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بار بار چہرے اور گردن سے پسینا پونچھ رہا تھا۔

ندیم کو بخار ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ سردی بھی لگنے لگی تھی۔ وہ سیٹ میں دبک گیا اور جسم پر اوڑھنے کے لیے کسی چیز کی تلاش میں کشتی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ندیم؟" جیوی نے پوچھا۔ ندیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں کے پیچھے سے اٹھنے والی درد کی لہریں سر، گردن اور پھر ریڑھ کی ہڈی میں پھیلتی چلی گئیں۔ دریا کے تین موڑ اور گھومنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی جھیل میں پہنچ گئے جس کے وسط میں تین سوکھے ہوئے درخت آدھے سے زیادہ پانی میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ندیم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی یہ کوئی دوسرا راستہ تھا وہ کسی اور راستے سے اس طرف آئے تھے۔

"جیوی!" ندیم نے کہا۔ "شاید مجھے ملیریا ہو گیا ہے۔" اس کی آواز بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" جیوی چونک گیا۔ "بخار ہو رہا ہے کیا؟"

"ہاں اور میری آنکھوں کے سامنے بھی دھند سی پھیل رہی ہے۔" ندیم نے جواب دیا۔

جیوی نے بوٹ کا انجن بند کر دیا اور دوسرے قبائلیوں کو پکارنے لگا جن کی کشتیاں اس دوران بہت آگے نکل چکی تھیں۔ جیوی نے پہلے انجن کی ٹینکی میں تیل کا آخری ڈبا انڈیلا اور بستر بند کی طرح لپٹا ہوا خیمہ کھولنے لگا۔ ندیم سیٹ سے اٹھ کر بوٹ کے فرش پر لیٹ گیا۔ جیوی نے خیمہ کھول کر اسے اچھی طرح اوڑھا دیا۔ اس دوران وہ قبائلی بھی اپنی کشتیاں واپس لے آئے۔ وہ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور جب انہیں لاکو سے پتا چلا کہ اسے ملیریا ہو گیا ہے تو ان کی کشتیاں تیزی سے حرکت میں آگئیں۔

بوٹ کی رفتار خاصی تیز تھی یا فرش پر لیٹے ہونے کی وجہ سے ندیم کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کشتی کو لگنے والے کسی جھٹکے سے ندیم بے اختیار کراہ اٹھتا۔ اس کے پٹھے اور جوڑ بُری طرح دکھ رہے تھے اور سردی لگنے کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

بادلوں کی گرج کی آواز سن کر ندیم کی مایوسی مزید بڑھ گئی۔ اسی کی کسر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

بارش ان سے دور ہی رہی... شمال میں گھن گرج کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور ان کا سفر مشرق کی طرف جاری رہا۔ دو تین مرتبہ قبائلیوں نے اپنی کشتیاں روک کر آپس میں مشورہ کیا کہ انہیں کس طرف جانا چاہیے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد جیوی نے اپنی بوٹ کو ان کے قریب ہی رکھا تھا تاکہ اندھیرے میں ان سے بچھڑ کر کسی غلط دریا کی طرف نہ مڑ جائے۔ وہ بار بار مڑ کر ندیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ندیم کی طرف سے اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اسے اپنا وہ دوست یاد تھا جو ملیریا میں مبتلا ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس کا تو علاج کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی لیکن ندیم کے لیے تو فی الحال علاج کی کوئی سہولت بھی میسر نہیں تھی۔

دو گھنٹے کے سفر کے دوران کشتیاں کئی چھوٹے بڑے دریاؤں اور ندی نالوں میں سے گزریں اور بالآخر وہ ایک کشادہ دریا میں پہنچ گئے۔ یہاں کشتیوں کی رفتار کچھ ہلکی ہو گئی۔ قبائلی کچھ آرام کرنا چاہتے تھے۔ لاکو نے چیخ کر جیوی کو بتایا کہ وہ دشوار ترین مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ دریائے نارا اب یہاں سے صرف دو گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور دریائے نارا سے وہ سیدھا برہم پترا تک پہنچ جائیں گے۔

"کیا اب ہم یہاں سے اکیلے جا سکتے ہیں؟" جیوی نے پوچھا۔

"نہیں۔" لاکو نے جواب دیا۔ "آگے بھی کئی مقامات پر چھوٹے دریا اور نہریں اسی طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں کہ تمہیں صحیح راستے کا پتا نہیں چلے گا۔ میرے ساتھی آگے دریائے نارا پر ایک ایسی جگہ سے واقف ہیں جہاں کچھ دیر آرام کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔"

لاکو نے ندیم کے بارے میں بھی دریافت کیا تو جیوی نے بتایا کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ خیمے میں لپٹا ہوا ندیم ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بوٹ رکی ہوئی ہے لیکن اس نے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بخار سے اس کا جسم پھنک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوج کر بند ہو گئی تھیں اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ جیوی نے اس سے کچھ پوچھا لیکن وہ جواب نہیں دے پایا۔ اس پر بار بار غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

سفر پھر شروع ہو گیا لیکن اس مرتبہ کشتیوں کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ جیوی اپنی بوٹ کو ان کے بالکل ساتھ رکھے ہوئے تھا۔ اب بھی کئی جگہوں پر نالے اور ندیاں اس

دریا سے مل رہی تھیں اور جیوی راستہ دیکھنے کے لیے ٹارچ کی روشنی سے قبائلیوں کی مدد کر رہا تھا۔

لاکو کو بھی ندیم کی فکر تھی۔ وہ بار بار جیوی سے اس کے بارے میں دریافت کر رہا تھا کہ گگن دیپ کو جا کر کیا بتائے گا۔

”اسے بتا دینا کہ تمہارے دوست کو ملیریا ہو گیا تھا۔“ جیوی نے کہا۔

بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ آسمان پر بار بار بجلی چمک رہی تھی۔ قبائلیوں نے کشتیوں کی رفتار بڑھا دی۔ جیوی کو فکر تھی کہ کہیں انجن بند نہ ہو جائے۔ اس نے ٹینک میں تیل کا جو آخری کین انڈیلا تھا، اس سے چھ گھنٹے تک سفر جاری رکھا جا سکتا تھا۔ وہ دریائے برہم پترا تک پہنچ سکتا تھا۔ برہم پترا میں کسی نہ کسی بڑی کشتی یا لانچ کے ملنے کی توقع تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ صبح کی روشنی پھیلنے تک وہ برہم پترا تک پہنچ جائے گا۔

بجلی چمکتی رہی اور قبائلی پوری قوت سے کشتیوں کے چپو چلاتے رہے۔ بالآخر وہ ایک کشادہ دریا میں آ گئے جس کے دونوں کنارے پر خشکی تھی۔ یہ دریائے نارا تھا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ انہیں وہ جگہ بھی نظر آ گئی جہاں انہیں رکنا تھا۔ انہوں نے کنارے پر کشتیاں روک لیں۔

لاکو اپنی کشتی سے اتر کر موٹر بوٹ کے قریب آ گیا اور ندیم پر لپٹا ہوا خیمہ ہٹا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا جو انگارے کی طرح تپ رہی تھی۔ ملیریا میں تیز بخار معمول کی بات تھی لیکن ندیم کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے گگن دیپ کے ساتھ ملیریا کے کئی مریض دیکھے تھے۔ خود بھی تین مرتبہ اس مرض میں مبتلا ہوا تھا لیکن یہ کیفیت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ندیم کو دوبارہ خیمہ اوڑھا دیا گیا اور ایک بوڑھا قبائلی لاکو کے توسط سے جیوی کو بتانے لگا کہ وہ اپنی کشتی کو دریا کے وسط میں رکھے اور کسی سمت.... مڑنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر وہ سیدھے راستے پر رہا تو دو گھنٹے میں برہم پترا میں پہنچ جائے گا۔ جیوی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ندیم کا بخار کم ہونے کے بجائے مزید تیز ہو گیا تھا۔ جیوی ہر تھوڑی دیر بعد اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے بوتل اٹھا کر پانی کے چند گھونٹ اس کے ہونٹوں میں ٹپکائے اور باقی پانی اس کے چہرے پر انڈیل دیا۔

دریا کی سطح ہموار تھی۔ بوٹ کی رفتار بھی مناسب
آسمان پر بادل چھٹ گئے اور چاند کی روشنی میں دریا پگھلی ہوئی چاندی کی طرح چمک اٹھا۔ جیوی نے جانم رخ پر دریا میں سفر جاری رکھا۔

☆☆☆

رات کے تین بجے تھے۔ وہ دریا کا ایک موڑ گھو تھا کہ ایک بڑی کشتی کی روشنیاں دکھائی دیں۔ اس کے کی آواز سن کر جیوی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مال بردا ہے۔ ان جنگلوں میں بڑے دریاؤں کے ساتھ کئی بستیاں تھیں جہاں مویشیوں کے فارم بھی تھے اور کیلے باغات بھی۔ اس قسم کی بڑی کشتیاں ان دریاؤں میں لگاتی رہتی تھیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی کشتی تھی جو جنوب واقع سیام آئل فیلڈز کی طرف جا رہی تھی۔

جیوی کو اس کشتی سے اپنی بوٹ کے لیے پانچ کین بھی مل گیا اور گرم گرم کافی سے اس کی تواضع بھی کی گئی جب اس نے اس کشتی کے عملے سے اپنی کشتی جل پری بارے میں دریافت کیا تو ہر ایک نے لاعلمی کا اظہار کیا لوگ اسی طرف سے آ رہے تھے اور کسی نے برہم پترا میں جگہ جل پری کو نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے پرشوتم اسے کسی طرف لے گیا ہو۔

جیوی اپنی بوٹ پر آ گیا۔ دو کپ گرم گرم کافی پینے اس کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ اس نے ٹینک میں تیل ڈالا انجن اسٹارٹ کر کے کشتی کو پوری رفتار سے دوڑا دیا۔

صبح کی روشنی پھیلنے تک جیوی اس جگہ پہنچ گیا جہا دریائے کابسکا، برہم پترا سے ملتا تھا۔ اس سنگم پر اس جل پری کو چھوڑا تھا لیکن اب اس کا نام و نشان تک نظر آ رہا تھا۔

جیوی وہاں سے نصف میل آگے نکل گیا۔ یہاں ا بڑی نہر برہم پترا سے آ کر ملتی تھی اور اس سنگم پر مویشیوں ایک فارم بھی تھا۔ فارم کا مالک جیوی کو جانتا تھا۔ اس بتایا کہ اس رات زبردست طوفان آیا تھا۔ اگلے روز صبح اپنی کشتی پر اس طرف گیا تھا لیکن جل پری وہاں نہیں تھی شاید طوفان اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا اور وہ ڈوب گئی تھی۔

”اور وہ لڑکا؟“ جیوی بولا۔ ”کشتی پر ایک لڑکا بھی تھا۔“

”ہو سکتا ہے وہ بھی ڈوب گیا ہو۔“ اس شخص جواب دیا۔

آوازیں سن کر ندیم بھی ہوش میں آ گیا۔ اس کا

کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس نے انگلیوں سے آنکھیں کھول کر اطراف میں دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کے سینے اور گردن پر سرخ خراشیں سی تھیں جن میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ اس نے گردن گھمائی تو خون نکل آیا۔

''جیوی!''

''اب کیسے ہو ندیم؟'' جیوی نے قریب آ کر ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ ''تمہارا بخار کم ہو رہا ہے۔''

''ہم کہاں ہیں؟'' ندیم نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

''کابسکا کے سنگم پر ہماری کشتی ڈوب چکی ہے اور پرشوتم لاپتا ہے۔'' جیوی نے کہتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔

سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ ندیم ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے سے ٹکرانے والی ہوا اسے بھلی لگ رہی تھی لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے سردی لگنے لگی اور اس نے خود کو دوبارہ خیمے میں لپیٹ لیا۔

☆☆☆

ستیش چوپڑا نے بہت سوچ سمجھ کر پلاننگ کی تھی اور وہ سب اس وقت ڈیلکس او برائے ہوٹل کے پرائیویٹ ڈائننگ ہال میں جمع تھے۔ ستیش نے شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل کا یہ پورا ہال بک کروالیا تھا۔ میز پر انواع واقسام کے کھانے اور اعلیٰ ترین شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

گیارہ بجے تک وہ سب لوگ اس ہال میں جمع ہو چکے تھے۔ ستیش چوپڑا نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اسے ایک ایسا گواہ مل گیا ہے جس کے بیان سے کیس کا رخ ان کے حق میں مڑ سکتا ہے۔ اس نے یہ یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ اس میٹنگ کو دوسروں سے خفیہ رکھا جائے گا اور ان سب سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ بھی اس سلسلے میں رازداری کا خیال رکھیں۔

اس میٹنگ میں صرف فیروز باہمن کے بچوں کے وکیلوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کی سابقہ بیویوں کے وکیلوں کو اس کی بھنک بھی نہیں لگنے دی گئی تھی۔ تینوں سابقہ بیویوں کا کیس بہت کمزور تھا اور جج کے ریمارکس سے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی کامیابی کی کوئی توقع نہیں۔ اس لیے ستیش چوپڑا نے بھی انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔

چوپڑا نے درخواست کی تھی کہ ہر وارث کے زیادہ سے زیادہ دو وکیل اس میٹنگ میں شریک ہوں... بلکہ صرف ایک ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ وہ خود بھی اکیلا ہی تھا۔

فیروز باہمن کی تینوں سابقہ بیویوں میں سے کسی نے ابھی تک وصیت کو چیلنج نہیں کیا تھا جبکہ اس کے بچوں نے وقت ضائع کیے بغیر پٹیشنز داخل کروا دی تھیں اور ان میں ایک ہی مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ وصیت پر دستخط کرتے وقت فیروز باہمن کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔

فرشید باہمن کی نمائندگی کرتے ہوئے ستیش چوپڑا اس میٹنگ میں اکیلا ہی شریک ہوا تھا۔ سمرا کا وکیل کندن لال بھی اکیلا ہی آیا تھا۔ راون کے قانونی مشیر گنگو رام کے ساتھ بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ شروع ہی سے اکیلا تھا اور اس نے اپنے ساتھ کوئی اسسٹنٹ نہیں رکھا تھا۔ سوسن کا وکیل دھن راج مہتا بھی اپنے ساتھ کسی کو نہیں لایا تھا اور مرینہ کی خاتون وکیل بھی اکیلی ہی آئی تھی۔ مہتاب باہمن اپنے باپ کی موت کے بعد سے اب تک وکیلوں کی تین پارٹیوں کو برطرف کر چکا تھا اور اب اس نے ایک بہت بڑی لا کمپنی کے دو وکیلوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان دونوں نے ہما اور ہری چند کے ناموں سے اپنا تعارف کرایا تھا۔

ستیش چوپڑا نے ہال کا دروازہ بند کر دیا اور تقریر کرنے والے انداز میں انہیں وکرم سنگھ کے بارے میں بتانے لگا۔

''وہ تیس سال تک فیروز باہمن کے ساتھ رہا ہے۔'' ستیش چوپڑا کہہ رہا تھا۔ ''ہو سکتا ہے اس نے آخری وصیت لکھنے میں فیروز باہمن کی مدد کی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ یہ بیان دینے کو تیار ہو جائے کہ فیروز باہمن نے جب وصیت پر دستخط کیے تھے تو اس وقت اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔'' وہ خاموش ہو کر ساتھی وکیلوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ یہ خبر ان سب کے لیے بم کا دھماکا ثابت ہوئی تھی۔ ہر چہرے پر سنسنی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ چوپڑا بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے وہ یہ بیان بھی دے دے کہ وہ فیروز باہمن کی ہاتھ سے لکھی ہوئی اس وصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور یہ کہ اس روز فیروز باہمن صبح ہی سے اپنے حواس میں نہیں تھا۔''

''ہمارا یہ گواہ کیا چاہتا ہے... میرا مطلب ہے کتنی رقم؟'' کندن لال نے فوراً ہی اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

''پچاس لاکھ روپے۔'' چوپڑا نے جواب دیا۔ ''دس لاکھ ایڈوانس اور باقی کیس کا فیصلہ ہونے کے بعد!''

وکرم سنگھ کا یہ مطالبہ ان وکیلوں کے لیے زیادہ حیران کن نہیں تھا۔ اربوں کی دولت داؤ پر لگی ہوئی تھی اور اس لحاظ سے تو یہ بہت معمولی رقم تھی۔

''اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے مؤکلوں کے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔'' ستیش چوپڑا کہہ رہا تھا۔ ''لہٰذا اگر اس کارآمد گواہ کو خریدنا ہے تو ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ہم میں سے ہر ایک کے حساب میں تقریباً سوا لاکھ روپے آتے ہیں۔ یہ رقم ہم بعد میں اپنے مؤکلوں کے بل میں شامل کر سکتے ہیں۔ فی الحال تو اس رقم کا بندوبست ہمیں ہی کرنا ہوگا تاکہ وکرم سنگھ سے معاہدہ کر لیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بیان سے کیس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے گا یا کسی اور طریقے سے معاملہ طے ہو جائے گا۔''

دس لاکھ کا سن کر سب کے چہرے لٹک گئے۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ کندن لال پہلے ہی اپنے بینک سے اوور ڈرافٹ لے چکا تھا اور اس کا ٹیکس کا معاملہ بھی چل رہا تھا۔ ہما اور ہری چند کا تعلق ایک بڑی لا فرم سے تھا اور وہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔

''تمہارا مطلب ہے ہم ایک ایسے گواہ کو خطیر رقم ادا کر دیں جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا؟'' ہری چند نے اعتراض کیا۔

''یہ کہنا درست نہیں ہوگا۔'' ستیش چوپڑا نے جواب دیا۔ اس قسم کے سوال اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھے۔ ''وہ فیروز باہمن کے ساتھ اکیلا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی گواہ نہیں ہے۔ سچ وہی ہوگا جو وکرم سنگھ سے کہلوایا جائے گا۔''

''یہ بات اپنے من کو نہیں لگتی۔'' ہری چند بولا۔

''تمہارے ذہن میں اس سے بہتر کوئی اور تجویز؟'' چوپڑا نے اسے گھورا۔

ہما اور ہری چند کا تعلق بڑی لا فرم سے تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لوگ بدعنوانیوں میں ملوث نہیں تھے۔ ان کے ڈرامے بہت اونچے پیمانے پر ہوتے تھے۔ جن میں اعلیٰ سرکاری افسروں کو بھی شریک رکھا جاتا۔ اپنے حق میں فیصلے کروانے کے لیے ان اعلیٰ سرکاری افسروں کو کروڑوں کی رشوت دی جاتی جو ان کے سوئس بینکوں کے خفیہ اکاؤنٹس میں جمع کرا دی جاتی تھی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ لیکن یہاں جو کھیل ہو رہا تھا، انہیں پسند نہیں آیا تھا۔ ان کے خیال میں وکیلوں کا یہ گروہ گندگی کا ڈھیر تھا جس میں پتھر پھینکنے سے اپنے آپ کو غلاظت کے چھینٹوں سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ میرا مؤکل اس تجویز سے اتفاق نہیں کرے گا۔'' ہری چند نے کہا۔

''تمہارا مؤکل یہ تجویز سن کر اچھل پڑے گا۔'' ستیش چوپڑا نے کہا۔ ''ہم اسے تم سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ تم اس تجویز سے متفق ہو یا نہیں؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ وکرم سنگھ کو ادا کی جانے والی پچاس لاکھ کی گراں قدر رقم وکیل یعنی ہم اپنی ذاتی جیبوں سے ادا کریں؟'' یہ سوال ہما نے کیا تھا۔

''میرا مطلب یہی ہے۔'' ستیش چوپڑا نے جواب دیا۔

''ایسی صورت میں ہماری کمپنی آپ کی کسی ایسی اسکیم میں ساتھ نہیں دے سکتی۔'' ہما نے جواب دیا۔

''تو پھر تمہاری کمپنی کی بھی چھٹی ہو جائے گی۔'' دھن راج مہتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مہتاب باہمن ایک مہینے میں تین لا کمپنیوں کو اپنے کیس سے برطرف کر چکا ہے۔''

یہ حقیقت تھی۔ مہتاب باہمن اس کمپنی کو بھی دھمکی دے چکا تھا کہ اگر وہ ان کے کام سے مطمئن نہ ہوا تو انہیں بھی برطرف کر دیا جائے گا۔

''ہم میں سے کسی کو بھی نقد ادائیگی نہیں کرنی پڑے گی۔'' ستیش چوپڑا نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک بینک سے بات کر لی ہے۔ وہ ہمیں ایک سال کے لیے پچاس لاکھ روپے کی رقم قرض دینے کو تیار ہے۔ اس وقت ہمیں صرف قرضے کے کاغذات پر دستخط کرنے ہیں۔ چھ دستخط... اور میں اس معاہدے پر اپنے دستخط کر چکا ہوں۔''

''میں بھی دستخط کرنے کو تیار ہوں۔'' کندن لال جلدی سے بولا۔ ظاہر ہے اس کی اپنی جیب سے تو کچھ نہیں جا رہا تھا۔

''ایک بات کی وضاحت چاہتا ہوں۔'' گنگو رام بولا۔ ''پہلے ہمیں وکرم سنگھ کو ادائیگی کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد وہ زبان کھولے گا؟''

''ہاں... کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' ستیش چوپڑا نے جواب دیا۔

''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پہلے ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس کے ذہن میں کیا ہے؟''

''اس کے ذہن کو تیار کرنا پڑے گا۔'' ستیش چوپڑا نے جواب دیا۔ ''ادائیگی کرنے کے بعد وہ ہمارا زرخرید بن جائے گا۔ ہم اسے تیار کریں گے۔ اس کے ذہن میں وہ سب کچھ بٹھایا جائے گا جو ہم چاہتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وکرم سنگھ واحد گواہ ہے جو کیس کا رخ بدل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سیکریٹری ہے اور وہ بھی اس کیس میں اہم کردار

ادا کرسکتی ہے۔''

''اور وہ سیکریٹری کیا لے گی؟'' دھن راج نے پوچھا۔

''وہ ہمارا دردِسر نہیں ہے۔'' ستیش نے جواب دیا۔ ''اس کی ادائیگی وکرم سنگھ اپنے حصے میں سے کرے گا۔''

فیروز باہمن کا شمار ہندوستان کے امیر ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔ اس کی چھوڑی ہوئی دولت میں تقریباً اسی ارب روپے تو نقد رقم کی صورت میں تھے اور اس کی کھربوں کی جائداد اس کے علاوہ تھی۔ ان وکیلوں کے خیال میں ایسے مواقع تو زندگی میں کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ اس وقت تھوڑا سا رسک ضرور تھا لیکن بعد میں ان کے یہی مؤکل ان کے لیے سونے کی کانیں ثابت ہوتے۔

''میں اپنی کمپنی کو آمادہ کرلوں گی۔'' خاتون وکیل نے کہا۔ ''لیکن یہ سب کچھ راز میں رہنا چاہیے۔''

''یہ ہماری زندگیوں کا اہم ترین راز ہے۔ ہم تو کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔'' گنگو رام نے کہا۔ ''کیا ہم یہ نہیں جانتے کہ عدالت میں جھوٹی گواہی دینا سنگین جرم ہے اور ہم اس راز کو کیسے فاش کرسکتے ہیں۔''

''یہاں میں تم سے اتفاق نہیں کروں گا۔'' دھن راج مہتا نے کہا۔ ''یہ جھوٹی گواہی نہیں ہوگی۔ وکرم سنگھ واحد گواہ ہے اور وہی حقیقت بیان کرے گا۔ اگر وہ یہ کہے کہ اس نے وصیت لکھنے میں فیروز باہمن کی مدد کی تھی اور یہ کہ اس وقت فیروز باہمن اپنے حواس میں نہیں تھا تو اس کے بیان کو کون چیلنج کرسکتا ہے؟ بہت شان دار آئیڈیا ہے... میں دستخط کرنے کو تیار ہوں۔''

''اس طرح دستخط کرنے والوں کی تعداد چار ہوگئی۔'' ستیش چوپڑا بولا۔

''میں بھی تیار ہوں۔'' گنگو رام نے کہا۔

ستیش چوپڑا نے ہمبا اور ہری چند کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو ہری چند نے کہا۔ ''ہمیں اپنی کمپنی سے مشورہ کرنا پڑے گا۔''

''کیا مجھے دوبارہ یہ یاد دلانا پڑے گا کہ یہ معاملہ بہت کونفیڈنشل ہے۔'' کندن لال نے کہا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ایک سڑک چھاپ وکیل اپنے سے بہت اونچے وکیل سے اس تحقیر آمیز لہجے میں بات کررہا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' ہری چند نے تحمل سے جواب دیا۔

ستیش چوپڑا گہری نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میٹنگ ختم ہوتے ہی پہلی فرصت میں وہ فرشید کو صورتِ حال سے آگاہ کرے گا اور فرشید اپنے بڑے بھائی مہتاب کو بتائے گا کہ اس کے قانونی مشیروں کی وجہ سے ایک بہت بڑی ڈیل کا بیڑا غرق ہورہا ہے اور ہمبا اور ہری چند کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر فارغ کردیا جائے گا۔

''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرلو۔'' ستیش چوپڑا نے کہا۔ ''وکرم سنگھ اس وقت قلاش ہورہا ہے۔ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔ ہماری طرف سے مایوس ہوکر وہ دوسری طرف بھی جاسکتا ہے۔''

''دوسری پارٹی کون ہوسکتی ہے؟'' خاتون وکیل نے کہا۔ ''ہمارے تمام مؤکلوں نے تو وصیت کو چیلنج کردیا ہے۔ گگن دیپ لاپتا ہے... اور کون ہوسکتا ہے؟''

''گگن دیپ لاپتا نہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔'' ستیش چوپڑا نے کہا۔ ''سلطان زیدی جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور وہ عین وقت پر سامنے آجائے گی۔''

''اسی ارب روپے!'' دھن راج نے گہرا سانس لیا۔ ''بہت بڑی رقم ہے۔ اسے سامنے آنا ہی پڑے گا۔''

اسی ارب واقعی بہت بڑی رقم تھی۔ ہر وکیل حساب لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ فیروز باہمن کے چھ وارثوں میں سے ہر ایک کے حصے میں کتنی رقم آئے گی اور طے شدہ پرسنیج کے حساب سے ان کے حصے میں کیا آئے گا۔

☆☆☆

دوپہر کے قریب دریا کے کنارے ایک بہت بڑا ہٹ دیکھ کر جیوی نے کشتی روک لی۔ یہ ہٹ دراصل ایک دکان تھی۔ دریا میں سفر کرنے والے لوگ یہاں سے اپنی ضرورت کی چیزیں لے لیا کرتے تھے۔ ہٹ کے مالک لکشمن نے ہٹ کے دوسری طرف کچھ مویشی بھی پال رکھے تھے۔ وہ بوڑھا لکشمن، جیوی کے باپ کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ جیوی نے اس کی مدد سے ندیم کو کشتی سے اتار کر ہٹ کے برآمدے میں پڑے ہوئے لکڑی کے ایک تخت پر لٹا دیا۔ ندیم کا بدن اس وقت بھی تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ جیوی نے لکشمن کو پچھلے ایک ہفتے کے دوران پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مختصراً بتا دیا اور اپنی جل پری کے بارے میں دریافت کیا۔

''اس رات بڑا زبردست طوفان آیا تھا اور تمہاری جل پری ڈوب گئی تھی۔'' لکشمن نے بتایا۔

''اور پرشوتم داس... اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟'' جیوی نے پوچھا۔

''اسے مویشیوں والی ایک کشتی نے بچا لیا تھا۔'' لکشمن نے جواب دیا۔ ''وہ لوگ کچھ دیر کے لیے یہاں ہم رکے تھے۔ پرشوتم خیریت سے ہے اور اس وقت دیبور گڑھ میں ہوگا۔''

پرشوتم کے بارے میں سن کر جیوی کو تسلی ہوئی۔ کشتی کے ڈوبنے کا اسے بہرحال افسوس تھا۔ لکشمن باتیں کرتے ہوئے بار بار ندیم کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ ندیم پر اس وقت نیم مدہوشی سی طاری تھی۔ وہ ان کی آواز تو سن رہا تھا مگر باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔

''یہ ملیریا نہیں ہوسکتا۔'' لکشمن نے ندیم کی گردن پر خراش کو چھوتے ہوئے کہا۔ جیوی بھی آگے جھک گیا۔ ندیم کی آنکھیں اب بھی سوجی ہوئی تھیں۔

''تو پھر یہ کیا ہے؟'' اس نے الجھی ہوئی نظروں سے لکشمن کی طرف دیکھا۔

''ملیریا میں جسم پر اس طرح خراشیں نہیں پڑتیں۔ البتہ یہ علامتیں ڈینگو بخار میں پائی جاتی ہیں۔'' لکشمن نے کہا۔ ''یہ بیماری بھی ملیریا سے ملتی جلتی بھی ہے جو مچھروں سے پھیلتی ہے۔ تیز بخار، سردی لگنا، پٹھوں اور جوڑوں میں شدید درد اور آنکھیں سوج جانا... اور یہ سرخ خراشیں... یہ تو سوفیصد ڈینگو کی علامت ہے۔''

''مجھے یاد آگیا۔ ایک مرتبہ میرا باپ بھی اس طرح بیمار ہوا تھا۔'' جیوی بولا۔

''جتنی جلد ممکن ہو سکے اسے دیبور گڑھ لے جاؤ۔'' لکشمن نے کہا۔

''کیا تم مجھے اپنی بوٹ مستعار دے سکتے ہو؟'' جیوی بولا۔

لکشمن کی موٹر بوٹ جیوی کی بوٹ سے بہتر حالت میں تھی اور اس کا انجن بھی زیادہ طاقتور تھا۔ ندیم کو اٹھا کر اس بوٹ میں ڈال دیا گیا۔ ندیم پر مسلسل مدہوشی سی طاری تھی اور اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔

اس وقت ڈھائی بجے تھے۔ دیبور گڑھ نو دس گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ جیوی نے لکشمن کو بینر جی کا فون نمبر دے دیا۔ برہم پترا میں سفر کرنے والی بعض بڑی کشتیوں پر ریڈیو بھی ہوتے تھے۔ جیوی نے لکشمن کو ہدایت کردی تھی کہ اگر ایسی کوئی کشتی اس طرف نکل آئے تو ریڈیو کے ذریعے بینر جی کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا جائے۔

بوٹ پوری رفتار سے برہم پترا کی سطح پر دوڑ رہی تھی اور جیوی ندیم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈینگو واقعی خطرناک بیماری تھی۔ ایک مرتبہ اس کا باپ بھی اس میں مبتلا ہوچکا تھا۔ وہ ایک ہفتے تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا تھا۔ تیز بخار اور سوجی ہوئی آنکھیں، جوڑوں اور پٹھوں میں شدید درد... اس کا باپ سختیاں برداشت کرنے کا عادی تھا لیکن اس بیماری نے اسے بھی لاغر کردیا تھا۔

جیوی نے ندیم کی طرف دیکھا۔ وہ خیمے میں لپٹا ہوا تھا۔ جیوی ندیم کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔

☆☆☆

پہلی مرتبہ ندیم کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی چمک میں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا اور دوسری مرتبہ ہوش میں آیا تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ اسے بڑی شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔ پیٹ میں بھی گرہیں پڑتی محسوس ہورہی تھیں۔ اس نے جیوی سے کچھ کہنا چاہا مگر آواز اس کے حلق سے نہیں نکلی۔ کمزوری اور نقاہت نے اس کی قوتِ گویائی بھی سلب کرلی تھی۔ جوڑوں کے درد نے اسے الگ بے چین کر رکھا تھا۔ وہ کشتی کے پیندے میں گٹھڑی سا بنا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی تو چونک گیا۔ گگن دیپ اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے گھٹنے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ساتھ لیٹے ہونے کے باوجود گگن دیپ کا باقی جسم اس سے دور تھا۔ شاید گھٹنوں کا چھو جانا ہی اس کے لیے بہت معنی رکھتا تھا۔ وہ گیارہ سال سے ان قبائلیوں میں رہ رہی تھی جہاں مرد پتوں سے اپنی شرم گاہیں ڈھانپتے تھے اور عورتیں برہنہ رہتی تھیں۔ گیارہ سال بہت طویل عرصہ تھا لیکن گگن دیپ نے اپنے اور ان کے درمیان شرم و حیا کا ایک فاصلہ قائم رکھا تھا۔ وہ ان کے سامنے کبھی بے لباس نہیں ہوئی تھی۔ گیارہ سال کے اس طویل عرصے میں وہ مہذب انسانوں سے بھی دور رہی تھی۔ وہ یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ بوسہ کیا ہوتا ہے اور ایک مرد کا قرب کیا معنی رکھتا ہے۔

وہ اس کے رخسار پر بوسہ دینا چاہتا تھا لیکن ایسا نہیں کرسکا۔ وہ تو شاید بوسے کا مطلب بھی نہیں سمجھتی ہوگی۔ گگن دیپ نے بتایا تھا کہ وہ کالج کے زمانے میں ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اپنے دوست کا آخری بوسہ کب لیا تھا لیکن وہ یہ بھی نہیں پوچھ سکا۔

ندیم ایک ہاتھ سے اس کا گھٹنا سہلانے لگا۔ گگن دیپ نے کوئی اعتراض یا احتجاج نہیں کیا لیکن ندیم اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کے ہاتھ کی حرکت ایک حد سے آگے نہیں بڑھی۔

ندیم سے ہمدردی اور لگاؤ گگن دیپ کو یہاں لے آئی تھی۔ وہ اس بیماری کے خلاف اس کا حوصلہ بڑھانا چاہتی تھی، اسے تسلی دینا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی دو مرتبہ ملیریا کا شکار ہوچکی

تھی اور وہ جانتی تھی کہ یہ مرض انسان کو کس طرح نچوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

گگن دیپ اس کا بازو سہلا رہی تھی اور سرگوشی میں اسے بتا رہی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ گگن دیپ کے ہاتھ کے لمس سے وہ عجیب سا سرور محسوس کرنے لگا اور پھر گگن دیپ نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ندیم نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ اسے پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ خلا میں لہرا گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گگن دیپ وہاں نہیں تھی۔ وہ اکیلا ٹینٹ میں لیٹا کشتی کے پیندے پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کراہ سی نکل گئی۔

☆☆☆

جیوی نے دو تین مرتبہ ندیم کے کراہنے کی آوازیں سنی تھیں اور ہر مرتبہ اس نے اسے کشتی روک کر تھوڑا بہت پانی پلایا تھا اور کچھ پانی اس کے سر پر بھی ڈالا تھا۔ بخار کی شدت سے وہ مسلسل تپ رہا تھا۔

''ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔'' وہ بار بار ندیم کو تسلی دیتا۔ ''تم ٹھیک ہو جاؤ گے... گھبراؤ نہیں، ہمت رکھو۔''

دیبور گڑھ شہر کی روشنیاں دیکھتے ہی جیوی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے زندگی میں بیسیوں بار جنگل سے واپس آتے ہوئے یہ روشنیاں دیکھی تھیں لیکن آج ان روشنیوں کا مطلب کچھ اور تھا۔ وہ جگمگاتی ہوئی روشنیاں زندگی کا پیغام دے رہی تھیں۔

بوٹ جیٹی سے ٹکرائی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ جیوی چھلانگ لگا کر کشتی سے اترا۔ اس کی رسی جیٹی کے ایک کنڈے سے باندھی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گھاٹ سنسان پڑا تھا۔ وہ گھاٹ کے آخری سرے پر ٹیلی فون بوتھ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

بینر جی بستر پر لیٹا سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا اور چند سیکنڈ بعد ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے... کس کا فون تھا؟'' بیڈ پر لیٹی ہوئی اس کی بیوی نے دریافت کیا۔

''جیوی واپس آ گیا ہے۔'' بینر جی نے جواب دیا۔

''کون جیوی؟'' بیوی کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

بینر جی اس کے سوال کو نظر انداز کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کو صرف اتنا بتایا کہ وہ دریا کے گھاٹ پر جا رہا ہے۔

شہر کی سڑکوں پر تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے اپنے موبائل فون پر اپنے ایک ڈاکٹر دوست کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا اور اسے جلد از جلد اسپتال پہنچنے کے لیے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

جیوی جیٹی کے قریب بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ندیم ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں بینر جی وہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں نے ندیم کو اٹھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ بینر جی نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور کار کو طوفانی رفتار سے شہر کی طرف دوڑا دیا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال کلبلا رہے تھے۔

''یہ کب بیمار ہوا تھا؟''

''پتا نہیں۔'' پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے جیوی نے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ نیند سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہ دو دن سے جاگ رہا تھا۔ ''دنوں کا حساب نہیں رہا۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے۔ یہ ڈینگو بخار ہے۔ جسم پر خراشیں عام طور پر چوتھے یا پانچویں دن ظاہر ہوتی ہیں اور میں دو دن سے یہ خراشیں دیکھ رہا ہوں۔''

''اس عورت کا پتا چلا؟''

''ہاں۔'' جیوی نے مختصر سا جواب دیا۔

''کہاں ہے وہ؟'' بینر جی نے اگلا سوال کیا۔

''پہاڑوں کے قریب۔ میرا خیال ہے کہ وہ برما کی سرحد میں ہے۔ انگامی قبیلے میں۔'' جیوی نے جواب دیا۔ ''ہم بڑی مشکل سے وہاں تک پہنچے تھے۔ پرشوتم کیسا ہے؟''

''وہ ٹھیک ہے۔'' بینر جی بولا۔ ''مجھے اس عورت کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے کیا کہا؟''

''میری اس سے بات نہیں ہوئی۔ ندیم سے پوچھ لینا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسے پسند کرنے لگی تھی۔'' جیوی نے جواب دیا۔

ندیم پچھلی سیٹ پر مدہوش پڑا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی بات کا جواب دے سکے۔

اسپتال کے گیٹ پر ایک وارڈ بوائے وھیل چیئر لیے تیار کھڑا تھا۔ ندیم کو وھیل چیئر پر ڈال دیا گیا۔

ندیم کو فوراً ہی ایمرجنسی روم میں پہنچا دیا گیا۔ بینر جی کا ڈاکٹر دوست ان سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ ندیم کو بیڈ پر لٹا کر ایک نرس نے اس کے کپڑے اتار دیے اور ٹھنڈے پانی سے بھیگے ہوئے کپڑے سے اس کا بدن صاف کرنے لگی۔

ڈاکٹر آگے جھک کر ندیم کا معائنہ کرنے لگا۔ مچھروں کے کاٹنے سے پورے جسم پر نشان پڑے ہوئے تھے اور دا

سرخ خراشیں ٹھوڑی سے لے کر پیٹ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ٹمپریچر اور بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ یہ ڈینگو بخار ہے۔ وہ نرس کو لمبی چوڑی ہدایات دینے لگا۔ لگتا تھا جیسے نرس پوری توجہ سے اس کی باتیں نہ سن رہی ہو۔ تاہم اس نے اتنا ضرور کیا کہ ٹھنڈے پانی سے ندیم کا سر دھونے لگی۔ ندیم کچھ بڑبڑایا لیکن اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔

''بخار بہت تیز ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ڈرپ لگانی پڑے گی۔''

نرس نے ندیم کی آنکھوں پر کپڑے کی ایک گدی رکھ کر اسے ٹیپ سے چپکا دیا اور اس کے ایک بازو میں ڈرپ لگانے کے بعد اسے پیلے رنگ کا گاؤن سے ملتا جلتا ایک چوغہ سا پہنا دیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اس کا ٹمپریچر چیک کیا۔

''بخار ٹوٹ رہا ہے۔'' وہ نرس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر دوبارہ تیز ہونے لگے تو مجھے فوراً گھر پر فون کر دینا۔''

وہ لوگ کمرے سے باہر آ گئے۔ ڈاکٹر ان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا اور بینر جی، جیوی کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جیوی کا گھر شہر کے دوسرے سرے پر تھا اور کار کا رخ اسی طرف تھا۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے جیوی کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

سلطان زیدی کی بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ وہ گھر پر اکیلا ہی تھا اور کچھ دیر پہلے ہی سویا تھا کہ فون کی گھنٹی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت رات کے دو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔

''میں بینر جی بول رہا ہوں۔'' ریسیور کان سے لگاتے ہی یہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

سلطان کی نیند غائب ہو گئی۔ ''ہیلو بینر جی! کیا خبر ہے؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''تمہارا دوست واپس آ چکا ہے لیکن بیمار ہے۔'' اس نے کہا۔

''اوہ... کیا ہوا؟'' سلطان بولا۔ ''تشویش کی بات تو نہیں؟''

''اسے ڈینگو بخار ہے۔ ملیریا سے ملتا جلتا یہ بخار ایک خاص قسم کے مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہے اور میرا ایک ڈاکٹر دوست اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔''

''کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟'' سلطان نے کہا۔

''اس وقت ممکن نہیں۔ تیز بخار کی وجہ سے اس پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری ہے۔ شاید کل تم سے بات کرنے کے قابل ہو سکے۔'' بینر جی نے جواب دیا۔

''وہ عورت اسے ملی یا نہیں؟'' سلطان زیدی نے پوچھا۔

''ہاں مل گئی۔'' بینر جی نے جواب دیا۔

سلطان زیدی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے اس کے کمرے کا فون نمبر دو۔''

''اس کے کمرے میں فون نہیں ہے۔'' جواب ملا۔ ''یہاں ایک ہی اسپتال ہے اور یہ ممبئی کے اسپتالوں سے بالکل مختلف ہے۔''

''کیا میرے آنے کی ضرورت ہے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''تمہاری مرضی لیکن میرے خیال میں تمہارے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور اس کی بہت اچھی طرح..... دیکھ بھال ہو رہی ہے۔''

''وہ اسپتال میں کب تک رہے گا؟'' سلطان نے پوچھا۔

''چند روز تو لگیں گے۔'' جواب ملا۔

''کل صبح فون کرنا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔''

سلطان نے فون بند کر دیا اور بیڈ روم سے نکل کر کچن میں آ گیا۔ پہلے اس نے فریج سے بوتل نکال کر ٹھنڈا پانی پیا پھر کافی بنائی اور کپ اٹھا کر مکان کے بیسمنٹ میں اپنے دفتر میں آ گیا۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔

☆☆☆

ندیم کی بہترین دیکھ بھال کی گئی تھی۔ اسپتال میں لائے جانے کے دو گھنٹے بعد اس کا بخار ٹوٹ گیا۔ پسینا بھی رک گیا اور جوڑوں اور پٹھوں کا درد بھی بڑی حد تک غائب ہو گیا۔ نرس نے جب اسے ایمرجنسی روم سے دوسرے کمرے میں منتقل کیا تو اس وقت وہ گہری نیند میں تھا۔

اس کمرے میں پانچ مریض اور تھے لیکن آنکھوں پر پٹی بندھی ہونے اور گہری نیند میں ہونے کی وجہ سے ندیم نہ تو ساتھ والے بیڈ پر پڑے، سردی سے کپکپاتے ہوئے بوڑھے کے جسم پر کھلے ہوئے زخم دیکھ سکتا تھا، نہ ہی سامنے والے بیڈ پر دم توڑتے ہوئے آدمی کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی کمرے میں بکھری ہوئی غلاظت کی بو سونگھ سکتا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا اور اس کے نتھنوں سے ہلکے ہلکے خراٹے خارج ہو رہے تھے۔

☆☆☆

فرشید باہمن کے اپنے نام کوئی جائداد نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ ہی سے مالی بحران شکار رہا تھا لیکن وہ حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ صرف یہی ایک صفت تھی جو باپ کی طرف سے اسے ورثے میں ملی تھی۔

اپنے بہن بھائیوں میں وہ واحد شخص تھا جس نے وصیت کے خلاف دائر کی جانے والی چھ کی چھ پٹیشنز کا مطالعہ کیا تھا جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چھ کے چھ وکیلوں نے ایک دوسرے کی نقل کی ہے۔ یہاں تک کہ کئی جملے بھی لفظ بہ لفظ نقل کیے گئے تھے۔

چھ وکیل ایک ہی لڑائی لڑ رہے تھے اور ہر ایک یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ فیروز باہمن کے وارثوں کو ملنے والی وراثت سے اپنا حصہ وصول کرے گا۔

فرشید باہمن کے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ اپنے خاندان کے مفاد میں بھی تھوڑا بہت کام کرلیا جائے۔ اس نے مہتاب باہمن سے اپنا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس کے خیال میں اسے آسانی سے قائل کیا جاسکتا تھا۔

مہتاب باہمن ملاقات پر آمادہ ہوگیا۔ دونوں بھائیوں کی بیویاں ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتی تھیں اس لیے طے کیا گیا تھا کہ اس ملاقات کو ان سے خفیہ رکھا جائے گا اور ہو سکتا ہے اس ملاقات سے دونوں بھائی ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ فرشید نے بڑے بھائی کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ خود کو تباہی سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ دلوں سے کدورت ختم کردی جائے۔

ان دونوں کی ملاقات شہر کے نواحی علاقے میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ وہ بہت عرصے بعد ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ موسم اور کھیل پر گفتگو کے بعد ان کی جھجک دور ہوگئی اور اس کے فوراً ہی بعد فرشید اصل موضوع پر آگیا۔

''معاملہ بہت نازک اور اہم ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس سے ہم کیس جیت بھی سکتے ہیں اور تباہی ہمارا مقدر بھی بن سکتی ہے۔'' وہ وکرم سنگھ کی گواہی اور اپنے وکیلوں کی رائے کے بارے میں بتانے لگا۔ ''تمام وکیلوں نے بینک سے قرضے کے معاہدے پر دستخط کردیے ہیں... سوائے تمہارے وکیلوں کے۔ ان کے دستخط نہ کرنے سے سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔'' بات کرتے ہوئے وہ محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ ان کی نگرانی تو نہیں ہورہی۔

''وہ کتے کا بچہ پچاس لاکھ مانگ رہا ہے۔'' مہتاب باہمن بولا۔ ''کیا وہ اپنی حیثیت بھول گیا ہے؟''

''یہ تو کاروباری معاملہ ہے۔'' فرشید نے کہا۔ ''وہ یہ بیان دینے کے لیے تیار ہے کہ جب ڈیڈی نے وصیت لکھی تھی تو وہ اکیلا ان کے پاس موجود تھا۔ وہ دس لاکھ روپے ایڈوانس مانگ رہا ہے۔ باقی رقم کے لیے ہم بعد میں اس سے نمٹ لیں گے۔''

فرشید کی تجویز مہتاب باہمن کو پسند آئی۔ وکیلوں کو تبدیل کردینا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

''کیا تم نے وہ پٹیشنز پڑھی ہیں؟'' فرشید نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' مہتاب باہمن نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے تو وہ پٹیشن بھی نہیں پڑھی تھی جو اس کی طرف سے داخل کی گئی تھی۔ ہمبا اور ہری چند نے اس پٹیشن کے حوالے سے تفصیل سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر مہتاب کو اس وقت اپنی بیوی درگا کے ساتھ کہیں جانے کی جلدی تھی۔ اس نے وکیلوں کی پوری بات سنے اور پٹیشن پڑھے بغیر اس پر دستخط کردیے تھے۔

''میں نے بہت احتیاط سے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ سب کی سب ایک جیسی ہیں۔ لگتا ہے ایک پٹیشن کو سامنے رکھ کر چند الفاظ کے ردوبدل سے ان کی کاپیاں تیار کرلی گئی ہوں۔'' فرشید نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''چھ لافر میں ایک ہی کام کررہی ہیں۔ ان کا مقصد ایک ہی ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں؟''

''اس پر سوچا تو میں نے بھی تھا مگر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' مہتاب نے اسے گھورا۔

''وہ چھ کے چھ وکیل امید لگائے بیٹھے ہیں کہ جب معاملہ طے ہوگا تو وہ بھی کروڑ پتی بن جائیں گے۔ تمہارا اپنے وکیل سے کتنے فیصد پر معاملہ طے ہوا ہے؟''

''ستیش چوپڑا تم سے کیا لے رہا ہے؟'' مہتاب نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''پچیس فیصد۔'' فرشید نے جواب دیا۔

''میرا معاملہ بیس فیصد میں طے ہوا ہے۔'' مہتاب باہمن نے اس طرح جواب دیا جیسے اس معاملے میں اس نے اپنے بھائی سے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہو۔

''اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے تو وکرم سنگھ اور ان وکیلوں کا کمیشن دینے کے بعد ہمارے حصے میں صرف اکتیس فیصد رقم آئے گی۔ تم میرا مطلب سمجھ

رہے ہونا... سب کچھ تو یہ وکیل لے جائیں گے۔''

مہتاب باہمن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ یہ بات تو اس نے پہلے کبھی سوچی ہی نہیں تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے فرشید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''لیکن...'' فرشید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارے وکیلوں کو ہٹا دیا جائے اور ہم دونوں ایک ہوجائیں تو میرے وکیل ستیش چوپڑا کو اپنی فیس کم کرنی پڑے گی۔ ہمیں اتنے سارے وکیلوں کی ضرورت نہیں ہے بھائی۔ یہ سب ایک دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان کی نظریں ہماری دولت پر ہیں۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ کب معاملہ طے ہو اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر جھپٹ پڑیں۔''

''میں ستیش چوپڑا کو پسند نہیں کرتا۔'' مہتاب باہمن نے کہا۔ ''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ستیش کی چھٹی کرکے معاملہ میرے وکیلوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے؟''

''ستیش چوپڑا ہی نے وکرم سنگھ کو تلاش کیا ہے۔ وکرم کو رقم کی ادائیگی کے لیے بینک سے بات بھی اسی نے کی ہے اور ستیش چوپڑا قرضے کے معاہدے پر دستخط کرچکا ہے جبکہ تمہارے وکیلوں نے صاف انکار کردیا ہے۔ اس لیے ہم ستیش چوپڑا کو رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس معاملے سے وہی بہتر طور پر نمٹ سکتا ہے۔'' وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ ''اگر ہم دونوں مل جائیں تو ہمارے حوالے سے ستیش چوپڑا کا کمیشن بھی پینتالیس سے بیس فیصد پر آجائے گا۔ اگر ہم سوسن کو ملالیں تو یہ فیس سترہ فیصد اور سمرا کو بھی ملا لینے کی صورت میں ستیش چوپڑا پندرہ فیصد تک آنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

''سمرا کبھی اس پر راضی نہیں ہوگی۔'' مہتاب باہمن نے کہا۔

''یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔'' فرشید مسکرایا۔ ''ہم تین بھائی بہن ایک ہوجائیں گے تو وہ بھی ہماری بات سننے پر مجبور ہوجائے گی۔''

''اس کے بدمعاش شوہر سے کیسے نمٹو گے؟'' مہتاب باہمن نے یہ بات بڑے خلوص سے کہی تھی کیونکہ اسے یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ اس کی بہن سمرا کا شوہر کرتار سنگھ اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے لیکن بات کرتے ہوئے وہ یہ بھول گیا تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے اس کے بھائی کی بیوی بھی کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ وہ عریاں تصویریں کھنچوانے اور عریاں ڈانس کی شوقین تھی اور وہ بھی شوہر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔

''ہم ان سے الگ الگ بات کریں گے اور پھر ہم سوسن سے بات کریں گے۔ دھن راج مہتا اس کا قانونی مشیر ہے جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔'' فرشید نے کہا۔

''اس سلسلے میں ہمیں خاصی مشکلات پیش آئیں گی۔'' مہتاب بولا۔

''اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو ہمارے سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔'' فرشید نے جواب دیا۔

ان دونوں کے درمیان کچھ دیر اور بات ہوئی پھر ان کی یہ میٹنگ ختم ہوگئی۔

☆☆☆

دریائے نارا کے کنارے وہ اونچی اور خشک جگہ برسوں سے انگامی قبائلیوں کے استعمال میں تھی۔ شدید سیلاب میں بھی یہ جگہ پانی کی زد میں آنے سے محفوظ رہتی تھی۔ قبائلی ماہی گیر اکثر یہاں رات گزارنے کے لیے رک جاتے تھے اور دریا میں سفر کے دوران آرام کرنے کے لیے بھی وہ یہاں پڑاؤ ڈال لیا کرتے تھے۔

گگن دیپ، لاکو اور تیمن نام کا ایک اور قبائلی اسی جگہ ایک ویران جھونپڑے میں دبکے طوفان کے گزر جانے کا انتظار کررہے تھے۔ جھونپڑے کی چھت جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے آنے والے تیز ہوا کے تھپیڑے ان سے ٹکرا رہے تھے۔

وہ ابھی دریا ہی میں تھے کہ طوفان نے انہیں گھیر لیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے تک دریا کی بپھری ہوئی موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے اور درخت کے کھوکھلے تنے سے بنی ہوئی کشتی کو بھی کسی طرح کھینچ کر جھونپڑے تک لے آئے تھے۔ گگن دیپ کے کپڑے پانی سے تر ہورہے تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود سر سے پیر تک پانی میں شرابور ہورہی تھی۔ اس کے ساتھ دونوں قبائلی کم از کم ایسی پریشانی سے بے نیاز تھے۔ ان کے جسموں پر لباس تھا ہی نہیں۔ اس لیے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے صرف چمڑے کے لنگوٹ پہن رکھے تھے۔

کئی سال پہلے گگن دیپ کے پاس بھی ایک چھوٹی موٹر بوٹ تھی۔ یہ بوٹ دراصل ان میاں بیوی کی ملکیت تھی جو اس کے آنے سے پہلے یہاں تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ کبھی کہیں سے تیل مل جاتا تو گگن دیپ اس موٹر بوٹ پر دریاؤں کے کناروں پر آباد آس پاس کی بستیوں کے بھی چکر لگا لیتی۔ دیبو گڑھ بھی وہ اسی بوٹ پر جایا کرتی تھی۔ اس سفر

میں دو دن جانے میں لگتے اور دو دن واپسی میں۔

کئی سال پہلے بوٹ کا انجن جواب دے گیا تھا اور گگن دیپ کے پاس نئی موٹر خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ ہر سال اپنی تنظیم کو اپنا بجٹ بنا کر بھیجتی تو نئی یا استعمال شدہ موٹر خریدنے کے لیے رقم کا مطالبہ کرتی لیکن ہر سال کسی نہ کسی بہانے اسے ٹال دیا جاتا۔ اسے صرف اتنی رقم ملتی کہ وہ اس سے ضروری ادویات اور تبلیغی لٹریچر ہی خرید سکتی تھی۔

موٹر بوٹ نہ ہونے کی وجہ سے اسے دور دراز کی بستیوں تک بھی پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔ لاکو ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا جو بیساکھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا اس کے پیچھے چلتا رہتا۔

سال میں ایک مرتبہ اگست کے مہینے میں وہ قبیلے کے سردار سے ایک کشتی مستعار لے لیتی۔ گائیڈ اسے اس کشتی پر دریائے برہم پترا تک پہنچا دیتا جہاں اسے مویشیوں والی کوئی نہ کوئی کشتی مل جاتی اور بعض اوقات لفٹ کے لیے اسے کئی کئی روز تک انتظار کرنا پڑتا۔

دو سال پہلے کشتی کے انتظار میں اسے تین دن برہم پترا کے کنارے مویشیوں کے ایک فارم میں گزارنے پڑے تھے۔ ان تین دنوں میں فام کے مالک اور اس کی بیوی سے اس کی دوستی ہو گئی اور اگلے سال وہ انہیں عیسائی بنانے میں بھی کامیاب ہو گئی۔

اور اب دیبور گڑھ جاتے ہوئے وہ کل پھر انہی کے پاس رکتی۔

ہوا اور بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ گگن دیپ نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لاکو کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں دعا مانگنے لگے۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے دوست ندیم کی صحت اور سلامتی کے لیے!

☆☆☆

سلطان زیدی نے ناشتا اپنے بیسمنٹ والے دفتر ہی میں کیا تھا اور جب اس نے اعلان کیا کہ وہ آج سارا دن دفتر ہی میں رہے گا تو اس کی دونوں سیکریٹریوں کو دن میں ہونے والی کم از کم چھ میٹنگز کے لیے کچھ نئے انتظامات اور تبدیلیاں کرنی پڑی تھیں۔

سلطان نے بینر جی کو فون کیا تو جواب ملا کہ وہ کسی کام سے دفتر سے باہر گیا ہوا ہے۔ بینر جی کے پاس موبائل فون بھی تھا اور سلطان سوچ رہا تھا کہ اس نے موبائل پر اس سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔

سلطان کے ایک ماتحت نے ڈینگو بخار کے بارے میں انٹرنیٹ سے حاصل کی گئی ایک رپورٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ سلطان اس رپورٹ کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک سیکریٹری نے انٹرکام پر بینر جی کے فون کے بارے میں اطلاع دی۔ دونوں سیکریٹریوں کو پہلے ہی ہدایت کر دی گئی تھی کہ بینر جی کے سوا کوئی اور فون کال اسے نہ دی جائے۔

''میں نے ابھی ابھی مسٹر ندیم سے ملاقات کی ہے۔'' بینر جی فون پر بتانے لگا۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہی تھا۔ ''اس کی حالت پہلے سے بہتر ہے لیکن مدہوشی بہ دستور طاری ہے۔''

''کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟'' سلطان بولا۔

''ابھی نہیں۔ وہ دواؤں کے زیرِ اثر ہے۔ اس سے بات کرنا ممکن نہیں۔''

''ڈاکٹر سے پوچھ کر بتاؤ کہ وہ بات کرنے کے قابل کب ہو سکے گا۔'' سلطان نے کہا۔ ''جتنی جلد ممکن ہو سکے میرا اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔''

چند لمحے ایسی آوازیں سنائی دیتی رہیں جیسے بینر جی کسی سے مشورہ کر رہا ہو پھر اس نے کہا۔

''ڈاکٹر کے خیال میں چند گھنٹوں تک ممکن نہیں ہے لیکن تم پریشان مت ہو۔ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ اسے صرف آرام کی ضرورت ہے۔''

''میں دوپہر کو تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔'' سلطان نے کہا اور ریسیور پٹخ دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے ندیم جیسے کمزور آدمی کو اس کٹھن مہم پر بھیجا ہی کیوں؟ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ ندیم کچھ عرصہ باہر رہے گا تو اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے گی اور اس دوران وہ اس کے بگڑے ہوئے معاملات کو سمیٹنے کی کوشش کرے گا۔ ندیم نے دفتر میں اپنے کام میں بھی بڑی گڑبڑ پھیلا رکھی تھی۔ اس کے بعد کمپنی کے چار اور پارٹنرز تھے جن کے حصے ندیم سے کم تھے۔ ان میں سے تین سے ندیم کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ تینوں چاہتے تھے کہ ندیم کل کا جاتا آج چلا جائے۔ چوتھا پارٹنر نارائن البتہ مخلص تھا۔ وہ ندیم کے مفادات کا خیال رکھتا تھا۔ ندیم کی سیکریٹری نے بھی یہاں کام چھوڑ کر کسی دوسری کمپنی میں ملازمت کر لی تھی اور بہت خوش تھی۔

سلطان زیدی ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر ندیم ڈینگو جیسے خطرناک بخار سے بچ گیا تو یہاں بہت سے اس سے زیادہ خوفناک مسائل اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ ندیم کو لگی ہوئی ڈرپ کا بیگ خالی ہو چکا تھا لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ندیم کئی گھنٹوں بعد بیدار ہوا تھا۔ اس کے سر کا بوجھل پن ختم ہو چکا تھا اور بخار بھی نہیں تھا۔ اس کا جسم اگرچہ اکڑا ہوا تھا لیکن وہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر کپڑے کی گدی رکھی ہوئی تھی جسے ٹیپ کی مدد سے کنپٹیوں پر چپکایا تھا۔ وہ اپنا سیدھا ہاتھ اوپر لے گیا اور آہستہ آہستہ ٹیپ ہٹانے لگا۔ غالباً ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آواز بھی اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے آس پاس غالباً بہت سے لوگ موجود تھے لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ قریب ہی کسی کے مسلسل کراہنے کی آواز سن کر بھی وہ چونکا۔

بائیں طرف کا ٹیپ چپکا چھوڑ کر اس نے پٹی آنکھوں سے ہٹا کر کان کے قریب چھوڑ دی۔ وہ چند لمحے الوؤں کی طرح پلکیں جھپکاتا رہا۔ اس کی آنکھیں بتدریج روشنی سے مانوس ہونے لگیں۔ سامنے دیوار پر پیلا رنگ تھا جو جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ چھت کا پلستر بھی کئی جگہوں سے اکھڑا ہوا تھا اور کونوں میں لکڑیوں کے جالے نظر آرہے تھے۔ چھت کے عین وسط میں لٹکا ہوا ایک پرانا سا پنکھا بہت سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ ایک کھڑکی سے دھوپ بھی اندر آرہی تھی۔

کراہنے کی آواز کھڑکی کی طرف سے آرہی تھی۔ ندیم نے اس طرف دیکھا۔ استخوانی جسم کا مالک ایک آدمی بیڈ کے وسط میں اس طرح بیٹھا تھا کہ دونوں گھٹنے اس نے بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھے تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

سامنے والے بیڈ پر ایک ایسا آدمی پڑا ہوا تھا جس نے نیکر پہن رکھی تھی اور اس کے جسم پر لاتعداد زخم تھے۔ یہ پھوڑوں کے زخم تھے جنہیں دیکھ کر ہی کراہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس طرح بے حس و حرکت پڑا تھا جیسے روح اس کے ناتواں جسم کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔

کمرے میں پیشاب، غلاظت، پسینے اور دواؤں کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی جس سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کمرے میں پانچ بیڈ لگے ہوئے تھے اور کوئی بھی خالی نہیں تھا۔

دروازے کے قریب تیسرے بیڈ پر پڑا ہوا آدمی بھی بے حس و حرکت تھا۔ اس نے بھی صرف نیکر ہی پہن رکھی تھی اور اس کے جسم پر بھی سرخ رنگ کے لاتعداد دھبے نظر آرہے تھے۔

نرس یا وارڈ بوائے کو بلانے کے لیے بیڈ کے آس پاس نہ تو کال بیل کا کوئی بٹن نظر آرہا تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی چیز۔ کسی کو بلانے کے لیے چیخنا پڑتا۔ چیخنے سے مردے تو آنکھ کھول دیتے لیکن کوئی زندہ انسان شاید اسے پوچھنے نہ آتا۔

ندیم یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں کوڑھیوں کے اس وارڈ سے باہر کی کوئی بھی جگہ بہتر تھی جہاں کوئی ایسی بیماری لگنے کا خطرہ تو نہیں تھا۔

ندیم نے تکیے پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب روئے۔ وہ ممبئی میں بیمار ہوتا تھا تو اسپتال میں دو ہزار روپے روزانہ کمرے کا کرایہ دیتا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں ہر وقت اس کے آس پاس موجود رہتے لیکن یہاں کوئی اسے پوچھنے والا نہیں تھا اور اسے کوڑھیوں کے وارڈ میں ڈال دیا گیا تھا۔

کراہنے کی آوازیں سن کر اس نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ اس شخص کا پھوڑوں سے اٹا ہوا جسم دیکھ کر ندیم کا دل مالش کرنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے وہ پٹی آنکھوں پر رکھ لی اور اس کے ٹیپ پہلے سے زیادہ سختی سے کنپٹیوں پر چپکا لیے۔

☆☆☆

وکرم سنگھ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایگریمنٹ لے کر آیا تھا۔ اس کے لیے اس نے کسی قانون داں سے کوئی مشورہ نہیں لیا تھا۔ وہ ایگریمنٹ پڑھتے ہوئے ستیش چوپڑا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ مضمون برا نہیں تھا۔ ستیش چوپڑا نے اس تحریر پر کوئی اعتراض کیے بغیر دستخط کر دیے اور دس لاکھ روپے مالیت کا ایک تصدیق شدہ چیک اس کے حوالے کر دیا۔ وکرم سنگھ نے چیک کو بہ غور دیکھا۔ ایک ایک لفظ اور ہندسوں کو پڑھا اور چیک کو بند کر کے احتیاط سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

''اب بات کہاں سے شروع ہوگی؟'' اس نے مسکراتی نگاہوں سے چوپڑا کی طرف دیکھا۔

باتیں بہت سی تھیں۔ دوسرے وکیل بھی وکرم سے اس پہلی میٹنگ میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن ستیش چوپڑا نے انہیں منع کر دیا تھا۔ اس ابتدائی مرحلے میں وہ اکیلا ہی وکرم سنگھ سے نمٹنا چاہتا تھا۔

''انتقال والے دن فیروز باہمن کی عمومی ذہنی کیفیت کیا تھی؟'' ستیش چوپڑا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

وکرم سنگھ نے کرسی پر پہلو بدلا۔ اس کی پیشانی پر لکیریں سی ابھر آئیں۔ دس لاکھ کا چیک اس کی جیب میں آچکا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دے لیکن یہ چیک اسے سچ بولنے کے لیے نہیں دیا گیا تھا۔

''وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔'' اس نے ایک بار پھر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ کوئی غیر معمولی بات تھی؟'' ستیش چوپڑا نے دوسرا سوال کیا۔ پہلا جواب اس کی منشا کے عین مطابق تھا۔

''نہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ مشکل ہی سے حواس میں رہتا تھا۔''

''تم اس کے ساتھ کتنا وقت گزارتے تھے؟''

''میں تقریباً چوبیس گھنٹے ہی اس کے قریب رہتا تھا۔''

''تم کہاں سوتے تھے؟''

''میرا کمرا اس کے کمرے سے ذرا دور تھا لیکن اسے جب بھی میری ضرورت ہوتی، گھنٹی بجا کر مجھے بلا لیتا۔ میں چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہتا۔ بعض اوقات وہ آدھی رات یا رات کے پچھلے پہر بھی گھنٹی بجا کر مجھے طلب کر لیتا۔ اس وقت یا تو اسے جوس کی ضرورت ہوتی یا وہ کوئی دوا لینا چاہتا۔ اسے صرف گھنٹی کا بٹن دبانا ہوتا تھا اور میں اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے فوراً ہی اس کے پاس پہنچ جاتا۔''

''اس کے ساتھ اور کون رہتا تھا؟ یا وہ کس کے ساتھ وقت گزارتا تھا؟''

''اس کے ساتھ کوئی نہیں رہتا تھا لیکن وہ کچھ وقت اپنی سیکریٹری بملا کے ساتھ ضرور گزارتا تھا۔''

''کیا ان میں جنسی تعلقات بھی تھے؟''

''کیا اس بات سے ہمارے کیس پر کوئی مثبت اثر پڑے گا؟'' وکرم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' ستیش چوپڑا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ جاننا بہت ضروری ہے۔''

''تو پھر یوں سمجھ لو کہ بملا جتنی دیر وہاں رہتی، وہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر رہتے۔'' وکرم نے جواب دیا۔

ستیش چوپڑا کوشش کے باوجود اپنی مسکراہٹ کو نہیں چھپا سکا۔ یہ الزام کہ فیروز باہمن اپنی آخری سیکریٹری سے بھی عشق لڑا رہا تھا، کسی کے لیے زیادہ حیران کن بات نہ ہوتی۔

''اب ذرا میری بات توجہ سے سنو وکرم سنگھ!'' ستیش چوپڑا اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں کچھ ایسی شہادتوں کی ضرورت ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ جب فیروز باہمن نے اپنی آخری وصیت لکھی تو اس وقت اس کا ذہن قابو میں نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، حرکات و سکنات اور ہر وہ کام جو اس نے اس روز کیے تھے۔ تمہارے پاس وقت ہے۔ آرام سے کہیں بیٹھ جاؤ اور یہ سب کچھ تفصیل سے لکھتے جاؤ۔ کوئی بات نہ چھوٹے۔ بس کڑی سے کڑی ملاتے چلے جاؤ۔ تم چاہو تو بملا سے بھی مدد لے سکتے ہو۔ اس سے یہ تصدیق بھی کرلو کہ ان دونوں میں جنسی تعلقات استوار تھے۔ اس کی رائے بھی لو۔ تمہیں اس سے بھی بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔''

''بملا ہر وہ بات کہے گی جو ہم اس سے کہلوانا چاہیں گے۔'' وکرم نے جواب دیا۔

''گڈ!'' ستیش چوپڑا مسکرا دیا۔ ''خوب اچھی طرح ریہرسل کرلو۔ تم دونوں کے بیان ایک دوسرے سے ملنے چاہئیں۔ کوئی ایسا خلا نہ رہے جس سے کسی وکیل کو کسی بھی قسم کا فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔''

''کوئی بھی ہمارے بیانات کو چیلنج نہیں کر سکے گا۔''

''فیروز باہمن کا ڈرائیور، کوئی ملازم یا کوئی سابقہ سیکریٹری جو تمہارے بیان پر کسی قسم کی تنقید کر سکے؟'' ستیش چوپڑا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسے لوگوں کی فہرست تو بہت طویل ہے لیکن عمارت کی چودھویں منزل تک کسی کی رسائی نہیں تھی۔'' وکرم نے جواب دیا۔ ''فیروز باہمن اس منزل پر اکیلا ہی رہتا تھا۔ میرے سوا اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ جو میں جانتا ہوں وہ کوئی اور نہیں جانتا۔ وہ خبطی اکیلا رہنا ہی پسند کرتا تھا۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا پاگل تھا۔''

''تو پھر وہ تین ماہرِ نفسیات کو غچا دینے میں کیسے کامیاب ہو گیا؟'' ستیش چوپڑا نے پوچھا۔

یہاں وکرم سنگھ الجھ کر رہ گیا۔ وہ افسانوی باتیں تو بہت سی گھڑ سکتا تھا مگر حقیقت کو جھٹلانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' وکرم نے جواب دینے کے بجائے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرے خیال میں فیروز باہمن جانتا تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت درست نہیں ہے اور ماہرینِ نفسیات سے انٹرویو اس کے لیے بہت مشکل ہوگا۔ لہٰذا اس نے تم سے متوقع سوالات کی فہرست تیار کرنے کو کہا اور پھر تم دونوں ایسی تمام باتوں کا تجزیہ کرتے رہے۔ اسے اپنے ماضی کی بہت سی باتیں یاد نہیں رہی تھیں۔ مثلاً اپنے بچوں کے نام، انہوں نے کن کن اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور کہاں کہاں شادیاں کی تھیں وغیرہ وغیرہ... تم اس کے سب سے پرانے ملازم ہو اور یہ سب کچھ جانتے تھے۔ تم نے یہ سب کچھ بتانے کے علاوہ اس کی اپنی صحت کے بارے میں بھی متوقع سوالات

کے جوابات تیار کیے۔ میرے خیال میں تو ایسا ہوا ہوگا کہ یہ بنیادی باتیں رٹانے کے بعد تم نے کم از کم دو گھنٹے اس کی جائداد، باہمن گروپ آف کمپنیز کے بارے میں اہم معلومات، کمپنیوں کے نام، ان کے کاروباری اثاثے اور شیئرز کے تازہ ترین بھاؤ یاد کرانے میں بھی ضائع کیے ہوں گے۔ اسے تم پر سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ تم یہ سب کچھ جانتے تھے۔ اسے یہ باتیں رٹانا تمہارے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہیل چیئر پر فیروز باہمن کو ماہرینِ نفسیات کے سامنے لانے سے پہلے تم نے اسے تمام ہتھیاروں سے لیس کر دیا تھا جس سے وہ ان ماہرین نفسیات کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا خیال ہے، تمہارے اس بیان میں کوئی جھول تو نہیں آئے گا؟'' ستیش چوپڑا نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وکرم سنگھ دروغ گوئی پر دل ہی دل میں اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاں... بالکل یہی بات ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں نے ہی فیروز باہمن کو تیار کیا تھا اور اسی لیے وہ ماہرینِ نفسیات کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔''

''تو پھر جلد سے جلد اس پر کام شروع کر دو وکرم!'' ستیش چوپڑا بولا۔ ''تمہارا بیان حقیقت سے جتنا قریب تر ہو گا، تم اتنے ہی زیادہ کامیاب ثابت ہو گے۔ مخالف وکیل تم پر چڑھ دوڑیں گے۔ وہ تیز و تند سوالات کی بوچھاڑ سے تمہارے بخیے ادھیڑنے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا قرار دینے کی کوشش کی جائے گی اس لیے تمہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر طرح سے تیار رہنا چاہیے۔ ہر چیز کو ترتیب وار لکھ کر رکھ لو۔ تمہارے پاس ان تمام باتوں کا ریکارڈ ہونا چاہیے۔''

''مجھے تمہارا یہ آئیڈیا پسند آیا۔'' وکرم نے توصیفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''دن، تاریخ، واقعات... تمہارے پاس ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا ریکارڈ ہونا چاہیے۔ یہی باتیں بملا کو بھی سمجھا دینا۔ وہ بھی ہر بات لکھ کر رکھ لے۔''

''اس کی لکھائی اچھی نہیں ہے۔'' وکرم سنگھ مسکرایا۔

''اس کی مدد کرو۔'' ستیش چوپڑا نے کہا۔ ''سب کچھ اب تم پر منحصر ہے اور تم یقیناً باقی رقم بھی وصول کرنا چاہو گے... اس لیے...''

''مجھے کتنا وقت دیا جائے گا؟'' وکرم نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہم... یعنی میں اور میرے ساتھی وکیل چند روز میں تمہاری ویڈیو فلم بنائیں گے۔'' ستیش چوپڑا نے کہا۔ ''ہم تمہاری باتیں سنیں گے۔ تم سے سوالات کریں گے۔ تمہاری پرفارمنس کا جائزہ لیں گے۔ کچھ ردوبدل کی بھی ضرورت پڑے گی۔ ہم تمہیں گائیڈ کریں گے اور ہو سکتا ہے ایک سے زیادہ ویڈیو فلمیں بنانے کی ضرورت پڑے۔ اطمینان ہو جانے کے بعد تمہیں گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔''

''میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' وکرم سنگھ نے مسکرا کر جواب دیا۔

اور پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ ستیش چوپڑا کے دفتر سے نکل رہا تھا۔ اسے چیک کی رقم اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کرانے کا بندوبست کرنا تھا اور اپنے لیے ایک نئی کار خریدنی تھی۔ بملا نے بھی ایک کار کی فرمائش کر رکھی تھی اور اسے اس کا بھی بندوبست کرنا تھا۔

☆☆☆

رات کی ڈیوٹی والے وارڈ بوائے نے ڈرپ کا خالی بیگ دیکھا۔ اس پر ہاتھ سے بھی کچھ ہدایات لکھی ہوئی تھیں۔ وہ بیگ اتار کر ڈیوٹی پر موجود میل نرس کے پاس لے گیا۔ اس نے رجسٹر میں کچھ اندراجات کیے اور بیگ وارڈ بوائے کو واپس کر دیا۔

اسپتال میں اس دولت مند مریض کے بارے میں افواہیں گشت کرنے لگی تھیں جس کے علاج پر اس قدر توجہ دی جا رہی تھی اور وہ دولت مند مریض، ندیم اس وقت بھی بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے دماغ پر غنودگی سی طاری تھی۔ اسے نیند میں بھی ایسی دوائیں دی جا رہی تھیں جس کی اسے ضرورت نہیں تھی۔

ناشتے سے ذرا پہلے جیوی اس کے پاس آیا تو اس وقت بھی اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے آنکھوں پر سے پٹی نہیں ہٹائی تھی۔ وہ اب اندھیرے ہی میں رہنا پسند کرتا تھا۔

''پرشوتم ملنے آیا ہے ندیم۔'' جیوی نے مدھم لہجے میں کہا۔

اسی لمحے ایک نرس بھی پہنچ گئی اور جیوی کی مدد سے ندیم کے بیڈ کو دھکیلتی ہوئی باہر صحن میں لے آئی جہاں دھوپ چمک رہی تھی۔ نرس نے اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ ندیم نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ دھوپ کی چمک سے اگرچہ اسے آنکھیں کھلی رکھنے میں تکلیف ہو رہی تھی لیکن اس نے دوبارہ آنکھیں بند نہیں کیں اور جیوی کی طرف دیکھنے لگا جو اس

کے قریب ہی کھڑا تھا۔

''آنکھوں کی سوجن کچھ کم ہوئی ہے۔'' جیوی بولا۔

''ہیلو سر!'' دوسری طرف کھڑے ہوئے پرشوتم نے اسے مخاطب کیا۔ نرس نے باری باری ان کی طرف دیکھا اور واپس چلی گئی۔

''ہیلو پرشوتم!'' ندیم بولا۔ اسے اپنی آواز کسی کنوئیں کی گہرائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''اب بخار بھی نہیں ہے۔'' جیوی نے اس کی پیشانی چھوتے ہوئے کہا۔ وہ خوش تھا کہ ندیم کی جان بچ گئی تھی۔

''کیسے ہو پرشوتم... کیا ہوا تھا؟'' ندیم نے رک رک کر پوچھا۔

پرشوتم اس طوفانی رات کے بارے میں بتانے لگا جب جل پری تباہ ہوئی تھی۔ جیوی اس کی باتوں کا ترجمہ کر کے ندیم کو بتا رہا تھا۔ ندیم ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس پر بار بار غنودگی طاری ہو رہی تھی اور وہ زبردستی اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی دوران بینر جی بھی پہنچ گیا۔ ندیم کو بیڈ پر نیم دراز دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ چند رسمی جملوں کے بعد اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور نمبر ملاتے ہوئے بولا۔

''سب سے پہلے تم سلطان زیدی سے بات کر لو۔ وہ بہت پریشان ہو رہا ہے۔''

''پپ... پتا نہیں میں... بات کر... سکوں گا... یا...'' ندیم رک رک کر بول رہا تھا۔ اس کے دماغ پر ایک بار پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

''لو بات کرو... سلطان زیدی لائن پر ہے۔'' بینر جی نے کہتے ہوئے فون اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس کے سر کے نیچے تکیہ درست کرنے لگا۔ ندیم نے فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو ندیم! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟'' سلطان زیدی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''پتا نہیں۔'' ندیم کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔ بینر جی نے فون اس کے کان کے قریب کر دیا۔ ''ذرا زور سے بولو۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''ہیلو ندیم۔'' سلطان کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''گگن دیپ ملی یا نہیں؟''

ندیم چند لمحے خاموش رہا۔ شاید وہ ان الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا...؟'' سلطان دہاڑا۔

''اس کا نام گگن دیپ نہیں ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' سلطان کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

ندیم پر غنودگی کا شدید حملہ ہو رہا تھا اور وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔

''ندیم! تمہیں وہ عورت ملی یا نہیں؟''

''اوہ، ہاں... یہاں سب ٹھیک ہے سلطان... پریشان مت ہو۔'' ندیم بولا۔

''مجھے اس عورت کے بارے میں بتاؤ۔''

''وہ بہت حسین ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے۔'' سلطان نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''کیا اس نے کاغذات پر دستخط کر دیے ہیں؟''

''مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا۔''

''اس نے کاغذات پر دستخط کیے یا نہیں؟'' سلطان زیدی چیخا۔

ندیم کا سر سینے پر جھک گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بینر جی نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلایا اور فون اس کے کان کے قریب کر دیا۔

''میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ وہ... وہ بہت اچھی ہے۔'' ندیم اچانک ہی بولا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہو۔ شاید تمہیں خواب آور دوائیں دی جا رہی ہیں۔ ٹھیک ہو جاؤ تو مجھے فون کرنا۔''

''مم... میں نے اسے شادی کے لیے... کہا تھا...'' ندیم نے کہا اور اس کا سر ایک بار پھر سینے پر جھک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

بینر جی نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا اور وہاں سے کچھ دور جا کر سلطان زیدی کو ندیم کی کیفیت کے بارے میں بتانے لگا۔

''کیا میرے وہاں آنے کی ضرورت ہے؟'' سلطان نے چیختے ہوئے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اطمینان رکھو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' بینر جی نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے بعد میں فون کرنا۔ میں انتظار

کروں گا۔'' سلطان زیدی کی آواز سنائی دی اور پھر فون بند ہوگیا۔

☆☆☆

نارائن داس کمرے میں داخل ہوا تو سلطان زیدی کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ نارائن نے دروازہ بند کردیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بات ہوئی... کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اسے مل گئی ہے۔'' سلطان نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''اور یہ کہ وہ بہت خوب صورت ہے اور اس نے یعنی ندیم نے اس سے شادی کی درخواست بھی کی تھی۔''

''تم مذاق تو نہیں کر رہے؟'' نارائن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مذاق تو ندیم نے بھی نہیں کیا۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں اسے ایسی ادویات دی جارہی ہیں جن میں نیند کا اثر ہے اور شاید وہ حواس میں نہیں تھا۔''

''اب کیسا ہے وہ؟''

''بینر جی کا کہنا ہے کہ وہ پہلے سے بہت بہتر ہے۔ بخار بھی نہیں ہے۔'' سلطان نے کہا۔

''بے چارہ ندیم۔'' نارائن بولا۔ ''ہر عورت اسے اچھی لگتی ہے اور وہ...''

''واقعی دلچسپ بات ہے۔'' سلطان کھڑکی سے ہٹ کر اس کی طرف گھوم گیا۔ ''اس عورت کی عمر بیالیس سال ہے اور غالباً وہ کئی برسوں سے کسی مہذب انسان سے ملی بھی نہیں۔''

''وہ بدصورت بھی ہوتی تو ندیم کو شاید اس کی پروا نہ ہوتی۔'' نارائن بولا۔ ''وہ بہرحال عورت ہے اور اسے دنیا کی امیر ترین عورت ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔''

''میں نے ندیم کو یہ سوچ کر اس مہم پر بھیجا تھا کہ چند روز باہر رہے گا تو اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ آسام کے تاریک جنگلوں میں عشق لڑانا شروع کردے گا۔''

''کیا اس نے کاغذات پر دستخط کر دیے ہیں؟'' نارائن نے پوچھا۔

''زیادہ تفصیل سے بات نہیں ہوسکی۔'' سلطان زیدی نے میز کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس نے دستخط کر دیے ہوں گے۔ دوسری صورت میں ندیم وہاں سے واپس نہ آتا۔''

''وہ کب واپس آرہا ہے؟''

''جیسے ہی سفر کرنے کے قابل ہوگا۔'' سلطان نے کہا۔

''مجھے شبہ ہے۔'' نارائن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اسّی ارب روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ میں تو اس رقم کے لیے پوری زندگی جنگلوں میں گزار سکتا ہوں۔''

☆☆☆

ڈاکٹر دیوار کے سائے میں بیڈ پر پڑے ہوئے اپنے مریض کو دیکھ کر رک گیا۔ ندیم نیم دراز پوزیشن میں تھا۔ اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ منہ کھلا ہوا اور آنکھوں پر پٹی موجود تھی۔ قریب ہی زمین پر جیوی سو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ندیم کی پیشانی کو چھو کر دیکھا، بخار نہیں تھا۔

''مسٹر ندیم!'' ڈاکٹر نے ندیم کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

جیوی بھی آواز سن کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر، ندیم کو کمرے میں واپس لے جانا چاہتا تھا۔ وہ انگریزی نہیں بول سکتا تھا اور مقامی زبان میں بات کر رہا تھا۔ جیوی نے جب ترجمہ کرکے بتایا تو ندیم کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وہ واپس اس کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ جیوی بھی اس کمرے کی حالت دیکھ چکا تھا جہاں کھلے زخموں والے کوڑھ کے مریض پڑے ہوئے تھے اور جنہیں دیکھ کر جی متلانے لگتا تھا۔ جیوی نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ ندیم کو باہر ہی رہنے دیا جائے۔ اس نے وعدہ کیا کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ ندیم کو اندر لے جائے گا۔ ڈاکٹر نے کندھے اچکا دیے۔

ندیم کے بیڈ کے عین سامنے مختصر سے صحن کے دوسری طرف ایک اور وارڈ تھا جس کی دیوار میں دروازے کی جگہ لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس طرف بھی بعض مریض گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ وہ سلاخوں سے جھانک کر دیکھتے اور واپس چلے جاتے۔

چیخنے کی آواز سن کر ندیم چونک گیا۔ سلاخوں والے دروازے کے دوسری طرف کھڑا ایک آدمی انہیں دیکھ کر چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی جلد پر گہرے رنگ کے لاتعداد دھبے تھے۔ سر پر کہیں بال تھے اور کہیں کھوپڑی کی کھال نظر آرہی تھی۔ وہ صورت سے ہی پاگل لگتا تھا۔ اس نے دو سلاخوں کو پکڑ رکھا تھا اور چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی جو ہر طرف گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' ندیم نے پوچھا۔ اس پاگل کی

چیخ و پکار سے اس کی نیند غائب ہوگئی تھی۔

''کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ وہ ذہنی مریض ہے۔'' جیوی نے جواب دیا۔

''لعنت ہو ان پر۔'' ندیم بڑبڑایا۔ ''انہوں نے مجھے پاگل خانے میں داخل کرادیا ہے۔ یہ اسپتال ہے یا...''

''اس شہر میں یہی ایک اسپتال ہے جہاں ذہنی مریضوں کا بھی علاج ہوتا ہے۔'' جیوی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ان کا وارڈ الگ ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

پاگل اب پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخنے لگا تھا۔ اس کے پیچھے کہیں سے ایک نرس نمودار ہوئی اور اسے ڈانٹ کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ پاگل نے اسے ایسی ایسی گالیاں دیں کہ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس نے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔ پاگل دوبارہ ندیم اور جیوی کی طرف متوجہ ہوگیا اور پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں چیخنے لگا۔ اس نے سلاخوں کو اس سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ اس کی انگلیوں کے جوڑ بھی سفید پڑ گئے تھے۔

''بے چارہ۔'' ندیم نے تاسف کا اظہار کیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک میل نرس پاگل کے پیچھے نمودار ہوا اور اسے پکڑ کر پیچھے کھینچنے لگا۔ پاگل حلق پھاڑ پھاڑ کے چیخ رہا تھا۔

میل نرس اسے دبوچ کر گھسیٹتا ہوا پیچھے لے گیا۔ کچھ دیر تک پاگل کی چیخیں سنائی دیتی رہیں اور پھر فضا پُرسکون ہوگئی۔

''جیوی، مجھے یہاں سے لے چلو۔'' ندیم نے کمزوری آواز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' جیوی نے اسے گھورا۔

''میں اس پاگل خانے میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہاں سے لے چلو جیوی۔'' ندیم بولا۔ ''اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بخار بھی نہیں ہے۔ آنکھیں بھی ٹھیک ہیں اور جوڑوں میں درد بھی نہیں ہو رہا۔''

''تم ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔ اس کے علاوہ یہ...'' جیوی نے اس کے بائیں بازو میں لگی ہوئی ڈرپ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کچھ نہیں ہے۔'' ندیم نے بازو سے سوئی نکال دی۔ ''میرے لیے کہیں سے کپڑے تلاش کرو اور مجھے لے چلو یہاں سے۔ اب میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو ندیم... ڈینگو بخار بہت خطرناک ہوتا ہے اس کا دوبارہ حملہ...''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' ندیم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے ہوٹل میں لے چلو۔ تم بھی میرے ساتھ ہی رہنا۔ میں تمہیں معقول معاوضہ دوں گا۔ اگر مجھے دوبارہ بخار ہوگیا تو تم مجھے دوائیں تو دے سکتے ہو۔''

''معاوضے کی بات نہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں اور...'' جیوی خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی اور ان کی باتیں تو نہیں سن رہا۔

''میں بھی تمہیں اپنا دوست ہی سمجھتا ہوں اور دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''میں اس کمرے میں واپس نہیں جانا چاہتا جہاں کوڑھ کے مریض بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہی کراہیت ہوتی ہے۔ کمرے میں پھیلی ہوئی بو سے دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ نہ تو نرسوں کو مریضوں کی پروا ہے اور نہ ڈاکٹر توجہ دیتے ہیں۔ یہ اسپتال نہیں پاگل خانہ ہے۔ مجھے یہاں سے نکال لے چلو۔ میں تمہیں اتنی رقم دوں گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔''

''تمہارے پاس رقم یا اور جو کچھ بھی تھا، جل پری کے ساتھ برہم پترا میں ڈوب چکا ہے۔'' جیوی نے کہا۔

ندیم کا دماغ جیسے سن ہوگیا۔ اس نے جل پری کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا سب کچھ اس کشتی پر ہی تھا۔ اس کے کپڑے، بریف کیس... جس میں رقم بھی تھی، سیٹلائٹ ٹیلی فون بھی اور گگن دیپ کے کاغذات بھی۔

''رقم کی تم فکر مت کرو جیوی۔'' اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تار بھیج کر ممبئی سے رقم منگوالوں گا۔ تم مجھے یہاں سے لے چلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' جیوی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں چند منٹ میں آتا ہوں۔''

ندیم نے آنکھیں بند کرلیں اور صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے پاس واقعی کچھ نہیں رہا تھا۔ سب کچھ کشتی کے ساتھ ہی ڈوب گیا تھا۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ لکھ پتی تھا لیکن اب وہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔

وہ بڑی امیدیں لے کر گگن دیپ کی تلاش میں آیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ اس مہم میں کامیابی کے بعد اسے سلطان زیدی سے اتنی رقم مل جائے گی جس سے اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل جائے گا لیکن اس کا یہ خواب بھی چکنا چور ہوگیا تھا۔ گگن دیپ نے نہ صرف اس کے ساتھ آنے سے انکار کردیا تھا بلکہ کاغذات پر دستخط بھی

نہیں کیے تھے۔

جیوی واپس آگیا اور اس کے بیڈ کو دھکیلتا ہوا اسپتال کے ایک سنسان حصے میں لے آیا۔ یہاں لوہے کی ایک بہت بڑی الماری استادہ تھی جس کے پیچھے ایک کرسی پر کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ جیوی نے ندیم کو سہارے سے اٹھا کر الماری کے پیچھے پہنچا دیا۔ ڈینگو بخار نے ندیم کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

''جلدی سے کپڑے بدل لو... میں دیکھتا ہوں، کوئی اس طرف نہ آجائے۔'' جیوی اسے چھوڑ کر بیڈ کے قریب آگیا۔

ندیم جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا۔ اس کی ٹانگیں اب بھی کانپ رہی تھیں۔ جیوی بیڈ کے قریب کھڑا محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً دھڑام کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔

ندیم کپڑے بدل چکا تھا مگر کمزوری اس قدر زیادہ تھی کہ زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکا اور غش کھا کر گر پڑا۔ جیوی نے بڑی مشکل سے اسے گھسیٹ کر بیڈ پر ڈالا۔ اس کا لباس چھپانے کے لیے چادر اوڑھا دی اور بیڈ کو دھکیلنے لگا۔

''کک... کیا ہوا...؟'' ندیم کو ہوش آگیا۔ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

''تم بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔'' جیوی نے سرگوشی میں جواب دیا۔

وہ برآمدے میں دو نرسوں کے قریب سے گزرے مگر کسی نے ان پر توجہ نہیں دی۔ جیوی بیڈ کو دھکیلتا ہوا لابی کے آخری سرے پر لے آیا اور ندیم کو سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔ ندیم لہرانے لگا۔ اس پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

''اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ یہیں رہ جاؤ گے۔'' جیوی نے کہا۔

جیوی نے سہارا دینے کے لیے ایک بازو اس کی کمر میں حمائل کر دیا اور اسے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا باہر لے جانے لگا۔ لابی میں استقبالیہ اور انکوائری کاؤنٹر پر کلرک بھی موجود تھا۔ نرسیں بھی ادھر ادھر آجا رہی تھیں، کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے دو آدمی سگریٹ کے کش لگا رہے تھے لیکن کسی نے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

وہ لابی سے باہر آگئے اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر سڑک کے دوسری طرف چلنے لگے جہاں جیوی کا ٹینک نما ٹرک کھڑا تھا۔ دھوپ ندیم کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

ٹرک تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا ایک موڑ پر تو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

''کیا تم اس ٹینک کو آہستہ نہیں چلا سکتے؟'' ندیم کراہا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور اس کے پیٹ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

''سوری!'' جیوی نے کہتے ہوئے ٹرک کی رفتار ہلکی کر دی۔

ٹرک بیلی ویو ہوٹل کے سامنے رک گیا۔ جیوی نے ہوٹل میں داخل ہو کر استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خوب صورت لڑکی سے کچھ سرگوشیاں کیں اور پھر ندیم کو سہارا دے کر کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ ڈبل بیڈ روم تھا اور جیوی کو بھی ندیم کی دیکھ بھال کے لیے یہیں رہنا تھا۔

اس بھاگ دوڑ نے ندیم کو بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ وہ بستر پر بے سدھ سا پڑا تھا۔ جیوی نے ٹی وی کھول دیا جس پر فٹ بال میچ آرہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ بور ہو گیا اور ٹی وی بند کر دیا۔

ندیم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیوی کچھ چیزیں لینے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ ندیم نے کم از کم دو مرتبہ ٹیلی فون پر ممبئی میں سلطان زیدی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے مایوس ہو کر ریسیور پٹخ دیا۔

ادھر ڈاکٹر نے بینر جی کو مریض کے اسپتال سے فرار ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ بینر جی ان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ بیلی ویو ہوٹل کے سامنے جیوی کا ٹرک دیکھ کر وہ اندر آگیا۔ جیوی اس وقت سوئمنگ پول میں کھڑا ٹھنڈی بیئر پی رہا تھا۔

''ندیم کہاں ہے؟'' بینر جی نے پول کے کنارے پر رک کر کہا۔ اس کا لہجہ بڑا درشت تھا۔

''اوپر... اپنے کمرے میں۔'' جیوی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟'' بینر جی نے اسے گھورا۔

''کیونکہ وہ اسپتال میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔'' جیوی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

اسپتال واقعی اس قابل نہیں تھا کہ کسی شریف آدمی کو وہاں داخل کیا جاتا۔ بینر جی کو خود بھی ایک بار تجربہ ہو چکا تھا۔

وہ علاج کے لیے داخل ہوا تھا اور دوسرے ہی دن وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

''اب وہ کیسا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

''پہلے سے بہت بہتر۔'' جیوی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ رہو اور اس کا خیال رکھنا۔'' بینر جی نے بارعب لہجے میں کہا۔

''اب میں تمہارا ملازم نہیں رہا مسٹر بینر جی۔'' جیوی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے لیکن تم کشتی والے معاملے کو بھول رہے ہو۔'' بینر جی نے اسے گھورا۔

''کشتی میں نے نہیں ڈبوئی تھی۔ میں تو اس وقت کشتی پر تھا بھی نہیں... لیکن تم چاہتے کیا ہو؟''

''تم ندیم کا خیال رکھو۔ اس کے ساتھ رہو اور اس کی دیکھ بھال کرو۔'' بینر جی بولا۔

''اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' جیوی نے جواب دیا۔ ''اسے رقم کی ضرورت ہے۔ کیا تم ممبئی سے اس کے لیے رقم منگوانے کا بندوبست کر سکتے ہو؟''

''کوشش کروں گا۔ تم اس کا خیال رکھنا۔'' بینر جی کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

ندیم کو رات میں پھر ہلکا بخار ہو گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ حدت بڑھتی رہی۔ کہنیوں اور گھٹنوں کے جوڑوں میں بھی ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کے سر اور گردن سے بہنے والا پسینا تکیے کو تر کرنے لگا اور پھر سردی کی ایک لہر نے اسے لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے گھٹنے مڑ کر پیٹ سے لگ گئے۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی کنپٹیوں میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور چہرہ انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔

''جیوی...'' وہ کراہا۔ ''جیوی!''

جیوی فوراً ہی اٹھ گیا اور بتی جلا دی۔ ''بتی بجھا دو جیوی۔'' ندیم کراہا۔

جیوی نے کمرے کی بتی بجھا کر باتھ روم کی بتی جلا دی اور دروازہ تھوڑا سا کھلا رہنے دیا۔ اس طرح روشنی اب براہِ راست ندیم کے چہرے پر نہیں پڑ رہی تھی۔ ندیم کو یہاں لانے کے بعد جیوی نے پانی کی بوتلیں، برف، اسپرین، درد رفع کرنے کی گولیاں اور تھرمامیٹر بھی خرید کر رکھ لیا تھا اور وہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

ایک سو دو بخار کے ساتھ ندیم پر شدید کپکپی طاری تھی۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ جیوی نے دو گولیاں اس کے منہ میں ڈال کر پانی کی بوتل اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔ پھر گیلے تولیے سے اس کا چہرہ تر کرنے لگا۔

جوڑوں اور پٹھوں میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ندیم جب بھی چیخنا چاہتا، اسے اسپتال کا کمرا یاد آجاتا اور وہ چیخنے کے بجائے سختی سے دانت بھینچ لیتا۔

صبح چار بجے کے قریب بخار ایک سو تین تھا۔ ندیم کے گھٹنے اس کی ٹھوڑی کو چھو رہے تھے۔ بازو ٹانگوں پر لپیٹ رکھے تھے۔ سردی کی شدت سے وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اس کے اندر زلزلہ آگیا ہو۔ بخار ایک سو پانچ تک پہنچ گیا۔ جیوی بدحواس ہو گیا۔ اسے ندیم کی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔ اس نے راہداری میں فرش پر سوئے ہوئے ہوٹل کے ایک ملازم کو جگایا اور اس کی مدد سے ندیم کو کمرے سے نکال کر اپنے ٹرک میں ڈال دیا۔

اسپتال روانہ ہونے سے پہلے اس نے بینر جی کو بھی فون پر اطلاع دے دی تھی۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔

☆☆☆

اس کمرے میں دو مریض اور تھے۔ ایک کی ٹانگ حادثے میں ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا پیر بھی ٹخنے سے کاٹ دیا گیا تھا اور دوسرا مریض ایک گردہ فیل ہو جانے کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔

ندیم کو ان دونوں کے درمیان والے بیڈ میں ڈال دیا گیا۔ اس بیڈ کا پہلا مریض کینسر کی وجہ سے اگلے جہاں کو سدھار گیا تھا اور یہ بیڈ ندیم کو مل گیا تھا۔

کئی گھنٹوں کی بے ہوشی کے بعد ندیم کی آنکھ کھلی۔ آدھی رات کا وقت تھا اور کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ دوسرے مریض بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور راہداری میں دور کہیں مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا، کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

چادر کے اندر ندیم کا برہنہ جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ وہ اپنی سوجی ہوئی آنکھیں ملتے ہوئے ٹانگیں سیدھی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی پیشانی اب بھی بخار سے تپ رہی تھی اور حلق خشک ہو رہا تھا۔

سردی کی لہر نے ایک بار پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے

لیا۔ اس کے گھٹنے پیٹ سے لگ گئے اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ دانت بری طرح بج رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بخار بھی تیز ہوگیا۔ ندیم کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ چیخنے لگا۔

تاریکی میں ایک انسانی ہیولا کمرے میں داخل ہوا اور دوسرے بیڈ کے مریضوں کو دیکھتا ہوا ندیم کے بیڈ کے قریب رک گیا۔ وہ عورت تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ ندیم کے بازو پر رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے سرگوشی جیسی آواز نکلی۔

''ندیم!''

کوئی اور موقع ہوتا تو یہ آواز سن کر ندیم اچھل پڑتا لیکن اس وقت وہ نیم مدہوشی میں تھا۔ یہ آواز اس کی سماعت تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر رکھا ہوا تکیہ ہٹا دیا اور اپنے اوپر جھکی ہوئی عورت کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ندیم! یہ میں ہوں... گگن دیپ۔''

''گگن دیپ!'' ندیم نے بھی سرگوشی میں نام لیا۔ وہ بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے انگلیوں کی مدد سے آنکھیں کھولنے لگا۔ ''گگن دیپ... تم...''

''ہاں... میں ہوں ندیم۔'' اس نے جواب دیا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ خدا نے مجھے تمہاری مدد کے لیے یہاں بھیجا ہے۔''

ندیم نے اس کے چہرے کو چھونے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو گگن دیپ نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور ہتھیلی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا ندیم۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ابھی تو تمہیں اس دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔''

ندیم کی آنکھیں اب پوری طرح کھل چکی تھیں لیکن اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

''یہ واقعی تم ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟'' وہ بولا۔

''یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔ میں تمہارے پاس موجود ہوں۔'' گگن دیپ نے کہا۔

ندیم پر ایک بار پھر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس نے سر تکیے پر رکھ لیا۔ پٹھوں اور جوڑوں میں ایک بار پھر درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا ہاتھ اب بھی گگن دیپ کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کی نیند گہری ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر تک ندیم کا بخار اُتر گیا اور پٹھوں جوڑوں کا درد بھی جاتا رہا۔ کمزوری کے علاوہ اب اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے زبردستی چھٹی لے لی۔ ڈاکٹر بھی اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ندیم اسپتال سے نکلا تو جیوی اور بینرجی بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں رک گئے۔ کافی پیتے ہوئے بینرجی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور ندیم گگن دیپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

بینرجی اسے ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ ندیم نے جیوی کو اعتماد میں لیتے ہوئے اسے گگن دیپ کے بارے میں بتایا تو جیوی فوراً ہی اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

اسپتال میں کسی نے بھی گگن دیپ کو آتے یا جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جیوی اسپتال سے نکل کر پیدل ہی شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہا اور پھر وہ دریا کے گھاٹ پر پہنچ گیا۔ مویشیوں والی آخری کشتی کل شام کو یہاں پہنچی تھی اور گگن دیپ نے اس کشتی پر سفر نہیں کیا تھا۔ گھاٹ پر کسی اور نے بھی گگن دیپ کو نہیں دیکھا تھا۔ جیوی گھاٹ پر کام کرنے والے دوسرے لوگوں اور ماہی گیروں سے بھی پوچھتا رہا لیکن ہر ایک نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ندیم، بینرجی کے دفتر پہنچ گیا۔ بینرجی اس وقت اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ ندیم نے اس کی کرسی پر بیٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا اور ممبئی میں سلطان زیدی کا نمبر ملانے لگا۔

''کیسے ہو ندیم؟'' سلطان زیدی اس کی آواز سنتے ہی بولا۔ ''میں تمہاری طرف سے بہت پریشان ہوں۔''

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ معمولی سی کمزوری ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''مجھے اس عورت کے بارے میں بتاؤ، وہ کون ہے؟''

''میں نے اسے تلاش کرلیا ہے۔ وہ فیروز باہمن کی ناجائز بیٹی گگن دیپ ہی ہے اور اسے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ندیم نے جواب دیا۔

''تم نے اس سے کھل کر بات نہیں کی۔ یہ بہت بڑی رقم ہے۔ وہ کیسے انکار کرسکتی ہے؟''

''میں ہر طرح سے بات کر چکا ہوں۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''یہ دولت اس کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس معاملے میں وہ پتھر ثابت ہوئی جس سے میں سر پھوڑتا رہا اور پھر میں نے کوشش ترک کردی۔''

''تم نے مزید کوشش کی ہوتی۔ وہ کیسے انکار کرسکتی ہے؟'' سلطان نے کہا۔

''میں نے کہا نا کہ اسے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے حال میں مست ہے۔ بہت خوش ہے یہاں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی اس جیسی مطمئن اور پُرسکون عورت نہیں دیکھی۔ وہ اپنی باقی زندگی ان تاریک جنگلوں میں انہی لوگوں کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔''

''اس نے کاغذات پر دستخط کیے یا نہیں؟''

''نہیں۔'' ندیم نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم مذاق تو نہیں کررہے ندیم؟'' چند لمحوں کے توقف کے بعد سلطان زیدی کی آواز سنائی دی۔

''نہیں باس۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''میں اپنی ہر ممکن کوشش کرچکا ہوں کہ وہ کم از کم کاغذات پر دستخط ہی کردے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی اور کسی بھی قسم کے کاغذ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کردیا۔''

''کیا اس نے وصیت پڑھی تھی اور کیا تم نے اسے بتایا تھا کہ اس وصیت کے ذریعے اسے اسّی ارب روپے کی وراثت ملنے والی ہے؟''

''ہاں۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''وہ کسی بھی مہذب بستی سے سیکڑوں میل دور جنگل میں ایک ایسے مختصر سے جھونپڑے میں رہ رہی ہے جس کی چھت تنکوں اور گارے کی بنی ہوئی ہے۔ جس میں نہ تو بجلی ہے اور نہ پلمبنگ کا کوئی سسٹم... نہ ٹیلی فون نہ فیکس! بالکل سادہ کھانا۔ اسے کسی چیز کی محرومی کا غم نہیں ہے۔ وہ پتھر کے زمانے میں رہ رہی ہے سلطان... اور وہیں رہنا چاہتی ہے۔ اسے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''حیرت انگیز۔'' سلطان بولا۔ ''وہ کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے...''

''وہ ڈاکٹر ہے۔ اس کے پاس ایم بی بی ایس کی ڈگری ہے اور وہ پانچ بڑی زبانیں بڑی روانی سے بول سکتی ہے۔''

''ڈاکٹر!'' سلطان کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ ''تم نے بتایا تھا کہ وہ بہت حسین ہے۔''

''اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ہم ایک دوسرے کے دوست بھی بن گئے تھے۔'' ندیم نے جواب دیا۔ اس نے سلطان کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ گزشتہ رات گگن دیپ کو دیبور گڑھ کے اسپتال میں بھی دیکھ چکا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے تلاش کر کے وصیت کے بارے میں دوبارہ بات کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔

''اپنی طبیعت کا خیال رکھنا۔ میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوں۔ اور ہاں، میں نے بینرجی کو تمہارے لیے رقم بھیج دی ہے۔ اس سے لے لینا۔ تم واپس کب آؤ گے؟''

''ایک دو دن آرام کرنے کے بعد۔'' ندیم نے جواب دیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

کچھ دیر بعد بینرجی بھی آگیا۔ ندیم اس سے رقم لے کر دفتر سے باہر آگیا اور پیدل ہی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ اس کا پہلا اسٹاپ ایک گارمنٹس اسٹور تھا جہاں سے اس نے اپنے لیے کچھ کپڑے اور جوتے خریدے اور اپنے ہوٹل میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ تھک گیا تھا اس لیے جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

☆☆☆

جیوی، گگن دیپ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ بارونق بازار، ایسی دکانیں جہاں باہر کی بستیوں سے آنے والے لوگ خریداری کرتے تھے۔ دریا کے گھاٹ پر بھی کئی لوگوں سے پوچھا۔ رہائشی ہوٹلوں میں بھی دریافت کیا لیکن اس کے بتائے ہوئے حلیے کی عورت کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ جیوی کو اب ندیم کی ذہنی کیفیت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ ڈینگو بخار خطرناک ہونے کے ساتھ عجیب و غریب تماشے بھی دکھاتا ہے۔ مدہوشی کی حالت میں مریض کو کبھی مختلف آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کبھی بھوت دکھائی دیتے ہیں اور کبھی یوں لگتا ہے جیسے اس کا کوئی چاہنے والا اس کے قریب بیٹھا اس سے باتیں کررہا ہو۔ ہوسکتا ہے ندیم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہو لیکن اس کے باوجود جیوی نے گگن دیپ کی تلاش جاری رکھی۔

ندیم بھی ہوٹل میں دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد گگن دیپ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی اور وہ دھوپ سے بچنے کے لیے درختوں کے سائے میں چل رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دریا کے گھاٹ پر بھی رکا اور پھر مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا ہوٹل واپس آگیا۔ بیماری کے بعد اسے آرام کی ضرورت تھی لیکن وہ مسلسل آوارہ گردی کررہا تھا جس سے اسے تھکن اور نقاہت محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا اونگھ رہا تھا کہ دستک کی آواز سن کر اٹھ گیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ جیوی تھا، اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ادھر ادھر دیکھا لیکن اسے شراب کی کوئی خالی

بوتل نظر نہیں آئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ بازاروں میں بڑی چہل پہل تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔

وہ دونوں بھی باہر نکل کھڑے ہوئے۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ ساتھ والی میز پر ایک آدمی بیٹھا بیئر پی رہا تھا اور ندیم بڑی للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر باہر آگئے۔ اگلے روز صبح ملنے کا وعدہ کر کے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ جیوی ایک طرف چلا گیا اور ندیم مخالف سمت میں چل پڑا۔ ندیم خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا اور وہ فی الحال ہوٹل واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ چلتا رہا۔

دریا کی طرف تقریباً دو فرلانگ آگے قدرے سناٹا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ گھروں میں بھی زیادہ تر بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک بھی بہت کم تھا۔ سامنے ایک چرچ دیکھ کر ندیم کے ذہن میں اچانک ہی خیال آیا کہ گگن دیپ یہاں ہوسکتی ہے۔

چرچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ندیم اندر تک دیکھ سکتا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے رک کر اندر جھانکنے لگا۔ بنچوں کی قطاروں میں مختلف جگہوں پر پانچ افراد سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی لاؤڈ اسپیکر سے موسیقی کی مدھم سی آواز چرچ کی فضا میں بکھر رہی تھی۔ ان پانچوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس پر گگن دیپ کے ہونے کا شبہ کیا جاسکتا۔

ندیم کو جلدی نہیں تھی۔ ہوسکتا تھا کہ گگن دیپ یہاں آجائے۔ وہ اس کا انتظار کرسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد کچھ اور لوگ چرچ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے کسی کا چہرہ گگن دیپ سے ملتا ہوا نہیں تھا۔ ایک نوجوان مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر دھیمے سروں میں گٹار بجانے لگا۔

اس وقت ساڑھے نو بجے تھے۔ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں چرچ میں آرہے تھے۔ ندیم ایک طرف کھڑا ان کے چہروں کو تکتا رہا لیکن اسے گگن دیپ کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔

ندیم کو وقت کا اندازہ نہیں رہا تھا۔ وقت کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔ لوگ واپس جاچکے تھے۔ چرچ خالی ہو چکا تھا۔ وہ بھی گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ گیا اور شکست خوردہ سے انداز میں ایک طرف چلنے لگا۔ گگن دیپ دیبور گڑھ میں ہی تھی اور ندیم کو یقین تھا کہ اس سے ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ اس کی تلاش میں دیبور گڑھ کی سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔

☆☆☆

اگلے دن بھی جیوی نے گگن دیپ کی تلاش جاری رکھی۔ اس کا زیادہ وقت گھاٹ پر گزرتا تھا جہاں برہم پترا میں سفر کرنے والے ہر شخص سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ہر ایک سے پوچھتا رہا لیکن گگن دیپ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اگر وہ کسی بھی کشتی پر سفر کر کے آئی ہوتی تو کسی نہ کسی کو ضرور معلوم ہوتا لیکن کسی نے نہ اسے دیکھا تھا، نہ اس کے بارے میں سنا تھا۔ جمعے کی دوپہر تک جیوی کو یقین ہو چکا تھا کہ گگن دیپ دیبور گڑھ میں موجود نہیں ہے۔

دیبور گڑھ سے روانگی سے ایک روز پہلے بھی ندیم نے گگن دیپ کی تلاش جاری رکھی تھی۔ اس روز اس نے پرشوتم اور بینر جی سے بھی آخری ملاقات کی اور مہمان نوازی پر بینر جی کا شکریہ ادا کیا۔

جیوی، گوہاٹی تک ندیم کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھا اور پھر اگلے روز وہ صبح سویرے ہی بس پر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ چھ سات گھنٹوں کے اس سفر کے دوران وہ راستے بھر باتیں کرتے رہے۔ جیوی ممبئی آنا چاہتا تھا۔ ندیم نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ کام کی تلاش میں اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

گوہاٹی سے کلکتہ آیا اور وہ رات اسے کلکتہ میں گزارنی پڑی۔ اسے اگلے روز ممبئی جانے والے جہاز پر سیٹ ملی تھی۔

کلکتہ سے ممبئی کی پرواز کے دوران وہ سویا رہا اور جب ائرہوسٹس نے اسے جگایا تو جہاز ممبئی کی فضا میں پرواز کر رہا تھا اور آہستہ آہستہ نیچے جھک رہا تھا۔ ندیم نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ نیچے جانی پہچانی فلک بوس عمارتیں دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں بعد واپس آیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھرنے لگے۔

جب وہ جہاز کے دروازے سے نکلا تو ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے جسم پر صرف پولو شرٹ تھی۔ وہ سردی سے کانپ کر رہ گیا۔ ہلکی بارش اب بھی ہو رہی تھی۔

ارائیول گیٹ پر سلطان زیدی اس کے استقبال کے لیے موجود تھا اور اس نے عقل مندی کی تھی کہ وہ ایک فاضل کوٹ بھی لے آیا تھا۔ ندیم سردی سے کانپ رہا تھا اس نے کوٹ لے کر پہن لیا۔ سلطان نے اس کا بیگ اٹھالیا اور وہ ٹرمینل سے نکل کر پارکنگ میں آگئے جہاں سلطان کی کار کھڑی تھی۔

''تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔'' سلطان نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بخار نے تمہیں نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں تمہاری طرف سے بہت پریشان تھا۔ بہرحال، چند روز آرام کرو گے اور کھاؤ پیو گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''میں کہاں جاؤں گا... میرا مطلب ہے...''

''ناہید لکھنؤ گئی ہوئی ہے اپنے میکے۔'' سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم چند روز میرے گھر رہ سکتے ہو۔''

''شکریہ... اور میری کار کہاں ہے؟''

''میرے گیراج میں۔'' سلطان نے جواب دیا۔

ندیم کو یقین تھا کہ اس کی جیگوار کار کی اچھی طرح دیکھ بھال کی گئی ہوگی۔ یہ کار اس نے قسطوں پر خریدی تھی اور ابھی کئی قسطیں باقی تھیں۔

''تمہارے گھر کا فرنیچر میں نے ایک اسٹور میں رکھوا دیا تھا اور تمہارے کپڑے اور ذاتی استعمال کی دوسری چیزیں پیک کر کے تمہاری کار میں رکھوا دی ہیں۔'' سلطان نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میں نے ڈینگو بخار کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس سے نپٹنے کے بعد تمہیں کم از کم ایک مہینا آرام کی ضرورت ہے۔''

ندیم کے منہ سے گہرا سانس خارج ہوا۔ اس کے خیال میں سلطان نے واضح طور پر یہ نہیں کہا تھا کہ کمپنی کو اب اس کی ضرورت نہیں۔ اس طرح اسے ایک مہینے کی مہلت دی جارہی تھی۔

''تم سمجھتے ہو کہ میں کام کے قابل نہیں رہا لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ بولا۔ ''اب تو میں کسی نشے کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ میں بالکل بدل گیا ہوں... بس ذرا تھک گیا ہوں۔''

''اکثر وکیل بیس سال بعد تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' سلطان نے جواب دیا۔

ندیم کا منہ لٹک گیا... تو گویا اب وہ ریٹائر ہونے والا تھا۔ سلطان نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی۔ ندیم بھی خاموشی سے باہر دیکھتا رہا۔ کار ممبئی کی بھیگی ہوئی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

چوپاٹی میں سلطان زیدی کا یہ بنگلا بہت بڑا تھا۔ کھنڈالا میں ایک خوب صورت کاٹیج کے علاوہ نینی تال میں بھی اس نے خوب صورت بنگلا بنا رکھا تھا جہاں وہ سال میں صرف ایک مرتبہ جایا کرتا تھا۔ سلطان زیدی کے چار بچے تھے... دو بیٹے دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹوں اور ایک بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ سب الگ الگ رہ رہے تھے۔ چھوٹی بیٹی کالج میں پڑھتی تھی۔ سلطان زیدی کی بیوی کو سیر سپاٹے کا شوق تھا جبکہ سلطان کو کام سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔

ندیم کو گیسٹ روم دے دیا گیا۔ وہ گیراج میں کھڑی ہوئی اپنی کار سے کپڑے اور ضرورت کی چند چیزیں نکال لایا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ گرم پانی سے غسل کے بعد اس نے شیو بنایا، دانت صاف کیے اور کپڑے بدل کر سلطان زیدی کے بیسمنٹ والے دفتر میں آگیا جہاں سلطان پہلے سے موجود تھا۔

کافی... پینے کے دوران ندیم اپنی اس مہم کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے ہر بات تفصیل سے بتائی تھی لیکن کرسمس کی رات والا واقعہ گول کر گیا جب وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں شراب پی کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ بات بتانے کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک بار پھر اسے مذاق اور تنقید کا نشانہ بننا پڑتا۔

سلطان زیدی بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا جیسے ندیم کی مہم جوئی کی اس داستان سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اور جب انگامی قبیلے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے گگن دیپ کا ذکر آیا تو سلطان نے رائٹنگ پیڈ اپنے سامنے رکھ لیا اور خاص خاص باتیں نوٹ کرنے لگا۔ ندیم نے بڑی تفصیل سے گگن دیپ کا حلیہ بیان کیا۔ اس کی سرگرمیوں کی تفصیل بھی بتائی۔ دوسری بستی میں بچی کی موت، قبائلیوں سے اس کا لگاؤ... ندیم نے اس کے حوالے سے کوئی پہلو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔

اس دوران ملازمہ نے ان کے سامنے سوپ سرو کر دیا۔ سلطان زیدی نے اپنا پیالہ اپنی طرف سرکا لیا۔ چند چمچے سوپ پینے کے بعد ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

''اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر گگن دیپ وراثت کا یہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو جائداد فیروز باہمن کی ملکیت ہی سمجھی جائے گی اور اگر کسی وجہ سے وصیت باطل قرار دے دی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی۔''

''وصیت باطل کیسے ہوسکتی ہے؟'' ندیم بولا۔ ''اس کی خودکشی سے پہلے تین ماہرینِ نفسیات نے اس کا تجزیہ کیا تھا اور اسے ذہنی طور پر تندرست قرار دیا تھا۔''

''انہوں نے چند دوسرے ماہرین کی خدمات حاصل کرلی ہیں جو پہلے والے ماہرین سے زیادہ تجربہ کار بھی ہیں۔ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ فیروز باہمن کی تمام پرانی وصیتیں

ضائع کی جاچکی ہیں اور اگر موجودہ وصیت باطل قرار دے دی گئی تو اس کی دولت اس کے تمام، سات بچوں میں تقسیم کر دی جائے گی اور اگر گگن دیپ اپنا حصہ لینے سے انکار کرتی ہے تو اس کا حصہ بھی باقی چھ بہن بھائیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو گیارہ بارہ ارب روپے ملیں گے۔'' ندیم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں... تقریباً۔''

''وصیت کو چیلنج کرنے کے چانسز کیا ہیں؟'' ندیم نے پوچھا۔

''ہمارا کیس ان کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہے لیکن کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔'' سلطان زیدی نے جواب دیا۔

ندیم اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اس طرح بڑبڑا رہا تھا جیسے صورت حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''اگر گگن دیپ کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو وصیت کو باطل قرار دینے کی کوشش کیوں کی جائے گی؟'' اس نے رک کر سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی تین وجوہات ہیں۔'' سلطان زیدی نے بلاتوقف جواب دیا۔ لگتا تھا جیسے اس نے پہلے ہی سے کیس کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لے رکھا ہو اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اس نے ایک بہت بڑا پلان بنا رکھا تھا اور ندیم کو مرحلہ وار اس سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ ''سب سے اہم اور پہلی وجہ یہ ہے کہ میرے مؤکل فیروز باہمن نے جائز اور قانونی وصیت تیار کی تھی اور اس نے اپنی دولت اسی طرح تقسیم کی جس طرح وہ چاہتا تھا۔ اس کا قانونی مشیر ہونے کے ناتے میری ذمے داری ہے کہ میں اس وصیت کا تحفظ کروں۔ نمبر دو، میں جانتا ہوں کہ فیروز باہمن اپنے بچوں کے بارے میں کس انداز سے سوچتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر انہیں موقع ملا تو وہ اس کی ساری دولت اور جائداد برباد کر دیں گے اور میں فیروز باہمن کے ان خدشات سے سو فیصد متفق ہوں... اور نمبر تین، عین ممکن ہے کہ گگن دیپ کی سوچ میں تبدیلی آجائے۔''

''اس بات کو ذہن سے نکال دو۔'' ندیم نے کہا۔ ''اس کا فیصلہ پتھر پر لکیر ہے۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' سلطان بولا۔ ''کاغذات اس کے پاس ہیں۔ وہ انہیں پڑھے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں بار بار پڑھے اور اس کے ذہن میں یہ تحریک پیدا ہو کہ دولت کیا معنی رکھتی ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں ہر صورت میں وصیت کا دفاع کرنا ہے ندیم... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس میز پر اہم ترین سیٹ خالی ہے۔ گگن دیپ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔''

''یہ ممکن نہیں۔ اسے بھول جاؤ۔'' ندیم نے کہا۔

''گگن دیپ کے وکیل کے بغیر مقدمے کی کارروائی شروع نہیں ہو سکتی۔'' سلطان بولا۔

ندیم چونک گیا۔ وہ بائیس تئیس سال سے سلطان زیدی کے ساتھ کام کر رہا تھا لیکن وہ ابھی تک اسے پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ ندیم اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ سلطان اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم مذاق تو نہیں کر رہے؟'' اس نے سلطان کو گھورا۔

''نہیں۔ یہ مذاق نہیں ہے اور ہم اس معاملے کو زیادہ لٹکا بھی نہیں سکتے۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''فیروز باہمن کی موت کو ایک مہینا ہو چکا ہے۔ جج پرتاب کوہلی، گگن دیپ کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہے۔ وصیت کو چیلنج کرنے کے لیے چھ پٹیشنز داخل کی جا چکی ہیں۔ اس کیس کے حوالے سے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اخبارات میں شائع ہو رہی ہے۔ اگر انہیں بھنک بھی مل گئی کہ گگن دیپ نے وراثت کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تو معاملات ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ فیروز باہمن کے ورثا اور ان کے وکیل پاگل ہوئے پھر رہے ہیں۔ انہیں احساس ہو چکا ہے کہ انہوں نے اپنی کشتیاں ریت کے دریا میں ڈال رکھی ہیں اور وہ کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا وہ سارا زور لگا رہے ہیں کہ وصیت کو باطل قرار دے دیا جائے... جج بھی زیادہ عرصے تک اس معاملے کو التوا میں نہیں ڈال سکتا۔''

''تو گویا تم مجھے گگن دیپ کا وکیل مقرر کرنا چاہتے ہو؟''

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' سلطان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اس پیشے سے ریٹائر ہو رہے ہو تو دوسری بات ہے لیکن تمہیں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا یہ آخری کیس ضرور لڑنا چاہیے۔ تمہیں صرف میز پر بیٹھ کر گگن دیپ کے مفادات کے تحفظ کی بات کرنی ہے۔ باقی سارا کام ہم کریں گے۔''

''لیکن یہ معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔'' ندیم بولا۔ ''میں تمہاری کمپنی کا پارٹنر ہوں... گگن دیپ کی وکالت کیسے کر سکتا ہوں۔''

''ہمارے مفادات چونکہ ایک ہیں اس لیے کمپنی میں تمہاری پارٹنرشپ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔'' سلطان

نے کہا۔ ''ہم یعنی میں... فیروز باہمن کا قانونی مشیر اور گگن دیپ ایک ہی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمارا مقصد ایک ہی ہے، یعنی وصیت کا تحفظ! ہم دونوں میز کے ایک ہی طرف بیٹھے ہیں۔ اور رہا سوال کمپنی میں تمہاری پارٹنرشپ کا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تم نے پچھلے اگست میں کمپنی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔''

''اور یہ بات درست بھی ہے۔'' ندیم نے کہا۔

سلطان زیدی نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا۔ وہ سوپ پیتے ہوئے بھی ندیم کے چہرے کو تکتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔

''ہم کسی موقع پر جج پرتاب کوہلی سے رابطہ کر کے اسے بتا دیں گے کہ تم نے گگن دیپ کو تلاش کر لیا ہے اور یہ کہ فی الحال اس کا ذاتی طور پر عدالت میں پیش ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے تمہیں اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم جج کے سامنے جھوٹ بولیں گے؟''

''بہت معمولی سا... لیکن مجھے یقین ہے کہ بعد میں وہ اس جھوٹ کے لیے ہمارا شکر گزار ہو گا۔ وہ اس مقدمے کی کارروائی شروع کرنے کے لیے بے چین ہے لیکن جب تک گگن دیپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملے، وہ ایسا نہیں کر سکتا... اور اگر تم گگن دیپ کے وکیل کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوتے ہو تو جنگ شروع ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' ندیم نے کہا۔

''تو ایسا کرو کہ میرے کھنڈالا والے کاٹیج میں چلے

www

یم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 300/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا "ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں"۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 225/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے لرزہ خیز مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی بے بسی کی الم ناک داستان

قیصر و کسریٰ 300/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی حالات اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

پاکستان سے دیارِ حرم تک 125/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

گمشدہ قافلے 300/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستان مجاہد 200/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکہ آرا داستان

پردیسی درخت 275/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلۂ حجاز 300/-
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون 300/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی 275/-
لارڈ کلایو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ 150/-
بحر الکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ 225/-
فرڈی ننڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی 125/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان جنہیں بمحاذ پر منہ کی کھانی پڑی

محمد بن قاسم 225/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش 100/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تجزیہ، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان 275/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی 300/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

شاہین 275/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد 125/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا 225/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو ردعمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین 225/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے مجاہد کی داستان

جہانگیر بکس

051 55 [illegible] · 4781781 · 67256 · 021 27650

جاؤ۔ وہ آج کل خالی پڑا ہوا ہے۔'' سلطان نے کہا۔ ''وہاں کسی کی مداخلت کے بغیر تم آرام کر سکو گے اور تمہیں سوچنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ہر پریشانی کو ذہن سے نکال دو... تم صرف فرنٹ مین کے طور پر ہو گے۔ باقی سارا کام ہم کریں گے۔''

ندیم شیلف میں بھری ہوئی کتابوں کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ صرف اڑتالیس گھنٹے پہلے وہ دیبور گڑھ کی ایک سڑک کے کنارے بینچ پر بیٹھا سینڈوچ کھاتے ہوئے قریب سے گزرتے ہوئے لوگوں کے چہروں کو گھور رہا تھا لیکن اسے کسی چہرے میں مشابہت نظر نہیں آئی تھی اور اسی وقت اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اب وہ کبھی وکیل کی حیثیت سے عدالت میں پیش نہیں ہو گا لیکن سلطان کی تجویز نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ پیشہ ورانہ زندگی کے اس آخری مقدمے کے لیے گگن دیپ سے بہتر کوئی اور کلائنٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ بازی بہت اونچی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کیس سے اسے اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ چند ماہ آسانی سے گزارہ کر سکے گا۔

سلطان اپنا سوپ ختم کر چکا تھا۔ وہ پیالہ ایک طرف سرکاتے ہوئے بولا۔

''اس کیس میں تمہاری فیس پچاس ہزار روپے ماہانہ ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ اس رقم سے تمہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں خاصی مدد ملے گی۔''

''اور میرا انکم ٹیکس کیس؟'' ندیم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے جج سے بات کر لی ہے۔'' سلطان نے کہا۔ ''جیل کا خوف ذہن سے نکال دو۔ جرمانے پر معاملہ ختم ہو جائے گا اور پانچ سال کے لیے تمہارا وکالت کا لائسنس معطل کر دیا جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرا لائسنس چھن جائے گا تو...''

''ابھی نہیں۔'' سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کم از کم ایک سال تک اس معاملے کو نہیں چھیڑا جائے گا۔''

''شکریہ۔'' ندیم نے جواب دیا۔ اس پر تھکن سی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ آرام دہ بستر پر سو جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ اتوار کا دن تھا۔ ندیم صبح چھ بجے اٹھ گیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ وہ اس شہر بے وفا سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا جہاں اس نے زندگی کے چھبیس سال گزارے تھے۔ اب وہ یہاں صرف ایک رات رہا تھا اور مزید ایک منٹ بھی نہیں رکنا چاہتا تھا۔

سلطان زیدی بیسمنٹ والے دفتر میں بیٹھا ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ ندیم اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو کام کے علاوہ کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں اور اس نے کام ہی سے اتنی دولت کمائی تھی۔ ندیم اس بات پر بھی دل ہی دل میں شکر ادا کر رہا تھا کہ سلطان نے اسے دفتر میں کام کرنے کو نہیں کہا۔ ندیم اب اپنے کام سے بیزار... ہو چکا تھا۔ اس نے بھی اگرچہ زندگی بھر بڑی محنت سے کام کیا تھا، بہت کچھ کمایا تھا لیکن اس کی دونوں بیویوں نے اسے کنگلا کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ وہ منشیات کا عادی ہو گیا تھا اور چار مرتبہ موت کے منہ سے لوٹ کر آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس پر اس قسم کا پانچواں دورہ پڑا تو وہ زندہ نہیں بچ سکے گا۔

وہ بہت خوش تھا کہ اب اس شہر سے جا رہا ہے جہاں کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود وہ قابلِ رحم حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ انکم ٹیکس کیس میں اسے سزا ہو جانے کا خوف تھا۔ سلطان کی باتوں سے یہ خوف بھی دور ہو گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اس نے اپنے کپڑے اور کچھ ضروری چیزیں سوٹ کیس میں رکھیں اور باقی سامان گیراج ہی میں رہنے دیا۔

اس کی کار بہترین حالت میں تھی۔ وہ بہت عرصے بعد ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ہوئی سڑکوں پر کار چلانے میں اسے واقعی بہت مزہ آ رہا تھا۔ شہر سے نکل کر اس نے کار کا رخ کھنڈالا کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ بارش کی وجہ سے ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ بڑے مطمئن انداز میں ڈرائیو کرتے ہوئے اسے جیوی کا خیال آ گیا۔ کیا جیوی اپنے ٹینک نما ٹرک کو ممبئی کی سڑکوں پر اس خوفناک رفتار سے دوڑا سکتا ہے؟ وہ دیر تک جیوی اور پرشوتم کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ موقع ملتے ہی ان دونوں کو خط لکھے گا۔

ہلکی بارش مسلسل ہو رہی تھی اور کار متوسط رفتار سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ وہ سڑک پر نظریں جمائے مختلف لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں اپنے معالج چیٹر جی کے بارے میں، اپنی دونوں سابقہ بیویوں اور بچوں کے بارے میں۔ اپنے بڑے بیٹے کا خیال آتے ہی اس نے کار میں لگے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا جو بنگلور کے ایک

کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور ہوسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ کال ریسیو نہیں کی گئی۔ ندیم یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ تئیس سال کی عمر کا لڑکا اتوار کی شب کہاں اور کیسے گزار سکتا ہے۔

ندیم کی بڑی بیٹی کی عمر اکیس سال تھی۔ وہ کبھی کالج میں داخلہ لے لیتی اور کبھی چھوڑ دیتی۔ آخری مرتبہ ان کی بات ہوئی تھی تو اس نے ٹیوشن کے لیے کہا تھا اور اسی رات ندیم نے ایک ہوٹل کے کمرے میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ ندیم کی ایک بیوی اس سے طلاق لینے کے بعد دو شادیاں کر چکی تھی اور دونوں مرتبہ اسے طلاق ہو گئی تھی۔ ندیم کے خیال میں وہ دنیا کی بدتر عورت تھی اور اس کے ساتھ نباہ کرنا کسی شریف آدمی کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اس کی دوسری بیوی بھی ایک وکیل سے شادی کر چکی تھی۔ ندیم کے دونوں چھوٹے بچے اسی کے پاس تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے بچوں سے معافی مانگے اور ان کے ساتھ کچھ خوش گوار وقت گزارنے کی کوشش کرے لیکن اس کے خیال میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اب ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی آبادی میں اس نے کار روک لی اور ناشتا کرنے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا اور میز پر رکھا ہوا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اخبار میں اس کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہی خبریں تھیں جو الفاظ کے ردّوبدل کے ساتھ روزانہ چھپتی تھیں۔

دو گھنٹے کا فاصلہ بارش کی وجہ سے تین گھنٹوں میں طے ہوا۔ کھنڈالا خوب صورت جگہ ہے۔ اونچی نیچی سڑکیں، سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، کچھ پرانی طرز کی عمارتیں اور جدید طرزِ تعمیر کے حامل خوب صورت بنگلے اور کاٹیجز۔ گرمیوں کے موسم میں تو یہاں خوب رونق رہتی تھی۔ شہر کی آبادی میں اضافہ ہو جاتا تھا لیکن سردیوں میں یہاں کی رونق ختم ہو جاتی تھی اور آج تو بارش اور پھر اتوار ہونے کی وجہ سے سڑکیں تقریباً سنسان تھیں اور دکانیں بھی بند تھیں۔ کہیں کہیں کوئی دکان کھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

کاٹیج مین روڈ سے تقریباً دو فرلانگ دور رائے اسٹریٹ پر واقع تھا۔ اس کے عقب میں پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی خوب صورت جھیل بھی تھی۔

ندیم کے پاس چابیاں موجود تھیں۔ کاٹیج باہر سے بنگلے کی طرح تھا اور جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کی آنکھیں

''یہ تم نے کس قسم کی سیٹی مجھے دے دی ہے؟ اس کی آواز سنتے ہی یہ سب پرندے آ کر مجھے ٹھونگیں مارنے لگتے ہیں...''

حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ شان دار فرنیچر بڑے سلیقے سے آراستہ تھا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ سلطان نے بتایا تھا کہ ایک عورت ہفتے میں دو مرتبہ صفائی کرنے کے لیے یہاں آتی ہے۔ سلطان اور اس کی بیوی گرمیوں میں مہینے میں ایک بار دو تین دن کے لیے یہاں آتے تھے۔

یہ خوب صورت کاٹیج چار بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ ایک شان دار کچن تھا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ خشک دودھ کا بڑا ڈبا بھی رکھا ہوا تھا لیکن کافی یا چائے کی پتی نہیں تھی۔

ندیم کاٹیج کو تالا لگا کر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔

اس نے راستے میں ایک دکان کھلی ہوئی دیکھی۔ وہاں تک پہنچنے میں اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

واپس آتے ہوئے ندیم کی ملاقات عدنان نامی ایک ادھیڑ عمر آدمی سے ہو گئی جو تیسرے بنگلے میں رہائش پذیر تھا۔ وہ اپنی بیوی مریم کے ساتھ بنگلے کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے ندیم کو اندر آنے کی دعوت دی تو وہ انکار نہ کر سکا۔

عدنان کا بنگلا بھی چار بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہو چکا تھا اور مستقل طور پر یہاں رہائش پذیر تھا۔ ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی جس کی کافی عرصے پہلے شادی ہو چکی تھی اور وہ فیض آباد میں رہائش پذیر تھی۔

ندیم دیر تک ان کے ہاں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے بارے میں بھی انہیں بہت کچھ بتایا۔ دونوں میاں بیوی بہت پُرخلوص ثابت ہوئے۔ ان کے اصرار پر ندیم نے دوپہر کا کھانا انہی کے ساتھ کھایا اور پھر رات کے کھانے کی دعوت بھی قبول کرلی۔

عدنان اور مریم کی وجہ سے ندیم کو یہاں بڑا سہارا مل گیا تھا۔ اس کا زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزرتا۔ کبھی ندیم ان کے ہاں چلا جاتا اور کبھی وہ اس کے ہاں آجاتے۔ کبھی ندیم پیچھے جھیل کی طرف سیر کو نکل جاتا اور کبھی کمرے میں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر کچھ لکھنے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنی زندگی کے واقعات کو ایک داستان کی صورت میں ترتیب دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے لکھنے کی پریکٹس شروع کردی تھی۔

☆☆☆

دھن راج مہتا کو اپنے برطرف کیے جانے کی اطلاع دفتر کے فیکس اور ای میل پر ملی تھی۔ سوسن نے پورا ایک ہفتہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گرما گرم بحث مباحثے کے بعد بالآخر دھن راج مہتا کو برطرف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور سوموار کی صبح کو ای میل اور فیکس کے ذریعے اسے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کردیا تھا۔

دھن راج مہتا کا خون کھول اٹھا۔ اس نے فوراً ہی جوابی فیکس کے ذریعے سوسن کو پانچ لاکھ روپے کا بل بھیج دیا۔ سوسن سے اس کا معاملہ پہلے پانچ لاکھ روپے ماہانہ فیس پر طے ہوا تھا اور بعد میں پرسنٹیج کی بات ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے کہ اب پرسنٹیج کی بات نہیں رہی تھی اس لیے اس نے ایک مہینے کا بل بھیج دیا تھا۔ پچیس فیصد کمیشن کے حساب سے وہ بہت بڑی امید لگائے بیٹھا تھا۔ اسے امید تھی کہ وراثت کا معاملہ طے ہو جانے پر اس کی مؤکلہ کو کم سے کم دس ارب روپے ضرور ملیں گے اور اسی حساب سے وہ بھی ارب پتی بننے کا خواب دیکھ رہا تھا لیکن فیکس اور ای میل پر ملنے والے اس پیغام نے اس کے سارے خواب چکنا چور کردیے تھے۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی گئی تھی۔ اس نے کیا کیا منصوبے بنائے تھے لیکن سب کچھ چشمِ زدن میں زمیں بوس ہوگیا تھا۔

وہ کتنی دیر تک اپنے سامنے رکھے ہوئے فیکس کو گھورتا رہا پھر فون کا ریسیور اٹھا کر ستیش چوپڑا کا نمبر ملانے لگا۔ یہ جو کچھ ہوا تھا ستیش چوپڑا کی وجہ سے ہی ہوا تھا اور وہ فی الحال ٹیلی فون پر ہی اس سے دو دو ہاتھ کرلینا چاہتا تھا لیکن چوپڑا کی سیکریٹری نے بتایا کہ وہ میٹنگ میں مصروف ہے اور کسی سے فون پر بھی بات نہیں کرسکتا۔ دھن راج نے غصے میں ریسیور پٹخ دیا۔

ستیش چوپڑا، فیروز باہمن کی پہلی فیملی کے چار میں سے تین ورثا کو ہائی جیک کرچکا تھا۔ پہلے فرشید سے اس کا کمیشن پچیس فیصد طے ہوا تھا پھر مہتاب باہمن کے مل جانے سے یہ کمیشن بیس فیصد پر آگیا اور اب سوسن کی شمولیت سے اس کا کمیشن سترہ فیصد پر آگیا تھا لیکن اس پر بھی وہ بہت خوش تھا۔ وصیت کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس کمیشن سے بھی وہ ارب پتی بن سکتا تھا۔

دس بجے کے قریب ستیش چوپڑا کانفرنس روم میں داخل ہوا جہاں فیروز باہمن کے باقی ورثا کے قانونی مشیر جمع ہو چکے تھے۔ ستیش چوپڑا نے انہیں ایک اہم میٹنگ کے لیے بلایا تھا۔ اس نے چند استقبالیہ جملے کہے، باری باری سب سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بڑے پُرجوش لہجے میں بولا۔

''میں آپ لوگوں کو سب سے پہلے یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر دھن راج مہتا کا اس کیس سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کی سابق مؤکلہ مس سوسن نے اسے خدمات سے سبکدوش کردیا ہے اور اس کیس کے حوالے سے تمام تر ذمے داریاں مجھے سونپ دی ہیں۔''

ستیش چوپڑا کے یہ الفاظ کلسٹر بم کی طرح دھماکے کرتے ہوئے کانفرنس روم میں پھیل گئے۔ گنگورام ڈاڑھی کھجاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا بات تھی جس نے سوسن کو، دھن راج مہتا کو اس کیس سے الگ کرنے پر مجبور کردیا؟ لیکن وہ بہرحال اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ راون کی ماں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکی تھی کہ اس کا بیٹا بھی کسی اور وکیل کی خدمات حاصل کرلے لیکن راون کو ماں سے شدید نفرت تھی۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

مرینہ کی خاتون قانونی مشیر رام کلی کی آنکھوں میں تشویش لہرا گئی۔ دراصل اس کی پریشانی اسی روز شروع ہوگئی تھی جب ستیش چوپڑا نے مہتاب باہمن کو توڑا تھا لیکن یہ سوچ کر وہ کسی قدر مطمئن ہوگئی تھی کہ اس کی مؤکلہ مرینہ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں سے شدید نفرت کرتی ہے اور وہ ان کی صورت تک دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ اس لیے اسے اطمینان تھا کہ مرینہ اس گروپ میں نہیں جائے گی۔ لیکن بہرحال، رام کلی نے اس میٹنگ کے بعد مرینہ اور اس کے شوہر دشمبر سنگھ کے اعزاز میں ایک شان دار ڈنر دینے کا فیصلہ

کرلیا تھا۔

دھن راج مہتا کی اس کیس سے برطرفی کی خبر سن کر کندن لال کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اسے اپنی گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ستیش چوپڑا ان کے مؤکلوں کو ہائی جیک کررہا تھا۔ پہلی فیملی میں سے سمرا ہی ایسی تھی جو ابھی تک اس گروپ میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ سمرا، کندن لال کی مؤکلہ تھی اور اس نے طے کرلیا تھا کہ اگر ستیش چوپڑا نے اسے بھی ورغلانے کی کوشش کی تو وہ چوپڑا کو قتل کردے گا۔

''میری مؤکلہ سے دور ہی رہنا... سمجھے!'' اس نے کھا جانے والی نظروں سے ستیش چوپڑا کی طرف دیکھتے ہوئے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے پر سب ہی چونک گئے۔

''ریلیکس مسٹر کندن لال۔''

''لعنت ہو تم پر۔'' کندن لال غرایا۔ ''تم ہمارے کلائنٹس کو ہائی جیک کررہے ہو۔ ہم آرام سے کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟''

''میں نے سوسن کو ہائی جیک نہیں کیا۔'' ستیش چوپڑا بولا۔ ''اس نے خود مجھے فون کیا تھا اور ظاہر ہے، میں کسی سے ملنے سے انکار نہیں کرسکتا۔''

''ہم بے وقوف نہیں ہیں مسٹر چوپڑا! تم جو کھیل، کھیل رہے ہو ہم اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں۔'' کندن لال نے کہتے ہوئے دوسروں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے کوئی بھی خود کو بے وقوف نہیں سمجھتا تھا لیکن کندن لال کے بارے میں وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ کسی کو دوسرے پر بھروسا نہیں تھا۔ بازی بہت اونچی تھی۔ بہت بڑی رقم داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ کوئی اعتبار نہیں تھا کہ قریب بیٹھا ہوا ساتھی آپ کے پہلو میں چھرا گھونپ دے۔

اسی وقت ستیش چوپڑا کی سیکریٹری، وکرم سنگھ کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو ان کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ ستیش چوپڑا نے وکرم کا تعارف کرایا تو ان میں سے بعض کے چہروں پر سنسنی کے سے تاثرات ابھر آئے۔ وکرم کے چہرے پر بھی ایسے تاثرات تھے جیسے اسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کردیا گیا ہو۔ وہ میز کے سرے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دو ویڈیو کیمرے اسے فوکس میں لیے ہوئے تھے۔

''یہ صرف ریہرسل ہے... گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' ستیش چوپڑا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تمام وکیلوں نے رائٹنگ پیڈ اپنے اپنے سامنے رکھ لیے۔ ہر ایک نے پہلے ہی سے سوالوں کی ایک طویل فہرست تیار کررکھی تھی۔

ستیش چوپڑا اپنی جگہ سے اٹھ کر وکرم سنگھ کے پیچھے چلا گیا اور دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

''اب صورتِ حال یہ ہے مسٹر وکرم کہ جب تم اپنا حلفیہ بیان دوگے تو پہلے مخالف پارٹی کے وکیلوں کو تم پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ اب تم ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے یہ تصور کرلو کہ ہم تمہارے دشمن ہیں اور تم پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

وکرم پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے لیکن وہ ان سے ایک بڑی رقم لے چکا تھا اور یہ کھیل کھیلنے پر مجبور تھا۔

ستیش چوپڑا نے اپنا رائٹنگ پیڈ اٹھالیا اور وکرم سے سوالات کرنے لگا۔ یہ بہت سیدھے سادھے اور معمولی نوعیت کے سوال تھے۔ وہ کہاں پیدا ہوا تھا؟ اس کا خاندانی پس منظر، اس نے تعلیم کہاں تک اور کہاں سے حاصل کی تھی؟ اس کے کنبے میں کتنے افراد تھے اور کیا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ... وکرم بڑی آسانی سے ان سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ اس کی گھبراہٹ بھی ختم ہوگئی تھی پھر وہ مرحلہ آیا جب اس نے فیروز باہمن کے پاس ملازمت شروع کی تھی۔ اس سے مختلف سوالات کیے جارہے تھے اور کئی سوال تو اس کے خیال میں بالکل لاتعلق تھے۔

چند منٹ کا وقفہ دیا گیا۔ اس دوران وکرم سنگھ کو واش روم جانے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور جب اگلا سیشن شروع ہوا تو کمان خاتون وکیل رام کلی نے سنبھال لی۔ وہ فیروز باہمن، اس کے خاندان، بیویوں، بچوں، دوستوں اور رشتے داروں کے بارے میں سوال کرتی رہی۔ وکرم سنگھ

گاپوجی گاپوجی گم گم

انٹرویو کے دوران میں امیدوار سے مختلف سوالات پوچھے گئے جن کے اس نے درست جواب دیے اور وہ فخریہ انداز سے چیئرمین کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ اب وہ اس پوسٹ کا حق دار تھا۔

چیئرمین نے گہرا سانس لے کر اگلا سوال کیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ گاپوجی گاپوجی گم گم کا کیا مطلب ہے؟''

امیدوار نے بہت سوچا اور پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ مجھے یہ نوکری دینا نہیں چاہتے۔''

کے خیال میں بعض سوال تو ایسے تھے جو محض خانہ پری کے لیے کیے جا رہے تھے لیکن بہر حال، اسے ہر سوال کا جواب دینا تھا۔

''کیا تمہیں گگن دیپ کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا؟'' رام کلی نے ایک اور سوال کیا۔

''مجھے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔'' اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ گویا وہ یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے ستیش چوپڑا کی طرف دیکھا۔

ستیش چوپڑا کو باتیں گھڑنے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ وہ فوراً ہی بول پڑا۔ ''میرے خیال میں تو تم فیروز باہمن، اس کی بیویوں اور بچوں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔ ان کی کوئی بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ فیروز باہمن تم پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور اس نے کبھی کوئی بات تم سے نہیں چھپائی۔ یہاں تک کہ اس نے تمہیں اپنی ناجائز بیٹی کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ جب تم نے فیروز باہمن کے پاس ملازمت شروع کی تو اس وقت وہ لڑکی دس یا گیارہ سال کی تھی۔ فیروز باہمن گئے برسوں میں بار بار بیٹی سے ملنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے باپ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اس سے دور بھاگتی رہی۔ میرے اندازے کے مطابق گگن دیپ کے اس رویے سے وہ بددل ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے چاہا جائے مگر بیٹی نے اسے ٹھکرا دیا جس سے اس کی مایوسی غصے میں بدل گئی اور وہ گگن دیپ سے شدید نفرت کرنے لگا۔ ان حقائق کے بعد فیروز باہمن کا اپنا سب کچھ گگن دیپ کے نام چھوڑ جانا ثابت کرتا ہے کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔''

وکرم سنگھ ایک بار پھر دل ہی دل میں ستیش چوپڑا کی دروغ سازی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ دوسرے وکیل بھی اس کی ذہانت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟'' ستیش چوپڑا نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

ان سب نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلا دیے۔ ''بہتر ہے کہ وکرم سنگھ کو گگن دیپ کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا جائے۔'' کندن لال نے کہا۔

وکرم نے وہی کہانی کیمرے کے سامنے دہرا دی جو ستیش چوپڑا نے اس کے ذہن میں بٹھائی تھی۔ کیمرے کے سامنے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات بھی بڑے غضب کے تھے۔ وہ ایک بہت اچھا اداکار بھی ثابت ہو رہا تھا۔ دوسرے وکیل بھی اس کی پرفارمنس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ''اس ذلیل آدمی سے وہ سب کچھ اسی انداز میں کہلوایا جا سکتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔'' کندن لال بڑبڑایا۔

کسی سوال کا جواب وکرم کی سمجھ میں نہ آتا تو وہ کہہ دیتا۔ ''میں نے اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔'' ایسے موقع پر کمرے میں بیٹھے ہوئے وکیل اس کی مدد کرتے۔ ایسی باتوں میں ستیش چوپڑا پیش پیش تھا۔ لگتا تھا جیسے اس نے ہر سوال کا جواب پہلے ہی سے گھڑ رکھا ہو۔ دوسرے وکیل بھی گاہے بہ گاہے لقمے دے رہے تھے۔ اس وقت ہر کوئی دروغ سازی کے معاملے میں اپنی ذہانت ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

تہ در تہ جھوٹ سے بالآخر ایک ایسی کہانی تیار کر لی گئی جس سے وہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ فیروز باہمن نے جب اپنی آخری وصیت لکھی تو اس وقت اس کا ذہنی توازن درست نہیں تھا۔ وکرم سنگھ ان کا اہم ترین گواہ تھا۔ ہر بات اس کے ذہن میں اچھی طرح بٹھا دی گئی تھی۔ اس کا لب ولہجہ اور اداکاری دیکھ کر انہیں یقین تھا کہ اس کے بیان کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ اس قدر مضبوط ثابت ہوا تھا کہ ان کے خیال میں مخالف پارٹی کا کوئی وکیل اس سے کوئی دوسری بات کہلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

تین گھنٹے تک وکرم سنگھ کو بیان کے لیے تیار کیا گیا۔ ہر بات اس کے ذہن میں اچھی طرح بٹھا دی گئی اور اگلے دو گھنٹوں میں اسے آزمائش سے گزارا گیا۔ سوال در سوال کیے گئے۔ سب اس پر چیختے چلّاتے رہے۔ اسے جھوٹا اور مکار کہا گیا۔ رام کلی سب سے زیادہ شدت سے اس پر حملے کر رہی تھی۔ ایک موقع پر تو یوں لگا جیسے وکرم میں دراڑیں پڑنے لگی ہوں لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور بالآخر انہوں نے جرح ختم کر دی۔ وہ مطمئن تھے۔ اب وکرم کو زیر کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ستیش کے خیال میں جھوٹ کے اس حصار کو مزید مضبوط کرنے کی ضرورت تھی۔

وکرم سنگھ جب وہاں سے روانہ ہونے لگا تو اس کے پاس اس میٹنگ کے کئی ویڈیو کیسٹ بھی تھے جنہیں بار بار دیکھ کر اسے خود کو عدالت میں پیش ہونے کے لیے مکمل طور پر تیار کرنا تھا۔

تلاش جستجو کی اس داستان کے باقی
واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کیجیے

جرم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان ہونے والے مقابلے کا پرمزاح و پرتجسس قصہ

محمد عفان

بزدل

کچھ لوگ کسی بھی قسم کا کام کرتے ہوں ان میں سے بعض افراد میں یہ انفرادیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی متعین کردہ حدود سے متجاوز نہیں ہوتے۔ اپنا وقار اپنی رفعت کوداؤ پرنہیں لگاتے اور تندوتیز جذبات کے ریلے میں بہہ نہیں جاتے۔ مجرمانہ زندگی اختیار کرنے والے گروہوں کے گرد گھومتی کہانی جس کے کچھ کردار طلسماتی خاصیت رکھتے تھے۔

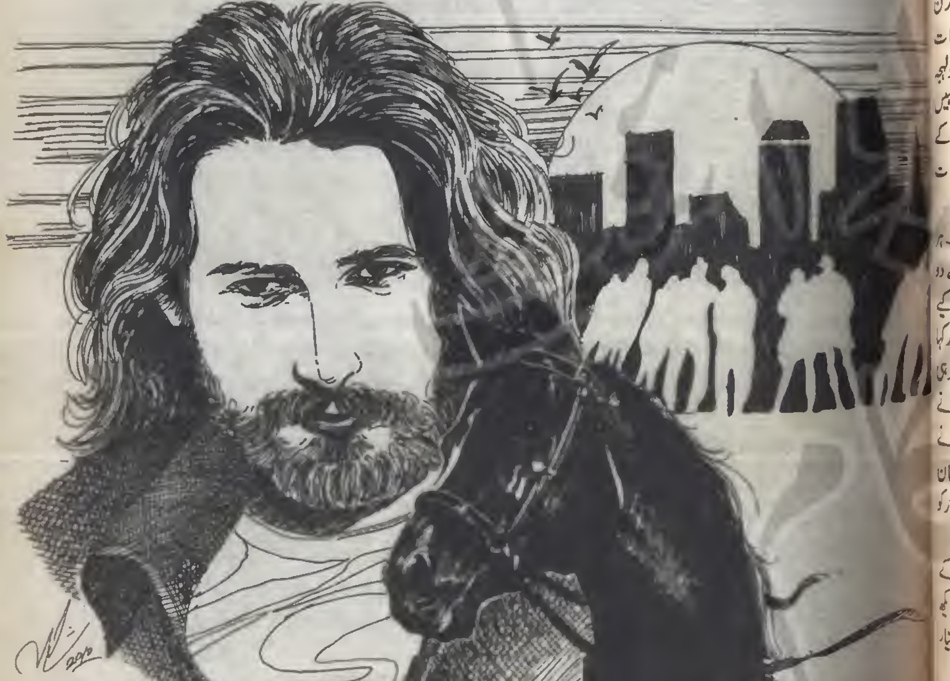

وہ فالکن اسٹریٹ پر نمودار ہوا تو سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے چھ فٹ قد، لمبے سنہری بال جو اس کے شانوں تک آ رہے تھے۔ شان دار جسامت اور پھر اس کے بڑے سے چہرے پر سرخی مائل سنہری ڈاڑھی جو دیکھنے والے کو خود متوجہ کر لیتی تھی۔ اس نے سرخ لیدر کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس پر لیدر کی ہی سنہری جھالریں تھیں۔ نیلی جینز بھی قیمتی تھی۔ سر پر کاؤبوائے ہیٹ تھا۔ نیویارک میں ایسے لوگ کم ہی نظر آتے ہیں۔ مائک نے اسے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''یہ کوئی نیا آدمی ہے۔''

''میں اسے جانتا ہوں۔'' ٹومی بولا۔ ''یہ تین دن سے اسکاٹ کے بار میں آ رہا ہے۔ کسی سے بات نہیں کرتا اور سنا ہے کہ جنوب سے آیا ہے۔''

''جنوب... کہاں سے؟''

''یہ نہیں پتا۔'' ٹومی نے جواب دیا۔

مائک اور ٹومی نیو پارک کے ایک اسٹریٹ گینگ کا حصہ تھے۔ یہ پورا علاقہ ان گینگز میں بٹا ہوا تھا۔ نوجوانوں پر

مشتمل یہ گینگ اپنے علاقے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی کسی کے علاقے میں کسی قسم کی دخل اندازی کرتا تو اس پر خوں ریز لڑائی بھی ہوتی تھی۔ لڑکے چاقوؤں، کاٹنے والی بیلٹوں، ڈنڈوں اور اسی طرح کے ہتھیاروں سے ہمہ وقت مسلح رہتے تھے لیکن ضرورت پڑنے پر وہ آتشیں اسلحہ بھی نکال لیا کرتے تھے۔ لیکن ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا۔ آتشیں اسلحہ استعمال کرنے کی صورت میں پولیس کی مداخلت لازمی ہو جاتی جس سے کئی دن کے لیے ان کے معمولات رک جاتے اور یہ معمولات نفع بخش تھے۔ وہ ان کا رکنا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے عام طور سے پُرامن بقائے باہمی کے اصول پر قائم رہتے لیکن کبھی کبھی جھگڑے کی نوبت آ ہی جاتی تھی۔

مائک کا گینگ فالکن اسٹریٹ پر قابض تھا۔ دو سال پہلے جب فالکن اسٹریٹ کا پرانا گینگ دو افراد کی موت کی وجہ سے ٹوٹا تو مائک نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر اپنا گینگ تشکیل دیا اور اس گینگ نے شدید لڑائیوں کے بعد یہاں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ مائک سمیت اس میں درجن بھر افراد تھے جو لڑنے میں ماہر تھے لیکن کچھ عرصہ ہوا کہ ان کا مخالف گینگ جو فیڈر کان کے نام سے مشہور تھا، طاقت ور ہوتا جا رہا تھا اور انہوں نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیے تھے۔ مائک کو اطلاع ملی تھی کہ فیڈر کان نے اس کے دو کوریئر توڑ لیے ہیں جو علاقے میں گھوم پھر کر منشیات سپلائی کرتے تھے۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی تھی کہ انہوں نے مائک کے گروپ سے منشیات لینا بند کر دی تھی۔ اس کے باوجود ان کے گاہکوں کو سپلائی جاری تھی۔ مائک اور اس کے ساتھیوں کے لیے یہ بہت تشویش ناک بات تھی۔ ان کی کمائی کا ذریعہ ہی منشیات کی فروخت تھی اور اگر ان کی آمدنی میں کمی ہوتی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ کمزور ہو رہے ہیں۔ گینگ میں جنگل کا قانون ہوتا ہے۔ کمزور کے لیے سوائے موت کے اور کہیں پناہ نہیں ہوتی۔ بقا کے لیے طاقت کا حصول لازمی ہوتا ہے اور طاقت دولت سے ملتی ہے۔

مائک نے اپنے ساتھیوں سے میٹنگ کی اور یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ مائک کے دستِ راست ٹومی نے کہا۔ ''فیڈر کان میں لڑکوں کی تعداد مستقل بڑھ رہی ہے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک لڑاکے ہیں۔''

''لیکن وہ ہمارے لڑکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' سینڈلر نے سینہ پھلا کر کہا۔

''ہمیں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے۔'' ٹومی بولا۔ ''فیڈر کان کے اراکین کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا ہے۔ وہ دو درجن سے اوپر جا چکے ہیں۔''

''لیکن وہ ہم سے الجھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔'' سینڈلر نے پھر کہا۔

''تم بھول رہے ہو، وہ ہمارے دو کوریئر توڑ چکے ہیں۔'' ٹامی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ دو کوریئر ہمارے بزنس کا ایک تہائی حصہ سپلائی کرتے تھے۔ ہماری آمدنی میں اسی حساب سے کمی آ چکی ہے۔''

''تب ہم کیا کریں؟ ہم فیڈر کان کے گروپ سے از خود تو نہیں الجھ سکتے۔'' سینڈلر بولا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ وہ خود بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔''

''ان کو حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مائک نے پہلی بار کہا۔ ''وہ خاموشی سے ہمیں تباہ کر رہے ہیں۔''

''سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔'' ٹومی نے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہماری بقا اس سوال کے جواب میں ہے۔''

مائک نے اس کی تائید کی۔ ''ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر فیڈر کان کا گروپ ایک بار یہاں داخل ہو گیا تو ہمارے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں رہے گی۔''

ٹومی نے سرد آہ بھری۔ ''یہاں کہاں... ہماری... نیویارک میں کہیں کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ اس لیے جلد ہی ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔''

سوال پھر وہی آ گیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے؟ اس پر سب کی نظریں مائک کی طرف اٹھ گئیں کیونکہ وہ باس تھا اور کسی مسئلے کا حل نکالنا اس کی ذمے داری تھی۔ مائک جانتا تھا کہ اسے اپنی کرسی برقرار رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ اس نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس ایک تجویز ہے۔''

''وہ کیا؟'' سب نے بیک وقت کہا۔

''ہمیں مزید لڑکے بھرتی کرنے چاہئیں۔''

''لڑکے کہاں سے آئیں گے؟'' ٹومی نے سوال کیا۔

''جہاں سے بھی آئیں۔'' مائک فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''ہمیں بہر صورت ریکروٹنگ کرنی ہے، تب ہی ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ فیڈر کان کا مقابلہ کر سکیں اور بزنس میں اپنی پوزیشن برقرار رکھ سکیں۔''

''یعنی ہمیں لڑکے لینے میں زیادہ چھان پھٹک نہیں کرنی چاہیے۔'' ٹومی طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اشتہار دے کر بھرتی کرنی چاہیے۔''

''اس کا نتیجہ کچھ اور بھی نکل سکتا ہے۔'' ایک تجربے کار رکن سائمن نے کہا۔ ''ایک کالی بھیڑ پورے گینگ کو تباہ کر سکتی ہے۔''

''ہم فیڈر کان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی اجنبی کو اپنے گروہ میں نہیں شامل کر سکتے۔'' سینڈلر نے کہا۔

مائک نے دیکھا کہ اس کے اکثر ساتھی اس کی تجویز کے حق میں نہیں ہیں۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم کسی اجنبی کو شامل نہیں کرتے لیکن یہاں ہمارے کچھ نہ کچھ جانے پہچانے لڑکے ہوں گے۔ ہمیں بس انہی لڑکوں کو بھرتی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

مگر مسئلہ یہ تھا کہ کام کے لڑکے فوراً نہیں مل سکتے تھے۔ اس میں کچھ وقت لگتا اور فیڈر کان کسی طوفان کی طرح ان کے سر پر چڑھا آ رہا تھا۔ مائک نے اپنے لڑکوں کو ٹاسک دے دیا تھا کہ وہ نئے لڑکے تلاش کریں اور ان کے بارے میں مکمل چھان بین کریں۔ اس کے بعد انہیں گینگ میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس میٹنگ کے بعد مائک کے ساتھی نئے لڑکوں کی تلاش میں لگ گئے۔ انہیں بھی احساس تھا کہ نئی افرادی قوت کے بغیر وہ فیڈر کان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مگر دو ہفتے گزرنے کے بعد بھی مسئلہ جوں کا توں رہا۔ جو لڑکے مل رہے تھے، وہ مشکوک تھے اور جو کسی شک سے پاک تھے، وہ ان کے ساتھ ملنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف فیڈر کان نے ان کا ایک ورنیر اور توڑ لیا تھا۔ ان کی منشیات کی آمدنی میں مستقل کمی آ رہی تھی۔ صورتِ حال گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ فالکن والوں کا اگلا اجلاس اسکاٹ کے بار کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں ہوا۔ یہ جگہ ایک طرح سے ان کا اڈا تھا اور کسی بھی ہنگامی موقعے پر ان کی میٹنگ بھی یہیں ہوتی تھی۔ وہ صبح سویرے یہاں آئے تھے۔ میٹنگ کا وقت دس بجے تھا اور جب دس بج گئے تو مائک نے اپنے ساتھی جوزی کے بارے میں پوچھا۔

''جوزی اب تک کیوں نہیں آیا؟''

جوزی عام طور سے ٹومی کے ساتھ رہتا تھا اس لیے سب نے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ جوزی کو میں نے بھی کل سے نہیں دیکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔''

مائک فکر مند ہو گیا۔ ''وہ خیریت سے تو ہے؟''

ٹومی ہچکچایا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ وہ کچھ زیادہ ہی خیریت سے ہے۔ میں اس سے کل سے دو بار بات کر چکا ہوں لیکن وہ مجھے بتانے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ منحرف ہو چکا ہے۔'' سینڈلر نے کہا۔ اس کا لہجہ سنگین تھا۔

''ہمیں الزام لگانے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔'' مائک نے اسے سرزنش کی۔

''تب اس کا آج کی انتہائی اہم میٹنگ میں شرکت نہ کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟'' سینڈلر کا انداز الزام لگانے والا تھا۔ وہ ٹومی کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے جوزی کے منحرف ہونے میں اس کا قصور ہو۔

''میرا خیال ہے سینڈلر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' خلافِ توقع خود ٹومی نے بھی کہہ دیا۔ ''ورنہ وہ مجھے کسی صورت اس طرح سے نہیں ٹال سکتا۔''

مائک کے لیے یہ ایک اور خوفناک خبر تھی کیونکہ جوزی ان کا ایک بے جگر ساتھی تھا اور لڑائی کی صورت میں وہ ہمیشہ سب سے آگے رہتا تھا۔ اگر وہ منحرف ہو گیا تھا تو ان کا کمزور پڑتا گروپ مزید۔۔۔۔ کمزور ہو جاتا۔ یہ سن کر مائک بھی کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ اگر وہ فیڈر کان والوں کے ساتھ نہیں بھی ملا تھا، تب بھی اس کے جانے سے ان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا۔ مائک نے کچھ دیر بعد کہا۔

''اگر یہ بات درست ہے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''اگر وہ ہم سے منحرف ہو چکا ہے تو ہمیں سب سے پہلے اسے سزا دینا ہو گی۔'' سینڈلر بولا۔

ماڈرن عقل

☆ سچ کہوں گا خواہ تم مجھ سے نفرت کرو۔ جھوٹ نہیں کہوں گا خواہ تم مجھ سے محبت کرو۔

☆ ہر روپیہ بولتا ہے... خدا حافظ!

☆ اپنے انتقام کو مزیدار بنانے کے لیے چوبیس گھنٹے سرد خانے میں رکھو۔

☆ دعاؤں میں یاد رکھیے۔ یہ فرمائش ہر صبح و شام آتی ہے۔ اگر میں کہوں نہیں تو لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اگر کہوں ہاں تو یہ جھوٹ ہے۔ میں اتنے سارے لوگوں کو یاد نہیں رکھ سکتا۔

☆ وہ لاڈلی ہنسی۔ نغمۂ بلبل، خندۂ صلصل، قہقہہ قلقل ہی جس کی باکس آفس ویلیو لگا سکتے ہیں۔

☆ سائنس دین کے بغیر اور دین سائنس کے بغیر نہیں چل سکتا۔

''سزا دینے کا مرحلہ بعد میں آئے گا، پہلے ہمیں اسے سمجھانے کی کوشش کرنا ہوگی۔'' ٹومی نے کہا۔

''بشرطیکہ وہ سمجھنے کے لیے راضی ہو۔'' مائک نے طنز کیا۔ ''اگر وہ سمجھنے کو تیار ہوتا تو اس طرح خاموشی سے غائب کیوں ہوتا؟''

حالات اچھے نہیں تھے اور وہ لوگ بحث کرتے ہوئے بار بار آپس میں الجھ رہے تھے۔ ٹومی اور سینڈلر کی آپس میں لگتی تھی۔ زیادہ اختلاف ان کے درمیان ہی ہوتا تھا۔ ابھی وہ بحث کر رہے تھے کہ مائک کا ایک خاص آدمی جیسی تیزی سے اندر آیا۔ اس کا کام علاقے پر نظر رکھنا اور کسی بھی خاص بات سے اس کو فوری آگاہ کرنا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا بار کے اوپر بنے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ میٹنگ کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ مائک اور دوسروں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''وہ اس طرف آ رہے ہیں۔''

''کون اس طرف آ رہے ہیں؟'' مائک نے پوچھا۔

''فیڈرکان والے... وہ سب مسلح ہیں۔''

یہ سنتے ہی وہاں سنسنی پھیل گئی۔ اب بحث کا وقت ختم ہو چکا تھا اور عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ فیڈرکان کی آمد کا صاف مطلب تھا کہ انہوں نے فالکن کے علاقے پر قبضے کا فیصلہ کر لیا ہے... اور انہیں بے دخل کرنے کے ارادے سے آ رہے ہیں۔ مائک نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''دوستوں...! مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

مائک کے ساتھیوں نے اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیے۔ اس میں آتشیں اسلحہ نہیں تھا۔ ''ہم تیار ہیں۔''

مائک نے جیسی سے کہا۔ ''تم جا کر اسلحے والی گاڑی لے آؤ۔''

''او کے باس!'' جیسی نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ ایک گیراج میں ان کی اسلحے سے بھری گاڑی تیار رہتی تھی۔ اگر کہیں آتشیں اسلحے کی ضرورت پڑتی تو اسے فوری طور پر بھیجا جا سکتا تھا۔ وہ نیچے آئے، اس وقت تک بار میں بھی یہ خبر پھیل چکی تھی کہ فیڈرکان والے اس طرف آ رہے ہیں اور ان کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ یہ تو سب کو پتا تھا کہ وہ فالکن بار میں موجود ہیں۔ کچھ گھبرا رہے تھے اور باقی دلچسپی سے متوقع مقابلے کے منتظر تھے۔ اسکاٹ بھی پریشان تھا، اسے معلوم تھا کہ یہاں لڑائی ہوئی تو اس کا بار تباہ ہو جائے گا لیکن وہ ان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی لڑائی اس کے بار سے باہر لے جائیں۔ اب وہ دعا ہی کر سکتا تھا کہ نقصان کم سے کم ہو اور وہ بالکل ہی برباد نہ ہو جائے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔'' ٹومی نے کہا تو مائک نے سر ہلایا۔

''لیکن پہلے انہیں آنے تو دو... اس دوران میں جیسی اسلحے والی گاڑی بھی لے آئے گا۔''

سینڈلر نے تائید کی۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ ہمیں آتشیں اسلحے کی ضرورت پڑے گی۔''

''آتشیں اسلحہ؟'' اسکاٹ گھبرا گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ لاشیں اور پھر پولیس کی آمد!''

''وہ تو لازمی بات ہے۔'' مائک نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب ہم ان کے سامنے شرافت سے ہتھیار تو نہیں ڈال سکتے۔''

''بالکل... فیڈرکان کو اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔'' سینڈلر نے سرد لہجے میں کہا۔

بار کے باہر ہلچل مچی تھی۔ مائک نے ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ فیڈرکان والے آن پہنچے تھے اور وہ بار کے سامنے گھیرا ڈال رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مائک کا خون کھولنے لگا کہ ان میں جوزی بھی تھا۔ اس نے گالی دی۔ ''حرامزادہ... غدار!''

مائک کے ساتھی اب گھبرا گئے تھے..... فیڈرکان گروپ کے لڑکوں کی تعداد کسی طرح بیس بائیس سے کم نہیں تھی۔ سینڈلر نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ جیسی کہاں مر گیا ہے؟ کیا اسلحے والی گاڑی اس وقت لائے گا جب ہمیں اس کی ضرورت باقی نہیں رہے گی؟''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے کہ یہ ہمیں اپنا اسلحہ استعمال کرنے کی مہلت نہیں دیں گے۔'' مائک نے بار کو گھیرنے والوں کی طرف دیکھا۔

لیکن چکر کچھ اور تھا۔ جیسی بار کی عقبی طرف سے پھر بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے ہانپتے ہوئے سرگوشی میں مائک سے کہا۔ ''اسلحے والی گاڑی غائب ہے، اسے جوزی لے گیا تھا۔''

اس بار مائک نے بلند آواز میں جوزی کو گالیاں دیں۔ اس نے انہیں مروانے کا مکمل بندوبست کر لیا تھا۔ اس کے ساتھیوں کے چہرے مزید سفید پڑ گئے۔ صورتِ حال یک دم ہی بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی ٹومی نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''اب ہمیں حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' مائک بولا، اس نے اپنی کانٹوں والی بیلٹ ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ اسی لمحے باہر سے فیڈرکان کا لیڈر بگسی چلایا۔ ''مائک! باہر آؤ! بزدل چوہے۔''

اب سوال مائک کی عزت کا تھا۔ وہ اندر بیٹھا رہتا تو لوگوں کی نظروں سے پہلے اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا آیا۔ فیڈرکان کے لڑکے پوری طرح مسلح تھے۔ مائک نے بگسی کی طرف دیکھا۔ ''بگسی! ہمارا اور تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے پھر ہمارے علاقے میں اس طرح گھس آنے کی وجہ؟''

بگسی مکاری سے مسکرایا۔ ''وجہ تو ہے، اب اس علاقے کا بزنس بھی ہمارے پاس ہے۔ اس لیے علاقہ بھی ہمارے پاس ہونا چاہیے۔''

''بزنس ہمارے پاس ہے۔'' مائک کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''اس لیے علاقہ بھی ہمارے پاس ہی رہے گا۔''

''اچھا، ثابت کرو۔'' بگسی نے اسے چیلنج کیا۔

مائک کے ساتھی بھی بار سے نکل کر اس کے عقب میں آ گئے تھے۔ مائک نے کہا۔ ''تم شاید اپنی عددی برتری پر اکڑ رہے ہو... اور یہ غدار...'' اس نے حقارت سے جوزی کی طرف دیکھا۔ ''اس سے تو ہم بعد میں نمٹیں گے۔''

''ہاں، پہلے ہم سے تو نمٹ لو۔'' بگسی بولا اور اس نے اپنے لڑکوں کی طرف دیکھا۔ ''ان کو بتا دو کہ اب یہ علاقہ ہمارا ہے۔''

بگسی کے لڑکے اپنے اپنے ہتھیار تولتے ہوئے جارحانہ انداز میں ان کی طرف بڑھے۔ مائک اور اس کے ساتھی بھی تیار ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے..... فیڈرکان گروپ کے ایک لڑکے نے مائک پر حملہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں بیس بال کا بلا تھا جس پر کیلیں لگا کر اسے مزید مہلک بنا لیا گیا تھا۔ مائک نے اس کا وار خالی کر کے اپنی بیلٹ سے ضرب لگائی۔ بیلٹ پر لگے کانٹوں نے حملہ کرنے والے کی کھال اتار دی اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔ اس کی چیخ سن کر باقی لڑکوں نے یک دم ہی حملہ کر دیا۔ ایک منٹ کے اندر وہاں خوفناک قسم کی لڑائی چھڑ گئی۔ اگرچہ مائک اور اس کے ساتھی حملوں کا پامردی سے جواب دے رہے تھے لیکن تعداد میں کمی آڑے آ رہی تھی اور فیڈرکان عددی برتری کی وجہ سے انہیں کامیابی سے دبا رہے تھے۔ مائک کی کوشش تھی کہ وہ ان پر مکمل طور پر حاوی نہ ہو سکیں اس لیے وہ ایک ڈھال کی طرح مدافعت کر رہے تھے۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو زخم آئے تھے لیکن انہوں نے فیڈرکان والوں کو بھی اچھی خاصی ضربیں لگائی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ ان کے پاس آدمی زیادہ تھے اور کوئی زخمی ہوتا تو اس کی جگہ دوسرا آ جاتا تھا۔ جبکہ مائک اور اس کے ساتھیوں کو زخمی حالت میں ہی لڑنا پڑ رہا تھا۔ اسی لیے وہ رفتہ رفتہ پیچھے ہو رہے تھے۔

ان کو پسپا ہوتے دیکھ کر بگسی چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو بڑھاوا دینے لگا۔ ''مارو... ان کو اور مارو... مار ڈالو۔''

بگسی پیچھے تھا اس لیے مائک چاہنے کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس وقت وہ فیڈرکان گروپ کے دو لڑکوں سے بیک وقت مقابلہ کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک کے پاس فولادی زنجیر تھی اور وہ اسے گھما گھما کر مائک کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار اس نے حملہ کیا تو مائک جھکائی دے کر بچ گیا لیکن زنجیر والے کے ساتھی نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر اپنا ڈنڈا مائک کے سر پر دے مارا اور وہ نیچے گر پڑا۔ یک دم ہی دنیا اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگی اور اسے اپنا انجام قریب نظر آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ اسے کسی صورت نہیں بخشیں گے۔ اس کے باقی ساتھیوں کو فیڈرکان والے شاید مارنے سے گریز کریں لیکن اسے مارنا لازمی تھا... تب ہی اس علاقے پر ان کا قبضہ مکمل ہو سکتا تھا۔

اس پر وار کرنے والے نے پھر اپنا ڈنڈا بلند کیا، وہ اس کے سر کو نشانہ بنانے جا رہا تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ ایسا نہیں کر سکا۔ مائک سر جھٹک کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور جب دنیا اس کی نظروں کے سامنے رکی تو اس نے خود پر حملہ کرنے والے کو دیوار کے ساتھ یوں پڑے دیکھا کہ اس کے پاؤں اوپر اور سر نیچے تھا۔ اس کے ساتھ ہی زنجیر والا بھی پڑا تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ سامنے دو عدد فیڈرکان دنیا سے بے خبر چت پڑے تھے۔ مائک نے اس جیالے کو تلاش کیا جس نے بازی پلٹ دی تھی تو اسے وہی سنہری بالوں والا دیو قامت اور شان دار شخص دکھائی دیا۔ اس نے ایک فیڈرکان کو گردن سے پکڑ کر بے پروائی سے ہوا میں معلق کر رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ایک اور کی مرمت لگا رہا تھا۔ ایک نے اسے غافل سمجھ کر عقب سے حملہ کرنے کی کوشش کی تو اس نے اسے پاؤں سے ایسی جگہ ضرب لگائی کہ وہ وہیں لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ دیو قامت ہونے کے باوجود اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔

مائک کے زخم خوردہ ساتھی بھی اب نئے حوصلے سے میدان میں آ گئے تھے اور بڑھ بڑھ کر فیڈرکان پر حملے کر رہے تھے۔ مائک نے سر سے بہتے خون کی پروا کیے بغیر بگسی کی طرف پیش قدمی کی اور راہ میں آنے والے ایک فیڈرکان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ ہوا تھا۔

بگس نے صورتِ حال میں اچانک تبدیلی دیکھ کر فرار کی کوشش کی لیکن مائک نے اسے اپنی بیلٹ پھینک کر ماری جو اس کے قدموں سے لپٹ گئی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، مائک اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''بھاگتے کہاں ہو... کیا علاقے پر قبضہ نہیں کرنا ہے؟'' مائک غرایا اور اپنی بیلٹ سے بگس کی کھال ادھیڑنے لگا۔ اس کے بیشتر... ساتھی فرار ہوگئے تھے اور جو باقی تھے، وہ بری طرح پٹ رہے تھے۔ پٹنے والوں میں جوزی بھی تھا۔ اس کی فرار کی کوشش ناکام رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مائک کے ساتھیوں نے اس کی ہڈی پسلی برابر کر دی تھی۔ وہ دردناک انداز میں چلا رہا تھا لیکن کسی کو اس پر ترس نہیں آیا۔ غدار پر کسی کو ترس نہیں آتا۔ فیڈرکان کے دوسرے ہاتھ آجانے والے ارکان کو بھی ایک حد تک مار پیٹ کر انہوں نے بخش دیا تھا لیکن جوزی کو وہ مار ڈالنے پر تل گئے تھے کیونکہ اس نے بھی انہیں مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کم سے کم مائک کو اپنے بارے میں یقین تھا کہ وہ نہیں بچتا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے ساتھیوں کو روک دیا۔

''بس... اس کے لیے اتنی سزا کافی ہے۔''

مائک کے ساتھیوں نے جوزی کے دونوں پاؤں اور ہاتھ کی ہڈیاں توڑ دی تھیں اور اب اسے سیدھے ہو کر صحیح طرح سے چلنے کے لیے کوئی سال کا وقت درکار تھا۔ مائک کے کہنے پر بہ مشکل اس کے ساتھیوں نے جوزی کو چھوڑا۔ مائک کو بھی اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ پولیس تک جائے۔ قتل کی صورت میں بات لازمی پولیس تک جاتی اور ان کے بزنس میں خلل پڑتا۔ پولیس بھی ان سے صرف ایک حد تک چشم پوشی کر سکتی تھی۔ لاش کی صورت میں انہیں پوری کارروائی کرنا ہی پڑتی۔ اس سے ان کے لیے دوسرے بہت سارے مسائل پیدا ہو جاتے۔

☆☆☆

مناسب مرمت اور مرہم پٹی کے بعد وہ اس فتح کا جشن منانے کے لیے اسکاٹ کے بار میں اپنے مخصوص کمرے میں موجود تھے۔ بوتلیں کھلی ہوئی تھیں اور جام چل رہے تھے۔ مائک کے صرف دو ساتھی اتنے زخمی ہوئے تھے کہ انہیں اسپتال میں داخل کرانا پڑا تھا۔ فیڈرکان کے دس افراد اسپتال میں داخل ہوئے تھے جن میں ان کا لیڈر بگس بھی شامل تھا۔ دسواں فرد جوزی تھا۔ سب سے برا حال اسی کا تھا۔ مائک کو یقین تھا کہ اس ہزیمت کے بعد فیڈرکان گروپ اس کے علاقے کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ کم سے کم بہت عرصے تک وہ اس کی ہمت نہیں کر سکیں گے بلکہ اب وہ فیڈرکان کے علاقے پر قبضے کی سوچ رہا تھا۔

اس فتح کا ہیرو ان کے گینگ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ یعنی دیو قامت سنہری بالوں والا! وہ وہاں موجود تھا اور اپنی تعریف پر شرما رہا تھا۔ مائک کو پہلی بار اس کا نام پتا چلا۔ جارڈن سچ مچ جنوب سے آیا تھا۔ مائک نے اس سے پہلا سوال اس بارے میں کیا۔ ''تمہارا تعلق ٹیکساس کے کس علاقے سے ہے؟''

''میں ٹیکساس کی راک ویلی سے آیا ہوں۔''

مائک نے پہلی بار یہ نام سنا تھا لیکن پھر اسے یاد آنے لگا۔ اس کے دادا کا تعلق بھی ٹیکساس سے تھا اور وہ اسے بچپن میں اپنے علاقے کی کہانیاں سناتے تھے۔ ان میں راک ویلی کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ ویسے تو سارا جنوب اور خاص طور سے ٹیکساس وحشی تھا اور وہاں پر انسانیت نام کو ہی تھی لیکن راک ویلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مکمل طور پر وحشی افراد کی سرزمین ہے جہاں سے عام انسان کا گزر ممکن نہیں۔ وہاں ایسے دیو قامت لوگ رہتے ہیں جن کے لیے کسی انسان کی زندگی ایک کھلونے سے زیادہ نہیں۔ جو ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر قتل و غارت گری پر اتر آتے ہیں۔ راک ویلی میں آباد لوگوں کا تعلق ایک ہی نسل سے ہے اور ٹیکساس کے لوگوں کو یقین ہے کہ یہ انسان کی نسل نہیں.... بلکہ شاید دیو کی نسل کے لوگ ہیں جو راک ویلی میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں رہنے والے افراد کے قد ساڑھے چھ فٹ اور سات فٹ تک عام ملتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سیکسن نسل کے لوگ ہیں جن کی نسل میں کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ یہ لوگ جانور پالتے ہیں اور ان کا دل پسند مشغلہ لڑائی ہے۔

''میری وادی میں لوگ واقعی وحشی ہوتے ہیں۔'' جارڈن نے بوتل سے پیتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے میں گرائپ واٹر پی رہا ہوں۔ یہاں کوئی تیز شراب نہیں ملتی؟''

''یہ یہاں کی سب سے تیز شراب ہے۔'' ٹومی نے اسے مطلع کیا۔

جارڈن نے اسے جواباً مطلع کیا۔ ''اگر تم ہمارے ہاں کی سب سے ہلکی شراب پی لو تو تمہیں ایک گھونٹ میں تارے نظر آجائیں۔''

''اچھا۔'' مائک نے دلچسپی سے کہا۔ ''وہ کس طرح بناتے ہیں؟''

''ہم عام طور سے شراب میں اسپرٹ اور ہلکا تیزاب ملاتے ہیں تب ہی اس میں تیزی آتی ہے۔''

''تیزاب؟'' سینڈلر کا منہ کھل گیا۔ ''تیزاب کون پیتا ہے؟''

''ہم۔'' اس نے فخر سے کہا۔ ''اور اگر تم ہماری سب سے تیز والی شراب پی کر کسی کے منہ پر تھوک دو تو اس کے منہ پر ہمیشہ کے لیے نشان پڑ جائے گا۔''

''میں نے اپنے دادا سے راک ویلی والوں کے بارے میں جو سنا ہے انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' مائک نے سر ہلایا۔

''تم لوگ کھاتے کیا ہو؟'' ٹومی نے شرارت سے پوچھا۔ ''کیا اس میں کوئی خطرناک چیز شامل ہوتی ہے؟''

''ہم صرف گائے کا گوشت کھاتے ہیں... وہ بھی بھنا ہوا اور دودھ پیتے ہیں۔'' جارڈن نے وضاحت کی۔ ''میں تو یہاں کھانے کی اتنی چیزیں دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔''

''تم نے ہماری مدد کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟'' مائک نے خاصی دیر بعد اس سے اصل سوال کیا۔

وہ ہچکچایا۔ ''وہ... اصل میں تم لوگ مجھے مظلوم لگے۔ نو آدمیوں کے خلاف دو درجن افراد کو لانا بہادری نہیں ہے۔ لیکن تم لوگوں نے بہادری سے ان لوگوں کا سامنا کیا اور بھاگے نہیں۔ اس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شروع میں تو میں صرف تماشا دیکھنے والوں میں شامل تھا لیکن جب تم لوگ مار کھانے لگے تو مجھے غصہ آ گیا۔''

''بس یہی وجہ ہے؟'' سینڈلر نے پوچھا۔

''نہیں، ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں بھی اس علاقے کا رہنے والا ہوں اور اس طرح میرا فرض بنتا ہے کہ میں اپنے لوگوں کا ساتھ دوں۔ اس لیے میں نے تمہارا ساتھ دیا۔''

مائک خود تو دیکھ نہیں سکا تھا لیکن اس کے ایک ساتھی نے بتایا کہ جارڈن بار میں ہی تھا اور جب وہ کسی مدد سے بالکل مایوس ہو گئے تھے، خاص طور سے جب مائک گرا تھا تو جارڈن اچانک ہی اندر سے نکلا اور اس نے آتے ہی فیڈرکان کے دو افراد کو گردن سے پکڑ کر ان کے سر آپس میں ٹکرا دیے۔ وہ فوری بے ہوش ہو گئے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو مائک کے سر پر ڈنڈے سے وار کرنے جا رہا تھا۔ ان سے نمٹ کر جارڈن نے انہیں کھلونوں کی طرح دائیں بائیں پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ اس شخص کی طرف جھپٹا جس نے انہیں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ وہ فیڈرکان کا ماہر فیدوز تھا۔ اس کے پاس ایک زنجیر تھی جس کے سرے پر درجن بھر کانٹے دار فولادی گیندیں تھیں۔ جس کو ایک بار یہ ہتھیار لگ جاتا، وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ فیدوز نے اسے گھما کر زنجیر ماری لیکن جارڈن نے ہٹے بغیر ہاتھ سے زنجیر پکڑ لی اور فیدوز کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ جب وہ نزدیک آیا تو اس کی ناک پر اپنے سر کی ایک ہی ٹکر رسید کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

جب فیڈرکان گروپ کے لڑکوں نے دیکھا کہ جارڈن تیزی سے ان کے آدمیوں کو ناکارہ بنا رہا ہے تو وہ دیوانے ہو گئے۔ انہوں نے جارڈن کو چاروں طرف سے گھیر کر اس پر یورش کر دی لیکن اس نے ان کی ذرا بھی پروا نہیں کی..... وہ جسے ایک ہاتھ مار دیتا، وہ دوبارہ اس کے پاس آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا اور فیڈرکان والے جیسے اس کے اردگرد جمع ہوئے تھے، ویسے ہی ان کی بھیڑ چھٹ گئی۔ اس کے بعد خود فالکن والوں نے ان کو سنبھال لیا۔ اگر جارڈن نہ آتا تو اس روز فالکن اسٹریٹ پر ان کی حکمرانی ختم ہو چکی ہوتی لیکن اب فیڈرکان والوں کی اپنی پوزیشن بہت کمزور ہو گئی تھی۔ مائک نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''یہ اچھا موقع ہے، اگر ہم فیڈرکان کے علاقے پر قبضہ کر لیں۔ اس وقت وہ اپنے زخم سہلا رہے ہیں۔''

ٹومی نے جوش سے کہا۔ ''میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ ہمارے پاس اس سے اچھا موقع پھر نہیں آئے گا۔''

''آدھے فیڈرکان اسپتال میں ہیں اور باقی غائب ہیں۔'' سینڈلر نے بھی تائید کی۔ مائک خوش ہو گیا۔ اس کے اکثر ساتھی اس کی تجویز سے متفق تھے۔ ان کے پاس ابھی کچھ وقت تھا اور وہ مزید لڑکے بھرتی کر کے فیڈرکان کے علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کر سکتے تھے۔ مائک کو سب سے زیادہ امید اس بات سے تھی کہ جارڈن بھی ان کے گینگ میں شامل ہو سکتا ہے۔ جارڈن کی موجودگی سے ان لوگوں کا حوصلہ بڑھا تھا اور تبھی وہ فیڈرکان کے علاقے پر قبضے کا سوچ رہے تھے۔

جارڈن نے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ نیویارک میں بھی اس قسم کے گینگ پائے جاتے ہیں اور ان میں اس قسم کی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ میں تو نیویارک کو بہت پُرسکون اور پُرامن شہر سمجھتا تھا۔''

''راک ویلی میں ایسے گینگ ہوتے ہیں؟'' مائک نے پوچھا۔ ''تمہیں دیکھ کر تو میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کا ہر فرد خود اپنے آپ میں ایک گینگ ہوتا ہے۔''

''نہیں، ہمارے ہاں ایک آدمی عام سا آدمی ہی ہوتا ہے اور وہاں پر گینگ بھی ہوتے ہیں۔ وہاں آدمی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اسے کسی نہ کسی گینگ میں شامل ہونا پڑتا ہے۔''

''وہاں پر گینگ کی آپس میں لڑائی ہوتی ہے؟''

''بالکل ہوتی ہے۔'' جارڈن نے سر ہلایا۔ ''اور بہت خوں ریز ہوتی ہے۔ میں خود ایک بار مرتے مرتے بچا ہوں۔ مجھے دو گولیاں لگی تھیں... یہ دیکھو۔'' اس نے بتاتے ہوئے سامنے سے اپنی قمیص کے بٹن کھولے۔ اس کے فراخ سینے پر دو گولیوں کے نشانات نمایاں تھے۔ وہ سب بہت متاثر ہوئے کیونکہ ان میں سے کسی کو اب تک گولی کھانے کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔

''تم کس گینگ میں ہو؟''

''میرے گینگ کا نام مڈ ویسٹ ویلی ہے اور وہ وادی کا سب سے طاقت ور گروپ ہے۔'' جارڈن نے فخر سے کہا۔ ''اس میں سو کے قریب افراد ہیں۔''

''کیا وہاں بھی گینگ جرائم میں ملوث ہوتے ہیں؟'' مائنک نے تجسس سے پوچھا۔

''ظاہر ہے، اس کے بغیر گینگ کیسے چل سکتے ہیں؟ رقم لازمی ہوتی ہے، لیکن ہمارے ہاں منشیات نہیں ہوتی۔ ہم شراب اور اسلحے کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔ اسی طرح جو جرائم پیشہ باہر سے آتے ہیں ہم انہیں رقم لے کر پناہ دیتے ہیں۔ ہائی وے سے گزرنے والے بڑے ٹرکوں سے بھتا لیتے ہیں۔''

''حالانکہ سب سے زیادہ کمائی منشیات سے ہوتی ہے۔'' مائنک نے کہا۔ ''حیرت ہے کہ تم لوگ اس طرف توجہ نہیں دیتے۔''

''منشیات انسان کو کمزور کر دیتی ہے اور ہمارے ہاں کوئی بھی کمزور ہونا برداشت نہیں کر سکتا۔ کمزور اور بزدل کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ انہیں مرنا پڑتا ہے یا راک ویلی سے جانا پڑتا ہے۔'' جارڈن نے بتایا۔ ''اس وجہ سے ہمارے ہاں کسی کو منشیات سے خاص دلچسپی نہیں ہے۔''

''اپنے گینگ میں تمہاری خاص پوزیشن ہوگی؟'' ٹومی نے اندازہ لگایا۔

''میں۔'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''نہیں، میں تو ایک عام سا کارکن تھا اور وہاں میری کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔''

یہ بات ان لوگوں کے لیے ناقابلِ یقین تھی کیونکہ وہ خود اسے دیکھ چکے تھے کہ جارڈن کس قدر ماہر لڑاکا تھا۔ اس نے تن تنہا درجن سے بھی زیادہ افراد سے مقابلہ کیا تھا اور کم سے کم دس افراد اس نے ناکارہ کر دیے تھے۔ وہ تو ایسا آدمی تھا کہ نیویارک کے کسی گینگ میں ہوتا تو باس ہوتا۔ مائنک نے یہ بات اس سے کہہ بھی دی۔

''اگر تم یہاں ہوتے تو باس ہوتے۔''

خلافِ توقع وہ شرمندہ ہو گیا۔ ''ارے نہیں... میں کوئی خاص نہیں ہوں۔''

''جارڈن! کیا تم ہمارے ساتھ شامل ہونا پسند کرو گے؟'' مائنک نے کہا۔ ''یقین کرو، ہمارے گینگ میں تمہیں بہت خاص مقام حاصل ہوگا۔''

اس نے شک سے مائنک کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم سچ مچ مجھے اپنے ساتھ شامل کر رہے ہو؟''

''ہاں دوست... اگر تم ہمارے ساتھ آجاؤ تو ہم فیڈر کان والوں کو اس علاقے سے کان پکڑ کر نکال سکتے ہیں۔''

جارڈن نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''واہ...'' ٹومی چلّایا۔ ''اس پر ایک دور اور ہو جائے... اے اسکاٹ...! جلدی سے اپنی بہترین شراب بھیجو۔''

''اگر اس کی بہترین شراب ایسی ہوتی ہے تو میری لیے مت منگوانا۔'' جارڈن نے اپنی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

''تم فکر مت کرو دوست۔ تمہارے لیے یہاں کا ایک اسپیشل آئٹم منگواتے ہیں۔ اسے پی کر تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔''

دیہات میں کشید کی ہوئی مکئی کی یہ شراب جارڈن کو کسی قدر پسند آئی اور وہ اس کی دو بوتلیں پی گیا...۔ رات گئے وہ سب نشے میں تھے۔ اچانک مائنک کو خیال آیا۔ اس نے جارڈن سے کہا۔

''دوست! جب تم راک ویلی کے سب سے طاقت ور گروہ میں تھے تو تم یہاں نیویارک کیوں آ گئے؟''

جارڈن اداس ہو گیا۔ ''میں کہاں آنا چاہ رہا تھا... انہوں نے خود نکال دیا۔''

مائنک کو یقین نہیں آیا۔ اس نے سوچا شاید اس نے نشے میں غلط سنا ہے۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''کیا... انہوں نے تمہیں نکال دیا تھا؟''

جارڈن نے سر ہلایا۔ ''یہ سچ ہے... میرے گینگ والوں نے مجھے نکال دیا تھا۔''

''مگر کیوں؟'' مائنک چلّا اٹھا۔

جارڈن جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ ''وہ... اصل میں ان کا خیال تھا کہ میں بزدل ہوں اور گینگ کے لیے موزوں نہیں ہوں۔''

☆

آزمائش کی آخری گھڑیوں میں ایک نیا رخ اختیار کر لینے والی صورتِ حال

دانیال عارف

آزمائش

ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے... کچھ لوگ اپنے حصے کا کام نہایت دیانتداری سے انجام دیتے ہیں ...اس کے باوجود انہیں سراہا نہیں جاتا بلکہ ٹھکرادیا جاتا ہے ...ایک ایسی ہی ستم گذیدہ عورت کی روداد جس نے اپنی زندگی بدلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

یہ اندر کے کسی شخص کی کارروائی تھی۔ یہ بات مجھے معلوم تھی۔ یہ بات پولیس کو اور ڈورتھی کو بھی معلوم تھی۔ رقم غائب تھی اور ساتھ ہی ڈورتھی اسٹیونز بھی!

اس بارے میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی تو پھر میرے پاس وہ فون کال کیوں آئی تھی؟

میں صبح کی نیند کے مزے لے رہی تھی جب فون کی مسلسل بجنے والی گھنٹی نے مجھے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ جی ہاں! یہ میری تعطیلات کے دوسرے پیر کی صبح تھی اور میں اپنی چھٹیاں غارت کرنے کے قطعی موڈ میں نہیں تھی۔

''چلّانے کی ضرورت نہیں!'' مجھے بالآخر کہنا پڑا۔ ''میں جاگ رہی ہوں۔''

''فائن۔ تو پھر کنگ اسٹریٹ برانچ پہنچ جاؤ... ابھی اور اسی وقت!'' ہیری نے چلاتے ہوئے کہا۔

ہیری میرا باس تھا۔ ہم ایک قومی کینیڈین بینک میں کارپوریٹ سیکیورٹی کے لیے کام کرتے تھے۔ خاص طور پر فراڈ، جعل سازی اور کھوئی ہوئی رقم کی بازیابی کے لیے! اور یہ کام ایسے کسی شخص کے لیے اچھا نہیں تھا جو دباؤ برداشت نہ کر سکتا ہو۔ ہیری دباؤ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور میں اکثر اس دباؤ میں اضافے کا سبب بن جاتی تھی۔ میں ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتی تھی۔ بس یہ خود بہ خود ہو جاتا تھا۔

''میں چھٹیوں پر ہوں۔'' میں نے ہیری کو یاد دلایا۔

''اب نہیں ہو۔'' ہیری کا جواب بالکل واضح تھا۔

میں نے سوچا، کاش میں چھٹیاں منانے شہر سے باہر چلی گئی ہوتی۔

''سو اس برانچ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''لعنت بھیجو، میکس۔'' ہیری نے جواب دیا۔

میکس... یہ میں تھی۔ میرا پورا نام میکسین ہے۔ لوگ مجھے میرے قد کی وجہ سے 'شارٹ میکسین' بھی کہتے ہیں۔ میرا قد پانچ فٹ ایک انچ ہے... مجھے اپنے مختصر قد کی وجہ سے اکثر فقرے سننے کو ملتے تھے۔ اڑتیس سال کی عمر میں بھی میں ابھی تنہا ہی تھی۔ میرا جسم کسی ایتھلیٹ کے مانند ٹھوس تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں خاصی دلکش عورت ہوں لیکن ہر کوئی میری شکل و صورت کے بجائے میرے قد کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا تھا۔ زندگی اور لوگ کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

''میکس! میں جانتا ہوں کہ تم پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھیں۔'' ہیری نے حسبِ عادت چلاتے ہوئے کہا۔

''اب میں پوری طرح جاگ چکی ہوں ہیری... مجھے

سب کچھ دوبارہ بتاؤ۔"
اس مرتبہ میں نے پوری تفصیل دھیان سے سن لی۔
جب ہمارے بینک کی کنگ اسٹریٹ برانچ کے والٹ کا دروازہ، سیف کا دروازہ اور کمپارٹمنٹ کے دروازے کھولے گئے تو وہاں کوئی رقم نہیں تھی۔
سیدھی سی بات تھی۔ رات میں کوئی والٹ میں گھس گیا تھا اور اس نے رقم اڑالی تھی۔
میں نے ایک اچٹتی نگاہ اپنے بیڈ سائڈ کلاک پر ڈالی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ بات اتنی بھی سیدھی نہیں تھی۔
"تم مجھے اس وقت فون کیوں کر رہے ہو؟" میں نے ہیری سے پوچھا۔
"میرے پاس کال ابھی ابھی آئی ہے۔ انہیں ابھی پتا چلا ہے کہ وہ لٹ چکے ہیں۔"
"ابھی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ گزشتہ تین گھنٹوں سے کیا کر رہے تھے؟"
"والٹ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔" ہیری نے بتایا۔ "میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تمام ٹائم کلاک اپنے انتہائی وقت پر سیٹ کر دیے گئے تھے۔ اسی لیے انہیں ہر شے کو ڈرل کرنا پڑا ہوگا۔ اس لیے یہ احساس ہونے میں اتنا وقت لگ گیا کہ وہاں نہ کوئی رقم ہے، نہ ڈرافٹس نہ ٹریولرز چیکس! نہ ہی آسانی سے کیش کرائے جانے والے کسی قسم کے اثاثے... سب کچھ چلا گیا۔"
"اندر کے کسی شخص کی کارروائی۔" میں نے کہا۔
"ظاہر ہے۔"
"تو پھر غائب کون ہے؟"
"ڈورتھی اسٹیونز نامی ایک خاتون!"
"رقم غالباً اسی کے پاس ہوگی؟"
"بریلینٹ! تو جاؤ اسے اور رقم کو تلاش کرو، ابھی۔"
یہ کہہ کر ہیری نے فون پٹخ دیا۔
یہ بہت برا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ میں اس معاملے کو یہیں ختم کر دوں اور بستر نہ چھوڑوں لیکن میری قسمت ایسی کہاں تھی۔
جب میں کنگ اسٹریٹ برانچ پہنچی تو پولیس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ البتہ ڈورتھی اسٹیونز رقم سمیت غائب تھی۔ صورت حال پوری طرح واضح تھی۔
میں برانچ کے وسط میں کھڑی واقعات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کرنسی ایک اور لوکیشن سے منگوائی گئی تھی تاکہ برانچ کا کام اپنی معمول کے مطابق جاری رہے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ فون بج رہے تھے اور گاہکوں کو سرو کیا جا رہا تھا۔
اتنے میں، میں نے ڈیٹکٹیو انسپکٹر مارٹن کو منیجر کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔ پہلے اس نے اپنے ماتحتوں کو کچھ ہدایات دیں پھر اطمینان سے چلتا ہوا میری طرف آ گیا۔
وہ دراز قامت اور مضبوط جسامت کا مالک تھا اور دیکھنے میں ہی سراغ رساں لگتا تھا۔ میں اسے پسند کرتی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی اور وہ دلکش شخصیت کا حامل تھا۔ اس کی شادی کو عرصہ گزر چکا تھا اور وہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی موجودگی میں کام زیادہ خوش گوار طریقے سے ہو جاتا تھا۔
"مارننگ میکس!" اس نے نزدیک آ کر کہا۔
پچھلے کئی برسوں سے ہم فراڈ اور جعل سازی کے مختلف کیسز میں ایک دوسرے سے ملتے رہے تھے اور ہمیں اکثر ایک دوسرے کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن ہمیں اپنے اس کام کے علاوہ کبھی ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہم نے کبھی اپنے کام کے سوا کسی دوسرے موضوع پر آپس میں گفتگو نہیں کی تھی۔
"مارننگ مارٹن! کوئی ایسی بات جو مجھ سے شیئر کرنا چاہو؟"
"یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہوا ہے۔ میرا مطلب حقیقی پلاننگ سے ہے۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گئی کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ "اور اس میں بڑے حوصلے اور جرأت مندی سے کام کیا گیا ہے۔ گواہوں کے سامنے اس عورت نے سیف اور والٹ کے دروازے کھلے چھوڑ دیے تھے۔ پھر اس نے دوسروں کو قائل کیا ہوگا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں۔ پھر اس کے بعد اس والٹ کا دروازہ، سیف کا دروازہ، ٹریژری سپلائی کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا ہوگا۔ اس نے کیش اکٹھا کیا ہوگا، تینوں دروازوں کے کمبی نیشن تبدیل کیے ہوں گے... ٹائم لاک کو ان کے انتہائی وقت پر سیٹ کیا ہوگا اور نکل گئی ہوگی۔ بڑی دیدہ دلیر اور مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔"
"اس نے خود ہی کمبی نیشنز تبدیل کیے تھے... خود ڈورتھی اسٹیونز نے؟"
"ہاں، بالکل۔"
"لیکن..." میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اس میں تو وقت لگتا ہے... بہت زیادہ وقت۔"
"جیسا کہ میں نے بتایا کہ یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت کیا گیا ہے۔"

میں اس بارے میں قدرے سوچ میں پڑ گئی۔ "یہ واقعہ کب پیش آیا؟" میں نے پوچھا۔
"جمعے کی رات برانچ بند ہونے کے وقت... یہ برانچ ہفتے کے دن نہیں کھلتی۔" مارٹن نے بتایا۔
"اس طرح اسے پورے دو دن اور آج کی پوری صبح مل گئی۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔" مارٹن نے اتفاق کیا۔
"یا..." میرے ذہن میں ایک اور خیال نے سر ابھارا۔
"ہاں؟"
"اس نے تالوں پر کوئی وقت سیٹ نہیں کیا ہوگا۔ کمبی نیشنز کو آف پر گھما دیا ہوگا اور پھر ویک اینڈ پر کسی بھی وقت آ کر اطمینان کے ساتھ اپنا کام نمٹایا ہوگا۔ کمبی نیشنز تبدیل کیے ہوں گے، وقت سیٹ کیا ہوگا... رقم سمیٹ کر پیک کی ہوگی اور چلتی بنی ہوگی۔ یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اگر اس کے پاس برانچ کی چابی ہوگی۔"
"چابی اس کے پاس تھی۔"
"تب تو اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔"
"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔"
"بہر حال، دونوں صورتوں میں رقم غالباً اب تک ملک سے باہر جا چکی ہوگی۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
"ہاں، میرے خیال کے مطابق ایسا ہی ہے۔" مارٹن نے جواب دیا۔
"لعنت ہو۔" میں بڑبڑائی۔
"میرا خیال تھا کہ تھوڑے سے بین الاقوامی سفر سے تم لطف اندوز ہونا پسند کرو گی۔" مارٹن نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔
"آج کل ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سب کچھ اب عام ہو گیا ہے... ای میل، فیکس وغیرہ!"
"آہ... جدید آسائشیں!"
"ہاں۔"
"تم عمر رسیدہ ہوتی جا رہی ہو۔"
"ہر کسی پر یہ وقت تو آتا ہی ہے۔"
"جو کچھ بھی سہی۔" مارٹن نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں واپس اسٹیشن جا رہا ہوں۔"
"تم نے اسٹاف سے بات کی؟"
"صرف برانچ منیجر سے بات کی ہے۔ میں اپنے افسران میں سے ایک کو باقی لوگوں کے بیانات لینے کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں اور ہم بھاگ دوڑ کا کام شروع کرتے ہیں۔ فلائٹس کی چیکنگ، فون کے ریکارڈ کا حصول... اس کے

سخی

بھکاری: جناب میں کل سے بھوکا ہوں، ہو سکے تو میری کچھ مدد کیجیے۔
راہ گیر: "تم صورت شکل سے بھکاری نہیں معلوم ہوتے۔ اچھے بھلے شریف آدمی لگتے ہو... بہر حال یہ لو روپیہ اور یہ بتاؤ کہ تم بھکاری کیسے بنے؟"
بھکاری: "مجھ میں بھی وہی کمزوری تھی جو آپ میں پائی جاتی ہے... میں بھی آپ ہی کی طرح رحم دل اور سخی ہوا کرتا تھا۔"

بعد میں ڈورتھی کے اپارٹمنٹ جاؤں گا۔ تم بھی وہاں موجود ہونا چاہتی ہو؟"
یقیناً میں بھی ایسا ہی چاہتی تھی۔ بہ ظاہر تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی لیکن کوئی چیز ایسی تھی جو فوکس میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے ذہن میں بجنے والی خطرے کی گھنٹی مجھے بتا رہی تھی کہ ابھی اور کچھ بھی تھا جو سامنے نہیں آ رہا تھا۔ میں کہاوت کے طور پر دوسرا جوتا گرنے کی منتظر تھی۔
مارٹن اور میں نے دو گھنٹے بعد ڈورتھی کے اپارٹمنٹ پر ملنے کا پروگرام بنایا۔ اس دوران مارٹن نے یہ معلومات حاصل کرنے میں وقت گزارنے کا فیصلہ کیا کہ ڈورتھی اسٹیونز اگر ملک سے باہر فرار ہو چکی تھی تو کہاں گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس دوران ڈورتھی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔

یہ کوئی آسان معاملہ نہیں تھا۔ ڈورتھی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا آغاز میں نے برانچ میں اس کے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو سے کیا۔ ڈورتھی کے بارے میں زیادہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ درمیانی عمر کی ایک غیر شادی شدہ عورت تھی جو کافی عرصے سے اس بینک میں کام کر رہی تھی۔ وہ قابلِ اعتماد لیکن ایک بور خاتون تھی۔ کوئی بھی اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا اور نہ ہی کسی نے کبھی اس پر زیادہ دھیان دیا تھا۔ کوئی اس کے متعلق کبھی سوچتا ہی نہیں تھا۔
اور وہ ٹھس عورت جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کم از کم ساڑھے سات لاکھ ڈالرز چرا لے گئی تھی۔
یہ بات ناقابلِ فہم تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ روزانہ کسی کے ساتھ وقت گزارتے ہوں اور اس کے بارے میں کچھ جانتے بھی نہ ہوں؟
میں نے ہیلن سے گفت گو کی .... وہ

ڈورتھی اسٹیونز کی قریبی سپروائزر تھی۔ یقیناً اسے کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہیے تھا۔

''بینک سے باہر ڈورتھی کی کیا دنیا تھی، ہم اس بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہمارے درمیان کوئی بھی چیز زیادہ مشترک نہیں تھی۔ اس کا کوئی خاندان بھی نہیں تھا۔ میرے خیال میں تو وہ بے حد تنہا تھی لیکن یہ بات آخری دنوں میں محسوس نہیں ہوئی۔'' ہیلن نے بتایا۔

''کیا حال ہی میں اس میں کوئی تبدیلی آگئی تھی؟'' میں نے اسے کریدا۔

''حقیقت میں تو ایسی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ غالباً مجھے اس بات کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیے... کیونکہ یہ میرا ایک ذاتی تاثر تھا جو مجھے محسوس ہوا تھا۔'' ہیلن نے کچھ اس لہجے میں کہا جیسے اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔

جب میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموش رہی تو اس نے قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''میں نے محسوس کیا کہ اس نے کسی کے ساتھ ملنا جلنا شروع کردیا ہے۔''

''تمہارا مطلب رومانوی طور پر میل جول سے ہے؟''

''ہاں! لیکن جیسا کہ میں نے کہا، یہ صرف میرا خیال ہے۔ آخری دنوں میں وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی اور یہ اس کا مزاج نہیں تھا۔ یوں سمجھ لیا جائے جیسے کوئی فرد جو ہمیشہ کسی کی توجہ کا طلب گار رہا ہو، اس پر آخرکار نظرِ التفات ہوگئی ہو۔ اس بات نے مجھے افسردہ کردیا تھا۔''

''افسردہ کیوں؟''

''یہ بھی میرے ذاتی تاثرات تھے... جب آپ اس تعلق کا ذکر کسی سے نہیں کرسکتے، اس کا نام نہیں لے سکتے، فون کالز رازداری سے اٹینڈ کی جائیں اور وہ شخص کبھی بھی سامنے نہ آئے تو پھر...''

''تمہارے خیال میں وہ شخص شادی شدہ تھا؟''

''ہاں۔'' ہیلن نے جواب دیا۔ ''بعض اوقات آپ اس بات کو مس نہیں کرسکتے۔ تم سمجھ رہی ہونا کہ میرا کیا مطلب ہے؟''

میں جانتی تھی کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

اسٹاف سے بات چیت کرنے کے بعد میں نے ڈورتھی کے بینک..... ریکارڈ کو ٹٹولنا شروع کردیا۔ اس میں بھی قابلِ توجہ تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ ڈورتھی اسٹیونز نے اپنے تمام اکاؤنٹس ختم کردیے تھے، اپنے سیفٹی ڈپازٹ بکس کی تمام اشیا نکال لی تھیں، اپنے ڈپازٹ سرٹیفکیٹ کیش کرا لیے تھے اور اپنے تمام قرضے لوٹا دیے تھے۔

ان تمام چیزوں سے واضح تھا کہ وہ کہیں جانے کی تیاری کررہی تھی... لیکن کہاں؟

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد میں اس عمارت کے سامنے موجود تھی جہاں ڈورتھی اسٹیونز رہتی تھی۔ مارٹن وہاں پہلے سے میرا انتظار کررہا تھا۔

چند لمحوں بعد ہم بلڈنگ منیجر کے ہمراہ ڈورتھی کے سوئٹ میں داخل ہوگئے۔ وہاں کوئی بھی شے فینسی نہیں تھی... نہ اپارٹمنٹ، نہ اس میں موجود اشیا! بلڈنگ منیجر کے جانے کے بعد مارٹن اور میں نے آپس میں ان معلومات کا تبادلہ کیا جو انفرادی طور پر ہم نے اکٹھا کی تھیں۔

ہم آپس میں اسی طرح مل جل کر کام کیا کرتے تھے۔ ہمارے درمیان آپس میں کبھی مقابلہ آرائی نہیں ہوتی تھی اور یہ ایک اچھی بات تھی۔ بیشتر افسران اس طرح کھل کر تعاون کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ دیگر افسران تو ایک دوسرے سے تعاون بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن مارٹن کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ لہٰذا میں جانتی تھی کہ جب وہ یہ کہتا تھا کہ اس کے پاس بتانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے تو واقعی کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی... جبکہ دوسری طرف میں ایک نئی تھیوری تشکیل دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اس واردات کے پیچھے کوئی مرد ہے۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''میکس! جب ارتکاب کرنے والی کوئی عورت ہو تو آپ ہمیشہ یہی خیال کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے کسی مرد کا ہاتھ ہے!'' مارٹن نے اپنا نکتہ واضح کرنے کے لیے میرا نام لیتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے ڈورتھی کا جو حلیہ اسٹاف سے دریافت کیا تھا، وہ مارٹن کے سامنے دہرا دیا۔

''کیا وہ ایسی تھی جو اس قسم کی واردات کا خواب دیکھ سکے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس نے اپنی پوری زندگی اس طرح گزار دی تھی جیسے کہ کوئی بے لچک پروگرام ہو اور ایک ہی طرز... میں دہرایا جاتا ہو۔ تمہارا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ منصوبے کے تحت کیا گیا ہے اور اس میں بڑی دیدہ دلیری درکار تھی۔ کیا مس اسٹیونز کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اس پر پوری اترتی ہے؟''

ڈورتھی کے ظاہری طور طریق میں تبدیلیاں اس کے لیے خاصی ناقابلِ فہم تھیں۔ البتہ اس کے مالیاتی معاملات مارٹن کے لیے زیادہ قابلِ توجہ تھے۔

ہم نے اس کے اپارٹمنٹ کی اچھی طرح تلاشی لے ڈالی۔ ہم کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھے جو یہ ظاہر کرسکے کہ وہ

اس جرم میں ملوث تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کی زندگی میں ایک مرد کی موجودگی کا کوئی ثبوت بھی تلاش کررہی تھی۔ لیکن ہمیں کسی قسم کی کوئی کامیابی نہیں ہورہی تھی۔ ایسی کوئی شے ہاتھ نہیں لگ رہی تھی جو ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوتی۔

اپارٹمنٹ میں اس لحاظ سے اگر ڈورتھی اسٹیونز ان کمروں سے اپنے وجود کے تمام سراغ مٹا دینا چاہتی تھی تو وہ اس میں کامیاب رہی تھی۔ گو عام طور پر جب کوئی فرد خود اپنی موجودگی کے ثبوت مٹا دینا چاہتا ہے تو کوئی نہ کوئی چیز مس کردیتا ہے۔ ہمارے اپنے استعمال کی ذاتی اشیا اتنی نارمل دکھائی دیتی ہیں کہ ہم ان پر توجہ دینا چھوڑ دیتے ہیں۔

مگر نہیں... ظاہر یہ ہورہا تھا کہ اس کمرے کی صفائی کسی اور فرد نے کی تھی۔ یہ کام ڈورتھی اسٹیونز کا نہیں لگتا تھا۔

اتنے میں مارٹن نے مجھے آواز دی۔ وہ بیڈروم میں تھا۔ اس نے بیڈ کے نیچے سے چند سفری بروشرز تلاش کرلیے تھے۔ یہ ڈورتھی کے سفری ارادے کا پہلا اشارہ تھا۔ یہ سفری بروشرز اس مسئلے میں ایک اور سوالیہ نشان کا اضافہ کررہے تھے۔ یہ بروشرز ہوائی، بہاماز کے سیاحتی علاقوں سے متعلق تھے۔ چند کینیڈا کے تفریحی مقامات سے متعلق تھے جو چار گھنٹے کی ڈرائیو سے زیادہ دور کے فاصلے پر نہیں تھے۔

صرف ایک پمفلٹ پر ایک تحریری یادداشت موجود تھی۔ یہ ڈومینیکن ری پبلک میں شادی کے پیکیجز سے متعلق تھا اور یہ ان مقامات میں سے قطعی طور پر نہیں تھا جن کا انتخاب بینک لوٹنے والے کیا کرتے ہیں۔

''میرا خیال ہے۔'' مارٹن نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اس واردات میں کوئی مرد ملوث ہے۔''

اپارٹمنٹ میں مزید کچھ اور ملنا مشکل تھا، اس لیے مارٹن اور میں بیئر پینے اور قدرے غور و فکر کرنے کے لیے قریب ترین بار میں جا بیٹھے۔ اس دوران ہم خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے خیالات میں مگن رہے۔

یہ سب کچھ بہت سہل رہا تھا۔ ڈورتھی کے پاس کمبی نیشن کا ایک سیٹ تھا۔ وہ لاک اپ کرنے میں ہمیشہ مدد دیتی تھی اور اس کے پاس لاک اپ کی چابی بھی تھی۔ جمعے کے روز بینک سے رخصت ہونے والی وہ آخری فرد تھی اور آج وہ کام پر حاضر نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اس نے فون پر کوئی اطلاع دی تھی۔ وہ بغیر اطلاع کام پر سے غائب تھی۔

وہ مجرم تھی۔

اب معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اگر اس واردات میں کوئی اور فرد شامل تھا تو وہ کون تھا؟ یہ پہلا سوال تھا لیکن سب سے اہم نہیں۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سوال یہ تھا کہ ڈورتھی کہاں ہے؟

کیا وہ کسی جگہ رقم سمیت بیٹھ کر اپنے ساتھی کا انتظار کررہی ہے؟ یا پھر وہ...

''مجھے امید ہے کہ ہمیں کسی لاش کی تلاش نہیں ہے۔'' مارٹن نے میرے خیالات کو پڑھتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کردی۔

اب کہاں جایا جائے؟

مارٹن ان تفریحی مقامات کو چیک کرنے کے لیے اپنے ذرائع استعمال کررہا تھا جن کا تذکرہ ان بروشرز میں تھا جو ہم نے تلاش کیے تھے۔ میں واپس منیجر کے پاس چلی گئی اور اس سے ایک بار پھر ڈورتھی کے اپارٹمنٹ کو دیکھنے کی اجازت چاہی۔ مجھے کچھ اور ملنے کی امید تھی۔

اپارٹمنٹ کی وہی حالت تھی جو میں پہلے دیکھ کر جا چکی تھی۔ اجڑا سا اور سامان سے عاری! اپارٹمنٹ کی مکین نے اپنے اپارٹمنٹ کی جو حالت بنا رکھی تھی اس سے اس کی نیت کا اظہار ہورہا تھا۔ یہی کہ تمام کی تمام رقم چوری کرکے یہاں سے فرار ہوجائے۔

بیشتر کیسز میں رقم ہی مقصد ہوتی ہے۔ اس کیس میں متوقع ولولہ انگیزی ہی فیصلہ کن عنصر ہوسکتی تھی۔ اس لیے کہ ڈورتھی کی دنیا جھنجلاہٹ اور بوریت سے بھری ہوئی تھی۔

میں جب بیٹھ کر اس کے کینسل شدہ چیکس کا جائزہ لے رہی تھی تو یہ خیالات بھی میرے ذہن میں ساتھ ساتھ گردش کررہے تھے۔ ان میں اشیائے خورونوش کے چیک، کرائے کے چیک اور یوٹیلٹیز کے چیک تھے۔ اب چیک کون استعمال کرتا ہے؟ خاص طور پر کوئی بینکر! صرف وہ کوئی جو اس مرحلے کو جہاں تک ممکن ہو طول دینا چاہتا ہو۔

ڈورتھی اسٹیونز سرسری طور پر زندگی کو گزار رہی تھی لیکن اسے زندگی ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میں ایک بار پھر اس امید کے ساتھ ڈورتھی کی میز کی تلاشی لے رہی تھی کہ ہیلن میکنٹائر نے ڈورتھی کی جس ذاتی زندگی کا تذکرہ کیا تھا، اس کی کوئی نشانی مل جائے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔

''میں ڈوگ ہیرس ہوں۔'' اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اس شخص کے انداز سے اعتماد جھلک رہا تھا۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی اور وہ قبول صورت ہونے کے ساتھ دل پھینک بھی لگ رہا تھا۔ اس نے نہایت نفیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے بالوں اور ناخنوں کی تراش بھی عمدہ تھی۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا۔

''تم یہیں رہتے ہو؟'' میں نے سوال کیا، حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ یہاں نہیں رہتا۔

اس کا قہقہہ تمام بندشوں سے آزاد تھا... متاثر کن اور مخالف کو زیر کر دینے والا! لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ مجھ میں اس قسم کے لوگوں کو سمجھنے کی صلاحیت بہ خوبی موجود تھی۔

''کوئی چانس نہیں۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا جسے وہ دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

مجھے وہ شخص بالکل پسند نہیں آیا۔ گو میں ابھی تک اسے پہچان نہیں پائی تھی لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں اسی سوال کا اس کی جانب سے انتظار کر رہی تھی۔ جب اس نے یہ سوال نہیں کیا تو میں نے پوچھ لیا۔

''مس ڈورتھی اسٹیونز میرے لیے کام کرتی ہے۔ میں جنرل منیجر ہوں۔'' اس نے اپنا کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اوہ... تو یہ ڈوگ ہیرس تھا!

میں یہ تاثر دیے بغیر کہ میں اسے جانتی ہوں، خاموش رہی تاکہ وہ خود ہی مزید اگلنا شروع کر دے۔

''میں یہ دیکھنے کے لیے آیا تھا اگر... بلڈنگ کے منیجر نے مجھے چابی دی ہے...'' ڈوگ ہیرس نے کہا۔

''تم کیا دیکھنے کے لیے آئے تھے مسٹر ہیرس؟'' میں نے تجسس سے عاری لہجے میں پوچھا۔

''تم مجھے ڈوگ کہہ سکتی ہو۔''

میں نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی۔

قدرے توقف کے بعد وہ خود ہی بول پڑا۔ ''تم ڈورتھی کی رشتے دار ہو؟''

''نہیں۔''

''پولیس سے تعلق ہے؟''

''میں بینک کے لیے کام کرتی ہوں۔''

''اوہ!'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی طراری میں پہلی دراڑ ظاہر ہوئی تھی۔

''میں انویسٹی گیٹر ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ میرا کام ہے کہ جو رقم تم نے کھوئی ہے، اسے تلاش کروں۔ کیا تمہارے خیال میں، میں اسے تلاش کر لوں گی مسٹر ہیرس؟''

''کیا تم اپنے کام میں پختہ ہو؟'' اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا پھر پوچھا۔ ''تم پولیس کے ساتھ ہو؟''

میں نے اپنی پوزیشن جتنے کم الفاظ میں ممکن ہو سکتا تھا، واضح کر دی لیکن اسے اپنا نام نہیں بتایا۔ اپارٹمنٹ میں اس کی موجودگی کی تفصیل ابھی مبہم تھی۔ کوئی ایسی بات تھی جس کے بارے میں وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ڈورتھی ایسا کر سکتی ہے۔ یہ بات وضاحت طلب تھی۔

اس کی یہاں آمد کا مقصد یہی تھا کہ وہ اسے تلاش کرنا چاہتا ہے۔ البتہ میری یہاں موجودگی پر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ وہ خود کو مطمئن اور پُرسکون رکھنے کے لیے ہر قسم کی کوشش کر رہا تھا اور کسی قسم کی عجلت ظاہر نہیں کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

نہیں، مجھے وہ شخص قطعی طور پر پسند نہیں آیا۔ ملاقات سے پہلے بھی میں نے اسے ناپسند کیا تھا اور اب تو وہ مجھے اور بھی ناپسندیدہ لگ رہا تھا۔ البتہ بہ طور مشتبہ میں اسے پسند کر رہی تھی لیکن یہ اس کی شخصیت تھی... یا پھر میرا تجربہ جو مجھ سے یہ بات کہہ رہا تھا!

مارٹن ہوتا تو یہی کہتا کہ میں حقائق سے دور جا رہی ہوں لیکن حقائق کیا تھے؟

میں ڈورتھی کے اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔ میں نے سوچا کہ میں بلڈنگ منیجر سے تھوڑی سی گپ شپ کر لوں۔ بعض اوقات آپ خوش قسمت واقع ہوتے ہیں اور لینڈ لارڈ مصروف ملتا ہے۔ قسمت میرے ساتھ نہیں تھی۔

''مس ڈورتھی ایک خاموش طبع عورت تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک عمدہ کرایہ دار... کوئی پارٹیاں نہیں کرتی تھی اور کرایہ وقت پر ادا کرتی تھی۔ متین اور پُرسکون عورت۔''

''کیا کوئی اس سے ملنے کے لیے آتا تھا؟''

''میں تاک جھانک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' اس نے قدرے برہمی سے جواب دیا۔ ''نہ ہی میں کرایہ داروں کی جاسوسی کرتا ہوں۔ میں صرف یہ خیال رکھتا ہوں کہ کرایہ وقت پر ادا ہو جائے اور کسی قسم کی بدنظمی یا جھگڑا وغیرہ نہ ہو۔ وہ کیا کرتے ہیں، یہ ان کا معاملہ ہے... سمجھیں؟''

''میں بات اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔'' میں نے تیزی سے جواب دیا۔ ''شاید کبھی ہال سے گزرتے ہوئے...'' مجھے جب کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے پوچھا۔ ''اب اس شخص کی بات کو ہی لے لو جسے تم نے اپارٹمنٹ کی چابی دی ہے...''

''کون شخص؟'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''وہ شخص جو اس وقت اوپر آیا تھا جب میں وہاں کمرے میں موجود تھی۔''

''میں نے تو کسی شخص کو نہیں دیکھا اور نہ ہی میں کسی ارے غیرے کو چابی دیتا ہوں۔ جیسا کہ آج میں تمہارے اور پولیس کے ساتھ اوپر گیا تھا اور اس وقت بھی جب تم دوبارہ آئی تھیں۔ کوئی بھی مرد، عورت یا بچہ جو کرایہ دار نہیں ہے، مجھ سے کبھی کسی کی چابی نہیں لے سکتا۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا۔ ''تم نہایت مددگار ثابت ہوئے۔''

میں نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں مارٹن سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے ملاقات کا انتظار بھی نہیں کیا۔ میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کیا۔

ہیرس ہی ہمارا مطلوبہ فرد تھا۔

بس اب ہمیں انتظار کرنا تھا۔ اگر مارٹن اس کے تعاقب میں لگا رہا تو وہ شخص رقم تک ہماری راہنمائی کر دے گا اور امید تھی کہ ڈورتھی اسٹیونز تک بھی... بشرطیکہ ڈورتھی اسٹیونز ابھی تک زندہ ہو! اس دوران مارٹن ہمارے بینک جنرل منیجر کے بارے میں مکمل چھان بین کر رہا تھا۔

اور میں؟

میں اپنے بونس کا حساب لگا رہی تھی جو ساڑھے سات لاکھ ڈالرز کی بازیابی پر یقینی طور پر ایک بڑی رقم ہوتی۔

معاملہ ختم ہو چکا تھا ماسوائے اس کے حقیقی انجام کے! اور یہ وقت کی بات تھی کہ کب انجام پذیر ہوگا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ انجام تو ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔ آغاز تو مختلف ہو سکتا ہے لیکن انجام ہمیشہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ یہ بات ان کیسز سے ثابت ہو چکی تھی جو اب تک ہم نے حل کیے تھے۔

خوش قسمتی سے میرے پورے کیریئر میں زیادہ ناکامیاں نہیں ہوئی تھیں اور یہ کیس بھی اس فہرست میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات صاف طور پر عیاں تھی اور انجام بھی نزدیک تھا۔ اس لیے کہ مسٹر ہیرس مجھے اس ٹائپ کا آدمی نہیں لگا تھا کہ جو اپنی کامیابی کے حصول کے لیے زیادہ دیر تک انتظار کر سکتے ہیں۔

انجام میرے تصور سے زیادہ قریب آ چکا تھا۔ جب تک مارٹن اور میں دوبارہ یکجا ہوئے، نتائج پہلے ہی ظاہر ہو رہے تھے۔

ہیرس نے رات کی ایک فلائٹ میں اپنی ریزرویشن کرائی ہوئی تھی اور ارجنٹائن کی ایک پرواز سے کنیکٹڈ فلائٹ تھی۔ یہ ریزرویشن ایک اکلوتے مسافر کی تھی اور اس کے اصل نام تھی۔ اس نے فرضی نام سے بھی بکنگ کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اسے پہلے رقم حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔'' میں نے مارٹن سے کہا۔

''بشرطیکہ رقم اس کے پاس پہلے سے موجود نہ ہو۔'' مارٹن نے جواب دیا۔ ''یا بشرطیکہ ڈورتھی اسٹیونز رقم سمیت پہلے سے ارجنٹائن میں موجود نہ ہو۔''

''میں اس شخص سے مل چکی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ڈورتھی اسٹیونز کے ساتھ کبھی نہیں رک سکتا۔''

''تو پھر ڈورتھی کہاں ہے؟''

''وہ خود کو ظاہر کر دے گی۔''

''جب تم سے کوئی جواب نہیں بن پاتا تو تم ہمیشہ یہی کہتی ہو۔'' مارٹن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میں واقعی ہمیشہ یہی کہہ دیتی تھی۔ ہم انتظار کرنے لگے۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مارٹن کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ ڈوگ ہیرس، ڈورتھی کے اپارٹمنٹ کے اطراف میں واپس آ گیا تھا۔ رقم وہاں موجود نہیں تھی۔ ہم اپارٹمنٹ کی خوب اچھی طرح تلاشی لے چکے تھے۔ کوئی بات ایسی تھی جو اسے وہاں مسلسل واپس آنے پر مجبور کر رہی تھی۔

مارٹن اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''آؤ چلیں۔'' ہم نے ایک ساتھ کہا۔

ہمیں اس کار تک پہنچنے میں چند منٹ لگے جو ہیرس کی نگرانی پر مامور تھی۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہیرس عمارت کے اندر تھا اور کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی تھی۔

مارٹن اور میں نے عمارت میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے بلڈنگ منیجر کو ڈھونڈا اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

ابھی ہم نے چند سیڑھیاں ہی عبور کی تھیں کہ ہمیں فائر کی آواز سنائی دی۔ ہم نے دوڑتے ہوئے باقی سیڑھیاں پھلانگیں اور دندناتے ہوئے کمرے میں جا گھسے۔ جیسا کہ ہمیں توقع تھی، موت نے ہمارا استقبال کیا۔

ہیرس مر چکا تھا۔

وہ کمرے کے وسط میں چاروں خانے چت پڑا ہوا تھا اور اس کے جسم سے خون ابل رہا تھا۔ وہ یقینی طور پر مر چکا تھا۔

اسے اس عورت نے شوٹ کیا تھا جو کاؤچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ریوالور بدستور اس عورت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کو پیار سے تھپتھپا رہی تھی۔

مارٹن اس عورت کے نزدیک گیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس عورت نے مارٹن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ریوالور مارٹن کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''یہ مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔'' عورت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس نے جو کچھ کہا، وہ کرنے کے بعد بھی اور اس نے جو وعدہ کیا، وہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی! وہ مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے ساتھ خودکشی کی ایک تحریر بھی لایا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو جیسے میں نے خود اپنے آپ کو مار ڈالا ہے۔ میں نے اس کی خاطر تمام رقم چرائی اور وہ مجھے چھوڑ کر جا رہا تھا... مجھے مردہ چھوڑ کر! اور خودکشی کا رنگ اس لیے دینا چاہ رہا تھا جیسے میں اپنے کیے پر نادم تھی۔ یہ اس کی دیدہ دلیری تھی اور میں پاگل تھی۔ میں پاگل تھی جو اس پر یقین کر بیٹھی تھی لیکن اتنی پاگل بھی نہیں تھی۔'' اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔

پھر اس نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ اسے یہ مشورہ دینے کا کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ بات نہ کرے۔ نہ ہی اسے وکیل کو طلب کرنے کا مشورہ دینا مناسب تھا۔ اسے کوئی چیز اس وقت روک نہیں سکتی تھی۔ اس پر طاری کیفیت ہی کچھ اور تھی۔

''رقم کہاں ہے ڈورتھی؟'' میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''رقم!'' اس نے حقارت سے کہا۔ ''اسے بھی تو بس رقم ہی کی طلب تھی۔ میں نے اس کے ساتھ سب کچھ طے کر لیا... اس کی خواہش کے عین مطابق۔ رقم میرے پاس آگئی لیکن میرے بغیر وہ رقم تلاش نہیں کر سکتا تھا۔''

اب وہ مکمل طور پر سنجیدہ ہو گئی تھی۔ یہ اس کے اظہار کا وقت تھا۔

''یہ اس کی آزمائش تھی، تم سمجھ رہے ہو! یہ جاننا میرے لیے ضروری تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ رقم کہاں ہے تو وہ میرے بغیر یہاں سے نکل گیا ہوتا... اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ سو جو کچھ ہوا، وہ سامنے ہے۔ وہ اس امتحان میں پاس نہیں ہوا۔'' اس نے لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور قدرے حقارت آمیز لہجے میں بولی۔ ''یہ ناکامیاب شخص لاش کی صورت میں پڑا ہوا ہے۔''

''رقم کہاں ہے ڈورتھی؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''تم بھی!'' اس نے کہا۔ ''ہر کسی کو رقم کی پڑی ہوئی ہے۔ ہر کسی کی دلچسپی رقم سے ہے جبکہ رقم اہمیت نہیں رکھتی۔''

مجھے اپنی بونس کی رقم کھڑکی سے باہر ہوا میں اڑتی محسوس ہوئی۔

''یہ ہم تمہاری مدد کے لیے پوچھ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں یہ بتا دو کہ تم نے رقم کہاں رکھی ہے۔ اس سے تمہارے لیے آسانی ہو جائے گی۔''

''کوئی بھی شخص رقم کہاں رکھتا ہے؟'' اس نے میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میں ایک لمحے کے لیے ٹپٹا سی گئی۔

''بتاؤ؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے خیال میں بینک میں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، میں نے وہ رقم بینک میں ہی رکھ دی تھی۔'' ڈورتھی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کون سے بینک میں؟''

''کون سے بینک میں؟'' اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ''یقیناً اسی بینک میں جہاں میں کام کرتی ہوں۔''

اب حیران ہونے کی باری ہماری تھی۔ ''تم نے وہ رقم بینک سے کبھی باہر نکالی ہی نہیں؟''

''یقیناً نہیں۔'' اس نے اکڑفوں لہجے میں جواب دیا۔ ''میں کوئی چور نہیں ہوں۔''

وہ کوئی چور تھی یا نہیں، اس بات کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام تھا۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں یہ ایک آزمائش تھی۔''

اور بالآخر اس نے ہمیں بتا دیا کہ اس نے رقم کہاں چھپائی تھی۔ اس نے سیدھے سادے انداز میں رقم بینک میں موجود فائلوں کے چند بکسوں میں بھر دی تھی اور ان پر پرانی تاریخوں کے لیبل چسپاں کر دیے تھے۔ یہ اس کے لیے نہایت آسان کام تھا۔

میں نے اسے مارٹن کے پاس چھوڑ دیا اور ہیری کو یہ خبر سنانے کے لیے وہاں سے چل پڑی۔ مجھے ایک دن کے کام کے عوض نہایت عمدہ بونس ملنے کی توقع تھی اور اگر میں ہیری کو قائل کر لیتی تو بونس کی رقم میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہو سکتا تھا۔

اس تمام بھاگ دوڑ کے باوجود ہیرس مر گیا تھا اور ڈورتھی جیل جا رہی تھی۔

بہرحال، یہ سب کچھ منصفانہ نہیں لگ رہا تھا لیکن میں اس معاملے میں انصاف کرنے کے لیے شامل نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی ذمے داری پوری دیانت داری سے سرانجام دی تھی اور ہیرس کی طرح اس آزمائش میں ناکام نہیں رہی تھی۔

میرا نام والٹر گٹنبرگ ہے۔ میں ایک کمپیوٹر انجینئر ہوں... بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں کمپیوٹر جینئس تھا۔ جتنا میں اپنے بارے میں جانتا تھا اس سے کہیں زیادہ میں کمپیوٹرز کے بارے میں جانتا تھا۔

میری زندگی کا وہ مسرور کن دن تھا جب میں نے دنیا کی عظیم ترین کمپیوٹر کمپنیز میں سے ایک کو جوائن کیا۔ وہاں مجھے بہت سے نامور پیشہ ور انجینئرز کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کے باوجود بھی میں ان سب میں ممتاز تھا۔

اپنی محنت اور کوشش سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے بالآخر بتیس سال کی عمر میں، میں ہیڈ آفس کے منیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر پہنچ گیا۔

بیس ستمبر کو میں نے اپنی سالگرہ، اپنی شادی کی سالگرہ اور منیجنگ ڈائریکٹر پرفائز ہونے کی چوتھی سالگرہ ایک ساتھ منائی۔

تیئس ستمبر کو کمپنی کے چیف ایگزیکٹو آفیسر مسٹر ہیکٹر نے اپنے بیٹے میتھیو کے گریجویشن پر ایک شان دار پارٹی دی۔ میتھیو نے کمپیوٹر اور کمیونیکیشن انجینئرنگ میں آنرز کی ڈگری لی تھی۔

چوبیس ستمبر کو مجھے کمپنی کی جانب سے شکریے کا خط موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ مجھے افریقا میں کمپنی کی برانچ کو ہینڈل کرنے کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔

افریقا؟

وہاں تو بہت سڑی ہوئی گرمی پڑتی ہے!

میں تو وہاں جھلس کر رہ جاؤں گا۔

پھر میرا قصور کیا ہے؟

جواب تھا۔ کوئی نہیں... بس کوئی نہیں۔

عین اس وقت جب میں اپنی چیزیں پیک کر رہا تھا، مجھے اطلاع ملی کہ نیا منیجنگ ڈائریکٹر مامور کر دیا گیا ہے۔ اندازہ لگائیں کہ وہ کون ہو سکتا تھا؟

جی ہاں... میتھیو!

چیف ایگزیکٹو آفیسر کا بیٹا نیا منیجنگ ڈائریکٹر تھا۔

مجھے بات کرنی ہوگی... مجھے چیف ایگزیکٹو آفیسر سے بات کرنی ہوگی۔

میں اس کے دفتر میں چلا گیا اور اس سے بات کی۔ اس گفتگو کا نتیجہ حیران کن طور پر سامنے آیا۔

اس نے مجھے نوکری سے برخاست کر دیا۔

ایک انوکھے اور اچھوتے خیال کے ذریعے پوری ہونے والی خواہشات کا ڈرامائی اندازِ بیاں

خواہش

سلیم انور

فی زمانہ کوئی بھی ایسی ہستی نہیں جو اپنے دل میں خواہشات نہ رکھتی ہو ... ہر شخص اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے ہزار جتن کرتا ہے ... اور کسی کو بنا جدو جہد کے وہ سب حاصل ہو جاتا ہے جس کی آرزو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں موجود ہوتی ہے۔

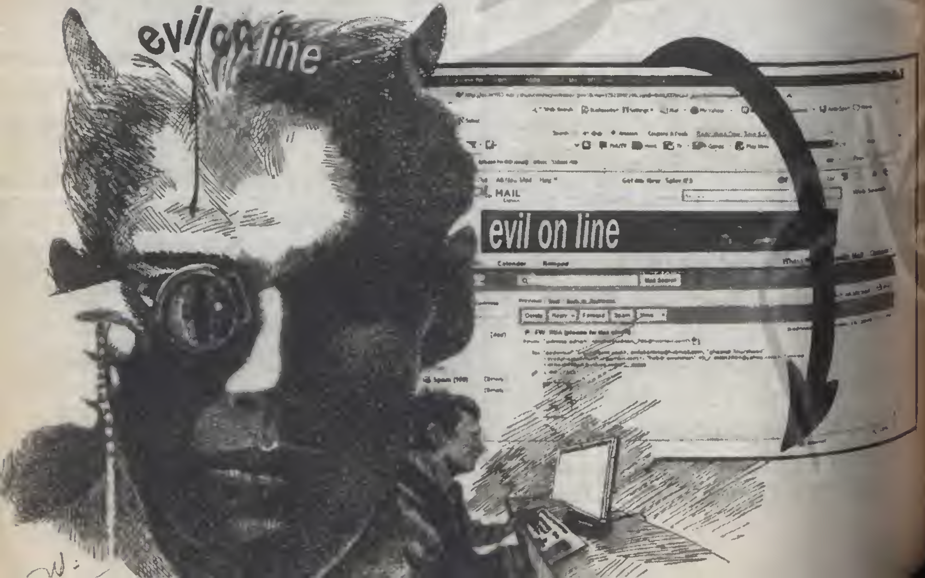

بالکل اس اطمینان کے ساتھ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں واپس اپنے دفتر میں آگیا اور اپنی چیزیں اکٹھی کرنے لگا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا، سو میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں۔ میں اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھے خود کو مضبوط اور اپنے اعصاب کو قوی ظاہر کرنا تھا... اس موقعے پر خود کو کمزور اور ناتواں ثابت کرنا میرے لیے بے عزتی اور شرمندگی کا باعث بن سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کر دوں اور کہیں اور مصروف ہو جاؤں۔

میری نگاہ اپنے کمپیوٹر پر پڑی۔ میں کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اپنی ای میل کھول لی اور اسے چیک کرنے لگا۔

میری عادت تھی کہ بیشتر پیغامات کو یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کس نے بھیجے ہیں....، ڈیلیٹ کر دیا کرتا تھا کیونکہ میرے پاس ان کو پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اب میرے پاس وقت تھا۔

اس دوران میری نگاہ ایک پیغام پر پڑی جس پر بھیجنے والے کا نام نہیں تھا۔ اس پر کوئی موضوع بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔

''ایسے پیغامات میں وائرس ہو سکتا ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ''مجھے یہ میل نہیں کھولنی چاہیے۔''

''لیکن کیوں نہیں۔'' میں نے دوبارہ اپنے آپ سے کہا۔ ''انہیں کھول کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ مجھے کون سا کوئی نقصان پہنچے گا۔''

میں نے احتیاط کے ساتھ وہ پیغام کھول لیا۔

چونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس میں کس قسم کا وائرس ہو سکتا ہے، اس لیے مجھے احتیاط برتنا لازم تھی۔ اگر میں کمپنی کے سرور کو وائرس سے متاثر کرنا چاہتا، تب بھی میں کسی قسم کا تنازعہ نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا۔

مانیٹر کی اسکرین جھلملائی اور پھر وہ میسیج کھل گیا:

''EVIL ONLINE میں خوش آمدید!

''ہم نے ایک نئے ممبر کے طور پر آپ کا نام فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ دنیا بھر میں ہمارے ممبروں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ ہماری ویب سائٹ پر جانے کے لیے بس یہاں کلک کر دیں۔''

ایول آن لائن؟ میں نے ایسی کسی چیز کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔

بہرحال، میرے لیے یہ جاننا ضروری ہو گیا تھا کہ انہیں میرا نام کیسے پتا چلا اور انہوں نے کس بنیاد پر میرا نام بہ طور ممبر اپنی فہرست میں شامل کیا ہے۔ ''یہ بات صرف ایک مرتبہ ماؤس کو کلک کرنے سے پتا چل جائے گی۔'' میں بڑبڑایا۔

میرے کلک کرتے ہی میرے انٹرنیٹ براؤزر نے ایک عجیب ویب سائٹ کھول دی جو بے حد پُرکشش اور خوب صورتی سے ڈیزائن کی گئی تھی۔

ابتدا میں ایک حیرت انگیز بھڑکتا ہوا تعارف تھا پھر ایک ویلکم نوٹ جو واقعی ایک بے ڈھب سا ویلکم نوٹ تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''EVIL ONLINE

خوش آمدید والٹر گٹنبرگ!

ہمارے ساتھ یہاں شامل ہونے کی خوشی ہوئی۔

یہاں انٹر کریں۔

لیکن

یاد رہے،

ایک مرتبہ جب آپ اندر آ جائیں گے تو پھر باہر نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے!''

انہیں میرے نام کا علم کیسے ہوا؟ کوکیز! ہاں، کوکیز! یقیناً انہوں نے ای میل کے ساتھ ایک کوکی (COOKIE) بھی بھیجی ہو گی۔

یہ بڑا پُراسرار اور ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا لیکن ساتھ ہی رغبت بھی دلا رہا تھا۔ بہرحال، یہ خطرناک تو نہیں ہو سکتا اور اگر خطرناک ہوا، تب بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔

جب میں نے کی بورڈ پر انٹر کے بٹن کو دبایا تو یہ پیغام سامنے اسکرین پر آ گیا:

''ڈیئر والٹر!

آپ کے رسپانس کا شکریہ اور ایول آن لائن میں شامل ہونے پر خوش آمدید۔ جب آپ پہلی بار اس سائٹ تک رسائی کریں گے تو آپ کو یہ عجیب لگے گا لیکن بعد میں یہ کم عجیب اور زیادہ خوش کن لگنے لگے گا۔ یہ یاد رہے کہ ہماری سائٹ ورلڈ وائڈ ویب پر انتہائی محفوظ ترین سائٹ ہے۔ اس کا علم آپ کو بعد میں ہو جائے گا۔

انجوائے کریں!''

جب میں آگے بڑھا تو مزید انکشافات ہوئے۔ انتہائی شاک پہنچانے والی تفصیل ممبر شپ کے قوانین میں تھی۔ اس میں لکھا تھا:

''دعوت دیے جانے پر آپ ممبر ہو جائیں گے۔ ایک بار جب آپ کو دعوت دی جائے گی تو آپ کو اپنی ممبر شپ کی تصدیق کے لیے ایول آن لائن کا وزٹ کرنا ضروری ہو گا اور اس کے لیے آپ کو SUBSCRIBE کو کلک کرنا پڑے گا۔ ایک بار جب آپ SUBSCRIBED ہو جائیں گے تو پھر

صرف اسی صورت میں UNSUBSCRIBE ہو سکتے ہیں جب آپ خود کو مرنے کے لیے تیار کر لیں گے۔''

''یہ کس قسم کی بکواس ہے؟'' میں حیرانی سے بڑبڑایا۔ ''کیا یہ کوئی مذاق ہے؟''

اس کے نیچے ممبر شپ کے فوائد کی تفصیل جاننے کے لیے ایک لنک دیا گیا تھا۔ میں نے اس لنک کو کلک کیا تو یہ تفصیل سامنے آ گئی:

''ممبران ہماری سب سے زیادہ امتیازی سروس ''خواہش بتائیں'' تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سروس کے استعمال کے بعد آپ جان جائیں گے کہ آپ کی ممبر شپ کتنی فائدہ مند ہے۔ یاد رہے کہ ممبر شپ سو فیصد مفت ہے۔ ''خواہش بتائیں'' کے بارے میں مزید پڑھیں۔''

خواہش بتائیں ایک سروس ہے جو ایول آن لائن فراہم کرتی ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ میں صرف اپنی خواہش بیان کر دوں اور وہ اسے یقینی بنا دیں گے کہ وہ خواہش سچ ثابت ہو جائے۔ پروا نہیں... خواہش کچھ بھی ہو، وہ ضرور پوری ہو گی لیکن انتہائی قدرتی انداز میں!

''کیوں نہ آزمایا جائے!'' میں نے خود سے کہا۔

میں نے واپس سبسکرپشن کا صفحہ کھول لیا اور لفظ SUBSCRIBE پر کلک کر دیا۔ ایک میسیج آ گیا جس میں لکھا تھا:

''او کے والٹر! اب آپ ممبر بن چکے ہیں۔

''اب ہم آپ کو آٹومیٹک طور پر آپ کے ''خواہش بتائیں'' کے صفحے پر لے جائیں گے۔''

اس صفحے پر میرے لیے ایک بکس کھل گیا جس میں مجھے اپنی خواہش بیان کرنا ضروری تھی۔

''میں کیا ٹائپ کروں؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ میری ملازمت مجھے واپس مل جائے۔''

جونہی میں نے اپنی خواہش ٹائپ کر کے انٹر کا بٹن دبایا، مانیٹر کی اسکرین جھلملانے لگی اور پھر ایک اور میسیج آ گیا جس میں یہ لکھا ہوا تھا:

''آپ کی خواہش کارروائی کے عمل میں ہے۔ تین دن میں آپ کی خواہش سچ ثابت ہو جائے گی۔ یاد رہے کہ یہ نہایت قدرتی انداز میں پوری ہو گی۔''

دو دن بعد میں نے سنا کہ مسٹر ہیکٹر اور ان کا بیٹا کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ تیسرے دن مجھے کمپنی کے نئے چیف ایگزیکٹیو آفیسر کا خط موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ میں اپنی دوبارہ ملازمت کے سلسلے میں بات چیت کے لیے ان سے ملاقات کر لوں۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

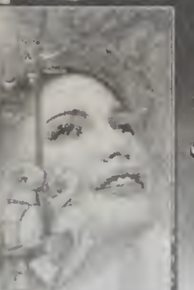

جنوری 2010ء

نئے سال کی نئی بہاریں

مزاج آشنا

چاہتوں کے گلاب پیروں تلے روند کر اونچی اڑان اڑنے والے ایک نادان پنچھی کا بے سمت سفر۔ جسے رائگانی کا عذاب تو سہنا ہی تھا...... آخری صفحات پر ناصر ملک کا دلکش شاہکار

ہند سے یونان تک

سکندرِ اعظم ...... دنیا کو فتح کرنے والا اپنے لختِ جگر کے لیے دو گز زمین بھی نہ جیت سکا...... محی الدین نواب کا شاہکار تاریخ کے جھروکے سے ابتدائی صفحات کی سوغات

حضرت نوحؑ

آدمِ ثانی کے روز و شب کا عبرت اثر احوال...... جب اپنوں کی بے رخی عروج پر پہنچی تو سمندر کی سرکشی اور زندگی کی بے کسی...... بہت سوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بن گئی

جان لیوا

مجرم چاہے کتنا ہی بڑا کھلاڑی ہو...... ایک دن کھیل تو ختم کرنا ہی پڑتا ہے...... اور مرزا امجد بیگ کی یہی خوبی ہے کہ کھیل کے اختتام پر فاتح وہی قرار پاتے ہیں

فروری 2010ء کے شمارے میں
محی الدین نواب
کے قلم سے ''بے زمین بے آسمان''

اور
وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!
دیر نہ کیجیے تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

”میں خدا کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں، میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مر جائیں۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”یہ محض ایک اتفاق ہوسکتا ہے۔“

میں یقین ہی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ میری خواہش کی بنا پر ہوا ہوگا۔ مجھے یہ قطعی پاگل پن لگ رہا تھا۔ بھلا دنیا میں کون ایسی باتوں پر یقین کرسکتا تھا؟

مجھے انکار نہیں کہ میں اس ویب سائٹ پر دوبارہ جانے سے ڈر رہا تھا۔ حتیٰ کہ میں انٹرنیٹ تک رسائی اور اپنی ای میل کو چیک کرنے سے بھی گریز کرتا رہا۔

اس کے باوجود اس ویب سائٹ نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔

میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا ہوا تھا جس نے اپنے کمپیوٹر کی خرابی دور کرنے کی خاطر مجھے طلب کیا تھا۔ چونکہ میں اس کام میں اسپیشلسٹ تھا، اس لیے میں نے اس کا پی سی چیک کرنے کے لیے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کردی تھیں۔

وہ میرے لیے چائے تیار کرنے کے لیے چلا گیا۔

جونہی میں نے پی سی آن کیا، وہ خود بہ خود انٹرنیٹ سے کنیکٹ ہوگیا اور EVIL ONLINE پر چلا گیا۔ اس کے ہوم پیج پر ایک میسج تھا جو میرے لیے تھا۔

”ہائے والٹر! بہت دن سے نظر نہیں آئے۔“

”اس نے مجھے کس طرح پہچان لیا؟“ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر ایک اور میسج نمودار ہوا۔

”تم اپنی خواہش کی تکمیل پر لطف اندوز ہوئے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ میری خواہش نہیں تھی۔ میں نے ان کے مرنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ میں نے صرف یہ خواہش کی تھی کہ مجھے میری ملازمت واپس مل جائے۔“

یوں لگا جیسے کوئی میری بات سن رہا ہے۔ ایک اور میسج آ گیا جس میں لکھا تھا:

”یہ تمہاری خواہش تھی، والٹر! سوری کہ وہ مر گئے۔ لیکن انہیں مرنا تو تھا۔ یہی وہ راستہ تھا جس کے ذریعے تمہاری خواہش سچ ثابت ہوسکتی تھی۔“

میں نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ شٹ ڈاؤن نہیں ہوا۔

ایک اور پیغام ابھر آیا۔

”تم ایک اور خواہش نہیں کرنا چاہتے؟“

مجھے خود بہ خود ”خواہش بتائیں“ والے صفحے پر منتقل کردیا گیا۔ مجھے ایک اور خواہش کرنی تھی... لیکن کیا؟

”ہاں! میں دولت مند بننا چاہتا ہوں... بے حد دولت مند!“ میں نے خواہش ٹائپ کردی۔

ایک دن بعد میری بیوی اور میرا تین سالہ بیٹا پیرس سے واپس آتے ہوئے ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے۔

ائرلائن کمپنی نے بہ طور تلافی مجھے ایک بہت بڑی رقم دی جو کہ کئی ملین ڈالرز تھی۔ مزید یہ کہ مجھے اپنی بیوی کی دولت بھی ورثے میں مل گئی جو ایک سال قبل اس وقت اسے وراثت میں ملی تھی جب اس کے دولت مند باپ کا انتقال ہوا تھا۔ میری بیوی اور بیٹے کی بیمہ کی رقم الگ تھی۔

تیسرے روز جب میں تدفین کے بعد اپنی کار ڈرائیو کررہا تھا تو اس سوچ میں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میرا ذہن اس معاملے میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ میں کار کے اسٹیئرنگ وھیل کو قابو میں نہ رکھ سکا اور کار ایک چٹان سے نیچے جا گری۔

ڈاکٹر نے بعد میں بتایا کہ میرا زندہ بچ جانا ایک معجزہ ہے۔ یہ الگ بات تھی کہ اب مجھے اپنی پوری زندگی معذوری کے زیرِ اثر گزارنا ہوگی۔ حادثے میں میری ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی تھی اور میں کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کے عوض مجھے اپنی کمپنی اور انشورنس کمپنی سے پچاس لاکھ ڈالرز سے زیادہ رقم مل گئی۔

اب میں دولت مند ہوں... بے حد دولت مند!

☆☆☆

”ڈیئر سر!

میں بہ ذریعہ ہٰذا اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا انٹرویو کے دوران جو میں نے اس کے مرنے سے قبل لیا تھا۔ والٹر گٹنبرگ نے جو کچھ بھی کہا، وہ من و عن وہی ہے جو لکھا گیا ہے۔ اس انٹرویو کے بعد وہ سانتا ماریا کے محتاج گھر میں اپنے کمرے میں مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ اسے بری طرح قتل کیا گیا تھا اور اس کے جسم کے اعضا تک کاٹ دیے گئے تھے۔ اس تصدیقی بیان میں، میں مزید ایک اور چیز کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس شب جب اس کی موت واقع ہوئی، والٹر نے میرا لیپ ٹاپ مستعار لیا تھا۔ جب میں نے اپنی انٹرنیٹ ہسٹری چیک کی تو پتا چلا کہ اس نے 'ایول آن لائن' نام کی ایک ناقابلِ فہم، پُراسرار ویب سائٹ کا وزٹ کیا تھا۔ جب میں نے اس ویب سائٹ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو مجھے صرف ایک میسج موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ ویب سائٹ تلاش نہیں کی جاسکتی۔ بہترین خواہشات کے ساتھ جیفرے کے فلپس...

ایم ڈی

سانتا ماریا محتاج گھر۔“

دبیز تہوں میں چھپے جرم کا قصہ جو ہر صورت عیاں ہونے کو تھا

ایک بوڑھے شخص کی زندگی کے دن و رات ...وہ اپنے کام ایک طے شدہ وقت پر کرنے کا عادی تھا ...پھر اس کے معمولاتِ زندگی میں ایک فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی...

نسیان

تنویر ریاض

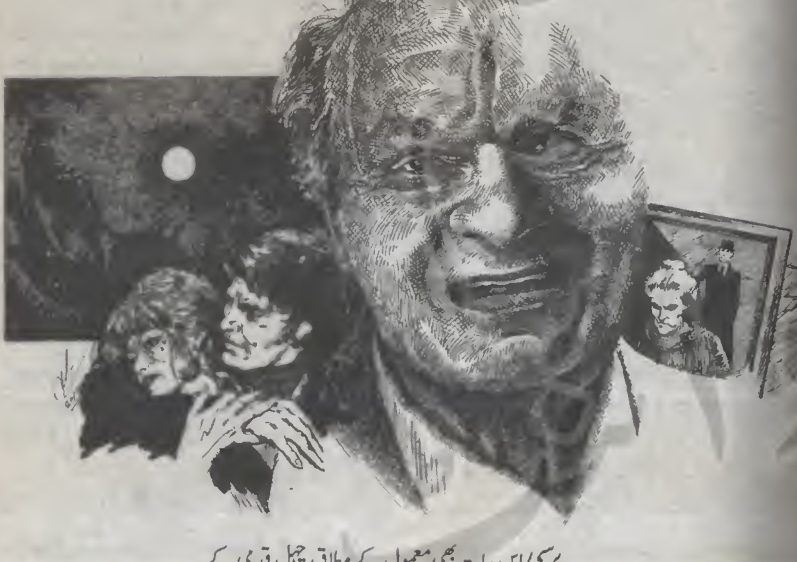

برسی اس رات بھی معمول کے مطابق چہل قدمی کے لیے نکلا۔ اس نے سڑک پار کی اور فٹ بال گراؤنڈ سے ہوتا ہوا جنگل کی جانب بڑھ گیا۔ یہ راستہ اس کا جانا پہچانا تھا اور یہاں پہنچتے ہی اس کی چال میں اعتماد آ گیا۔ وہ اس راستے پر برسوں سے آ رہا تھا۔ پچاس سال پرانی یہ سڑک بھی اس کے سامنے ہی تعمیر ہوئی تھی۔ اسی طرح وہ فٹ بال گراؤنڈ اور جنگل بھی اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ اس کا رات گئے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلنا کسی کے لیے باعثِ تشویش نہ تھا کیونکہ اس کے آس پاس رہنے والوں کو یقین تھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر کمزور ہوگیا ہے جس سے اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ اس رات بھی وہ گھر سے باہر نکلا تو اس کے ایک پاؤں میں جوتا اور دوسرے میں سینڈل تھا۔ نہ جانے یہ خیال اس کے ذہن میں کب اور کیسے آیا کہ اس کی دونوں ٹانگوں کی لمبائی میں فرق ہے چنانچہ اس نے

اس فرق کو مٹا کر اپنی چال کو متوازن بنانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اسے جانے پہچانے راستے پر آگے بڑھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک چلنے کے بعد وہ ستانے کے لیے بیٹھ گیا اور دھندلائی آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ چاند پوری طرح نہیں نکلا تھا اور اسٹریٹ لائٹس بہت پیچھے رہ گئی تھیں اس لیے وہ واضح طور پر کچھ دیکھنے سے قاصر تھا... لیکن اس کے لیے یہ تاریکی بے معنی تھی۔ وہ اپنے ذہن کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔

وہ ایک بارہ منزلہ عمارت کے ایک کمرے والے فلیٹ میں رہتا تھا جس کی دیکھ بھال کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی۔ سوشل سروس کی جانب سے اسے ایک خادمہ کی سہولت فراہم کر دی گئی تھی جو ہفتے میں ایک بار آتی اور سارا کام نمٹا کر چلی جاتی۔ اس بلاک میں رہنے والوں سے اس کے واجبی سے تعلقات تھے۔ البتہ سامنے والے فلیٹ میں رہنے والی مسز فلاور سے اتفاقیہ آمنا سامنا ہو جانے پر وہ ایک مخصوص جملہ ضرور بولتا۔

''گڈ مارننگ مسز فلاور...! کتنا خوب صورت دن ہے۔''

کوئی موسم ہو اور کوئی بھی وقت ہو، اس جملے کی ترتیب اور ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ بے چاری مسز فلاور اس کی دن بہ دن کمزور ہوتی یادداشت کے بارے میں سوچ سوچ کر اکثر پریشان ہو جاتی تھی۔

وہ کسل مندانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے ایک چیخ سنائی دی۔ یقیناً یہ کسی پرندے کی آواز نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ تو کب کے سو چکے تھے۔ اس جنگل میں کئی طرح کے جانور رہتے تھے جن میں گلہریاں، لومڑیاں اور ہرن وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ جنگل سے متصل میدان میں خانہ بدوشوں کا پڑاؤ تھا جو وہیں اپنے گھوڑے باندھ دیا کرتے تھے۔ آخری خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ یہ کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ہے جو بعض اوقات انسانی چیخ سے مشابہ ہوتی ہے۔ اسے یہ شبہ بھی ہوا کہ آیا اس نے کوئی آواز سنی ہے یا نہیں... کیونکہ اس کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا۔ کئی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی ہے یا ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے کان بج رہے ہوں۔ اس سے کوئی ملنے آتا تھا اور نہ ہی ٹیلی فون کرتا تھا... ماسوائے اس کی بیٹی کے جو آسٹریلیا میں مقیم تھی۔ وہ کبھی کبھار فون کر کے ہمیشہ ایک ہی سوال کرتی۔ ''کیا کیون تم سے ملنے آتا ہے؟''

کیون اس کے بیٹے کا نام تھا۔ دونوں بہن بھائیوں میں کئی برس پہلے جھگڑا ہو گیا تھا اور ان کے درمیان بات چیت بند تھی۔

بوڑھا پرسی اپنی بیٹی کی تسلی کے لیے ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا۔ ''ہاں، وہ مجھ سے ملنے آتا رہتا ہے۔'' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اسے اپنے بیٹے کی شکل دیکھے ہوئے بیس سال ہو چکے تھے اور نہ ہی کبھی اس کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوتی کہ کیون اس سے ملنے آئے۔ کئی سال پہلے وہ اپنی بیٹی سے ملنے گرافٹن گیا تھا۔ بیٹی کا اصرار تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی رہے لیکن وہ ماحول اس کے لیے اجنبی تھا لہٰذا اس نے یہ کہہ کر بیٹی سے معذرت کر لی۔ ''میں تم سے ملنے کے لیے آتا رہوں گا لیکن تمہارے ساتھ رہنا کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔''

یہ جملہ جیسے اس کے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی بیٹی نے فون کر کے اسے اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہا تو اسے یہی جواب ملا۔ تنگ آکر اس کی بیٹی نے اس بارے میں کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔

وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا اور اندھیرے میں نشیب کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آیا لیکن وہ اس جگہ کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اس نے اپنی سمت کا تعین کیا اور درختوں کی قطار کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ چند قدم چلا ہو گا کہ اسے ایک اور چیخ سنائی دی جیسے کوئی مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ اس بار وہ اپنے آپ کو قائل نہ کر سکا کہ یہ کسی گھوڑے کی آواز ہے۔ یہ یقیناً کوئی عورت تھی۔ وہ وہیں رک گیا۔ عام طور پر اسے اندھیرے میں ڈر نہیں لگتا تھا لیکن یہ معاملہ کچھ مختلف تھا۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی جو مصیبت میں گرفتار تھی یا اپنی جان بچانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے نشیب کی طرف دیکھا تو اندھیرے میں اسے دو ہیولے نظر آئے۔ ان کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ ان میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ اس طرف سے آنے والی آوازیں سن کر وہ محسوس کر سکتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ واپس مڑا اور بلندی کی جانب تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس کی رفتار حیران کن حد تک تیز تھی۔ شاید اس لیے کہ اسکول کے زمانے میں وہ بہت تیز دوڑتا تھا۔ ہر چند سیکنڈ کے بعد وہ اپنا سر گھما کر نیچے جنگل کی جانب دیکھتا۔ سیاہ لباس میں ایک شخص ڈھلوان سے اوپر کی طرف دوڑ رہا تھا لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ وہ بوڑھے کا تعاقب کر رہا ہے یا خود جائے واردات سے فرار

ہو رہا ہے۔ وہ بازو ہوا میں لہرا کر یوں دوڑ رہا تھا جیسے اس نے اپنی پیٹھ پر کوئی بوجھ اٹھایا ہوا ہو۔ چند لمحوں بعد بوڑھے کا دماغ یہ محسوس کرنے سے قاصر تھا کہ اس نے کیا دیکھا ہے۔ وہ فٹ بال گراؤنڈ کے کنارے دوڑتا دوڑتا سڑک تک آیا اور مکانوں کی طرف ہو لیا۔ پھر غیر شعوری طور پر ایک مکان کے سامنے رکا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

''کون ہے؟'' اندر سے ایک مرد کی غصیلی آواز ابھری۔

''پلیز! دروازہ کھولو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں کوئی ہولناک واقعہ پیش آیا ہے۔''

''اس جنگل میں ہمیشہ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔'' کسی عورت نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟''

''لگتا ہے کہ کسی کا ریپ یا قتل ہوا ہے۔'' پرسی چلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔''

''ڈک! میرا خیال ہے کہ یہ وہی بوڑھا ہے جو اکثر وہاں جاتا رہتا ہے۔'' عورت کی آواز آئی۔ ''تم ذرا باہر کی لائٹ جلا کر دیکھو۔''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلتے ہی پرسی اندر داخل ہو گیا اور گھٹنوں کے بل گر گیا۔

''ڈک! پولیس کو بلاؤ۔'' اندر موجود عورت خوف زدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''یہ کام تم کرو، میں اسے دیکھتا ہوں... شاید اسے مصنوعی تنفس دینا پڑے۔''

دس منٹ بعد پرسی کے اوسان بحال ہوئے۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دو پولیس والے اس کے بولنے کے منتظر تھے، تب پرسی نے پُرجوش انداز میں کہنا شروع کیا۔

''میں نے وہاں دو افراد کو دیکھا۔ وہ جنگل سے باہر آرہے تھے۔ وہ لڑکی مدد کے لیے پکار رہی تھی لیکن وہ لوگ نیچے تھے اس لیے اندھیرے میں، میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔''

''کیا تم ہمیں وہ جگہ دکھا سکو گے؟'' ان میں سے ایک پولیس والا بولا۔

''کیوں نہیں۔ وہ جگہ میری دیکھی بھالی ہے۔ ساری زندگی وہاں جاتا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر پرسی اپنی جگہ سے اٹھا اور خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ جائے واردات پر پہنچ چکے تھے۔

''وہ دیکھو... وہاں۔'' اس نے انگلی سے نیچے کی جانب

ماڈرن عقل

☆ وقت بچانے کے لیے محبت ہمیشہ پہلی نگاہ میں کرو... نکاح کے بعد۔

☆ اب تو گھڑیاں بھی سات گھنٹوں کا دن، پانچ دنوں کا ہفتہ اور بڑھاپے کی پینشن مانگتی ہیں۔

☆ وہ ہابی نہیں جو ڈیوٹی ہو۔ وہ ڈیوٹی نہیں جو ہابی ہو۔

☆ ہم بچوں کو بالغ سمجھنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ بچے ہمیں نابالغ نہ سمجھیں۔

☆ جب پہلی عورت پیدا ہوئی، مرد سویا ہوا تھا۔ اسے رائے دینے کا موقع ہی نہ ملا۔

☆ بیسویں صدی کے اواخر میں دنیا اٹامک درندوں کا جنگل بن گئی ہے۔

اشارہ کیا۔ ''میں نے وہاں دو سائے دیکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ لڑ رہے تھے۔ تم وہاں جا کر دیکھو... شاید وہ لڑکی اب بھی زندہ ہو۔''

ان میں سے ایک پولیس والے نے اپنے ساتھی کی جانب دیکھا، جیب سے ٹارچ نکالی اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

''یہ کوئی عورت ہے۔'' ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ ''اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے... ہو سکتا ہے کہ یہ مر ہی چکی ہو!''

دس منٹ بعد مزید کمک وہاں پہنچ گئی اور پرسی کو ایک پولیس والے نے گھر پہنچا دیا۔ اسے بتایا گیا کہ وہ اس سے اگلے روز بیان لیں گے کیونکہ اس کیس میں اس کی گواہی بہت اہم ہے لیکن فی الحال اسے آرام کی ضرورت ہے۔ کانسٹیبل کو واپس جانے کی جلدی تھی لیکن پرسی کو یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے اپنے فلیٹ کی چابیاں کہاں رکھی تھیں۔ ان دونوں کی آوازیں سن کر مسز فلاور بھی باہر آگئی اور پولیس کانسٹیبل کو دیکھتے ہی غضب ناک انداز میں بولی۔ ''تم اس کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟''

''میم! کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں صرف اسے گھر تک چھوڑنے آیا ہوں۔''

''تم اسے بالکل تنگ نہیں کرو گے۔ یہ بالکل بے ضرر انسان ہے۔''

اس دوران پرسی نے بے دھیانی میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابیاں نکال لیں۔ کانسٹیبل اسے لے کر اندر آیا

اور بستر پر لٹاتے ہوئے بولا کہ اب وہ سو جائے۔ پولیس صبح کسی وقت اس کا بیان لینے آئے گی۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے اسے پرسی کی آواز سنائی دی جو غنودگی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ''کیا؟'' بعد میں اس نے انسپکٹر انچارج کو بھی یہی بتایا کہ اس وقت تک وہ بالکل بھول چکا ہے کہ کچھ دیر پہلے کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

دوسرے دن انسپکٹر علی الصباح سراغ رساں سارجنٹ کے ساتھ پہنچ گیا اور اسے یہ جان کر خاصی حیرت ہوئی کہ پرسی نے واقعات کی ترتیب بتانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ اس نے تفصیل سے اس جنگل اور پارک کے بارے میں اپنی محبت کا اظہار کیا اور بتایا کہ وہ بارہ سال کی عمر سے وہاں جا رہا ہے۔ اس پہاڑی اور اس جگہ کی بھی نشان دہی کی جہاں سے وہ جوڑا برآمد ہوا تھا اور یہ بھی بتایا کہ لڑکی کے ممکنہ قاتل نے کہاں تک اس کا تعاقب کیا۔

''یہ بھی اچھا ہوا کہ تم اس سے کافی آگے نکل آئے اور ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں تم دونوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ مخالف سمت بنے ہوئے مکانوں کی کھڑکی سے بھی تم نظر آ سکتے تھے۔ شاید اسی لیے اس نے تمہیں مارنے کا ارادہ بدل دیا۔ ایسے مجرم چشم دید گواہوں کو کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑتے۔''

''ہاں۔ شاید اسی لیے وہ کسی دوسری سمت میں نکل گیا۔'' پرسی نے اس کی تائید کی۔

''کیا تم اس کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو سکے؟''

''نہیں، اس نے اپنے بازو اور کندھے اوپر اٹھا رکھے تھے اور جھکنے کے انداز میں دوڑ رہا تھا۔''

''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا؟ ذرا ذہن پر زور دو... یاد کرنے کی کوشش کرو۔''

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد پرسی بولا۔ ''تم نے مجھ سے کیا پوچھا تھا؟''

''کیا تم اس کا چہرہ دیکھ سکے تھے؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور بات جو تمہارے ذہن میں آ رہی ہو؟'' انسپکٹر نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

''ہاں... میں نے اس بارے میں سوچا تھا۔'' پرسی پُرخیال انداز میں بولا۔ ''اس کا دوڑنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ مجھے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگوں کو ڈرا کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر مجھے کسی کی یاد آ گئی۔''

''وہ کون ہو سکتا ہے؟ سوچ کر بتاؤ۔''

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ انسپکٹر کو ڈر تھا کہ کہیں پرسی اس سے دوبارہ نہ پوچھ بیٹھے کہ اس نے کیا سوال کیا ہے۔ بالآخر پرسی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کوشش کر چکا ہوں لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔''

''ایک بار پھر اچھی طرح کوشش کرو۔ ممکن ہے کہ کچھ یاد آ جائے۔''

''نہیں، تم مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں، تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔''

انسپکٹر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پرسی کے ساتھ بچوں جیسا سلوک کر کے اس کے وقار کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے پرسی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آئی ایم سوری! بہرحال، تم اس بارے میں سوچتے رہو کہ وہ شخص کون ہو سکتا ہے۔ ان فلیٹوں میں رہنے والا یا کوئی ایسا شخص جسے تم نے شاپنگ کے دوران یا بینک یا پوسٹ آفس وغیرہ میں دیکھا ہو۔''

''نہیں، میں فلیٹ میں رہنے والوں کو نہیں جانتا اور نہ ہی کبھی بینک یا پوسٹ آفس گیا۔'' پھر اسے کچھ خیال آیا اور اس نے چونک کر پوچھا۔ ''وہ عورت کون تھی؟''

''وہ جوان عورت تھی بلکہ ہم اسے لڑکی بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ لڑکپن سے ہی اس کھیل میں شریک تھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا... کیسا کھیل؟''

''وہ ایک طوائف تھی اور اینجل کورٹ سے یہاں گھومنے کے لیے آئی تھی۔ اب تو تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے؟''

پرسی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اینجل کورٹ کا نام اس کے لیے اجنبی تھا۔

''یہ فلیٹ یہاں سے دو سو گز کے فاصلے پر ہیں۔'' انسپکٹر نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی کی موت چھرا گھونپنے سے واقع ہوئی۔ خیر، میں تمہارے لیے یہ نوٹ بک اور قلم چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تمہیں کچھ یاد آ جائے تو اس پر لکھ لینا۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' پرسی نے برہمی سے کہا۔ ''میرے پاس کاغذ پنسل ہے۔ میں کوئی فقیر نہیں ہوں۔''

''یقیناً ہوں گے لیکن یہ چیزیں میں صرف تمہاری آسانی کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں ایک، دو دن بعد آؤں گا۔ شاید اس وقت تک تمہیں کچھ یاد آ جائے۔''

انسپکٹر دوبارہ اکیلا نہیں آیا بلکہ اس بار سپرنٹنڈنٹ کولنز

ھی اس کے ہمراہ تھا۔ البتہ ان لوگوں نے آنے کے لیے صحیح ن کا انتخاب نہیں کیا۔ اس روز صفائی کرنے والی خادمہ مسز ربن آئی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کی گفتگو کے دوران ویکیوم کلینر چلنے اور برتن دھونے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ پرسی نے اس مداخلت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے کسی اور وقت آنے کے لیے نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ بہت مصروف ہے اور میرے لیے دوبارہ وقت نہیں نکال سکتی۔''

''تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' کولنز نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں بھی ہاؤس کیپر تھی اور میں ان آوازوں کو سننے کا عادی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکالے اور انہیں پرسی کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ان لوگوں کی تصویریں ہیں جو اس علاقے میں ریپ اور قتل کی وارداتوں میں ملوث رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو سزا ہو چکی ہے اور کچھ مفرور ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم باری باری ان تصویروں کو غور سے دیکھو۔ ممکن ہے کہ اس طرح تمہیں کچھ یاد آ جائے۔''

پرسی نے وہ تصویریں اٹھائیں اور انہیں ڈائننگ ٹیبل پر پھیلا کر بیٹھ گیا اور ایک ایک تصویر پر اپنی انگلی رکھ کر دیکھنے لگا۔ وہ دسویں تصویر پر جا کر رک گیا۔ اس نے ایک بار پھر تمام تصویروں کا جائزہ لیا اور بلا جھجک آٹھویں تصویر پر انگلی رکھ دی۔ ''یہ تصویر کسی حد تک ملتی جلتی ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتا کہ اسے کہیں دیکھا ہے یا اسے جانتا ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سڑک پر چلتے ہوئے اس سے سامنا ہوا ہو۔''

کولنز نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔ ''ایک بار پھر ذہن پر زور دو کہ تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ کیا تم اسے جانتے ہو... اس کا کیا نام ہے؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ میں اسے نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ میں نے کہیں راہ چلتے اسے دیکھا ہو۔''

کولنز نے وہ تصویر اس کے حوالے کی اور کہا۔ ''اب ہم چلتے ہیں۔ تم اس تصویر کو وقفے وقفے سے دیکھتے رہو اور اگر کچھ یاد آ جائے تو اسے لکھ لینا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ جیسے ہی کوئی بات ذہن میں آئے مجھے فوراً فون کر دینا۔''

جب وہ دونوں جانے لگے تو انسپکٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بالکل بھی یقین نہیں ہے کہ ہم اس سے کچھ معلوم کر سکیں گے لیکن بعض اوقات بوڑھے آدمی بھی حیران کر دیتے ہیں۔ میں نے ایسا کئی بار ہوتے دیکھا ہے۔''

ان کے جانے کے بعد پرسی نے ایک بار پھر اس تصویر پر اپنی نظریں جما دیں۔ دس منٹ بعد ہی وہ اونگھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھ مسز ہاربن کی آہٹ سے کھلی جو ویکیوم کلینر لیے اس کے سر پر سوار تھی۔ اس نے تصویر اٹھائی اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کسی اہم کام میں مصروف ہو۔ اس نے دو تین بار تصویر کو غور سے دیکھا۔ ویکیوم کلینر کی آواز سے اس کی یک سوئی میں خلل پڑ رہا تھا۔ اس نے نوٹ بک سے ایک صفحہ نکالا اور کچھ لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ عرصہ ہوا کہ اس نے اپنے دستخط کرنے کے علاوہ کچھ نہیں لکھا تھا۔ ویسے بھی وہ لکھنے کے معاملے میں خاصا سست واقع ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ یہ تحریر لکھ پایا۔ ''یہ تصویر دیکھ کر مجھے اپنا بیٹا کیون یاد آ گیا... گو کہ میں نے اسے برسوں سے نہیں دیکھا لیکن وہ آدمی بالکل کیون کی طرح ہی دوڑ رہا تھا۔''

مسز ہاربن نے کلینر کا سوئچ آف کیا اور جیب سے کپڑا نکال کر صفائی کرنے لگی۔ چند منٹوں بعد اس نے سسکیوں کی آواز سنی۔ عام طور پر وہ دوسروں کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرتی تھی لیکن اس کے کان بہت تیز تھے۔ اس نے کچھ بے ترتیب جملے سنے۔ ''یہ میں کیا کر رہا ہوں... وہ کون لوگ تھے جو یہاں آئے... میں نہیں جانتا... وہ آدمی کیوں دوڑ رہا تھا؟ جو لوگ یہاں آئے، وہ کیا چاہ رہے تھے... مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا چاہ رہے تھے... مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔''

پرسی نے وہ کاغذ اٹھایا اور اسے موڑ توڑ کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔

مسز ہاربن نے زندگی میں پہلی بار اپنی عادت کے خلاف کوئی کام کیا۔ وہ پرسی کے پاس آئی۔ اس کی کمر میں اپنا بازو ڈالا اور اسے کرسی سے اٹھا کر بستر تک لے گئی۔

''تم بہت تھک چکے ہو اور تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں بھی اپنا کام ختم کر کے جا رہی ہوں اس لیے اب تمہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ میں پردے برابر کر دوں گی تاکہ تم آرام سے سو جاؤ۔''

اس نے بیڈروم کا دروازہ بند کیا اور لیونگ روم میں پڑا ہوا وہ کاغذ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا پھر اس نے میز پر سے کولنز کا کارڈ اٹھایا اور لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل سے نیچے چلی آئی۔ جیب سے اپنا موبائل نکالا اور سپرنٹنڈنٹ کولنز کو فون کرنے لگی۔ وہ ایسا کرنے میں حق بہ جانب تھی کیونکہ کئی برس پہلے وہ خود بھی جوانی میں اس جنگل میں ایسے ہی گھناؤنے تجربے سے دوچار ہو چکی تھی۔

گرداب

اسما قادری

ساتویں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بااثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنیٰ ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظامِ قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اُس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

''کیا مطلب؟ کہاں گئی وہ؟'' لفظ ''لاپتا'' نے اس کے ذہن میں بھونچال بپا کر دیا۔ ایک پندرہ سالہ لڑکی کے لاپتا ہونے کا یہ مطلب تو نہیں لیا جاسکتا کہ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح گھر کا راستہ بھول گئی تھی یا کہیں بھیڑ بھاڑ میں گم ہوگئی ہو۔ اس کے لاپتا ہونے کا مطلب تھا کہ اسے کسی نے غائب کر دیا ہے یا پھر وہ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔ یہ دونوں ہی صورتیں نہایت تشویش ناک تھیں۔

ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو اگر کسی نے غائب کیا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی گہری سازش تھی۔ سجاد رانا کو کسی کام سے روکنے یا اس سے کوئی مطالبہ منوانے کے لیے ایسی حرکت کی جاسکتی تھی جبکہ دوسری صورت بھی بعید از امکان نہیں تھی۔ شوخ و شنگ، بھولی بھالی شینا عمر کے جس حصے سے گزر رہی تھی، وہ بہت نازک تھا۔ اس عمر کی لڑکیوں کو راستے سے بھٹکا دینے والے بہت ہوتے ہیں۔

''وہ کہاں گئی، کچھ پتا نہیں چل رہا۔ مجھے تو خود ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بارے میں بتایا گیا ہے ورنہ تمہارے ماموں اور سجاد دونوں نے ہی مجھ سے یہ بات چھپائی تھی۔ اب بھی انہوں نے مجھے مریم کی وجہ سے اطلاع دی ہے۔ شینا کے غائب ہونے کی وجہ سے پریشانی میں اس کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ میں اس وقت سجاد کے گھر میں مریم ہی کے پاس ہوں۔ مریم کو ڈاکٹر کوئی دوا دے کر گیا ہے جس کی وجہ سے وہ سوگئی ہے۔ میرا دل اکیلے میں بہت گھبرا رہا تھا اس لیے میں نے تمہیں فون کر لیا۔'' اسے ان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''اچھا، آپ پریشان مت ہوں۔ میں خود وہاں آتا ہوں پھر مل کر اس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔'' اس نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' ان پر اس کی بات کا فوری اثر ہوا۔ اس سے ان کی جذباتی وابستگی اتنی شدید تھی کہ وہ سجاد رانا سے بھی زیادہ اس پر بھروسا کرتی تھیں۔ اس نے دو تین مزید تسلی آمیز جملے کہے اور پھر فون بند کر کے سجاد رانا سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین کوششوں کے بعد انہوں نے اس کی کال ریسیو کر لی۔

''میں یہ کیا سن رہا ہوں سجاد بھائی... شینا کیسے لاپتا ہو گئی؟ آپ کہاں ہیں اور مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' ان کی آواز سن کر اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

''تمہیں یقیناً ممی نے فون کیا ہوگا۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اطلاع نہیں دی تھی کہ تم پریشان ہو جاؤ گے۔'' وہ یقیناً پریشان تھے لیکن اپنے لہجے کو سنبھالا ہوا تھا۔

''مجھے پریشان ہونا بھی چاہیے۔ میری بھتیجی صبح سے غائب ہے اور مجھے خبر بھی نہیں دی آپ نے۔'' اس وقت وہ اے سی شہریار نہیں بلکہ ایک چچا تھا جو اپنی بھتیجی کے غائب ہونے پر بری طرح پریشان تھا۔ ''مجھے تفصیل سے یہ بتائیں کہ ہوا کیا تھا؟ آخر اس طرح شینا کیسے غائب ہو سکتی ہے؟'' سجاد رانا نے اس کی بات کا جواب دینے میں کچھ توقف کیا تو اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کر ڈالا۔

''میری سمجھ میں خود بھی کچھ نہیں آرہا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ صبح وہ ساڑھے دس بجے کے قریب ڈرائیور کے ساتھ اسکول کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ آج اس کے اسکول میں کوئی فنکشن تھا اس لیے اسے اسکول ٹائمنگ سے ہٹ کر دیر سے وہاں پہنچنا تھا۔ میں تو صبح ہی گھر سے نکل چکا تھا۔ مریم گھر پر تھی۔ پونے بارہ بجے کے قریب اس کا مجھے فون آیا کہ فوراً گھر پہنچیں ایمرجنسی ہے۔ میں گھر پہنچا تو مریم، ڈرائیور پر چیخ چلا رہی تھی۔ اس نے دوسرے ملازموں سے اس کے ہاتھ پیر بندھوا دیے تھے۔ میں نے اس سے اس صورتِ حال کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ شینا کہیں غائب ہو گئی ہے اور یہ اطلاع لے کر آنے والا ڈرائیور ہے۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ صبح جب وہ شینا کو لے کر گھر سے نکلا تو راستے میں اس کے گھر سے اس کی بیوی کا فون آگیا۔ بیوی نے اسے بتایا کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے اور گھر میں اس کی دوا موجود نہیں۔ ڈرائیور کے مطابق اس کی ماں دمے کی مریضہ ہے جس کی حالت کسی بھی وقت اچانک بگڑ جاتی ہے۔ پچھلے روز اس کی بیوی نے اسے یاد دلایا تھا کہ ماں کی دوائیں ختم ہو چکی ہیں مگر وہ تھکا ہوا ہونے کی وجہ سے جلدی سو گیا اور ماں کی دوا نہیں لا سکا۔ اب جو اسے فون پر یہ اطلاع ملی کہ ماں کی طبیعت خراب ہو رہی ہے اور گھر پر دوا بھی موجود نہیں تو وہ پریشان ہو گیا۔ شینا نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے تو اس نے اصرار کیا کہ ڈرائیور اسے اسکول پہنچانے سے قبل اپنی ماں کو اس کی دوائیں پہنچائے۔ پریشانی کی وجہ سے اس نے شینا کی بات مان لی اور راستے میں پڑنے والے ایک میڈیکل اسٹور سے دوائیں اور ان ہیلر... خرید کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا گھر لاہور کے جس علاقے میں ہے، وہاں گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ کوئی گاڑی اندر نہیں لے جائی جاسکتی۔ چنانچہ اسے شینا کے ساتھ گاڑی کو اپنے گھر سے دور چھوڑنا پڑا۔ گھر پہنچ کر ماں کو ان ہیلر

دینے اور اس کی حالت سنبھلنے میں اسے دس بارہ منٹ کا وقت لگ گیا۔ دس بارہ منٹ بعد وہ واپس اس جگہ آیا جہاں گاڑی کھڑی کی تھی تو اس نے دیکھا کہ شینا گاڑی میں نہیں۔ اس نے اردگرد کے علاقے میں اسے تلاش کیا لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں شینا جاسکتی۔ میں نے خود جا کر اس علاقے کا معائنہ کیا ہے۔ واقعی وہاں تو کوئی دکان وغیرہ تک نہیں کہ یہ سوچا جاسکتا کہ شینا کسی چیز کی خریداری کے لیے ہی گاڑی سے اتری ہو۔ بہرحال، ڈرائیور کے مطابق اس نے اپنے طور پر شینا کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر مزید دس پندرہ منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ اگر شینا کسی ضرورت کے تحت گاڑی سے اتر کر کہیں گئی ہے تو اس دوران میں واپس آجائے لیکن جب وہ نہیں آئی تو وہ اس کی گم شدگی کی اطلاع لے کر گھر پہنچ گیا۔ مریم نے اسے اس کی بے پروائی پر پہلے خوب ڈانٹا ڈپٹا پھر اسکول فون کر کے معلوم کیا کہ شینا وہاں تو نہیں پہنچی ہے۔ مریم کو یقین تھا کہ شینا ضرور اسکول پہنچ چکی ہوگی۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ ڈرائیور کو دیر ہو رہی ہے تو اس نے کسی ٹیکسی وغیرہ کے ذریعے اسکول پہنچنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا لیکن جب اسکول سے یہ بتایا گیا کہ شینا وہاں نہیں آئی ہے تو مریم کو صحیح معنوں میں پریشانی ہوئی اور اس نے مجھے فون کر کے گھر بلوا لیا۔ اس وقت کے بعد سے اب تک میں مسلسل شینا کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کہیں سے کچھ بھی پتا نہیں چل رہا۔'' سجاد رانا نے اسے پوری تفصیلات سے آگاہ کر ڈالا۔

''میں ابھی نکل رہا ہوں یہاں سے۔ جلد ہی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' ان کی پوری بات سننے کے بعد اس نے انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''رہنے دو شیری! تم کہاں رات کے وقت پریشان ہو گے۔ یہاں ہم سب مل کر کوشش کر تو رہے ہیں شینا کو ڈھونڈنے کی۔'' سجاد رانا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''میں یہاں رہ کر اور بھی زیادہ پریشان رہوں گا۔ ویسے بھی صبح مجھے لاہور پہنچنا ہی تھا۔ دھماکے کے زخمیوں کی عیادت کے لیے لاہور آنا میرے شیڈول میں شامل تھا۔ وقت سے کچھ پہلے پہنچ جاؤں گا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔'' وہ واقعی صحیح کہہ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو وہ شینا کے غائب ہونے کی اطلاع سن کر یہاں آرام سے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ شینا، سجاد رانا کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے سب ہی کی آنکھ کا تارا تھی اور وہ خود بھی اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ یہ شدید محبت ہی تھی جس کی وجہ سے اسے اپنا لاہور جانا بہت ضروری محسوس ہو رہا تھا ورنہ جس لڑکی کا باپ ڈی آئی جی، نانا آئی جی اور دادا ایم این اے ہوں اس کی تلاش میں کون سی کسر باقی رہنے دی گئی ہوگی... یہ بات وہ خود بھی خوب سمجھتا تھا۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ تمہارے آنے سے مریم اور ممی کو تھوڑا سا حوصلہ مل جائے گا۔'' اسے اپنے ارادے میں اٹل دیکھ کر سجاد رانا نے جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے بیٹ مین کو اپنا سامان پیک کرنے کا حکم دیا اور عبدالمنان کو فون کر کے اپنی فوری طور پر لاہور روانگی سے متعلق اطلاع دینے کے بعد چند ضروری ہدایات دینے لگا۔ عبدالمنان کو یقیناً پروگرام کی اس تبدیلی پر حیرت ہوئی ہو گی تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اس کی ساری ہدایات سنتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔ اس دوران اس کا ضروری سامان پیک کیا جا چکا تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ لاہور کی جانب رواں دواں تھا۔

☆☆☆

دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی وہ چپ چاپ ان تینوں کو تیار ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ملکہ، رانی اور نگار کے نام سے پہچانی جانے والی تینوں ہستیاں آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے تیار ہو رہی تھیں۔ تینوں نے خوب بھڑکیلے اور چمک دار اور قدرے فٹنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس قسم کے کپڑے پہننے کا ایک ہی سبب تھا کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے، سو وہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے بھرپور انتظام کرتی تھیں یا شاید کرتے تھے۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آتا تھا کہ ان کے لیے کون سا صیغہ استعمال کیا جائے۔ وہ معاشرے کے اس تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والی ہستیاں تھیں جنہیں اللہ نے مرد یا عورت کی واضح پہچان عطا کرنے کے بجائے ایک درمیانی سی حالت میں پیدا کر دیا تھا اور اب اس تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے وہ افراد اپنی تخلیق کے مقصد پر حیران پریشان زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنے کے لیے اپنی ذات کو تماشا بنا کر پھرتے تھے۔ صرف جنس کا تعین نہ ہو سکنے کے باعث وہ اچھے خاصے صحت مند، ہاتھ پیروں سے سلامت، عقل و شعور رکھنے کے باوجود معاشرے میں ایک عضوِ معطل کے طور پر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ انہیں نہ تو اپنوں کے درمیان رہنے کا حق حاصل تھا، نہ تعلیم و ہنر حاصل کرنے کا اور نہ ہی رزقِ حلال کمانے کے سیدھے راستوں پر چلنے کا۔ وہ سارے حقوق جو بہ طور انسان انہیں حاصل تھے، معاشرے نے

صرف اس وجہ سے ان سے چھین لیے تھے کہ قدرت نے انہیں ایک واضح شناخت دینے کے بجائے آزمائش بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ وہ تیسرا طبقہ معاشرے کے ان افراد کے لیے جو ہر طرح سے مکمل تھے، ایک آزمائش ہی تو تھا لیکن معاشرے نے ان سے جو سلوک روا رکھا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ مجموعی طور پر پورا معاشرہ اس آزمائش میں ناکام ہو چکا ہے۔ انہیں معاشرے سے کچھ ملتا تھا تو وہ تضحیک، تحقیر اور بھیک تھی۔ لوگ انہیں روزگار کے مواقع دینے کو رضامند نہیں ہوتے لیکن چند سکّے بھیک میں دینے کے بعد خود کو سرخ رو کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں بھی ہمدردی اور دردمندی کے احساس کے ساتھ بھیک دینے والے کم ہی تھے۔ زیادہ تر تو ان کی بھونڈی آوازوں، بےلوچ جسموں کی حرکت، تالیوں کی پٹاپٹ اور ڈھول کی ڈھپاڈھپ سے تیار کردہ بے ہودہ تماشے سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہی نوازتے تھے۔ ایک مختصر تعداد ان شوقین مزاجوں کی بھی تھی جنہیں دادِ عیش دینے کے لیے یہی آدھے ادھورے، معمّا جسم ہی بھاتے تھے۔ اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر آواز احتجاج بلند کرنے کے بجائے اس تیسرے طبقے کے زیادہ تر افراد نے معاشرے کے آگے سپر ڈال دینا ہی مناسب سمجھا تھا اور اپنی ایک الگ دنیا بسا کر سارا درد دل میں چھپائے ہنسی خوشی رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے ساتھ اس تنگ و تاریک گھر میں موجود افراد بھی ایسے ہی تھے جن کے ماں باپ نے تو انہیں جانے کیا نام دیے تھے لیکن وہ خود کو ملکہ، رانی، نگار کہلا کر خوش ہوتے تھے۔ اسے بھی یہاں شہزادی کے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ ایسی شہزادی کے عہدے پر جس کے پاس کوئی اختیار و سہولت نہیں تھی اور وہ ان کے ساتھ جا کر ڈھول پیٹتی تھی، تب کہیں جا کر وہ چند روپے ہاتھ آتے تھے جن کے سہارے زندگی کی گاڑی کو گھسیٹا جا سکے۔

''اے شہزادی! تو کیا کاہلوں کی طرح بیٹھی منہ تک رہی ہے... اٹھ کر تیار کیوں نہیں ہوتی؟'' اسے بہت دیر سے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر ملکہ نے اسے ٹوکا۔ وہ خود آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ اپنی گردن سے ذرا نیچے تک آئے بالوں میں اس نے نقلی بالوں کی چٹیا گوندھی تھی اور اب اس چٹیا میں زرد اور سنہری رنگ کا پراندہ ڈال رہی تھی۔

''ہاں ہاں، جلدی اٹھ جا۔ دیکھ آج میں نے تیرے لیے یہ سرخ رنگ کا جوڑا نکالا ہے۔ تو جلدی سے اٹھ کر کپڑے بدل لے پھر مجھے تیرا میک اپ بھی کرنا ہوگا۔'' رانی نے بھی ملکہ کا ساتھ دیتے ہوئے اسے ٹوکا مگر وہ یونہی دیوار سے ٹیک لگائے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

''چل اٹھ جانا... کیوں نخرے سوجھ رہے ہیں آج تجھے؟ خوامخواہ ہمیں بھی دیر کروائے گی۔ اچھی خاصی شام پڑ گئی ہے۔ میں نے صبح راؤنڈ لگا کر دو شادی والے گھر تاڑ لیے تھے۔ اب تیار ہو کر سیدھے وہیں جانا ہے مگر تو تیار تو ہو...'' رانی اسے لیکچر سناتے ہوئے تھوڑا سا جھنجلا کر بولی۔

''شہزادی کو رہنے دو۔ آج یہ میرے ساتھ رہے گی۔'' اس سے قبل کہ شہزادی ان لوگوں کے اصرار پر اپنی جگہ چھوڑ کر تیار ہونے کے لیے اٹھتی، کمرے میں ایک آواز گونجی۔ یہ آواز ان سب کے گرو الماس کی تھی۔

''لے جانے دیں نا گرو جی شہزادی کو ہمیں اپنے ساتھ۔ آج بڑی کمائی کا چانس ہے۔ شہزادی ساتھ ہوئی تو زیادہ پیسے ملیں گے۔'' رانی نے ٹھنک کر فرمائش کی۔

''کیوں، تو اپنا سارا ہنر بھول گئی ہے کیا جو لوگوں نے تجھ پر نوٹ نچھاور کرنے چھوڑ دیے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو میں تجھے اپنے ڈیرے سے چلتا کرتی ہوں۔ تیری جگہ کوئی اور آجائے گا۔'' گرو نے فوراً اسے جھاڑا۔

''ایسی کوئی بات نہیں گرو جی! رانی میں ابھی بڑا دم باقی ہے۔ میں تو بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ شہزادی بڑا اچھا ڈھول بجاتی ہے۔ اس کے ڈھول کی تھاپ پر میں دل سے ناچتی ہوں۔'' رانی نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

''کوئی بات نہیں، آج نگار ڈھول بجا لے گی۔ پہلے بھی تو یہی بجاتی رہی ہے اور تم لوگ اسی کے ڈھول پر ناچ گا کر کماتی رہی ہو۔ آج شہزادی سے مجھے کام ہے اس لیے اسے روک رہی ہوں۔ اگر تم کچھ کم بھی کما کر لائیں تو میں کچھ نہیں کہوں گی۔'' گرو نے گویا سارا مسئلہ ہی حل کر دیا پھر شہزادی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تو تیار ہو جا... آج تجھے میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے۔'' حکم صادر کرنے کے بعد اس نے کمرے میں مزید رکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

شہزادی کو گرو سے سخت نفرت تھی اور اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی حکم مانے مگر ان بےضرر وجودوں کے درمیان گرو کی حیثیت ایک ظالم حکمران کی تھی جو اپنے حکم سے ذرا سی بھی سرتابی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی یہاں آمد کے ابتدائی عرصے میں گرو کے بڑے مظالم سہہ چکی تھی اس لیے اب بھی دل نہ چاہتے ہوئے اس کے حکم پر عمل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگار نے اس کی تیاری میں مدد دی۔ اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ نگار کے کیے میک اپ نے اسے بالکل بدل کر رکھ دیا تھا اور آئینے میں نظر آتا عکس اسے اپنے

تبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْھَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا

سید محمد علی قادری

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

آپ کیلئے کون سا سال' مہینہ' دن بہتر رہے گا؟ محبت' دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ماہرِ فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

اس کے علاوہ قادری صاحب آپکے دنیاوی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اسماء الحسنٰی سے پیش کرتے ہیں۔

☆ میں کاروبار کرنا چاہتی ہوں' بیرونِ ملک کاروبار کرنا مناسب رہے گا یا یہیں کوئی کاروبار کروں؟ شادی کب تک ہوگی؟ مبارک نگینہ کون سا ہے؟ (سمیعہ ناز' کراچی)

● بٹی سمیعہ ناز! ماشاء اللہ آپ کے اندر بہت صلاحیتیں ہیں' آپ گھریلو اشیاء سے متعلق کوئی کاروبار کریں تو بہت کامیابی ملے گی' شادی کا امکان جنوری 2011ء تک ہے۔ مبارک نگینہ نیلم ہے' سیدھے ہاتھ کی کسی انگلی میں پہن سکتی ہیں۔

☆ میری شادی کب ہوگی؟ رشتے آتے ہیں مگر بات نہیں بنتی' کب تک شادی کی اُمید ہے؟ (فرح ناز' کراچی)

● آپکی شادی میں وقتی دُشواریاں ہیں' اب صورتِ حال بہتر ہو رہی ہے' شادی کا امکان جون 2010ء تک ہے۔

☆ میرا نام اصغر حسین ہے میں اپنا نام تبدیل کرنا چاہتا ہوں' میرے لیے کون سا نام بہتر رہے گا؟ (اصغر حسین' لاڑکانہ)

● بیٹا بلوغت کے بعد نام تبدیل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا' محنت کریں انشاء اللہ کامیابی ملے گی۔

☆ قادری صاحب! میرے شوہر اپنے گھر والوں کے کہنے میں تھے مجھ پر بہت ظلم کرتے تھے' میں گھر کا سارا کام کرتی تھی مگر پھر بھی میری کوئی عزت نہیں تھی' آپ سے لوح اور مبارک نگینہ لیا' وظیفہ پڑھا' اب اللہ کا شکر ہے' شوہر میرا خیال رکھنے لگ گئے ہیں' گھر والوں کے رویے میں بھی بہت تبدیلی آئی ہے' اٹھتے بیٹھتے آپ کو دعائیں دیتی ہوں' لوح کا کیا کرنا ہے؟ (فاطمہ بتول' ملتان)

● بٹی! لوح کو اب ٹھنڈا کروادیں' بس اپنے حسنِ سلوک سے سب کے دل جیتیں' وظیفہ کی ایک تسبیح ابھی پڑھتی رہیں' شوہر کے آرام اور ضروریات کا بھی خیال رکھیں' اللہ تعالیٰ تم کو ازدواجی سکون عطا فرمائے' نماز کی پابندی کا خیال رکھیں۔

☆ قرض کے لیے لوح بنوائی تھی' اللہ کا شکر ہے میرا بانڈ لگ گیا اور میرا سارا قرض اُتر گیا' اب لوح کا کیا کروں؟ (نفیسہ کنول' لانڈھی)

● بٹی! اللہ کا شکر ادا کریں' لوح ٹھنڈی کروادیں' نماز کی پابندی رکھیں۔

☆ قادری صاحب! میری منگنی گھر والوں نے زبردستی کہیں اور کردی تھی جبکہ میں کسی اور کو چاہتی تھی' کوئی اُمید نظر نہیں آرہی تھی' آپ سے لوح بنوائی' وظیفہ پڑھا' اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ لڑکے والوں نے خود ہی منگنی توڑ دی اور میری منگنی اب میری پسند سے ہو رہی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ! لوح کا کیا کرنا ہے؟ (بینش' لاہور)

● بٹی! لوح کو اب ٹھنڈا کروادیں' ایک تسبیح نکاح ہونے تک جاری رکھیں' نماز کی پابندی رکھیں۔

O.....O.....O

محمد علی قادری: A-911' سیکٹر 11-B' نارتھ کراچی' نزد ٹیلی فون ایکسچینج' کراچی۔
موبائل: 0333-2105914
E-mail:
mashal_e_raah@yahoo.com /
mashal_e_raah1@hotmail.com

بجائے کسی اور کا محسوس ہو رہا تھا۔

''ہاں بھئی شہزادی! تیار ہو گئی تو؟'' ابھی وہ آئینے میں اپنا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ گرو نے پیچھے سے آکر پوچھا۔ اس نے محض اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''چل تو پھر نکل چلیں۔ ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔'' گرو نے کہا تو وہ اس کے پیچھے چل پڑی مگر یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ انہیں کہاں جانا ہے اور کون ان کا انتظار کر رہا ہے؟ اس کا یہی خیال تھا کہ گرو بھی اسے کسی خوشی کے گھر میں کمائی کے خیال سے لے جا رہا ہے۔ ویسے یہ بات کچھ خلافِ معمول تھی۔ گرو عموماً گھر میں ہی رہتا تھا۔ کمانے دھمانے کی ذمے داری اس کے سر پر نہیں تھی۔ ہاں اگر کہیں کوئی بڑا فنکشن ہو رہا ہو تو وہ خود اپنی ٹیم کے ساتھ نگرانی کے لیے ضرور جاتا تھا۔ آج نہ جانے اسے کہاں جانا تھا کہ اس نے باقی ٹیم کو ساتھ لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ دل ہی دل میں الجھتی وہ گرو کے پیچھے چلتی رہی۔ پتلی پتلی گلیوں میں سے گزر کے جہاں جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر لگے تھے، وہ دونوں کھلی جگہ پر پہنچے۔ یہ جگہ مین روڈ تو نہیں تھی لیکن یہاں سے رکشا اور ٹیکسی وغیرہ آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس وقت بھی گرو نے ہاتھ دے کر ایک خالی ٹیکسی کو روکا۔

''کدھر جانا ہے سوہنٹریوں؟'' ان کے قریب رکنے کے بعد ٹیکسی والے نے معنی خیزی سے پوچھا۔ یقیناً ان انوکھی سواریوں کو دیکھ کر اسے تفریح سوجھ رہی تھی۔

''تم چلو تو سہی، جگہ کا بھی بتا دیں گے۔'' گرو نے اس کے لہجے کی پروانہ کرتے ہوئے خود ہی ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا اور نروس سی کھڑی شہزادی کو بھی ٹیکسی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت وہ عمر کے جس حصے میں تھا اسے اس طرح کے رویے سہنے کی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ وہ ان رویوں کو کسی خاطر میں لانا غیر ضروری سمجھتا تھا۔

''اب تو بتا دو کہ کہاں جانا ہے یا میں خود ہی اپنی مرضی سے کہیں لے چلوں؟'' ٹیکسی مین روڈ پر پہنچی تو ڈرائیور نے ایک بار پھر شوخی سے پوچھا۔

''ماڈل ٹاؤن چلو۔'' گرو نے جواب دیا۔

''اوہو، لگتا ہے کسی اونچی جگہ پروگرام ہے آج... جب ہی بڑے نخرے سے بات کر رہی ہو۔'' گرو کے لہجے کی مسلسل بے نیازی کو محسوس کرتے ہوئے ڈرائیور نے اسے چھیڑا۔

''ہمارے اونچی نیچی جگہ پروگرام کرنے سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟ تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔ جب ہم تمہاری ٹیکسی سے اتریں تو اس وقت اپنا منہ کھولنا۔ تمہیں تمہارا منہ مانگا کرایہ مل جائے گا۔'' گرو نے اس بار سختی سے اس کی بات کا جواب دیا لیکن وہ کافی ڈھیٹ انسان تھا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا پھر بیک ویو مرر میں شہزادی کی طرف دیکھ کر اسے آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے تیرا گرو تیرا سودا کرنے جا رہا ہے جب ہی اتنا مغرور ہو رہا ہے۔ ہاں بھئی، آج کل تو تمہاری قوم کے بھی بڑے دام چڑھے ہوئے ہیں اور تو تو ہے بھی زبردست مال۔'' اس کی یہ بے حجابانہ باتیں سن کر شہزادی نے جواب تو کوئی نہیں دیا لیکن منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی وقت ان کی ٹیکسی کے قریب سے ایک گاڑی گزری۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ اس کے لیے شناسا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ شناسا چہرے والے اس شخص کو آواز دیتی، گاڑی ٹیکسی کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکل چکی تھی۔ دوسری طرف یہاں ٹیکسی میں بھی صورتِ حال بدل گئی تھی۔ گرو کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کا رویہ ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا اور وہ نہایت غصے میں اسے ٹیکسی روکنے کا حکم دے رہا تھا۔

''اتنا غصہ اچھی بات نہیں۔ غصہ کرنے سے چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ تم تو پہلے ہی اچھی خاصی عمر کی ہو گئی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اتنی زیادہ جھریاں پڑ جائیں کہ یہ سرخی پاؤڈر کی تہ بھی بے کار جائے۔'' وہ ہنوز ان سے مستی کے موڈ میں تھا اس لیے گرو کے غصے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا لیکن گرو بھی کوئی معمولی شے نہیں، اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ اپنے بھدّے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے رکھنے کے باوجود اس میں عورتوں والی کمزوری کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ چنانچہ پیچھے سے ہاتھ ڈال کر ٹیکسی ڈرائیور کی گردن کو اپنی سخت اور کھردری انگلیوں کی گرفت میں لے کر جھٹکا دیتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''شرافت سے گاڑی روک دے ورنہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر میں تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔'' خرمستیوں میں مصروف ڈرائیور کو انگلیوں کی گرفت اور لہجے کی سنگینی نے سمجھا دیا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا ہے اس لیے مزید بنا کسی حیل وحجت کے ٹیکسی روک دی۔

''تو اس لائق تو نہیں کہ تجھے کچھ دیا جائے لیکن میں تجھے یہاں تک کا کرایہ دے ہی دیتی ہوں۔'' ٹیکسی رکنے کے بعد گرو نے فوراً نیچے اترتے ہوئے ڈرائیور سے کہا اور کھڑے کھڑے اپنے بڑے سے پرس کو ٹٹول کر اس میں سے کرائے کے پیسے ڈھونڈنے لگا۔ شہزادی ابھی تک حیران پریشان سی

ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن اس صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔

''اے شہزادی! اتر نیچے۔ کیا اس مسٹنڈے کے ساتھ جانے کا ارادہ ہے؟'' اسے یونہی بیٹھا دیکھ کر گرو نے اسے ڈپٹا تو اس نے لاک کھول کر اپنی طرف کا دروازہ کھولا لیکن ابھی نیچے اتر نہیں پائی تھی کہ ڈرائیور نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف جھک کر تیزی سے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ شہزادی کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اس کا درمیان میں رکھا ہوا ہاتھ دروازہ بند کرنے کی وجہ سے بُری طرح کچل گیا۔ ڈرائیور جو یقیناً دروازہ بند کرنے کے بعد اس سمیت ٹیکسی کو بھگا لے جانے کا ارادہ کر رہا تھا، اس چیخ پر ذرا سا بوکھلا گیا۔ گرو کے لیے یہ ذرا سا وقفہ ہی کافی تھا۔ اس نے ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے گھسیٹا اور دونوں ہاتھوں سے بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ ڈرائیور اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کے قریب سے گزرنے والی گاڑیاں اور اردگرد موجود لوگ اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ایک ہیجڑے کے ہاتھوں پٹنے کا نظارہ کرنے سے زیادہ دلچسپ کام بھلا اور کون سا ہو سکتا تھا۔

''میں ہیجڑا ہوں مگر تجھ جیسے پھوس کے بنے مردوں سے نمٹنا خوب آتا ہے مجھے۔ میں تو تیرا خون پی جاؤں گی۔'' ٹیکسی ڈرائیور کو مارنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کرخت آواز میں اس سے بولتا بھی جا رہا تھا۔

''چھوڑ دو بھئی۔ اسے جانے دو... دیکھو تمہاری ساتھی کے ہاتھ سے کتنا خون نکل رہا ہے۔ پہلے اسے دیکھو۔'' آخر ایک سمجھ دار بڑے میاں نے آگے بڑھ کر مداخلت کی اور ڈرائیور کی جان چھڑاتے ہوئے گرو کو شہزادی کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے ہاتھ سے واقعی بہت خون نکل رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کا حال دیکھتے ہوئے گرو نے ڈرائیور کو ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھر اس کی طرف لپکا۔ اپنے دوپٹے کو اس کے ہاتھ کے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور ایک دوسری ٹیکسی روک کر اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ٹیکسی والا سنجیدہ مزاج اور اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا۔ اس نے نہ تو ان دونوں کو گھور گھور کر دیکھنے کی کوشش کی اور نہ ہی الٹے سیدھے سوالات کر کے دماغ خراب کیا۔ بس خاموشی سے انہیں ماڈل ٹاؤن کی اس پرانی سی کوٹھی تک پہنچا دیا جس کا پتا گرو نے بتایا تھا۔ انہیں وہاں پہنچانے کے بعد وہ اپنا کرایہ وصول کر کے روانہ ہو گیا۔

گرو نے کوٹھی کے دروازے کے ساتھ لگا گھنٹی کا بٹن دبایا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

''کیا ہوا الماس! یہ بچی زخمی کیسے ہو گئی؟'' گیٹ کھولنے والے نے جو انہی جیسا تھا، شہزادی کے ہاتھ سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر فوراً پوچھا۔

''بس ایک خبیث آدمی ٹکرا گیا تھا، اس کی وجہ سے یہ مصیبت آگئی۔'' گرو خود شہزادی کے زخمی ہونے پر بڑا رنجیدہ تھا چنانچہ اس طرح دانت کچکچاتے ہوئے بتایا جیسے اس ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے دانتوں تلے پیس رہا ہو۔

''تم اسے لے کر اندر چلو تاکہ اس کی مرہم پٹی کی جا سکے۔'' اس کے مشورے پر گرو نے عمل کیا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر گرو نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ پر بندھا ہوا دوپٹا کھولنے لگا۔ دوپٹا کھلتے ہی ایک بار پھر خون کا اخراج شروع ہو گیا لیکن اس دوران انہیں یہاں بھیجنے والا فرسٹ ایڈ بکس لے کر آ گیا تھا۔ اس نے اور گرو نے مل کر شہزادی کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ لوگ سامان سمیٹ کر واپس فرسٹ ایڈ بکس میں رکھ رہے تھے کہ ایک لمبا چوڑا ادھیڑ عمر ہیجڑا کمرے میں داخل ہوا۔

''نمستے مہا گرو جی!'' گرو ہر کام چھوڑ کر فوراً اس کی قدم بوسی کے لیے پہنچا۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھی شہزادی نے کچھ چونک کر گرو کی طرف دیکھا۔

''جیتی رہ... میں نے جیسے ہی سنا کہ الماس پہنچ گئی ہے، میں فوراً تجھ سے ملنے چلی آئی۔'' گرو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مہا گرو نے کہا اور پھر شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ شہزادی ہے نا... جس کا تو نے مجھ سے ذکر کیا تھا؟''

''ہاں مہا گرو جی! مگر بدقسمتی سے ایک بدمعاش ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے یہاں آتے ہوئے اس کا ہاتھ شدید زخمی ہو گیا۔'' گرو الماس اپنے مہا گرو کو سارا قصہ تفصیل سے سنانے لگا۔ یہ سب سناتے ہوئے اس کے لہجے میں جو دکھ اور غصہ تھا، وہ شہزادی کو حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس نے گرو کو ہمیشہ خود پر غصہ کرتے ہوئے ہی دیکھا تھا، اب اپنے زخمی ہونے پر اس کے افسردہ اور غضب ناک ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''چل جانے دے... غصہ تھوک دے۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔'' مہا گرو نے ساری بات سننے کے بعد الماس کو پچکارا اور فرسٹ ایڈ بکس اٹھا کر باہر جاتے ہوئے اپنے دوسرے چیلے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اری او سونی! جا دودھ میں گلوکوز گھول کر لے آ۔ دیکھ تو

بچی کی رنگت کیسی پیلی پڑ گئی ہے۔ گلوکوز والا دودھ پی کر اس میں ذرا جان شان آجائے گی۔"

"ابھی لائی مہا گرو جی۔" سونی کے نام سے پکارا جانے والا ہیجڑا پھرتی سے کمرے سے باہر نکلا۔

"اب تو اس کی طرف سے بے فکر ہو جا الماس! سونی اس کا خیال رکھے گی۔ تو چل کر دوسرے کام دیکھ۔ تیری شہزادی آج رات اس کمرے میں مہمان بن کر رہے گی۔ سویرے واپس جاتے ہوئے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔" مہا گرو، الماس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد سونی دودھ کے گلاس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ شہزادی نے اس کے ہاتھ سے دودھ لے کر پی لیا۔ دودھ پینے سے اسے خاصی تقویت محسوس ہوئی۔

"تم اسی صوفے پر آرام سے لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہارے لیے کھانا لے آؤں گی، کھانا کھا کر تم آرام سے سو جانا۔" سونی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہزادی کو محسوس ہوا کہ اس نے باہر سے دروازے کی کنڈی بھی لگا دی ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے اس بات کی تصدیق کی۔ واقعی دروازہ باہر سے بند تھا اور وہ اسے کھول کر نہیں نکل سکتی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ایسا گرو کے اشارے پر کیا گیا ہوگا۔ گرو کو اس کے فرار ہونے کا خطرہ تو بہر حال لگا ہی رہتا تھا اس لیے وہ کسی بھی موقعے پر احتیاط کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی جب بھی وہ باہر نکلتی تھی تو ملکہ، رانی اور نگار اس پر خصوصی نظر رکھتی تھیں۔ وہ ان سب کے لیے ہی ناقابلِ اعتبار تھی جسے وہ اپنی نظروں کے پہروں میں رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی اس کے فرار کی راہ مسدود تھی چنانچہ وہ واپس صوفے پر آ بیٹھی اور پھر سونی کے مشورے کے مطابق اسی پر لیٹ کر آرام کرنے لگی۔ لیٹے لیٹے اس پر ہلکی سی غنودگی چھانے لگی لیکن اس غنودگی کے عالم میں بھی وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس کمرے سے باہر اچھی خاصی چہل پہل ہے۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی میں بہت سارے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شاید وہاں کوئی دعوت تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ گرو الماس اسے یہاں لانے کے بعد بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے کسی دعوت میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا تو اسے اس طرح ایک کمرے میں بند کیوں کر دیا تھا؟ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ یونہی سوتی جاگتی حالت میں سوچوں کے درمیان تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا اور اسے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ آہٹ کی آواز پر وہ چونک کر اٹھی۔ سونی ٹرے اٹھائے کمرے میں آرہی تھی۔ ٹرے لا کر اس نے میز پر رکھی اور بولی۔

"یہ تمہارا کھانا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد برتن ایسے ہی رہنے دینا اور خود آرام سے سو جانا۔ میں بعد میں آ کر برتن لے جاؤں گی۔ اس کمرے کے ساتھ اٹیچڈ باتھ روم بھی ہے۔ تمہیں اپنی کسی ضرورت کے لیے باہر نہیں نکلنا پڑے گا۔ پانی بھی میں اس بوتل میں بھر کر لے آئی ہوں۔ برف جما ہوا پانی ہے، بہت دیر تک ٹھنڈا ہی رہے گا۔"

اسے یہ ساری باتیں بتا کر وہ عجلت میں کمرے سے باہر نکل گئی اور حسبِ سابق دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ سونی کے جانے کے بعد اس نے ٹرے میں رکھے کھانے کا جائزہ لیا۔ چکن بریانی، مٹن کڑاہی اور فیرنی پر مشتمل اس کھانے کے ساتھ سلاد اور رائتے کا بھی اہتمام تھا۔ کھانا دیکھ کر اسے مزید یقین ہو گیا کہ کوٹھی میں کوئی دعوت ہو رہی ہے۔ ٹائم اچھا خاصا ہو چکا تھا اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی چنانچہ اٹھ کر غسل خانے میں گئی اور منہ ہاتھ دھو کر آنے کے بعد اللہ کا نام لے کر کھانا کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر ہاتھ دھونے غسل خانے گئی۔ اس وقت اس نے... بہ غور باتھ روم کا جائزہ لیا۔ سفید ٹائلز والے اس باتھ روم میں صرف پانی کی ایک بالٹی رکھی ہوئی تھی لیکن اس کی توجہ کا مرکز دیوار پر موجود وہ روشن دان تھا جس میں کوئی سلاخ وغیرہ نہیں لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ روشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اسے امید تھی کہ اگر وہ کسی طرح اس روشن دان تک پہنچ گئی تو اپنے دبلے پتلے وجود کو اس میں سے گزار کر باہر کود سکتی ہے۔ فرار کا ایک امکان نظر آنے کے بعد اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ باتھ روم سے باہر آئی اور کمرے کے دروازے سے کان لگا کر باہر کی سن گن لینے لگی۔ اس وقت باہر بالکل سناٹا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کوٹھی میں اس کے سوا دوسرا کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ کچھ دیر مزید سن گن لینے کے بعد وہ واپس باتھ روم پہنچی۔ روشن دان کی صورت میں نظر آنے والا فرار کا راستہ اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ تو اس روشن دان تک رسائی کا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس روشن دان کی دوسری طرف کیا ہے؟ وہاں سے کودنے کی کوشش میں وہ کسی کی نظر میں بھی آسکتی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کی مشکلات مزید بڑھ جاتیں۔ گرو الماس کا ظلم اس نے صرف دیکھا ہی نہیں، سہا بھی تھا اس لیے پکڑے جانے سے بے حد خوف زدہ تھی لیکن پھر آزادی کی خواہش ہر خوف پر غالب آگئی اور اس نے ایک

کوشش کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے روشن دان تک پہنچنے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ روشن دان فلیش ٹینکی کے عین اوپر تھا۔ یعنی وہ فلیش ٹینکی پر چڑھ کر اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن فلیش ٹینکی سے روشن دان کا فاصلہ دیکھتے ہوئے اسے یہ کام مشکل لگ رہا تھا مگر وہ کوشش کیے بغیر ہار نہیں ماننا چاہتی تھی، چنانچہ عمل کے لیے تیار ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے غسل خانے میں موجود بالٹی کو الٹ کر رکھا پھر اس پر پیر رکھ کر فلیش ٹینکی پر چڑھ گئی۔ اس مختصر سی جگہ پر کھڑا ہونا آسان نہیں تھا، دوسرے یہ ڈر بھی تھا کہ فلیش ٹینکی اس کا وزن سہارنے سے انکار کر کے زمین بوس نہ ہو جائے لیکن خیر گزری اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ٹینکی کی سطح پر بہت احتیاط سے پیر جماتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ ٹکا کر آہستہ آہستہ بلند کیے۔ جلد اس کی انگلیوں نے روشن دان کے چوکھٹے کو چھو لیا۔ انگلیاں چوکھٹے سے.... چھوئیں تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے ہاتھوں کو پوری طرح بلند کر کے چوکھٹ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

اب اس کے پاس روشن دان تک پہنچنے کی واحد صورت یہی تھی کہ اپنے بازوؤں کی قوت کو آزمائے اور اچھل کر روشن دان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے یہی کیا۔ اس کی یہ پہلی کوشش بس جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکی۔ اس کا جسم ذرا سا اوپر تو اٹھا لیکن وہ اتنا اپنے جسم کو اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ روشن دان تک پہنچ پاتی۔ اب اس کی پوزیشن کچھ یوں تھی کہ وہ روشن دان کی چوکھٹ سے لٹکی تھی اور اس کے پیر سپاٹ دیوار پر جمنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے اتنی عقل مندی ضرور کی تھی کہ اپنی سینڈلیں کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ پیروں میں سینڈلیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے پنجوں کو موڑ کر دیوار کا سہارا لینے میں کافی مدد مل رہی تھی۔ کچھ بچپن میں درختوں پر چڑھنے کی پریکٹس کا بھی فائدہ تھا کہ وہ اس سخت جدوجہد سے کسی نہ کسی طرح خود کو گزار رہی تھی۔ اگر سپاٹ دیوار کے بجائے یہ کوئی درخت ہوتا تو وہ اب تک اس کی چوٹی پر پہنچ چکی ہوتی لیکن... فی الحال تو روشن دان تک پہنچنا بھی خاصا مشکل لگ رہا تھا۔ جسم کا زیادہ تر بوجھ بازوؤں پر آ جانے کی وجہ سے بازو شل ہو گئے تھے لیکن آزادی کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی اور مسلسل اپنے جسم کو اچھال کر اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ آخر کار اس کی یہ محنت رنگ لائی اور وہ روشن دان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہاں بیٹھ کر اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ اس حصے میں زیادہ روشنی نہیں تھی تاہم یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوٹھی کے باہر کا نہیں بلکہ کوئی اندرونی حصہ ہے۔ بہر حال، اس حصے تک پہنچ جانے میں بھی اس بات کا امکان تھا کہ اسے باہر جانے کا موقع مل جائے گا۔ سانس درست کر لینے کے بعد اس نے دوسری طرف اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے ایک دم چھلانگ لگانے کے بجائے اس نے وہی ترکیب استعمال کی جو روشن دان پر چڑھنے کے لیے استعمال کی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ روشن دان کی چوکھٹ پر جما کر وہ اس سے لٹک گئی اور پھر آہستہ سے اپنے ہاتھ چھوڑ دیے۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ بلی کی طرح پنجوں کے بل زمین پر گرے تاکہ چوٹ نہ آئے لیکن ظاہر ہے، اسے اس کی مشق نہیں تھی اس لیے دھپ سے زمین پر آ رہی۔ خوش قسمتی سے اس طرف دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بہ خیر و عافیت یہاں تک پہنچ جانے کا دل میں شکر کرتے ہوئے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ لاؤنج نما کھلا حصہ تھا جہاں بید کی کرسیاں اور میز وغیرہ رکھی تھیں۔ سناٹے اور نیم تاریکی کے باوجود وہ بے حد احتیاط سے دیوار کے ساتھ لگ کر آگے کی طرف بڑھی تاکہ گھوم کر اس سامنے والے حصے کی طرف آسکے جہاں اس کمرے کا دروازہ تھا جس میں وہ تھوڑی دیر پہلے قید تھی۔ اس حصے میں پہنچ کر اسے کوٹھی سے باہر جانے کا راستہ ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتی کھسکتی جب وہ اس مقام تک پہنچی جہاں دیوار ختم ہو رہی تھی تو ایک دم سامنے جانے کے بجائے اس نے احتیاطاً ذرا سا سر نکال کر جھانکا اور فوراً پیچھے کر لیا۔ وہاں اسے سونی کے علاوہ دو تین افراد اور نظر آئے لیکن ان میں سے کسی کی توجہ اس طرف نہیں تھی۔ اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر جھانکا۔ وہ سب اس سے بے نیاز ایک ایسی جدوجہد میں مصروف تھے کہ ان کے اس کی طرف متوجہ ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ وہ حیران پریشان سی اس منظر کو دیکھتی رہی اور پھر ان کے دائیں طرف مڑنے کے بعد خود بھی دبے قدموں سے اس طرف چل پڑی۔ تجسس اور حیرت نے اسے فی الوقت اپنے فرار کا خیال بھلا دیا تھا۔

☆☆☆

"کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کریں؟ نہ جانے شینا کو زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے۔ کہیں سے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی۔ پوری پولیس فورس الرٹ ہے۔

شہر سے باہر جانے والے راستوں کی ناکابندی کر دی گئی ہے۔لڑکیوں کے بزنس میں انوالو تمام گروہوں کو کھنگالا جا چکا ہے۔ پولیس کے مخبر شہر میں سرگرم تمام جرائم پیشہ گروہوں کی سرگرمیوں کے بارے میں چھان بین کر چکے ہیں لیکن کہیں سے بھی ایک معمولی سا کلیو تک نہیں ملا۔'' سجاد رانا کے ڈرائنگ روم میں اس وقت وہ چار افراد جمع تھے جن کا شینا سے بے حد قریبی رشتہ تھا۔ وہ چاروں ہی ملک کے بااختیار افراد میں شمار ہوتے تھے لیکن اس وقت چاروں ہی بڑے بے بس نظر آرہے تھے۔

''میرے لیے تو مریم کو فیس کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ شینا کے بارے میں سوال کرنا شروع کر دیتی ہے کہ پاپا، شینا کا کچھ پتا چلا اور میں شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ آئی جی پنجاب ہونے کے باوجود اتنا بے بس ہوں کہ اپنی نواسی کے بارے میں اب تک کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا۔'' مختار مراد کے چہرے پر شدید بے بسی تھی۔

''میرے خیال میں یہ کسی عام جرائم پیشہ گروہ کا کام ہے بھی نہیں۔ ڈرائیور کو آپ لوگ اچھی طرح کھنگال چکے ہیں۔ تفتیش کا ہر طریقہ آزمانے کے باوجود وہ اپنے پہلے بیان پر قائم ہے۔ معلومات کروانے پر اس کی تمام باتوں کی تصدیق بھی ہو گئی ہے اس لیے یہ سوچنا تو بے کار ہے کہ کسی نے اس سے ساز باز کر کے شینا کو غائب کیا ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے... ہو سکتا ہے کہ کوئی پہلے سے اس تاک میں لگا ہو کہ موقع ملے اور شینا کو غائب کر دے۔ اس مقصد کے لیے وہ مسلسل اس کی نگرانی کرتا رہا ہو گا اور کل صبح جب.... اسے شینا ایک سنسان جگہ پر تنہا گاڑی میں بیٹھی نظر آئی تو اسے اغوا کر لیا گیا۔'' شہریار نے خیال آرائی کی۔

''ایکسپرٹس نے بہت اچھی طرح گاڑی کا جائزہ لیا ہے۔ انہیں دروازے کے ہینڈل پر شینا کے سوا کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے بلکہ پوری گاڑی پر کہیں کسی اجنبی کے فنگر پرنٹس نہیں ہیں۔ گاڑی میں کسی قسم کی کوئی ابتری بھی نظر نہیں آئی جس سے خیال کیا جاتا کہ شینا کو کسی نے زبردستی گاڑی سے اتارا ہے۔ اس کا ہینڈ بیگ، فلاور بکے اور کیک کا ڈبا جو وہ پارٹی کے لیے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، بالکل جوں کے توں پائے گئے ہیں۔''

''کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسی بات ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ سوچ سکیں کہ شینا کو اغوا نہیں کیا گیا اور وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے؟'' سجاد رانا کی بات سن کر اس نے جھکی نظروں سے ایک نازک سوال کیا۔ وہ رات سے یہاں آیا ہوا تھا اور شینا کی بازیابی کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں سب کے ساتھ تھا لیکن کہیں سے ایسا کوئی کلیو نہیں مل سکا تھا جس سے یہ گمان کیا جاتا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ ایسے میں شینا کے اپنی مرضی سے کہیں چلے جانے والی بات خود بہ خود ہی ذہن میں آرہی تھی... لیکن ایک تو وہ خود جانتا تھا کہ شینا کتنی معصوم طبیعت کی لڑکی ہے، دوسرے ایسے کسی سوال کو زبان پر لانا بہت تکلیف دہ بھی تھا اس لیے اب تک لب نہیں کھول سکا تھا... مگر ہر طرف سے ہونے والی مایوسی نے اسے اب یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''شینا کو ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ سب ہی کی لاڈلی ہے اور اس کی ہر بات ہر صورت میں مانی جاتی ہے۔ اگر وہ ہم سے کوئی ناجائز مطالبہ کرتی بھی تو ہم بہت نرمی سے اسے ہینڈل کرتے... مگر ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں پھر بھی احتیاطاً میں اس کے تمام ملنے جلنے والوں، دوستوں اور کلاس فیلوز کو چیک کروا چکا ہوں۔ وہ سب اس کے بارے میں مکمل طور پر بے خبر ہیں۔'' سجاد رانا باپ تھے، چنانچہ یہ سمجھنے کے باوجود کہ وہ خود بھی شینا سے ایسی ویسی کسی حرکت کی توقع نہیں رکھتا ہے، اس کے سوال کے جواب میں رکھائی سے بولے۔

''سوری سجاد بھائی! میرے اس سوال کا کوئی غلط مطلب مت سمجھیے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری شینا بہت معصوم اور تمیزدار لڑکی ہے۔ میں نے صرف امکانات کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوال کیا تھا۔'' اس نے فوراً ہی ان سے معذرت کی اور اپنی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''شینا کو غائب ہوئے چھتیس گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا ہے۔ اگر اس اغوا کے پیچھے ایسے افراد ہوتے جو اس کو یرغمال بنا کر تاوان میں آپ سے، ماموں جان سے یا مختار انکل سے اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہتے تو انہیں اس عرصے میں رابطہ کر کے اپنا مطالبہ پیش کر دینا چاہیے تھا۔ اگر اس اغوا کے پیچھے کسی بلیک میلنگ کا امکان ختم کر دیا جائے تو دوسرا سبب انتقام ہی سمجھ آتا ہے۔ اب ہم سب کو مل کر اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ہمارا کون سا ایسا دشمن ہے جو شینا کو اغوا کر کے ہمیں تکلیف پہنچانا چاہتا ہے؟''

''ہمارے دشمنوں کی تو ایک طویل فہرست ہے۔ اپنے پورے سیاسی کیریئر میں، میں نے بے شمار دوست اور دشمن بنائے ہیں۔ یہی حال مختار صاحب اور سجاد کا ہے۔ ان کی فیلڈ ہی ایسی ہے جس میں دوست سے زیادہ دشمن بنتے ہیں لیکن

یہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حد تک دشمنی میں آگے جا نکلنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بہر حال، اس امکان کو ہم نے نظر انداز تو نہیں کیا ہے اور ہمارے بندے ہمارے مخالفین کی ٹوہ لینے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں سے کوئی معمولی سی بھی بات پتا چلی تو ہمیں معلوم ہو جائے گی لیکن اپنے طور پر مجھے یہ امکان ذرا کمزور ہی لگتا ہے۔ ہمارا کوئی بھی دشمن ایسی حرکت کرتے وقت سو بار یہ ضرور سوچے گا کہ اگر ہم اپنے مجرم تک پہنچ گئے تو اس کا اتنا بُرا حال کریں گے کہ نسلوں تک یہ بات یاد رکھی جائے گی۔'' لیاقت رانا جواب تک خاموش بیٹھے تھے، نہایت سنگین لہجے میں بولے۔ ان کی یہ بات واقعی درست تھی۔ شینا کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ ننھیال اور ددھیال، دونوں طرف کے لوگ بے حد بااختیار تھے اس لیے کسی کے لیے بھی اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔

''آپ نور پور بم بلاسٹ والے کیس کو بھی تو دیکھ رہے تھے انکل! کہیں اس کیس میں تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس کی وجہ سے کوئی آپ کو دباؤ میں لے کر خاموش رکھنے کی کوشش کرے؟'' اسے اچانک خیال آیا تو اس نے مختار مراد سے پوچھا۔

''اس کیس کی تحقیقات کے نتیجے میں تمہارے ظاہر کیے شکوک کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ہمیں ایسے شواہد ملے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ واقعی اللہ آباد سے وائرلیس کے ذریعے مشکوک پیغامات بھیجے گئے ہیں اور اس معاملے میں پڑوسی ملک کا ہاتھ ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس معاملے میں مجھے دباؤ میں لینے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ یہ بہت اپر لیول کا معاملہ ہے جسے اگر چھیڑا گیا تو پھر سربراہانِ مملکت کے لیول پر ہی جا کر بات ہو گی۔'' انہوں نے اس بات کا جواب دیا پھر جیسے اچانک کچھ یاد آجانے پر چونک کر بولے۔

''ایک اہم بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ تم نے پیر آباد کی مسجد سے مولوی غلام محمد کے جو فنگر پرنٹس اٹھائے تھے، وہ اللہ آباد کے مدرسے سے ملنے والے فنگر پرنٹس سے میچ ہو گئے ہیں... البتہ دوسرے بندے کے فنگر پرنٹس کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ملا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مولوی غلام محمد بھی شاہنواز کا ہی ساتھی تھا اور اسی مشن پر کام کر رہا تھا جس پر شاہنواز تھا۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ پیر آباد سے غلام محمد کے غائب ہونے کے بعد جب ہم نے اس کے بارے میں تحقیقات کروائی تھیں تو ہمیں یہ پتا چلا تھا کہ وہ ارد گرد کے کسی گاؤں تک گیا ہے لیکن گاؤں کا نام واضح طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ اب سمجھ آرہا ہے کہ وہ شاہنواز سے ملنے اللہ آباد گیا ہو گا اور یہ پتا چل جانے پر کہ اس کے شرمناک کردار کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے، وہیں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں اس نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا اس لیے موقع آنے پر وہاں سے نکل جانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر انکل! آپ خیال رکھیں کہ کسی طرح اسے اور شاہنواز کو تلاش کیا جا سکے۔ اللہ آباد کے دو لڑکے شاہنواز اپنے ساتھ لے کر گیا ہے جن کا کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہو رہا۔ ان لڑکوں کی طرح جانے اور بھی کتنے لڑکوں کے ذہن میں اس نے زہر بھر کر انہیں نیکی کے نام پر اس قسم کے بھیانک کاموں پر آمادہ کر لیا ہو گا۔ ہمارا دشمن بہت چالاک اور سازشی ہے۔ وہ ہمارے ملک کو کھوکھلا کرنے کے لیے ہمارے ہی نوجوانوں کو استعمال کر رہا ہے۔ گاؤں دیہاتوں کے مولویوں کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنا کوئی نیا ہتھکنڈا نہیں۔ جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تھا اس وقت بھی اسی طرح کی چالیں چلی گئی تھیں۔ بعد میں کتنے ہی ایسے ثبوت ملے جن سے یہ معلوم ہوا کہ مسجدوں کے امام کے بھیس میں بھارتی جاسوس اپنی کارروائیاں کرتے رہے۔ سادہ لوح ذہنوں کو بھٹکا کر اپنے وطن اور اپنے مذہب کے خلاف کام کروا لینا کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ ہندوؤں کا چالباز ذہن تو اس معاملے میں بہت ہی زرخیز ہے۔ اب جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس وقت بھی اسی طرح لوگوں کو بہکانے میں مصروف ہیں۔ ان کا انتخاب پسماندہ گاؤں دیہات ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہاں کے کم علم لوگوں کو تھوڑی سی ہمدردی، غلط معلومات اور خوش حالی کے خوابوں کے ذریعے آسانی سے بہکایا جا سکتا ہے۔ آپ لوگ ہائی لیول پر اس مسئلے کو اٹھائیں۔ اپنے ضلع میں تو میں خود اب بہ طورِ خاص اس معاملے پر نظر رکھوں گا اور کسی مذہب اور وطن کے دشمن کو مقدس شخصیت کے بھیس میں وہاں ٹک کر کام نہیں کرنے دوں گا۔'' مختار مراد کی دی ہوئی اطلاع پر سرعت سے سارے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ حسبِ عادت جذباتی ہو چکا تھا۔ جذبات کو قابو میں رکھنے کی تربیت جانے کیوں ایسے ہر موقعے پر پسِ پشت چلی جاتی تھی۔

''اس معاملے کو بھی دیکھ لیں گے لیکن پہلے شینا والے مسئلے کا تو کوئی حل نکلے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ مریم کے ساتھ ساتھ اب آفرین کی بھی حالت خراب ہونے لگی ہے۔ ابھی تک تو ہم ان دونوں کو تسلیاں دیتے رہے ہیں کہ جلد شینا کے بارے میں

معلوم ہو جائے گا لیکن ہمیں جس طرح ناکامی کا سامنا ہے، اس سے تو یہی لگ رہا ہے کہ ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔" لیاقت رانا نے اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

"اس مسئلے پر سوچتے ہوئے جو بات میری سمجھ میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ ہر طرف بھاگ دوڑ کر لینے کے باوجود ہمیں ناکامی کا سامنا ہو رہا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم جن لوگوں پر انحصار کررہے ہیں، ان میں سے کسی نے کوتاہی کی ہو۔ شینا کوئی سُوئی تو ہے نہیں کہ اس کے ایک بار ہاتھ سے پھسل جانے پر سراغ لگانا ہی ممکن نہ رہے۔ وہ جس جگہ سے غائب ہوئی ہے وہاں بے شک کوئی دکان وغیرہ نہیں ہے لیکن چار پانچ مکانوں کے دروازے تو اسی طرف کھل رہے ہیں۔ ان مکانوں میں سے کسی کے مکین نے تو شینا کو گاڑی میں بیٹھا ہوا دیکھا ہوگا۔ میں نے خود وہ جگہ دیکھی ہے اور مجھے تفتیشی ٹیم کی پیش کردہ اس رپورٹ کو ماننے میں تامل ہے کہ کسی شخص نے شینا کو وہاں نہیں دیکھا۔ ڈرائیور کے مطابق اسے اپنے گھر جاکر واپس آنے میں دس بارہ منٹ لگے تھے۔ دس بارہ منٹ میں ان پانچ مکانوں میں سے ایک کے بھی مکین کا باہر نکلنے یا جھانکنے کا اتفاق نہ ہوا ہو، یہ بات ذرا مشکل ہی لگتی ہے۔ میرے خیال میں تو ہمیں ایک بار پھر وہیں سے شینا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"آج بھی تو ہم وہاں گئے تھے۔ تفتیشی ٹیم کے علاوہ ہم نے خود بھی تو لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا، یہ تم بھی جانتے ہو۔" اس کی بات سن کر سجاد رانا نے اسے یاد دلایا۔

"ہم اپنے ساتھ پولیس پارٹی لے کر گئے تھے۔ لوگ اگر کچھ جانتے بھی ہوں تو پولیس والوں کو بتانا مناسب نہیں سمجھتے۔ میرے خیال میں تو ہمیں سچ جاننے کے لیے کوئی غیر روایتی طریقۂ کار استعمال کرنا پڑے گا۔ کل میں خود اس علاقے میں جاؤں گا اور اپنے طور پر لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے اپنا فیصلہ سنایا جس کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ کسی بھی طریقے سے سہی، انہیں تو بس شینا کے بازیاب ہوجانے کی فکر تھی۔

☆☆☆

وہ بے حد احتیاط سے کام لیتے ہوئے دبے قدموں ان لوگوں کے پیچھے چل رہی تھی۔ طویل برآمدہ طے کرنے کے بعد وہ آخری سرے پر موجود ایک دروازے کے قریب پہنچ کر رکے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سب اس کھلے دروازے سے گزر کر اندر پہنچے اور پھر دروازہ برابر کردیا۔ وہ جو ان سے کافی فاصلے پر تھی، دروازہ بند ہوجانے کے بعد تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی درمیانی فاصلہ طے کرنے لگی۔ پیروں میں سینڈل نہ ہونے کے باعث فرش پر اس کے قدموں کی چاپ نہیں ابھر رہی تھی اس لیے وہ اس طرف سے بے فکر تھی کہ کوئی آواز سن کر متوجہ ہوجائے گا۔ البتہ یہ فکر ضرور تھی کہ اگر اندر جانے والوں میں سے کوئی اچانک باہر نکل آیا تو وہ دھر لی جائے گی۔ لیکن خیر گزری کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ برآمدہ عبور کرکے اس دروازے تک پہنچ گئی جس کے پیچھے وہ سب غائب ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے جھری سے اندر جھانکا۔ اندر اسے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس بات پر حیرت زدہ ہوتے ہوئے اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا چنانچہ اس کے دھکیلنے پر کھلتا چلا گیا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔ یہ جگہ کوئی اسٹور معلوم ہوتی تھی کیونکہ یہاں ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، ایک پرانی سی الماری اور دوسرا بے مصرف سا سامان رکھا نظر آرہا تھا۔ یہاں داخل ہونے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اس جگہ کوئی دوسرا دروازہ بھی ہوگا جس سے گزر کر وہ لوگ دوسری طرف چلے گئے ہوں گے لیکن سپاٹ دیواروں کو دیکھ کر جن میں کوئی کھڑکی تک موجود نہیں تھی، وہ دنگ رہ گئی۔ نکاسی کا کوئی اور راستہ نہ ہونے کی صورت میں آخر وہ سب لوگ کہاں غائب ہوسکتے تھے؟ ان کے پاس کوئی سلیمانی چادر تو تھی نہیں کہ اس میں خود کو چھپا کر غائب ہوجاتے۔ حیران پریشان نظروں سے در و دیوار کو تکتے ہوئے یک دم ہی اس کی نظر فرش پر پڑی۔ چوکور ٹائلز والے فرش پر اسے سنہری رنگ کے گوٹے، جسے کرن کہا جاتا ہے، کے چند تار نظر آرہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سونی نے اسی طرح کی کرن لگا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ وہ کمر کے بل جھکی اور ان سنہری تاروں کو اپنی انگلیوں کی مدد سے اٹھانا چاہا مگر تار اس کی انگلیوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود فرش سے یوں جڑے رہے جیسے ان کا دوسرا سرا کہیں بندھا ہوا ہو۔ وہ حیران ہوتی ہوئی پنجوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی اور بہ غور اس جگہ کا جائزہ لینے لگی۔ فوراً ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ تار دو ٹائلز کے درمیانی خلا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دور سے دیکھنے پر اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ چوکور ٹائلز والے اس فرش پر نظر آنے والی لکیروں میں سے ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں ٹائلز کے درمیان موجود لکیریں محض لکیریں نہیں بلکہ ایک

معمولی سا جھری نما خلا ہے۔ اس نے اس درمیانی خلا میں انگلیاں ڈال کر زور لگایا تو فرش کا وہ حصہ کسی ڈھکن کی طرح اٹھ گیا اور نیچے کی طرف جاتی ہوئی لوہے کی سیڑھی نظر آنے لگی۔ شاید سیڑھیاں اترتے ہوئے سونی کا دوپٹا ڈھکن کے خلا میں اٹک گیا تھا۔ اس نے زور لگایا تو دوپٹا تو نکل آیا مگر دوپٹے پر لگی کرن کے چند تار ٹوٹ کر وہیں پھنس گئے۔ ان تاروں نے اس کی خفیہ راستے تک راہنمائی کردی۔ تجسس کی ماری وہ فرش میں ظاہر ہونے والے اس چوکھٹے خلا سے گزر کر سیڑھیاں طے کرتی نیچے اترنے لگی۔ سیڑھیوں کے فوراً بعد ہی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس نے چابی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر اندر جھانکا۔ یہ ایک ہال نما کمرا تھا جس میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر بیس کے قریب افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان افراد کی اس کی طرف پشت تھی لیکن لباس اور بالوں کے اسٹائل وغیرہ کی جو جھلک نظر آرہی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سب کے سب تیسری جنس کے ہی افراد ہیں۔ ان سب افراد کی توجہ اپنے سامنے موجود بڑے سے چبوترے کی طرف تھی۔ اس چبوترے پر نمایاں طور پر جو چیزیں نظر آرہی تھیں، ان میں مہا گرو، گرو الماس، ہندوؤں کی ایک دیوی کا بڑا سا مجسمہ اور اس دیوی کے قدموں میں پڑی دلہن کی طرح سرخ لباس اور زیورات سے سجی ایک لڑکی شامل تھی۔ اس لڑکی کو سونی اور اس کے ساتھی اس کی نظروں کے سامنے اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ لڑکی بے ہوش تھی اور وہ صرف اس لڑکی کی وجہ سے ہی ان کے تعاقب میں اس جگہ تک آنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ دلہن بنی اس لڑکی کو کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ لڑکی نوعمر اور حسین تھی اور اس کے نقوش کی نرمی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ ان لوگوں کا براتوں وغیرہ میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا لیکن کسی شادی کے گھر سے سجی سنوری دلہن کو اٹھا لانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جانے وہ لوگ کس طرح اس بے چاری کو اٹھا لائے تھے اور اب اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے؟ اندر کمرے کا منظر دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ وہاں کوئی اہم کارروائی ہو رہی ہے۔ گرو الماس تمام حاضرین کی طرف منہ کیے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر اسے فوراً وہ منظر یاد آیا جب اس نے گرو الماس کو نمستے کہتے ہوئے مہا گرو کے قدموں میں جھکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اسے اس انداز پر حیرت ہوئی تھی لیکن اپنی تکلیف کی وجہ سے وہ زیادہ دھیان نہیں دے سکی تھی۔ اب جو دوبارہ اس نے اس طرح کا منظر دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ گرو الماس ہندو دھرم سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنے ساتھیوں کو اندھیرے میں رکھ کر ان پر خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔ چبوترے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا گرو الماس کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس تک واضح آواز نہیں آرہی تھی۔ اس کی بات سننے کے لیے اس نے اپنی آنکھ چابی کے سوراخ سے ہٹا کر کان اس جگہ لگا دیا۔ اس کے کان تک گرو الماس کی آواز پہنچنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"دیوی ماں کی کرپا سے آج میں آپ لوگوں کے سامنے شرمسار ہونے سے بچ گئی۔ اگر اتنا کشٹ اٹھا کر یہاں پہنچنے کے بعد آپ لوگوں کو نراش لوٹنا پڑتا تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔ میں مہا گرو کو دیے گئے وچن کے مطابق یہاں خالی ہاتھ نہیں آئی تھی، پر راستے میں ایک گھٹنا ہوگئی اور مجھے لگا کہ ہمارا آج کا جمع ہونا بے کار جائے گا... پر دیوی ماں نے کرپا کی اور مہا گرو نے مجھے بتایا کہ دیوی ماں کو دی جانے والی بھینٹ کا انتظام ہوگیا ہے۔ اب ہم دیوی ماں کے چرنوں میں بھینٹ دے کر اس سے پرارتھنا کریں گے کہ وہ اپنے پجاریوں کو اس کشٹ سے بچالے جو ہمیں اور ہمارے ماتا پتا کو اٹھانا پڑا۔ پھر دوبارہ ہمارے دھرم کے ماننے والے کسی گھر میں ہم جیسی اولاد جنم نہ لے۔" یہ جملہ بولتے ہوئے گرو الماس کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔ اس کے حساس دل نے اس دکھ کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ ادھر گرو الماس کی بات جاری تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

"اب میں مہا گرو سے بنتی کروں گی کہ وہ دیوی ماں کے چرنوں میں ہم سب کی طرف سے بھینٹ چڑھائیں اور دیوی ماں کی پوجا کروائیں۔" گرو الماس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اسے اندر سے "اوم ہری اوم" اور "جے دیوی کی" کے نعرے سنائی دیے پھر خاموشی چھا گئی۔ خاموشی چھا جانے پر اس نے اپنا کان چابی کے سوراخ سے ہٹا کر دوبارہ سے آنکھ وہاں لگا دی۔ اسے تجسس تھا کہ مہا گرو دیوی ماں کو کیا بھینٹ چڑھاتا ہے۔ آنکھ لگاتے ہی اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ مہا گرو ہاتھ میں بڑا سا چھرا لیے دیوی کی مورتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ مورتی کے چرنوں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ میں موجود چھری وہاں بے ہوش پڑی لڑکی کے گلے پر چلا دی۔ فوراً ہی اس کے گلے سے خون کا فوارہ سا بلند ہوا اور مہا گرو اور دیوی کی مورتی اس خون میں نہا گئے۔ اس نے گھبرا کر اپنی آنکھ وہاں سے ہٹالی۔ اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر اصولاً اس کے حلق سے بلند چیخیں نکل جانی چاہیے تھیں لیکن وہ اتنی خوف زدہ ہوگئی تھی کہ اس کی آواز اندر ہی کہیں گھٹ گئی

اور وہ دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھتی ہوئی واپس اوپر پہنچ گئی۔ خوف کی شدت کے باوجود اسے اس بات کا احساس تھا کہ ان لوگوں کو اس کے اس راز سے واقف ہو جانے کا علم نہیں ہونا چاہیے اس لیے اوپر پہنچنے کے بعد اس نے تہ خانے میں جانے والا خفیہ راستہ بند کیا اور وہاں سے باہر نکل گئی۔ اب اسے کسی طرح اس کوٹھی سے بھاگ نکلنا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس دروازے کی طرف بڑھی جس سے گزر کر وہ لوگ کوٹھی کی عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ دروازہ بند تھا اور اس کی بے حد کوشش کے باوجود کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ یقیناً کسی بیرونی مداخلت سے بچنے کے لیے ان لوگوں نے دروازے کو لاک کر دیا تھا۔ دروازے کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کھڑکیوں پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ کھڑکیوں کے پٹ شیشے کے تھے لیکن ان پر لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔ اس جالی کو توڑ کر باہر نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ واپس اس کمرے کی طرف چلی گئی جہاں اسے بہ ظاہر آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے قید کر دیا گیا تھا۔ کمرے کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ اس نے کنڈی کھولی اور کمرے میں چلی گئی۔ اب اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ان لوگوں پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ وہ ان کے راز سے واقف ہو گئی ہے۔ اگر انہیں اس کے واقفِ راز ہونے کا علم ہو جاتا تو وہ اس کی جان بھی لے سکتے تھے۔

کمرے میں آ کر اس نے غسل خانے کا رخ کیا اور جلدی جلدی منہ پر چھپاکے مارنے لگی۔ چھپاکے مارتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کا زخم کھل گیا ہے اور اس میں سے خون رس رس کر پٹی کو بھگو چکا ہے۔ اب تک وہ ذہنی اور جسمانی طور پر جس مشقت میں مبتلا رہی تھی، اس میں اپنے ہاتھ کی چوٹ کو فراموش کر چکی تھی لیکن اب یہ تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے پٹی کھول کر ہاتھ نل کے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کے نیچے رکھا۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد خون بہنا بند ہو گیا، البتہ درد کا کوئی علاج نہیں تھا۔ گیلی پٹی بھی اس لائق نہیں تھی کہ اسے دوبارہ ہاتھ پر باندھا جا سکتا۔ پٹی کو وہیں پھینک کر وہ باتھ روم سے باہر نکلنے لگی تھی کہ الٹی رکھی ہوئی بالٹی پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے جلدی سے بالٹی کو سیدھا کر کے اس کی جگہ پر رکھا اور واپس کمرے میں آ گئی۔ اب اس کی ٹانگوں میں بالکل بھی جان نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے کی طرف بڑھی اور اس پر ڈھیر ہو گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے ذہن میں لڑکی کو ذبح کیے جانے کا منظر ابھرا۔ اب تک تو وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں تھی اس لیے اس منظر کی اصل ہیبت ناکی کو پوری طرح محسوس نہیں کر سکی تھی... لیکن اب جو یہ منظر آنکھوں میں دوبارہ زندہ ہوا تو اس کے پورے وجود پر کپکپی طاری ہو گئی۔ کپکپاتے وجود کے ساتھ گھٹنوں کو پیٹ سے لگائے اسے کتنا وقت گزر گیا، وہ اندازہ نہیں کر سکی۔ بس اسے صرف اتنا احساس ہوا کہ کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ اندر داخل ہونے والا بولا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ گرو الماس ہے جو سونی پر غصہ کر رہا ہے۔

''میں نے تجھ سے کہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دینا لیکن تو نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔ اگر یہ موقعے کا فائدہ اٹھا کر بھاگ جاتی تو کیا ہوتا؟''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جب اسے کھانا دے کر گئی تھی تو میں نے دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ پتا نہیں کیسے کھل گئی؟'' الماس کی ڈانٹ سن کر سونی نے الجھن زدہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

''جن بھوت آئے ہوں گے یہاں کنڈی کھولنے۔ ایک تو تو ڈھنگ سے کام نہیں کرتی، اوپر سے جھوٹی صفائیاں بھی دیتی ہے۔'' الماس نے بگڑے ہوئے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

''جانے دے الماس! کیا ہوا جو کنڈی باہر سے کھلی رہ گئی۔ پوری کوٹھی اچھی طرح بند تو تھی۔ اگر تیری شہزادی اس کمرے سے باہر بھی نکل جاتی تو یہاں سے بھاگ تو نہیں سکتی تھی۔'' اس بار مہا گرو کی آواز سنائی دی۔ اس کی مداخلت کے بعد گرو الماس کے مزید کچھ بولنے کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا، چنانچہ سونی کی جان چھوڑ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یہ شہزادی اس طرح کیوں لیٹی ہوئی ہے؟ اس کا سارا بدن بُری طرح کپکپا رہا ہے۔''

''ارے ہاں، دیکھو تو لڑکی کو۔ اس کی حالت تو واقعی صحیح نہیں لگ رہی۔'' الماس کے بولنے پر مہا گرو بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ پھر وہ لوگ اسے چھو کر دیکھنے لگے۔

''اسے تو بڑا تیز بخار ہے، جب ہی تو اتنی بُری طرح کانپ رہی ہے۔''

''جا سونی! میرا پرس لے کر آ۔ اس میں بخار کی گولیوں کا پتا رکھا ہے۔ اتنی رات گئے ڈاکٹر کو تو نہیں دکھا سکتے۔ ابھی وہی گولیاں کھلا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ صبح الماس خود ہی اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گی۔'' الماس کی بات سن کر مہا گرو نے سونی کو حکم دیا۔ سونی فٹافٹ دوا لے کر حاضر ہو گئی۔ اس نے اور الماس نے مل کر اسے سہارے سے بٹھایا

اور زبردستی دو گولیاں حلق سے نیچے اتارنے پر مجبور کر دیا۔ گولیاں کھانے کے بعد وہ ایک بار پھر صوفے پر گر گئی۔ شاید ان گولیوں کا ہی اثر تھا کہ تھوڑی دیر بعد اسے کچھ آرام محسوس ہونے لگا اور نیند آ گئی لیکن یہ نیند بہت بے چین اور بے سکون تھی۔ بار بار چونک کر اس کی آنکھ کھلتی اور ایک خونی نظارہ تنگ کرنے لگتا۔

☆☆☆

حسبِ پروگرام صبح وہ اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں سے شینا غائب ہوئی تھی۔ یہاں آنے کے لیے اس نے ایک ڈرائیور کے علاوہ کسی اور کو ساتھ نہیں لیا تھا حالانکہ سجاد رانا اور مختار مراد نے اصرار کیا تھا کہ وہ ایک آدھ پولیس مین کو بھی اپنے ساتھ لے جائے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا اور اب وہاں پہنچ کر لکڑی کے نیلے پینٹ والے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دستک کے جواب میں اندر سے ایک درمیانی عمر کا آدمی باہر نکلا۔ اس آدمی نے سفید رنگ کی دھوتی اور ہاف آستین کی بنیان پہن رکھی تھی۔ دونوں ہی چیزوں کی سفیدی کو مدھم کرتی ہوئی پیلاہٹ سے ظاہر تھا کہ انہیں بہت کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ خود وہ شخص اپنے چہرے سے بھی ایک ایسا مزدور لگ رہا تھا جس کی مشقت، اس کی بدحالی کو خوش حالی میں تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہو۔

''مجھے شہریار عادل کہتے ہیں۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ سے اور آپ کے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اس شخص سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیسا ضروری کام؟'' وہ شخص حیران ہوا۔

''دو دن پہلے یہاں سے ایک لڑکی غائب ہوئی تھی، میں اس کے بارے میں آپ لوگوں سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بے حد نرم لہجے میں بتایا۔ باحیثیت آدمی اگر کسی کم حیثیت شخص سے نرمی اور عزت سے مخاطب ہو تو اس کی بات زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتی ہے، وہ اس حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

''ہم لوگ پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ اگر کچھ معلوم ہوتا تو ہم پہلے ہی پولیس والوں کو بتا چکے ہوتے مگر جانے کیوں آپ لوگوں کو یقین نہیں آتا۔'' اس شخص نے اس کی بات کے جواب میں اپنے لہجے سے بے بسی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''میں یقین کر لوں گا مگر اس صورت میں کہ آپ مجھے ایک بار اپنے تمام گھر والوں سے مل کر بات کرنے کی اجازت دے دیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ اندر آ جائیں۔'' وہ شخص اس کے اصرار پر بادل ناخواستہ پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بولا۔ جس شدومد سے پولیس وہاں پوچھ گچھ کرتی رہی تھی اور مختلف بہ حیثیت افراد کا آنا جانا لگا رہا تھا، اس سے علاقہ مکینوں کو اس بات کا تو بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ غائب ہونے والی لڑکی کسی بڑی شخصیت کی بیٹی ہے۔ اب وہ اس بارے میں معلوم کرنے وہاں پہنچا تھا تو اس کی شخصیت اور عقب میں باوردی ڈرائیور کے ساتھ کھڑی بیش قیمت گاڑی کو دیکھ کر بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کوئی بااثر شخصیت ہے، اس لیے اس شخص نے اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اجازت ملنے پر وہ اس شخص کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کافی چھوٹا تھا جس کے مختصر سے صحن میں پڑے تخت پر بیٹھے افراد ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ ان افراد میں مرد سے چار پانچ برس چھوٹی ایک عورت، دو نوجوان لڑکیاں اور ایک سات آٹھ سال کا لڑکا شامل تھے۔ وہ سب افراد اسے اندر آتا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''میرے سارے گھر والے اس وقت یہیں ہیں۔ آپ کو جو بھی گل کرنی ہے کر لیں۔'' مرد نے ایک سال خوردہ سی لکڑی کی کرسی اسے بیٹھنے کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ان لوگوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو زحمت ہوئی مگر میری مجبوری ایسی ہے کہ میں آپ لوگوں کو زحمت دیے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری بہت معصوم اور کم عمر بھتیجی آپ کے گھر کے قریب سے غائب ہو گئی ہے۔ میری اور میرے گھر والوں کی تکلیف کا آپ لوگ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تقریباً میری بھتیجی ہی کی عمر کی لڑکیاں اس گھر میں بھی موجود ہیں۔ اگر آپ اپنی بیٹیوں کو سامنے رکھیں تو آپ کو ہماری تکلیف اور پریشانی کا احساس ہو جائے گا۔ بے شک پولیس آپ لوگوں سے پوچھ گچھ کر چکی ہے اور آپ انکار کر چکے ہیں کہ آپ کو کچھ خبر نہیں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پولیس والوں کو کچھ بھی بتاتے ہوئے شریف لوگ گھبراتے ہیں کہ کہیں خوامخواہ تھانے کچہری کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔ اس وقت میری یہاں آمد کا بس اتنا مقصد ہے کہ آپ لوگوں سے انسانیت کے نام پر اپیل کر سکوں کہ اگر آپ کو کچھ معلوم ہے تو بتا دیں۔ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو کسی قسم کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ جو کچھ آپ مجھے بتائیں گے، میں بس وہ یاد رکھوں گا اور یہ قطعی بھول جاؤں گا کہ مجھے یہ سب بتانے والا

کون ہے۔''

وہ دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں پر اس کے لہجے کا اثر ہو رہا ہے اور وہ سب ہمدردی سے اس کی بات سن رہے ہیں۔ ایک پل کے لیے اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے ہوں مگر پھر وہ لب بھینچ گئی اور سر جھکا لیا۔ وہ بہ غور اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی نظر کے زاویے کو محسوس کرتے ہوئے عورت جو کہ یقیناً ان بچوں کی ماں تھی، زور سے کھنکھاری اور ذرا بلند آواز میں بولی۔

''صاحب! میں نے پہلے بھی بتایا تھا اور اب پھر بتا رہی ہوں کہ یہاں کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ میرا گھر والا مزدوری کرتا ہے اور سویرے ہی گھر سے نکل پڑتا ہے۔ تینوں بچے بھی سویرے ہی اسکول چلے جاتے ہیں اور پیچھے میں اکیلی گھر کے کام کاج کرنے کو رہ جاتی ہوں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد مجھے فرصت ہی نہیں ہوتی کہ دروازے سے باہر جھانک بھی سکوں۔ اگر آپ دس پندرہ منٹ بعد یہاں آتے تو آپ کو گھر پر میرے سوا کوئی نہیں ملتا۔ اب آپ بتائیں کہ جس وقت آپ کی بھتیجی اس جگہ سے غائب ہوئی' یہاں کون بیٹھا تھا کہ جو دیکھ سکتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا... کون اسے لے گیا؟''

''ٹھیک ہے محترمہ! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں اور یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ آپ لوگ میرا یہ کارڈ رکھ لیں، اس پر میرا فون نمبر درج ہے۔ اگر کسی وقت آپ کو میری انسانیت کے نام پر کی گئی اپیل کا خیال آ جائے تو اس نمبر پر فون کر کے مجھے اطلاع دے سکتی ہیں۔'' اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر عورت کے قریب تخت پر رکھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ واپس پلٹنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی، وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں چار ہوئیں تو وہ جلدی سے چہرے کا رخ موڑ گئی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ شاید یہ لڑکی کچھ جانتی ہے لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ زبردستی تو اس سے کچھ نہیں اگلوا سکتا تھا چنانچہ ان لوگوں سے زحمت دینے پر ایک بار پھر معذرت کرتا ہوا باہر نکل گیا اور دوسرے مکان کا رخ کیا۔ ایک در سے مایوس ہو جانے کے باوجود وہ ہمت چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اس دوسرے مکان میں ایک سبزی فروش اپنی نوجوان بیوی، چند ماہ کے جڑواں بچوں اور شدید بیمار ماں کے ساتھ مقیم تھا۔ سبزی فروش صبح نور کے تڑکے سبزی منڈی روانہ ہو چکا تھا اور اس کی نوجوان بیوی جڑواں بچوں اور بیمار ساس کو سنبھالنے میں جس بری طرح ہلکان ہوئی جا رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے واقعی یقین کیا جا سکتا تھا کہ اسے گھر سے باہر جھانکنے کی تو کیا سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہوگی۔ تیسرے گھر میں ڈھیر سارے افراد مقیم تھے۔ اس گھر میں اڈے پر کپڑوں پر زری، ستاروں، کلابتو اور سلمے وغیرہ کا کام کیا جاتا تھا۔ گھر کا چھوٹا بڑا ہر فرد اس کام میں حصہ ڈالتا تھا۔ وہ جب اس گھر میں داخل ہوا تو تب بھی وہاں کام جاری تھا اور سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ ایک بار پھر مایوسی کا منہ دیکھنے کے بعد وہ اس گھر سے باہر نکلا۔ اب بس ایک ہی گھر رہ گیا تھا جہاں سے کچھ معلوم ہونے کا موہوم سا امکان تھا۔ البتہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ جس پہلے گھر میں گیا تھا، ان لوگوں کو یا کم از کم اس لڑکی کو تو ضرور کچھ نہ کچھ معلوم تھا مگر اس نے جان بوجھ کر اپنے لب سی لیے تھے۔ اگر آخری مکان سے بھی اسے کچھ معلوم نہ ہو پاتا تو پھر اس کے پاس یہی چارہ رہ جاتا تھا کہ پہلے گھر کے مکینوں سے سختی سے باز پرس کر کے وہ سب اگلوا لے جو وہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چوتھے گھر کی طرف قدم بڑھانے سے قبل اس نے مڑ کر پہلے گھر کی طرف دیکھا۔ اسے وہی لڑکی مکان کی چھت پر نظر آئی۔ چھت پر تقریباً چار فٹ کی دیوار اٹھی ہوئی تھی اور وہ لڑکی اسی دیوار کے پیچھے کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔ اسے اپنی طرف متوجہ ہوتا دیکھ کر اس نے ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور دیوار کے پیچھے غائب ہو گئی۔ تیس پینتیس سیکنڈز بعد اس کا چہرہ دوبارہ دیوار کے پیچھے سے ابھرا اور اس نے ہاتھ گھما کر اس کی طرف کچھ پھینکا۔ پھینکی گئی وہ شے اس کے قدموں کے قریب آ کر گری جبکہ لڑکی فوراً ہی غائب ہو گئی۔ اس کے لیے یہ بہت آکورڈ سچویشن تھی۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا تھا اور بہ ظاہر اس سے بے نیاز تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اچھی طرح اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ بہر حال، اس وقت اسے اپنی پوزیشن سے زیادہ شینا کے بارے میں جاننے کی فکر تھی۔ اگر یہ فکر نہ ہوتی تو وہ اس طرح ایک ایک گھر کے دروازے کو کھٹکھٹا کر ان لوگوں سے تعاون کی درخواست کیوں کرتا؟ اپنے خاندان کے تمام تر اختیارات کے باوجود ہاتھ آنے والی ناکامی نے تو اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ لوگوں پر حکم صادر کرنے کے بجائے ان سے درخواستیں کرتا پھر رہا تھا۔ اس وقت پیش آنے والی آکورڈ سچویشن کو بھی اس نے شینا کی خاطر قبول کر لیا اور جھک کر اپنے قدموں میں پڑے ایک چھوٹے سے پتھر سے بندھے تہ شدہ کاغذ کو اٹھا لیا۔ کاغذ کو کسی تعویذ کے مانند بہت چھوٹے سائز میں فولڈ کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ پتھر باندھ دیا گیا تھا جو یقیناً اس لیے تھا کہ کاغذ اپنی بے وزنی کی وجہ سے

مطلوبہ جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ نہ پہنچ جائے۔ پتھر سے بندھے اس کاغذ کو اٹھانے کے بعد اس نے مناسب سمجھا کہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ یہاں کھڑے کھڑے اس کاغذ کو کھول کر پڑھنا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ کہیں سے بھی کوئی شخص نکل کر آ سکتا تھا چنانچہ وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا اور پتھر علیحدہ کرنے کے بعد کاغذ کی تہیں کھولنے لگا۔ ڈرائیور کو اس نے گاڑی چلانے کا اشارہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ اس کے حکم کا منتظر ہونے کے باوجود بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

کاغذ... پوری طرح کھل گیا تو اس پر نیلی روشنائی سے لکھی تحریر نظر آنے لگی۔ لکھنے والی کی لکھائی خراب نہیں تھی لیکن کہیں کہیں سے بگڑ جانے والے الفاظ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے بہت عجلت میں یہ سب لکھا ہے۔ بغیر کسی القاب کے شروع ہونے والی اس تحریر کا متن کچھ یوں تھا۔

''مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلوم ہے۔ پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ اماں نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ زبان نہ کھولنا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں کچھ بتاؤں اور پولیس والوں کے سوال جواب کا سامنا کروں لیکن آج آپ نے جس دکھ بھرے انداز میں تعاون کی درخواست کی، اسے سن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ پولیس والے تو بہت بدتمیزی اور سختی سے پوچھتے تھے اس لیے میں نے ڈر کر ان کے سامنے کچھ نہیں کہا۔ اب بھی آپ کو اس وعدے کے ساتھ سب کچھ بتا رہی ہوں کہ میرا کہیں ذکر نہیں ہوگا۔ دو دن پہلے جب آپ کی بھتیجی اغوا ہوئی تھی، اس دن میں نے اتفاق سے اسکول کی چھٹی کی تھی اور کپڑے پھیلانے چھت پر آئی تھی۔ کپڑے پھیلاتے ہوئے میں نے جھانک کر باہر دیکھا تو مجھے ایک شان دار سی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس گاڑی میں ایک لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ اتنی اچھی سی گاڑی اور لڑکی یہاں کہاں سے آ گئی؟ میں چھت پر کھڑی ارد گرد دیکھتی رہی کہ دیکھوں تو یہ گاڑی کس کے گھر آئی ہے۔ اسی وقت مجھے دو تین وہ افراد اس طرف آتے نظر آئے جو نہ ''ہی'' میں شمار ہوتے ہیں اور نہ ''شی'' میں۔ ان لوگوں نے گاڑی کے قریب آ کر بھیک مانگی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ کیوں مگر گاڑی میں بیٹھی وہ لڑکی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور ان لوگوں سے کوئی بات کرنے لگی۔ ان میں سے ایک فرد نے بات کرتے کرتے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر آس پاس کسی کو نہ پا کر اپنے تھیلے میں سے ایک بڑا سا چھرا نکال لیا۔ پھر چھرے کے زور پر وہ اس لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ کہیں لے گئے۔ میں چھت پر سے یہ سب دیکھ رہی تھی مگر ان میں سے کسی کا دھیان اس طرف نہیں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر بری طرح ڈر گئی اور بھاگتی ہوئی نیچے گئی۔ اماں کو میں نے ساری تفصیل سنائی۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا لیکن گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اماں نے مجھے سمجھایا کہ میں اس بارے میں اپنی زبان بند رکھوں ورنہ ہم لوگ بھی کسی چکر میں پھنس سکتے ہیں۔ اماں کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن اب آپ کو بتا رہی ہوں۔ جو لوگ آپ کی بھتیجی کو لے گئے، میں انہیں نہیں پہچانتی۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، وہ سب میں نے آپ کو بتا دیا۔ ان معلومات کی روشنی میں آپ اپنی بھتیجی کو ڈھونڈ سکتے ہیں تو ڈھونڈ لیں... مگر برائے مہربانی دوبارہ میرے گھر کا رخ مت کیجیے گا۔ یہاں آ کر آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا بھی تو میں صاف انکار کر دوں گی۔'' ان الفاظ پر آ کر تحریر ختم ہو گئی تھی۔ جس طرح تحریر کے شروع میں القابات موجود نہیں تھے، اسی طرح اختتام پر بھی کسی کا نام موجود نہیں تھا۔

''گھر چلو۔'' پوری تحریر پڑھنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو حکم دیا اور خود صورت حال پر غور کرنے لگا۔ لڑکی نے بتایا تھا کہ شینا گاڑی سے اتر کر ان لوگوں سے گفتگو کرنے لگی تھی، تب اسے چھرا دکھا کر اغوا کر لیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ شینا گاڑی سے اتری ہی کیوں تھی؟ اسے ان لوگوں میں کیا دلچسپی تھی؟ ان ہی سوچوں میں گم وہ سجاد رانا کے گھر پہنچ گیا۔

''کیا ہوا... کچھ معلوم ہوا شینا کے بارے میں؟'' وہ لاؤنج تک ہی پہنچا تھا کہ مریم اسے دیکھ کر سوال کرنے لگی۔ وہ بہت نک سک سے رہنے والی خاتون تھیں لیکن شینا کے دکھ نے انہیں اپنا آپ بھلا دیا تھا۔ نہ انہیں لباس بدلنے کا ہوش تھا اور نہ ہی بال سنوارنے کا۔ ان چند دنوں میں ہی ان کے چہرے کی خوب صورتی ماند پڑ گئی تھی اور وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھیں۔

''ایک کلیو تو ہاتھ آیا ہے۔ انشاء اللہ اس کی مدد سے ہم جلد شینا کو کھوج نکالیں گے۔'' اس نے اپنی جیب سے کاغذ نکال کر وہیں پر موجود سجاد رانا کے حوالے کیا۔ وہ کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگے۔ مریم بھی ان کے قریب ہی بیٹھ کر ان کے ساتھ ساتھ وہ تحریر پڑھنے لگی۔

''اوہ گاڈ! میں سمجھ گئی کہ شینا کیسے ان لوگوں کے ہتھے چڑھی۔ اسے اپنے اسکول کے اینول فنکشن میں ایک پلے میں خواجہ سرا کا رول پرفارم کرنا تھا۔ وہ یقیناً اسی سلسلے میں انفارمیشنز حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں سے بات چیت

کرنے کے ارادے سے گاڑی سے اتری ہوگی اور وہ بد بخت اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ سجاد! آپ فوراً آرڈر دیں کہ ان لوگوں کے قبضے سے میری بچی کو برآمد کیا جائے۔'' تحریر پڑھنے کے بعد مریم جوش سے بولی تو اس کی اس الجھن کا جواب مل گیا کہ شینا گاڑی سے کیوں اتری تھی۔

''میں ابھی آرڈر کرتا ہوں کہ شہر میں خواجہ سراؤں کے جو گروہ مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، فوری طور پر ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے اور مشکوک گروہوں کے خلاف ایکشن لیا جائے۔'' کلیو ہاتھ آنے پر سجاد رانا خود بھی جوش میں آگئے اور اپنے ارادے پر عمل درآمد کے لیے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر فوری طور پر نمبر ڈائل کرنے کے بجائے شہریار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''کیا خیال ہے شیری! میں اس خط والی لڑکی کو بھی تھانے بلوالوں؟ اس نے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کو نہیں پہچانتی مگر میرا خیال ہے کہ وہ ان کے حلیے تو بتا ہی سکتی ہے۔''

''نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میری انسانیت کے نام پر کی گئی درخواست کے نتیجے میں اس لڑکی نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر مجھے یہ اطلاع دی ہے اور اطلاع دینے کے ساتھ یہ وعدہ بھی چاہا ہے کہ اس معاملے میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہوگا۔ اس لڑکی کا احسان تسلیم کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ ہمارا اسے تھانے بلوانا اس کے لیے مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتی ہے، وہاں لڑکیوں کو پہلے ہی بہت سے مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ ہم اس کے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کردیں یہ کچھ مناسب نہیں ہوگا۔'' اس نے ان کی تجویز کی مخالفت کی۔

''او کے! اگر تم کہتے ہو تو رہنے دیتے ہیں۔'' انہوں نے فوراً اس کی بات مان لی۔ شاید اپنی بیٹی کی جدائی نے ان کے دل کو زیادہ نرم کردیا تھا جو وہ کسی اور لڑکی کی مشکل کو آسانی سے سمجھ گئے ورنہ پولیس کی ملازمت کرتے کرتے وہ خود اچھے خاصے سخت مزاج ہوچکے تھے۔

☆☆☆

کروٹ کے بل لیٹی وہ ایک ٹک نگار کو دیکھ رہی تھی۔ میک اپ، ہار بندوں اور چمکیلے بھڑکیلے کپڑوں سے آزاد اس وقت وہ بہت ہی سادہ حلیے میں بڑی سی سفید چادر اوڑھے نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ وہاں رہنے والی وہ واحد ہستی تھی جو اتنی باقاعدگی سے نماز پڑھتی تھی۔ اگر کسی مصروفیت کی وجہ سے اس کی کوئی نماز رہ بھی جاتی تو وہ بعد میں قضا نماز ضرور ادا کرتی تھی۔ ابھی ظہر کا وقت تھا اور اس وقت عموماً وہ لوگ گھر میں ہی رہتے تھے اس لیے وہ بہت اطمینان سے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز مکمل کرنے کے بعد اس نے دعا کی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر اٹھتے ہوئے جائے نماز تہ کررہی تھی کہ اس پر نظر پڑ گئی۔ جائے نماز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے بعد وہ اس کے قریب آئی اور اس پر پھونک مارنے کے بعد پوچھنے لگی۔

''اب کیسی طبیعت ہے میری شہزادی کی؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اس کی خاموشی کی پروا کیے بغیر خود ہی بولتی رہی۔ ''تو نے تو ڈرا کر ہی رکھ دیا تھا۔ اتنا تیز بخار اوپر سے بار بار ڈر کر اٹھ جانا۔ ہم لوگ تو گھبرا ہی گئے کہ جانے کیا ہوگیا تجھے؟ شکر ہے اللہ کا کہ آج تیری طبیعت ذرا سنبھل گئی ہے ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ اسپتال جا کر دوا لانا کوئی آسان کام ہے ہم لوگوں کے لیے۔ لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں جیسے ہم انسان ہی نہیں کہ ہمیں بھی بیمار پڑنے پر دوا دارو کی ضرورت پڑے۔'' اس کے لہجے میں وہی دکھ تھا جو ازل سے ان جیسے لوگوں کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔

''تم تو مجھے کسی بہت اچھے گھر کی لگتی ہو نگار! تم کیسے یہاں پہنچ گئیں؟'' اس نے نگار سے پوچھا۔

''ٹھیک کہتی ہو، میرا گھرانا بڑا اچھا تھا۔ سارے نمازی پرہیزگار، خیرات زکوٰۃ دینے والے لوگ تھے۔ مجھے بھی بچپن میں ہی نماز پڑھنے کی عادت پڑگئی تھی لیکن بچپن تو کسی خواب کی طرح فوراً ہی گزر گیا اور پھر مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے شرمندگی اور مشکلات کا سبب بن رہی ہوں۔ بس پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے دل پر جبر کر کے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور میں یہاں گرو کے پاس پہنچ گئی۔'' اس نے اپنی بے بسی اور دکھ بھری داستانِ حیات چند جملوں میں کہہ سنائی۔

''تمہیں گرو کے ساتھ رہنے میں مشکل نہیں ہوئی؟ میرا مطلب ہے وہ اتنا سخت، اکھڑ اور بے دین سا ہے... تم اس کے ساتھ کیسے گزارہ کرتی ہو؟''

''مجبوری انسان سے سب کچھ کروا لیتی ہے۔ اگر میں گرو کے ساتھ گزارہ نہ کروں تو پھر کہاں جاؤں؟ سر چھپانے کا ٹھکانا ملا ہوا ہے، یہ بہت ہے۔'' اس کے لہجے میں قناعت پسندی تھی۔

''گرو نے تمہیں کبھی نماز پڑھنے سے روکا نہیں؟ وہ خود تو ہندو ہے، ایسے لوگ کب پسند کرتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی نماز روزہ کرے۔'' نگار کے لیے یہ انکشاف تھا۔ وہ حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی اور پھر سرسراتی ہوئی آواز میں

بولی۔

''کیا کہا تم نے؟ گرو ہندو ہے... تمہیں کیسے معلوم ہوئی یہ بات؟''

''اس دن جب وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا، تب میں نے اس کا اصل روپ دیکھا۔ وہ جتنا بھیانک نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ بھیانک اور ظالم ہے۔'' یہ جملہ بولتے ہوئے اس کی آواز بُری طرح کپکپا گئی اور جسم بھی ہلکے ہلکے لرزنے لگا۔

''مجھے پوری طرح بتا شہزادی کہ اس روز جب تُو گرو کے ساتھ گئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ گرو تجھے کہاں لے گیا تھا؟ تو نے وہاں کیا دیکھا جو تیری ایسی حالت ہوگئی؟'' نگار نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''گرو انسان نہیں شیطان ہے۔ وہ سارے شیطان ہیں۔ انہوں نے اس معصوم لڑکی کو...'' وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی جو اس نے ماڈل ٹاؤن کی اس پرانی سی کوٹھی کے تہ خانے میں دیکھا تھا۔ نگار آنکھیں پھاڑے یہ داستان سنتی رہی۔ داستان کے اختتام تک اس کی حالت بہت بُری ہوچکی تھی۔ نگار کو لگا کہ اس کی طبیعت پھر خراب ہوجائے گی۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

''ہوش کر شہزادی! سنبھال خود کو۔ تیری آواز سن کر کہیں وہ لوگ یہاں نہ آجائیں۔'' اس نے اسے احساس دلایا پھر لپک کر ایک گلاس میں پانی بھر لائی اور اسے سہارا... دے کر بٹھانے کے بعد گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو تین گھونٹ پانی پینے کے بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلنے لگی۔

''چل آرام سے لیٹ جا۔ میں یہیں ہوں تیرے پاس۔ تیرا سر دبا دیتی ہوں۔ ملکہ اور رانی باورچی خانے میں کھانا پکا رہی ہیں۔ کھانا پک جائے تو پھر میں تجھے لا کر کھلاتی ہوں۔ اتنی کمزور ہوگئی ہے تو۔ ڈھنگ سے کچھ کھائے گی پیے گی، تب ہی جسم میں جان آئے گی۔'' نگار مسلسل بول رہی تھی اور اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کررہی تھی۔

''گرو کہاں ہے؟'' وہ تھوڑی دیر خاموش لیٹی رہی پھر نگار سے پوچھا۔

''سویا پڑا ہے۔'' نگار کے لہجے میں گرو کے لیے واضح نفرت اور بےزاری تھی۔ ایک تو اس کا اپنی شناخت چھپا کر ان لوگوں کو دھوکے میں رکھنا اور اس پر سے شہزادی کا بیان کردہ واقعہ... گرو کے لیے اس کے دل میں نفرت پیدا ہونا ایک فطری سی بات تھی۔ اس کا سر دباتے ہوئے وہ اپنی گرو کے لیے نفرت کا اظہار کرنے لگی۔

''گرو کے کرتوت تو مجھے شروع سے پسند نہیں۔ تجھے نہیں معلوم کہ وہ ملکہ اور رانی کو گانے بجانے کے علاوہ دوسرے دھندے کے لیے بھیجتا ہے۔ یہ جو وہ دونوں کبھی کبھی پوری رات گھر واپس نہیں آتیں تو اسی دھندے پر گئی ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے بد بخت اور حرام کاریاں کرنے والے پڑے ہوئے ہیں یہاں اور گرو جیسے لوگ ان کی مدد کرتے ہیں۔ مجھے بھی اس نے اس لائن پر لانے کی کوشش کی تھی لیکن میں مار کھا کر بھی راضی نہیں ہوئی تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا... پر اب اس کا اصل روپ جان کر میرا بھروسا اٹھ گیا ہے۔ ہندوؤں کے سازشی ذہن کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کیا کر جائیں۔ مجھے تو رہ رہ کر اس معصوم لڑکی کا خیال آرہا ہے جسے ان ظالموں نے اپنی دیوی ماں کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا۔ معلوم نہیں کس کے گھر کا ٹکڑا ہوگی بےچاری۔ کیسے ظالم ہیں... انسان کہلانے کے تو لائق ہی نہیں یہ لوگ۔''

''کیا کررہی ہو تم دونوں؟ کیا باتیں چل رہی ہیں تمہارے درمیان؟'' اچانک ہی گرو وہاں چلا آیا اور سخت لہجے میں ان دونوں سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں گرو! شہزادی کے سر میں درد ہورہا تھا اس لیے میں اس کا سر دبا رہی تھی۔'' نگار نے جواب دیا۔

''بس بہت نخرے اٹھا لیے اس کے۔ اس سے کہو کہ اب پلنگ کی جان چھوڑے اور کچھ کمانے دھمانے کی فکر کرے۔ ہم نے کوئی اس کے ناز نخرے اٹھانے کے لیے اسے یہاں نہیں رکھا ہوا۔'' گرو بولتا رہا اور وہ دونوں سر جھکا کر سنتی رہیں۔

☆☆☆

''کیا اطلاع ہے سجاد بھائی! کچھ معلوم ہوا شینا کے بارے میں؟'' وہ اپنی آفیشل مجبوریوں کی وجہ سے لاہور سے واپس آگیا تھا۔ اس کے ضلع میں کئی مسائل تھے جن پر توجہ دینا ضروری تھا اس لیے اس کا مزید لاہور میں رکنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''کہاں یار! کچھ معلوم ہی نہیں ہورہا۔ اتنے دنوں میں بس اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے کہ خواجہ سراؤں کا ایک گروہ مسلسل اپنے ٹھکانے سے غائب ہے۔ شینا کے اغوا اور اس گروہ کے غائب ہونے کا عرصہ ایک ہی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ شینا کے اغوا میں یہی گروہ انوالو ہے لیکن پورا کا پورا گروہ اٹھ کر کہاں چلا گیا، کچھ معلوم نہیں چل رہا۔ اب میرے پاس یہی چارہ رہ گیا ہے کہ ایسے تمام گروہوں کے ٹھکانوں پر چھاپے پڑواؤں۔'' انہوں نے افسردہ انداز میں اسے بتایا۔

''دیر کس بات کی ہے؟ آپ فوراً اس پروگرام پر عمل شروع کردیں۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے لیکن تم اندازہ کرو کہ پورے لاہور میں خواجہ سراؤں کے کتنے گروہ کام کررہے ہیں۔ ان کی اکثریت ایسے علاقوں میں رہتی ہے جو پیچ در پیچ گلیوں پر مشتمل ہیں۔ ایسے ہر گروہ تک پہنچنا، اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور پھر کوئی ایکشن لینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے مجھے جتنی پریشانی ہے، وہ صرف میں ہی جانتا ہوں لیکن پولیس فورس کو جو مشکلات درپیش ہیں، وہ بھی میرے علم میں ہیں... مگر اسے تلاش کرنے کے لیے مجھے شہر کی ایک ایک اینٹ بھی اکھاڑنی پڑی تو میں اس سے گریز نہیں کروں گا۔ مجھے اپنی بیٹی ہر حال میں چاہیے۔'' وہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہے تھے مگر آخر میں تھوڑے جذباتی ہوگئے۔

''انشاء اللہ ہمیں ہماری شینا ضرور ملے گی۔ آپ پُرامید رہیں اور مریم بھابی کو حوصلہ دیتے رہیں۔ میں فرصت ملتے ہی جلد لاہور کا چکر لگاؤں گا۔'' ریسیور کریڈل پر رکھتے ہی فوراً گھنٹی بجنے لگی۔

''پیرآباد کے ماسٹر آفتاب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں سر!'' ریسیور اٹھانے پر دوسری طرف سے اطلاع دی گئی۔

''ٹھیک ہے۔ بات کرواؤ۔'' اس نے اجازت دی۔

''السلام علیکم سر!'' دوسری طرف سے ماسٹر آفتاب کی آواز سنائی دی۔

''وعلیکم السلام... کیا حال ہے آفتاب؟ کیسے یاد کیا؟'' اگرچہ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اور وہ کوئی غیرضروری کال سننے کے موڈ میں نہیں تھا پھر بھی ماسٹر آفتاب جیسے پُرخلوص شخص سے بداخلاقی سے پیش نہیں آسکتا تھا۔

''الحمدللہ میں بہت بہتر ہوں۔ بس آپ کو انڈسٹریل ہوم والے پروجیکٹ کے سلسلے میں یاددہانی کروانے کے لیے زحمت دی تھی۔ آپ نے اس کا تذکرہ تو کیا تھا لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نظر نہیں آئی۔''

''ساری تیاری ہوچکی ہے۔ مشینوں وغیرہ کے ساتھ آج میں خود پیرآباد آؤں گا۔ مجھے چودھری افتخار سے بھی ملاقات کرنی ہے۔ انڈسٹریل ہوم کا افتتاح میں حویلی کی کسی خاتون کے ہاتھ سے کروانا چاہ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں چودھری صاحب سے بات کرنی ہے۔'' اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

''یہ تو آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے سر! اس طرح انڈسٹریل ہوم کو مضبوط بیک مل جائے گی۔ یہ چور کو چوکیدار بنانے والی بات ہے۔ حویلی کے کسی فرد کے ہاتھوں افتتاح ہونے کا مطلب ہوگا کہ پھر اس طرف سے کوئی مخالفت سامنے نہیں آئے گی۔'' آفتاب نے فوراً ہی اس کا اصل مقصد سمجھتے ہوئے اس کے فیصلے کو سراہا پھر مزید بولا۔ ''اب تو آپ پیرآباد آ ہی رہے ہیں، ملاقات ہونے پر مزید گفتگو ہوگی۔''

''نہیں بھئی، میں تمہاری طرف نہیں آسکوں گا۔ میرے لوگ سامان پہنچادیں گے۔ تم اپنی نگرانی میں سیٹنگ کروالینا۔ میں حویلی میں چودھری افتخار سے ملاقات کرکے واپس آجاؤں گا۔''

''چلیں، آج نہ سہی پھر دوبارہ کسی موقعے پر ملاقات ہوجائے گی۔'' آفتاب کو اس کا پروگرام سن کر تھوڑی سی مایوسی تو ہوئی لیکن وہ خوش دلی سے بولا۔ اس نے جواباً مسکراتے ہوئے ''انشاء اللہ'' کہہ کر فون بند کردیا۔ شیڈول کے مطابق ایک گھنٹے بعد اس کی پیرآباد کے لیے روانگی تھی۔ یہ ایک گھنٹا ضروری نوعیت کے چند کام نمٹاتے ہوئے گزر گیا۔

☆☆☆

چودھری افتخار کی حویلی میں اس کا استقبال ذرا سی حیرت کے ساتھ کیا گیا۔ اسمگلنگ والا معاملہ منظرِعام پر آنے کے بعد سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ دو الگ الگ کیمپس کے افراد ہیں۔ اگرچہ اس معاملے میں چودھری کا نام کھل کر نہیں لیا گیا تھا لیکن حقیقت تو دونوں ہی طرف کے افراد سمجھتے تھے۔

''آیئے جناب اے سی صاحب! آپ کو کیسے فرصت ملی ہمارے غریب خانے کو رونق بخشنے کی؟'' چودھری نے طنزیہ لہجے میں اس کا خیرمقدم کیا۔

''فرصت تو واقعی نہیں ہے میرے پاس مگر آپ سے ملاقات کے لیے آنا بھی اس بے تحاشا مصروفیت کا ہی ایک حصہ ہے۔'' اس نے رسان سے چودھری کے طنز کا جواب دیا۔ چودھری کی اس علاقے میں حیثیت مسلمہ تھی۔ اس کو ساتھ لے کر چلے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ وہ عوامی بھلائی کی خاطر اپنی چودھری کے لیے تمام تر ناپسندیدگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے ملنے آگیا تھا۔

''زہے نصیب... فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' اس کا جواب سن کر چودھری نے اسی طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہم اسکول کے ساتھ انڈسٹریل ہوم کا آغاز کررہے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم ظاہر ہے خواتین کے لیے کھولا جارہا ہے

اس لیے میری خواہش ہے کہ اس کا افتتاح علاقے کی ہی کسی معزز خاتون کے ہاتھوں سے کروایا جائے۔ اس سلسلے میں ایس پی صاحب کی بیگم کا نام زیرِغور آیا تھا لیکن پھر اس خیال سے رد کردیا کہ علاقے میں آپ کے گھرانے سے زیادہ بااثر کوئی اور نہیں ہے... اس لیے یہ کام حویلی ہی کی کسی خاتون کے ہاتھوں انجام پانا چاہیے۔'' وہ فوراً ہی مطلب پر آگیا۔

''حویلی کی خواتین پردہ دار ہیں۔ وہ کیسے اس طرح کا کوئی کام کرسکتی ہیں؟'' چودھری نے ناگواری سے جواب دیا تو اس کے ذہن میں بے ساختہ ہی وہ منظر ابھر آیا جب اس نے کشور کو لاہور کے ایک اسپتال میں آفتاب کے ساتھ اس طرح پایا تھا کہ اس کا ہاتھ آفتاب کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن ظاہر ہے، وہ چودھری کے سامنے اس بات کا تذکرہ نہیں کرسکتا تھا چنانچہ مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''پردے کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم پردے کا پورا خیال رکھیں گے۔ سمجھیں کہ کلی طور پر یہ خواتین ہی کی تقریب ہوگی اور کسی مرد کو تقریب میں شمولیت کی اجازت نہیں ہوگی۔ تقریب کی کوریج کے لیے اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ، میں خود اپنے کسی جاننے والے صحافی سے لکھوا کر چھپوادوں گا۔ رپورٹ میں یہ بات آنے سے کہ مسز چودھری افتخار نے انڈسٹریل ہوم کا افتتاح کیا، آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ آپ کی مسز کے ہاتھوں اس افتتاح کا یہی مطلب لیا جائے گا کہ آپ عوام کی بھلائی کے لیے کیے جانے والے ایسے کاموں میں ذاتی طور پر دلچسپی رکھتے ہیں۔''

وہ چودھری کے گرد وہی جال بُن رہا تھا جس سے وہ ہمیشہ ہی دھوکا کھاجاتا تھا۔

چنانچہ اس بار ذرا نرمی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے اے سی صاحب! اگر آپ اتنا اصرار کررہے ہیں تو میں بھی مزید انکار نہیں کرسکتا۔ آپ اپنے پروگرام کا شیڈول بھجوادیجیے گا۔ میں خواتین سے کہہ دوں گا کہ وہ مقررہ وقت پر تیار رہیں۔'' بالآخر اس نے ہامی بھرلی پھر موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔

''یہ اپنے باجوہ صاحب مفت میں پھنس گئے۔ پہلے ان پر اسمگلنگ کا الزام لگا کر پولیس نے بے جا انہیں گرفتار کیا۔ اپنے طور پر شاید پولیس والے سمجھ رہے تھے کہ جھوٹا گواہ پیش کرکے باجوہ کو مجرم ثابت کردیں گے لیکن اللہ بندے کی عزت رکھنے والا ہے۔ گواہ عدالت میں پولیس کی مرضی کے مطابق بولا ہی نہیں اور باجوہ بےقصور ثابت ہوگیا۔'' چودھری کے یہ ذکر چھیڑنے پر اس کے سینے میں کوئی آگ سی دہکنے لگی۔ اسے گواہ کا عین وقت پر بیان بدلنا اور پھر عدالت سے باہر نکلتے ہی قتل ہوجانا بھولا تو نہیں تھا۔ ایسے میں چودھری کا دھڑلے سے یہ کہنا کہ اللہ نے باجوہ جیسے شخص کی عزت رکھ لی تھی، صریحاً ڈھٹائی تھی۔ اس بات کو تو یوں سمجھانا چاہیے کہ اللہ ظالم کی رسّی دراز کرتا چلا جاتا ہے لیکن جب ایک مقررہ وقت پر وہ رسّی کھینچے گا تو پھر ایسے افراد کو کہیں کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی۔

''مجھے یقین ہے کہ جیسے باجوہ پر یہ الزام ثابت نہیں ہوسکا، اسی طرح اس پر نااہلی اور کوتاہی کا جو الزام لگا کر اسے اس کے عہدے سے معطل کیا گیا ہے، ایک دن وہ الزام بھی غلط ثابت ہوجائے گا۔'' اس کی اندرونی کیفیت کو چودھری بھی سمجھتا تھا لیکن اَن جان بنا اپنے خیالات کا اظہار کیے جارہا تھا۔

''ان سب باتوں کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ قبل از وقت کسی بھی قسم کی قیاس آرائیاں کرنا بےکار ہے۔ وقت خود سب سے بڑا منصف ہے، وہ خود ہی سچ اور جھوٹ کو کھول کر سامنے لے آئے گا۔'' چودھری کی بات کے جواب میں وہ سنجیدگی سے بولا پھر یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''اب اجازت دیجیے چودھری صاحب! مجھے کچھ دوسرے اہم کام بھی نمٹانے ہیں۔''

''کچھ دیر تو رکیے۔ رات کے کھانے کا وقت ہونے ہی والا ہے، کھانا کھا کر جایئے گا۔'' چودھری نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''نو تھینکس! کھانے کی کوئی خواہش نہیں۔ یہاں سے جا کر بھی میں مشکل ہی سے کھانا کھاؤں گا۔'' اس نے رسان سے انکار کیا۔

''میں سمجھتا ہوں... جس خاندان کی جوان لڑکی غائب ہوگئی ہو اس کے افراد کی بھوک پیاس اڑ جانا تو بالکل فطری سی بات ہے۔ آپ کی پھر بھی ہمت ہے کہ خود کو سنبھال کر دوسرے دھندوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ نہ کرے ہمارے ساتھ ایسا کوئی حادثہ ہوجاتا تو ہم زمین آسمان ایک کر ڈالتے۔'' بے حد ہمدردی سے کہے چودھری کے ان الفاظ نے اسے ایک پل کے لیے سُن سا کردیا۔ اپنے طور پر انہوں نے یہ بات راز میں رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن تلاش کے سلسلے میں اتنے لوگ انوالو تھے کہ مکمل طور پر رازداری کا امکان ہی نہیں تھا۔ کسی ذریعے سے چودھری تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی اور وہ ہمدردی کی آڑ میں اس پر طنز کا ایک تیر چلا گیا تھا۔ اس تیر سے گھائل ہونے کے باوجود اس نے کوئی جواب

نہیں دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''سیٹھ سندر رام۔'' کوٹھی کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا یہ نام پڑھنے کے بعد انہوں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا تو اس نے فوراً زوردار آواز میں گاڑی کا ہارن بجایا۔ ردعمل میں ذیلی دروازہ کھول کر چوکیدار باہر نکلا۔

''ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب تشریف لائے ہیں۔ سیٹھ سندر رام سے ان کی اس وقت ملاقات طے ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا تو چوکیدار پھرتی سے بڑا گیٹ کھولنے لگا۔ یقیناً اسے سیٹھ سندر رام کی طرف سے پہلے ہی ڈی آئی جی سجاد رانا کی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ گیٹ سے گزر کر ان کی گاڑی پورٹیکو میں داخل ہوئی تو سیٹھ سندر رام ان کے استقبال کے لیے خود وہاں آ پہنچا۔ یقیناً گیٹ کھولنے کے بعد چوکیدار نے سب سے پہلے انٹرکام پر اندر اطلاع کر دی تھی۔ سندر رام ایک مشہور صنعت کار تھا جس کی کئی ٹیکسٹائل ملز چل رہی تھیں۔ اس کی دولت کے سامنے ماڈل ٹاؤن میں واقع یہ پرانی سی کوٹھی بہت معمولی تھی اور جاننے والوں کو حیرت میں مبتلا کرتی تھی کہ اس جیسی حیثیت کا مالک اتنی عام سی کوٹھی میں کیوں رہتا ہے؟

''آپ کی طرف سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی گئی تو بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کی فیملی کا تو بڑا نام ہے۔ اتنی نامور فیملی کی ایک شخصیت مجھ سے ملنا چاہتی ہے، یہ سننے کے بعد میں نے اپنی ساری مصروفیات ملتوی کر دیں اور آپ کا انتظار کرنے لگا۔'' بہت جوش و خروش سے ان کا استقبال کرنے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے بولا۔

ہندو ہونے کے باوجود اس کی اردو بہت صاف تھی اور ایسا یقیناً اس لیے تھا کہ وہ پشتا پشت سے یہیں رہ رہا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس کے بزرگوں نے اپنا کاروبار سمیٹ کر یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے جانے کے بجائے یہیں رہنا مناسب سمجھا تھا اور ان کا یہ فیصلہ اس حساب سے بہت سودمند تھا کہ وہ پاکستان میں رہ کر خوب پھل پھول رہے تھے۔

''تھینک یو سندر رام صاحب! مجھے احساس ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ میری طرف سے ملاقات کی اس اچانک خواہش کی وجہ سے آپ کا شیڈول ڈسٹرب ہوا ہوگا لیکن معاملہ ہی ایسا تھا کہ میرا فوری طور پر آپ سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔'' سندر رام کے اشارے پر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ وہ خود بھی ان کے مقابل ایک دوسرے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

''کیوں غیروں جیسی بات کر رہے ہیں رانا صاحب! آپ کے لیے تھوڑا سا ڈسٹرب ہونا مجھے بالکل بُرا نہیں لگا۔ میں نے پورے من سے آپ کو اپنے غریب خانے پر خوش آمدید کہا ہے۔''

''اپنی کوٹھی کے لیے غریب خانے کی اصطلاح خوب استعمال کی آپ نے۔ ویسے تو یہ کوٹھی کافی ٹھیک ٹھاک ہے لیکن آپ جیسے انڈسٹریلسٹ کے اعتبار سے تو یہ واقعی غریب خانہ ہی لگتی ہے۔'' سجاد رانا پولیس کا ایک تربیت یافتہ اور سینئر آفیسر تھا۔ ایک چھوٹی سی بات کا سرا تھام کر بہت خوب صورتی سے گفتگو کو اپنے مطلب کے رخ پر موڑ دیا۔

''یہ بات بہت لوگ کہتے ہیں مجھ سے لیکن میں اس کوٹھی میں ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ اصل میں یہ کوٹھی میرے بزرگوں نے اس وقت بنوائی تھی جب یہاں اردگرد کوئی اور عمارت نہیں تھی۔ پُرکھوں کی نشانی، اس کوٹھی کو چھوڑنے پر میرا من راضی نہیں ہوتا۔ اگر بال بچے ساتھ ہوتے تو اس کوٹھی کو چھوڑ کر کہیں جانے پر غور کرتا۔ پتنی برسوں گزرے پرلوک سدھار گئی۔ بیٹی بیاہ کر کینیڈا چلی گئی۔ بیٹا آسٹریلیا میں ہے وہاں سے پڑھ لکھ کر واپس آئے گا تو اپنے لیے اپنی مرضی سے پسند کے مطابق کوئی اور کوٹھی دیکھ لے گا۔ تب تک میں اپنے پُرکھوں کی اس نشانی کے ساتھ خوش ہوں۔'' اس نے ذرا تفصیل سے ان کے سوال کا جواب دیا۔

''یہ آپ کے مزاج کی سادگی ہے جو آپ اس طرح سوچتے ہیں، ورنہ دنیا کا تو یہ چلن ہے کہ ذرا سا روپیا ہاتھ میں آیا نہیں اور سب بھول بھال کر اونچے سے اونچا اڑنے کی فکر میں ماضی سے جان چھڑا لی۔'' انہوں نے یونہی رواداری میں ایک بات کہی۔ اسی وقت ٹرالی دھکیل کر اندر آتی ہوئی ملازمہ کی وجہ سے ان کی توجہ بٹ گئی۔ ملازمہ سندر رام کے اشارے پر ٹرالی چھوڑ کر فوراً ہی باہر چلی گئی۔

''یہ میری ملازمہ سونی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی ہمارے ہاں ہی ملازمت کرتے تھے۔ وہ دونوں چند برس گزرے آگے پیچھے مر گئے۔ یہ چونکہ یہیں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی اس لیے میرے مزاج کو خوب سمجھتی ہے۔ میں ملازموں کی بھیڑ بھاڑ کو پسند نہیں کرتا۔ گیٹ پر چوکیدار رہتا ہے اور اندر کے سارے کام یہ خود اکیلی ہی سنبھال لیتی ہے۔ باہر کی دنیا میں اس بے چاری کے لیے کچھ رکھا بھی نہیں ہے۔ آپ خود بھی جانتے ہوں گے کہ اس جنس کے افراد کے ساتھ لوگ کیسا بُرا سلوک کرتے ہیں۔'' ان کی آنکھوں میں تیرتی الجھن

کو دیکھ کر سندر رام نے خود ہی سونی کا تعارف کروا دیا۔

''جی ہاں، مجھے اندازہ ہے۔'' انہوں نے سرسری لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور پھر ذرا سا کھنکھارتے ہوئے بولے۔ ''میری اس وقت آپ کے پاس آمد کا تعلق کچھ انہی افراد سے متعلق ہے۔ معاملہ ایسا ہے کہ پولیس پارٹی آپ کے پاس تفتیش کے لیے آتی یا کم از کم آپ کی ملازمہ کو تھانے بلوایا جاتا... لیکن آپ کی حیثیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ کسی چھوٹے آفیسر کو آپ کے پاس بھیجنے کے بجائے میں خود آ کر آپ سے بات کروں۔''

''ایسا کیا مسئلہ ہے ڈی آئی جی صاحب! کیا سونی سے کوئی جرم ہوا ہے؟ لیکن وہ بے چاری تو کوٹھی سے باہر جاتی ہی نہیں۔'' سندر رام نے تشویش سے پوچھا۔

''سونی کوٹھی سے باہر نہیں جاتی یہ تو میرے بھی علم میں ہے لیکن ہماری اطلاع کے مطابق اٹھارہ تاریخ کی شام آپ کی کوٹھی پر سونی جیسے کئی افراد کا اجتماع ہوا تھا۔ میں سونی سے ان افراد کے بارے میں جاننے کے علاوہ اس اجتماع کی نوعیت کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''اٹھارہ تاریخ...'' سندر رام نے سوچنے کے انداز میں اپنی کنپٹی پر انگلی کی مدد سے دو تین ہلکی سی ضربیں لگائیں اور پھر بولا۔ ''اٹھارہ تاریخ کو میں کراچی میں تھا۔ اس دن کے لیے سونی نے مجھ سے اجازت لے رکھی تھی کہ وہ اپنی چند سہیلیوں کو دعوت پر بلانا چاہتی ہے۔ اس کی سہیلیاں ظاہر ہے، اس جیسی ہی ہوں گی لیکن اس بات سے پولیس کو کیا پریشانی ہے؟ اس طرح کے لوگوں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا اور مل بیٹھنا قانوناً کوئی جرم تو نہیں۔''

''میں نے اسے جرم کہا بھی نہیں ہے لیکن میں ایک جرم کی کھوج میں ضرور ہوں۔ سترہ تاریخ کی صبح ایک لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس نے اپنی تحقیقات کے ذریعے اس گروہ کے بارے میں کچھ کلیوز تو حاصل کر لیے ہیں لیکن وہ گروہ غائب ہو گیا ہے۔ میں سونی سے مل کر اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے اپنا مقصد بیان کیا۔

''ٹھیک ہے، میں سونی کو بلوا لیتا ہوں لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ سونی کی کسی جرائم پیشہ گروہ کے افراد سے دوستی نہیں ہو سکتی۔'' سندر رام نے انہیں جواب دیا اور گھنٹی کا بٹن دبا کر سونی کو طلب کر لیا۔

''مجھے سیٹھ صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ اٹھارہ تاریخ کو تم نے اپنی کچھ سہیلیوں کو دعوت پر بلا رکھا تھا... اپنی ان سہیلیوں کی تعداد اور نام پتے لکھوا دو۔'' سونی کے حاضر ہوتے ہی انہوں نے اسے حکم دیا۔

''تعداد اور نام تو میں بتا سکتی ہوں صاحب لیکن سب کے پتے مجھے نہیں معلوم۔ اصل میں، میں خود تو باہر آتی جاتی نہیں ہوں اس لیے مجھے کسی کا پتا لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''پھر تمہاری ان لوگوں سے دوستی کیسے ہوئی؟'' انہوں نے سختی سے سوال کیا۔

''آپ کو تو معلوم ہے صاحب کہ ہم جیسوں کا زیادہ تر گزارہ بھیک مانگ کر ہی ہوتا ہے۔ بس ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے دو تین افراد ایک بار مانگنے کے لیے آئے تو چوکیدار کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے خود گیٹ پر جانا پڑا۔ اپنے جیسی ایک ہستی کو ایک گھر میں دیکھ کر ان لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی پھر ہفتے پندرہ دن میں جب بھی ان کا چکر لگتا، وہ مجھ سے مل کر ضرور جاتے۔ سیٹھ صاحب بڑے دیالو ہیں۔ مجھے اجازت ہے کہ میں دروازے پر آنے والے فقیر کو جو چاہے دے دوں، اس لیے میرے بھائی بند جب بھی آتے خوش ہو کر جاتے۔ انہی کی وجہ سے آہستہ آہستہ میری گھر بیٹھے دو چار اور سے بھی دوستی ہو گئی۔'' سونی نے وضاحت پیش کی جس پر سر ہلاتے ہوئے انہوں نے اپنی جیب سے چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور اسے اٹھارہ تاریخ کی دعوت میں شریک افراد کے نام لکھوانے کو کہا۔ سونی نے چھ افراد کے نام لکھوائے۔ ساتھ ہی علاقوں کے نام بھی بتا دیے۔ مکمل پتے اسے نہیں معلوم تھے لیکن بہ قول اس کے بات چیت میں رہائشی علاقوں کا ذکر تو نکل ہی آتا تھا۔

''اچھا، ذرا یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کسی کو تم پہچانتی ہو؟'' انہوں نے کارڈ سائز کی ایک تصویر اس کے سامنے کی۔ اس تصویر میں تین خواجہ سرا ناچتے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ مشکوک گروہ کے افراد کی یہ تصویر بڑی تگ و دو کے بعد ان کے ہاتھ آئی تھی۔ سونی نے ان کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی پھر فوراً ہی واپس کر دی۔

''نہیں صاحب! میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔'' تصویر انہیں پکڑاتے ہوئے اس نے یہ جملہ بولا۔ اس نے جس سپاٹ انداز میں تصویر کو دیکھا تھا، اس کے بعد وہ اسی جواب کی توقع کر رہے تھے۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' انہوں نے مایوس ہوتے ہوئے

اسے جانے کی اجازت دی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں ڈی آئی جی صاحب کہ اغوا ہونے والی لڑکی کون ہے؟ آپ کی یہاں آمد سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت بااثر گھرانے سے ہے۔'' سندر رام نے ان سے سوال کرتے ہوئے خود ہی ایک خیال بھی پیش کر دیا۔

''آپ کا خیال درست ہے۔ زیادہ تفصیلات بتانے سے میں معذور ہوں۔'' انہوں نے اسے جواب دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ سندر رام نے بھی فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ خلوص سے بولا۔ ''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتایئے گا۔ سونی بھی ہر وقت آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار رہے گی۔''

''تھینک یو!'' اس کی پیش کش کے جواب میں انہوں نے فقط اتنا ہی کہا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے۔ ڈرائیور کم باڈی گارڈ نے انہیں دیکھتے ہی پھرتی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ان کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ گاڑی پورٹیکو سے نکل کر مین گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا مگر ان کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی گیٹ سے باہر لے جانے کے بجائے درمیان میں ہی روک دی اور چوکیدار کو اشارے سے گاڑی کے قریب بلوایا۔

''کیا حکم ہے صاحب؟'' چوکیدار سمجھ گیا تھا کہ گاڑی رکوا کر اسے بلوانے والا کون ہے اس لیے پچھلی نشست پر بیٹھے سجاد رانا سے کھڑکی میں جھک کر پوچھا۔

''یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کوئی اٹھارہ تاریخ کو سونی کی طرف سے دی ہوئی دعوت میں شرکت کے لیے آیا تھا یا نہیں۔'' انہوں نے وہی تصویر جو کچھ دیر قبل سونی کو دکھائی تھی، اس کے آگے لہرائی۔

''مجھے نہیں معلوم صاحب! دعوت والے دن میں ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ چھٹی لے کر اپنی بہن سے ملنے گیا ہوا تھا۔ ویسے میرے خیال میں ان میں سے کوئی دعوت میں نہیں آیا ہو گا۔ میں نے سونی کی سہیلیوں کو دیکھ رکھا ہے۔ اس تصویر میں ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔'' چوکیدار نے جواب دیا تو انہوں نے تصویر واپس رکھتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا حکم دے دیا۔

اس وقت ان پر شدید مایوسی اور جھنجلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ شینا کے بارے میں جو واحد کلیو ملا تھا، وہ بھی بے کار چلا گیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں ہنوز ناکام تھے۔ آج پہلی بار انہیں ایسے افراد کا خیال آ رہا تھا جو عوام میں شمار ہونے کے باعث اپنی جان، مال اور عزت میں سے کچھ بھی گنوانے پر پولیس اسٹیشن کے چکر ہی کاٹتے رہ جاتے تھے لیکن انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اتنے بارسوخ ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کو ڈھونڈنے میں ناکام تھے اور ناکامی بے بسی کا احساس دلاتی ہے۔ بے بس آدمی امیر ہو یا غریب بالآخر ایک ہی سطح پر کھڑا نظر آنے لگتا ہے۔

☆☆☆

چن سجنا دے نیڑے نیڑے ہو
ڈھول جانیا دے نیڑے نیڑے ہو

بے سری آوازوں میں گائے جانے والے گانے کے بولوں کا ساتھ نبھانے کے لیے پیشانی تک دوپٹا اوڑھے وہ سر جھکائے مشینی انداز میں ڈھول بجا رہی تھی۔ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود ڈھول پر پڑنے والی ہر تھاپ بڑی نپی تلی تھی جس کی دھمک ہر ایک اپنے دل پر محسوس کر سکتا تھا۔ ملکہ، رانی اور نگار ٹھمکے لگاتی، ڈھول کی لے پر اپنی بھونڈی آواز میں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ان کے گرد موجود عورتوں، بچوں اور مردوں کا مجمع خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تالیاں بجا بجا کر بلند آواز میں داد دی جا رہی تھی لیکن یہ داد ایسی تھی جس میں تمسخر کا پہلو نمایاں تھا۔ وہ تینوں تو شاید عادی تھیں ایسے بے ہودہ فقرے اور مذاق برداشت کرنے کی... لیکن وہ جو جبراً ان کے ساتھ شامل کی گئی تھی، ہر بار بڑی اذیت کے ساتھ یہ سب سہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر غصے اور خفت کی سرخی تھی لیکن چہرے پر بے ہنگم طریقے سے تھپی میک اپ کی موٹی تہ کے باعث اس سرخی کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ان تینوں کے ساتھ شامل ہو کر ڈانس کرنے والے دو منچلوں نے چاہا بھی کہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے اسے کچھ بولنے پر مجبور کر سکیں مگر وہ لب سیے ڈھول بجاتی رہی۔ خدا خدا کر کے گانے اور ناچنے کا سلسلہ ختم ہوا تو حاضرین کی طرف سے نچھاور کیے گئے نوٹ سمیٹے جانے لگے۔ وہ اس کام میں بھی شامل نہیں ہوئی اور ڈھول کی ڈوریاں کستی ایک طرف بیٹھی رہی۔

''خالہ! آج رات اسے ڈھول بجانے کے لیے یہیں روک لیں۔ ہم لوگوں کا آج رت جگا کرنے کا پروگرام ہے، پر ڈھنگ سے ڈھول بجانا کسی کو نہیں آتا۔ یہ اتنا اچھا ڈھول بجاتی ہے، آپ اس کو روک لیں تو ہمارا کام بن جائے گا۔'' وہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھی کہ اسے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

''دماغ خراب ہے کیا؟ رات بھر اس ہیجڑے کو یہاں روک کر مجھے لوگوں کی باتیں سننی ہیں کیا؟'' خالہ کہہ کر مخاطب کی جانے والی عورت نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی نہیں سنائے گا باتیں۔ آپ کے سامنے کسی کی کیا مجال کہ کچھ کہہ سکے۔'' اس بار خوشامد سے کام لیا گیا۔

''بالکل خالہ! انیسہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' ایک اور آواز سنائی دی اور پھر تو جیسے ساری ہی لڑکیاں اس عورت کے پیچھے لگ گئیں۔ لڑکے بھی لڑکیوں کی حمایت کرنے لگے۔ شاید انہیں تفریح کا ایک عمدہ موقع ہاتھ آتا نظر آ رہا تھا۔ آخر کار اس عورت کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کرخت آواز میں بولی۔

''چپ کر جاؤ کم بختو! سن لی ہے میں نے تمہاری بات... پر مجھے ان لوگوں سے تو پوچھ لینے دو۔'' پھر وہ اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں بھئی! کیا ارادہ ہے تیرا؟ رکے گی رات یہاں؟ پورے پانچ سو دوں گی۔'' وہ چپ رہی۔

''اس اکیلی کو ہم رات بھر کے لیے یہاں نہیں چھوڑ کر جا سکتے۔ یہ بڑی سیدھی ہے، اکیلی گھبرا جائے گی۔'' ملکہ جو گرو کی غیر موجودگی میں اپنی سینیارٹی کی وجہ سے گروہ میں سب سے زیادہ مقام رکھتی تھی، خود جواب دینے کے لیے آگے بڑھی۔

''تو تم میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ رک جائے حفاظت کے لیے۔'' عورت نے نخوت سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، پر صرف پانچ سو روپے پر بات نہیں بنے گی۔ ساتھ ایک جوڑا، مٹھائی کا ڈبا اور تھوڑا اناج بھی دینا ہو گا۔'' ملکہ نے فوراً سودے بازی شروع کر دی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... دے دوں گی۔ میری بھانجیوں بھتیجیوں نے فرمائش کی ہے۔ اب میں ہاں کرنے کے بعد ان معمولی چیزوں کے پیچھے ان کا دل تو نہیں توڑ سکتی۔'' عورت نے بے حد شاہانہ انداز میں جواب دیا جس پر وہاں موجود لڑکے لڑکیوں نے زوردار نعرے لگائے۔

''میں رک جاتی ہوں شہزادی کے ساتھ یہاں۔''

عورت کے ہامی بھرتے ہی نگار نے ازخود پیش کش کی جسے ملکہ نے قبول کر لیا اور دھیمے مگر سخت لہجے میں نگار سے بولی۔ ''دھیان رکھنا۔ اگر یہ اِدھر اُدھر ہوئی تو گرو تیری کھال کھینچ لے گا۔''

''مجھے معلوم ہے سب... تُو زیادہ ہدایتیں نہ دے۔'' نگار نے رعب میں آئے بغیر جواب دیا۔ اس جواب پر ملکہ نے اسے گھور کر دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔ پھر وہ اور رانی کچھ دیر بعد وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

''کڑیوں! پہلے کھانا وانا کھا لو... پھر بعد میں آرام سے گانے بجانے بیٹھنا۔'' کرخت آواز والی عورت نے حکم دیا تو ان کے گرد موجود ہجوم چھٹنے لگا اور کھانے کے لیے ایک دوسرے کو آوازیں دی جانے لگیں۔ صحن میں موجود لڑکے جو وہیں رک کے ان پر جملے کس رہے تھے، وہ بھی کسی کے پکارنے پر اندر چلے گئے۔ ایک لڑکی نے پلاؤ سے بھری دو پلیٹیں ان دونوں کو بھی لا تھمائیں۔

''یہ اچھی مصیبت ہے۔ پیسے کے لالچ میں وہ لوگ ہمیں رات بھر ذلت سہنے کے لیے یہاں چھوڑ گئے۔'' تنہائی ملتے ہی اس نے دھیمی آواز میں نگار کے سامنے اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

''بے وقوف! اچھا ہے کہ وہ لوگ لالچ میں تجھے یہاں چھوڑ گئے۔ سمجھ لے کہ ان کے لالچ کی وجہ سے تجھے آزادی حاصل کرنے کا ایک موقع مل گیا ہے۔ ویسے تو سب تجھ پر نظریں گاڑ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ تو اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔'' ایک بڑا سا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے نگار نے اسے جواب دیا تو وہ حیران رہ گئی اور اسی حیرانی کے عالم میں بولی۔

''کیا مطلب؟ تم مجھے یہاں سے گرو کے اڈے کے علاوہ کہیں اور جانے دو گی؟'' نگار نے زبان سے جواب نہیں دیا، اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

''میں ہاتھ سے نکل گئی تو گرو تمہارا بہت بُرا حال کرے گا۔ یاد نہیں ابھی ملکہ جاتے جاتے کیا بول کر گئی ہے؟'' وہ خود بھی اس ماحول سے فرار کی خواہش مند تھی... خصوصاً گرو کا اصل روپ دیکھنے کے بعد تو اس کی نفرت کئی گنا بڑھ گئی تھی لیکن اپنی وجہ سے نگار کو مصیبت میں ڈالنا اسے گوارا نہیں تھا۔ نگار نے اس کی تشویش سن کر کان پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ ہلایا اور جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے نوالہ حلق سے نیچے اتار کر بولی۔

''گرو کی ایسی کی تیسی۔ اس کافر کے ڈر سے اب میں تجھ پر مزید ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ تجھے سمجھ نہیں آیا مگر میں سمجھ چکی ہوں کہ اس دن گرو تجھے کس لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا... اگر تو زخمی نہ ہو گئی ہوتی تو اس لڑکی کی طرح تجھے بھی وہ لوگ بلی چڑھا دیتے۔ اللہ سائیں کا کرم ہو گیا تجھ پر کہ تُو ٹیکسی والے کی وجہ سے زخمی ہو گئی۔ اب وہ مردود زخمی لڑکی کو تو اپنی دیوی کے آگے بھینٹ چڑھا نہیں سکتے تھے، اس لیے تجھے چھوڑ دیا، پر جب تُو پوری طرح ٹھیک ہو جائے گی تو گرو پھر دوبارہ تجھے وہاں لے جائے گا۔'' نگار کی باتیں سن کر وہ بُری طرح کانپ

اٹھی اور نظریں بے ساختہ اپنے زخمی ہاتھ کی طرف گئیں۔ وہاں موجود زخم مندمل ہونے لگا تھا۔ اس زخم نے اسے بہت تکلیف دی تھی لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑی سی تکلیف اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی تھی۔

''میں نے سوچ لیا ہے، ہم صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے چپکے سے یہاں سے نکل جائیں گے۔ ان لوگوں سے روپے میں رات میں ہی وصول کرلوں گی۔ تجھے جہاں جانا ہو، چلی جانا... میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ تجھے بھی میں اپنے ساتھ ہی لے جاتی مگر مجھے معلوم ہے کہ گروہ ہماری تلاش میں سب سے پہلے وہیں پہنچے گا۔ میری تو خیر ہے۔ آخر کو میرے سگے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔ میری جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے لیکن تجھے وہاں پناہ نہیں ملے گی۔ میرا اپنے گھر والوں پر بس چلتا ہوتا تو میں تجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلتی، پر میں خود مجبور ہوں... ورنہ اللہ گواہ ہے کہ میرے دل میں تیرے لیے سگی بہنوں جیسا پیار پیدا ہو گیا ہے۔'' وہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتی ہوئی نم سے لہجے میں بولی۔

''تم میرے لیے جو کچھ کر رہی ہو وہ بھی بہت ہے۔ تمہاری اس قربانی نے تو مجھے میری اپنی بہن کی یاد دلا دی ہے۔'' اس نے نگار کا ہاتھ تھام کر گلوگیر لہجے میں جواب دیا تو وہ دوسرے ہاتھ سے پیار بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگی پھر یک دم ہی اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

''چل ہٹ، خود تو کچھ کھاتی نہیں۔ لے کر میرا پلاؤ بھی ٹھنڈا کروا رہی ہے۔'' یہ کہنے کے ساتھ اس نے گفتگو کے دوران ایک طرف رکھ دی جانے والی اپنی پلیٹ دوبارہ اٹھالی۔ شہزادی بھی مسکراتی ہوئی اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھیں کہ لڑکیوں نے آ کر انہیں گھیر لیا۔ صحن میں بڑی سی دری پر چاندنیاں بچھا کر محفل سجالی گئی۔ پنجابی ٹپوں، انڈین اور پاکستانی فلمی گانوں اور پاپ سنگرز کے گائے مشہورِ زمانہ گیتوں سمیت ہر شے کی ٹانگ توڑی جانے لگی۔ نگار ان لڑکیوں کا ساتھ دینے میں پیش پیش تھی، البتہ اس نے حسبِ معمول ہونٹ سی لیے تھے۔

''اے چلو، اندر چل کر گاتے ہیں۔ جس کی خاطر ہم اپنا گلا پھاڑ رہے ہیں، وہ محترمہ تو آرام سے سو رہی ہیں۔ ذرا اس کے سر پر بھی تو جا کر ہنگامہ کیا جائے تاکہ اسے پتا چلے کہ بیاہ کرنا کوئی ایسی آسان بات نہیں۔'' گاتے گاتے ایک لڑکی نے آئیڈیا دیا جسے سب نے پسند کیا مگر چارپائیوں پر ذرا فاصلے پر بیٹھے لڑکے احتجاج کرنے لگے۔ انہیں مایوں بیٹھی دلہن کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی اور لڑکیوں کے اندر چلے جانے کی صورت میں ان کی تفریح ختم ہو جاتی۔

''ٹھیک ہے، تم سب اندر جاؤ مگر ان دونوں کو یہیں رکنا پڑے گا۔'' ذرا سی بحث کے بعد شہزادی اور نگار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک لڑکے نے شرط پیش کی۔

''انہیں تو تم نہیں روک سکتے۔ انہیں تو ہمارے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ ہم نے خالہ سے کہہ کر انہیں روکا ہے۔'' ایک لڑکی نے چمک کر جواب دیا۔

''لیکن خالہ نے عورتوں اور لڑکیوں کے سوا کسی اور کو دلہن کے کمرے میں جانے سے بھی تو منع کیا ہے۔'' اسی لڑکے نے اعتراض کیا۔

''ہاں تو یہ کون سا مرد ہیں؟'' لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''عورت بھی تو نہیں۔'' فوراً اعتراض ہوا جس پر سب نے زوردار قہقہہ مارا... یہ سوچے بغیر کہ ان کے اس ہنسی ٹھٹھول پر کسی کی دل آزاری ہو رہی ہے۔

''تم جو بھی کہو، ہم انہیں اپنے ساتھ اندر لے جائیں گے۔'' ہنسی کا طوفان تھما تو لڑکیوں نے سراسر زبردستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کو اپنے نرغے میں لے کر اندرونی حصے کا رخ کیا۔ وہ سب انہیں لے کر جس کمرے میں داخل ہوئیں، وہاں ایک لڑکی زرد لباس میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ لباس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ لڑکیوں کو کمرے میں آتے دیکھ کر وہ چارپائی پر اٹھ بیٹھی اور حیرت سے انہیں سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''بہت سو لیں بی بنو! اب کچھ دیر ہمارے ساتھ جاگو۔ ہم پاگل نہیں کہ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانے بنے رہیں۔ تمہیں بھی ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔'' اس کی نظروں کے سوال کا جواب فوراً دیا گیا۔

''میں بہت تھک گئی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں۔'' اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

''کل دن بھر سو لینا۔ ویسے بھی ابھی تو تمہارے مہندی بھی لگنی ہے۔ اس کے لیے تو تمہیں جاگنا ہی پڑے گا۔'' اس کی بے زاری کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے کسی نے کہا اور پھر جس کو جہاں جگہ ملی، وہ وہاں بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر گانے بجانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی، تیسری بار ڈھول سنبھالا تھا۔ عام حالات میں وہ رات بھر بھی یہ کام کر سکتی تھی لیکن اب ہاتھ کا زخم بے حد تکلیف

دینے لگا تھا اس لیے ڈھول بجانا روک دیا۔

''کیا ہوا... کیوں ڈھول نہیں بجا رہیں؟'' لڑکیوں نے فوراً شور مچانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔

''اوئی اللہ! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تیرا ہاتھ زخمی ہے۔ لا مجھے دے ڈھول، میں بجاتی ہوں۔'' نگار سب سے پہلے اس کا مسئلہ سمجھی اور فوراً اس سے ڈھول لے لیا۔ وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کئی دن بیمار رہی تھی اس لیے ابھی تک کمزوری بہت تھی۔ اتنی دیر کی محنت نے اور بھی تھکا دیا تھا۔ تھکن سے اکڑ جانے والی پیٹھ کو آرام دینے کے لیے اس نے چارپائی کے پائے سے پشت ٹکا دی۔ اسی وقت اس کی نظر چارپائی کے نیچے پڑی ایک پاسپورٹ سائز تصویر پر پڑی۔ تصویر میں موجود چہرہ اسے کچھ آشنا لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تصویر کو چپکے سے وہاں سے اٹھا لیا۔ تصویر میں موجود شخص سے وہ واقعی واقف تھی۔ اس شخص کی شناخت ہو گئی تو اس نے سر موڑ کر دلہن کا جائزہ لیا۔ زرد رنگت والی بے زار صورت دلہن یقیناً اس شادی پر خوش نہیں اور اس کے ناخوش ہونے کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

''اے کڑیوں! پارلر والی کا فون آیا ہے کہ اس کی پھوپی فوت ہو گئی ہے اس لیے وہ مہندی لگانے نہیں آ سکتی۔ اب تم لوگ خود ہی کچھ کر لو۔'' اسی وقت وہی کرخت آواز والی عورت کمرے میں آئی اور اپنی مخصوص آواز میں اطلاع دی۔

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ لگانے کو تو کوئی بھی مہندی لگا دے، پر دلہن کے ہاتھوں پیروں پر تو بڑی اچھی مہندی لگنی چاہیے۔'' لڑکیاں فوراً شور مچانے لگیں۔

''میں لگا دوں دلہن کو مہندی! مجھے بڑی اچھی مہندی لگانی آتی ہے۔'' ان کی پریشانی دیکھ کر اس نے بھاری آواز میں پیش کش کی۔

''ہیں... تم بولتی بھی ہو؟ ہم تو سمجھے تھے تم گونگی ہو۔'' اس کی زبان سے نکلنے والا یہ پہلا فقرہ سن کر ایک لڑکی نے حیرت کا اظہار کیا، وہ جواباً ذرا سا مسکرا کر رہ گئی۔

''چلو تم ہی لگا دو... پر یاد رکھو، مہندی لگانے کے صرف سو روپے دوں گی۔ زیادہ منہ مت کھولنا۔'' عورت کا تو جیسے مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی پیش کش قبول کرتے ہوئے ساتھ ہی اپنی شرط بھی سنا دی جو اس نے فوراً ہی منظور کر لی۔ ایک لڑکی نے اسے کون مہندی لا کر دے دی۔ وہ اوپر چارپائی پر دلہن کے مقابل بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی کی ہتھیلی پر تصویر رکھی۔ تصویر دیکھ کر وہ چونک گئی اور جلدی سے ارد گرد نظر ڈالی۔ عورت باہر جا چکی تھی اور لڑکیاں دوبارہ سے گانے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر دھری تصویر فوراً اپنے تکیے کے غلاف میں چھپا دی۔

''تم نیلم ہو؟'' کون مہندی دائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس کی ہتھیلی پر پہلی لکیر ڈالتے ہوئے اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ اس سوال پر اسے بہت زوردار جھٹکا لگا۔

''تم... تم کون ہو؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''میں جو بھی ہوں، اتنا جانتی ہوں کہ یہ سرمد ہے اور نیلم سے محبت کرتا ہے۔ کیا تم سرمد کی محبت نیلم نہیں ہو؟'' ڈھول اور گانوں کے درمیان ان کی بے حد دھیمی آواز میں کی گئی گفتگو کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''ہاں، میں نیلم ہی ہوں... سرمد کی نیلم۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

''یقیناً سرمد تمہارے ماں باپ کی شرط کے مطابق کسی باعزت نوکری یا کاروبار کا انتظام نہیں کر سکا اس لیے اب تم کسی اور سے شادی کر رہی ہو؟'' اس نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''ماں باپ کی شرط نہیں، صرف سوتیلی ماں کی شرط۔ یہ عورت جو ابھی اندر آئی تھی، میری سوتیلی ماں ہے۔ اسی نے میرے ابا کو بہکا کر سرمد کا رشتہ قبول نہیں ہونے دیا۔ شروع سے اس کی خواہش تھی کہ میری شادی اس کے بڈھے، لنڈورے، چار بچوں کے باپ مگر دولت مند پھوپی زاد سے ہو جائے۔ وہ خبیث میرے ابا کی اس عورت سے شادی کے بعد سے ہی مجھ پر نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ جانے میری سوتیلی ماں نے میرے باپ کے کس طرح کان بھرے کہ وہ بھی اس رشتے پر راضی ہو گیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ عورت میرے ابا کو کوئی نشے والی چیز پلاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سارا سارا دن یا تو سوتے رہتے ہیں یا گم صم بیٹھے رہتے ہیں اور اس کا جو جی چاہے، وہ من مانی کرتی پھرتی ہے۔ شروع میں تو اس نے مجھے بھی بہت بے وقوف بنایا اور یہی لارے لپّے دیتی رہی کہ سرمد کوئی باعزت کام کر لے تو تجھے اس سے بیاہ دوں گی۔ اس کی باتوں میں آ کر میں سرمد پر ڈرائیوری چھوڑنے کے لیے زور ڈالتی رہی اور پیچھے سے اس نے چپکے سے میرا رشتہ بھی کر دیا۔ جس دن سے شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے، میں گھر سے قدم نہیں نکال سکی۔ ہر وقت اس کا کوئی نہ کوئی بھانجا، بھتیجا باہر دروازے پر بیٹھا پہرا دیتا رہتا ہے کہ میں گھر سے باہر قدم نہ رکھ سکوں۔ ایسے میں بھلا میں سرمد سے کیسے رابطہ کرتی؟'' اس نے سارا حال کہہ سنایا۔

''میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں۔'' کچھ دیر غور و خوض کرنے کے بعد وہ بولی تو نیلم چونک پڑی۔

''وہ کیسے؟'' وہ اس کے ہاتھوں پر نقش و نگار بناتے ہوئے دھیمی آواز میں سارا منصوبہ اسے سمجھانے لگی۔ اس کا منصوبہ سن کر نیلم کی آنکھوں کی بجھی ہوئی چمک لوٹنے لگی۔

''تمہارا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

''اس احسان کے بدلے میں تمہیں بھی ایک کام کرنا ہو گا۔''

''وہ کیا؟'' نیلم نے پوچھا۔

''تم مجھے کاغذ پنسل دے دینا، میں سرمد کے نام ایک پیغام لکھوں گی۔ وہ پیغام تم اس تک پہنچا دینا۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' کام کی نوعیت جان کر نیلم کو اطمینان ہو گیا کہ اسے کوئی مشکل کام نہیں کرنا۔ اس گفتگو کے بعد ان دونوں نے آپس میں مزید بات نہیں کی اور خاموشی سے مہندی لگانے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کام کے مکمل ہونے تک گانے والی لڑکیاں بھی تھک چکی تھیں اور اب سونے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ محفل برخاست ہونے لگی۔ ان دونوں کو باہر صحن میں بچھی چارپائی پر جا کر سونے کا حکم دیا گیا۔ اس موقعے پر نگار نے عورت سے طے شدہ معاوضہ یہ کہہ کر وصول کر لیا کہ صبح وہ لوگ جلدی واپس چلے جائیں گے۔ عورت نے روپے تو تھما دیے لیکن جوڑے اور مٹھائی کے لیے صاف کہہ دیا کہ کل دن میں آ کر لے جانا۔ ان دونوں ہی نے اعتراض نہیں کیا۔ انہیں اصل میں روپوں کی ہی ضرورت تھی، باقی چیزیں بے کار تھیں۔ صحن میں آ کر جب وہ دونوں ایک ہی چارپائی پر لیٹیں تو اس نے نگار کو نیلم کے ساتھ طے کیے گئے اپنے تازہ منصوبے کے بارے میں بتا دیا۔

''اس طرح تو تُو پھنس جائے گی شہزادی۔ یہ لوگ تجھ پر اپنی لڑکی کے اغوا کا الزام لگا کر تجھے تھانے میں بند کروا دیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس سے پہلے گرو ہی یہاں پہنچ جائے۔ تیرے ہاتھ اس کے پنجوں سے آزاد ہونے کا جو سنہری موقع آیا ہے، وہ اس مصیبت میں پھنسنے پر ضائع چلا جائے گا۔'' نگار نے اس کا منصوبہ سن کر اعتراض کیا۔

''اللہ مالک ہے۔ میں نیلم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ اس بے چاری کے پاس بھی یہی ایک موقع ہے یہاں سے نکلنے کا۔ میرے پاس پھر بھی چانس ہے کہ پولیس کے ہاتھ لگنے کے بعد کسی ایسی جگہ رابطہ کر سکوں جہاں سے مجھے مدد مل سکے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''میں تو یہی کہوں گی کہ تُو اچھی طرح سوچ لے۔ کہیں اس ہمدردی کی وجہ سے تجھے خود لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔'' نگار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اسی کا نام انسانیت ہے نگار! تم خود بھی تو میری خاطر رسک لینے کے لیے تیار تھیں۔ بس اسی طرح میں نیلم کی خاطر خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ نیلم میری کچھ نہیں لگتی لیکن سرمد کا مجھ پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کا موقع مل رہا ہے مجھے تو میں پیچھے کیسے ہٹ سکتی ہوں؟'' اس کی یہ بات سن کر نگار نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ سمجھ گئی کہ شہزادی کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ خاموشی کی چادر اوڑھے وقت آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگا۔ صبح سے ذرا پہلے شہزادی چارپائی سے اتر کر دبے قدموں نیلم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا انداز بے حد محتاط تھا۔ گھر میں موجود تمام لوگ اگرچہ نیند میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن یہ ڈر اپنی جگہ تھا کہ کہیں ذرا سی آہٹ پر کسی کی آنکھ نہ کھل جائے... مگر خیر گزری کہ کسی کے بھی علم میں آئے بغیر وہ آرام سے نیلم کے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بے حد دھیمی آواز میں دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ یقیناً نیلم اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

''میں نے اندر سے کنڈی اس لیے لگا لی تھی کہ کہیں کوئی مہمان لڑکی یہاں سونے کے لیے نہ آ جائے۔'' اس کے ٹوکنے سے پہلے ہی نیلم نے دروازہ اندر سے بند کرنے کی توجیح پیش کی تو اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بولی۔

''اب جلدی کرو۔ مجھے اپنے کپڑے دے دو اور خود میرے کپڑے پہن لو۔ میں نے نگار سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر یہاں سے نکل جائے گی۔ کچھ وقت گزرے گا تو دکانیں وغیرہ کھل جائیں گی۔ تم کسی پی سی او سے سرمد کے موبائل پر کال کر لینا۔ نمبر تو اچھی طرح یاد ہے نا تمہیں؟'' جواباً نیلم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نیم تاریک کمرے میں ان دونوں نے آپس میں لباس تبدیل کیے۔ اب وہ مایوں کے زرد لباس میں اور نیلم اس کے بے ڈھنگے پن سے سلے چمکیلے نیلے لباس میں تھی۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے نیلم کے فراہم کردہ کاغذ پر بال پین سے ایک مختصر سا پیغام سرمد کے نام لکھا۔ کمرے میں روشنی بے حد کم تھی اس لیے اسے یہ مختصر پیغام لکھنے میں بھی کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بلب روشن کرنے کا خطرہ اس نے خود نہیں مول لیا تھا کہ کہیں روشنی کسی کو اس طرف متوجہ نہ کر دے۔ پیغام والا کاغذ تہ کر کے اس نے نیلم کے حوالے کیا جسے اس

نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر رکھ لیا۔ شہزادی کی آمد سے پہلے وہ اپنے پاس موجود تھوڑی سی رقم کو بھی اسی جگہ رکھ چکی تھی۔ کمرے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے وہ شہزادی سے گرم جوش انداز میں گلے ملی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم میرے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہو... بس اسے میری خود غرضی سمجھو کہ میں سرمد تک پہنچنے کا یہ موقع کھونا نہیں چاہتی اس لیے جانتے بوجھتے تمہیں اس مصیبت میں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ہو سکے تو مجھے میری اس خود غرضی کے لیے معاف کر دینا۔''

''ایسا مت سوچو۔ اگر تم انکار کرتیں تو بھی میں زبردستی تمہیں راضی کر لیتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس بس یہی ایک موقع ہے، نجات حاصل کرنے کا۔ اپنے لیے مجھے یقین ہے کہ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔ وہ مالک اس سے پہلے بھی مجھے بڑی بڑی مصیبتوں سے نکالتا رہا ہے۔ بس تم میرے لیے دعا کرتی رہنا اور میرا پیغام یاد سے سرمد کے حوالے کر دینا۔'' اس نے نیلم کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی اور ہدایات دیں پھر اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ ''جاؤ... اب اور دیر مت کرو۔ صبح ہونے والی ہے۔ سب لوگ اٹھ گئے تو نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

نیلم باہر نکل گئی اور وہ خود دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان جھری سی بنا کر اسے دیکھتی رہی۔ اس کے صحن میں قدم رکھتے ہی چارپائی پر لیٹی نگار بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ قریب پہنچی تو اس نے سرہانے رکھا ڈھول اسے تھما دیا۔ دونوں ہاتھوں میں ڈھول کو کسی بچے کی طرح تھام کر اس نے اس پوزیشن میں رکھ لیا کہ ہونٹ اور ناک اس کی آڑ میں چھپ گئے۔ دوپٹا پہلے ہی خوب پھیلا کر پیشانی تک اوڑھا گیا تھا۔ اس حلیے میں اگر کوئی سرسری نظر ڈالتا تو بالکل بھی اندازہ نہ کر پاتا کہ وہ شہزادی کے بجائے نیلم ہے۔

''بھایا جی! ہم جا رہے ہیں۔ ہمیں راستہ دے دو۔'' بیرونی دروازے کے ساتھ چارپائی لگا کر سوئے ہوئے نیلم کی سوتیلی ماں کے بھانجے سے کہا گیا نگار کا یہ جملہ اسے کمرے میں بھی سنائی دیا۔

''کیا مصیبت آئی ہے تم لوگوں کو جو اتنی صبح جانے کے لیے بے تاب ہو گئے ہو۔'' لڑکا یقیناً گہری نیند سے جگائے جانے پر جھنجلا گیا تھا۔

''ہمیں یہاں نیند نہیں آ رہی۔ اپنے گھر جا کر آرام سے سوئیں گے۔ ویسے بھی ہماری رات ہی بات ہو گئی تھی کہ ہم سویرے جلدی نکل جائیں گے۔'' نگار نے اپنی کرخت آواز میں اسے جواب دیا۔

''اوئے جانے دے شیدے! کیوں بحث میں پڑ کر سب کی نیند خراب کر رہا ہے؟'' صحن میں ہی سوئے ہوئے افراد میں سے کسی نے ہانک لگا کر لڑکے کو ٹوکا تو اس نے بڑبڑاتے ہوئے انہیں باہر جانے کا راستہ دے دیا۔ وہ دونوں باہر نکل گئیں تو اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کیا اور نیلم کی چارپائی پر آ لیٹی۔ نہایت کشیدہ لمحات کے گزر جانے کے بعد ملنے والے اس عارضی سکون کے دوران اس نے پہلی بار اپنے جسم پر موجود زرد لباس سے اٹھتی ابٹن کی مہک کو محسوس کیا۔ یہ مہک یقیناً مایوں بیٹھی دلہن کے جذبات میں ہلچل مچا کر اسے آنکھوں میں خوب صورت سپنے سجانے پر اکساتی ہو گی۔ خود اس کے اپنے احساسات بھی عجیب سے ہونے لگے لیکن فی الحال کوئی سپنا ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی آنکھوں میں سجا سکتی۔ وہ چند چھوٹے چھوٹے خواب جو اس نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کبھی دیکھے بھی تھے تو حالات کے گرداب میں پھنس جانے کے باعث تعبیر کے مراحل میں داخل ہوتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تقدیر کے اس کھیل کے بارے میں سوچتے ہوئے کب اس کی آنکھ لگ گئی، اسے احساس بھی نہیں ہوا۔ باہر سے سنائی دینے والے شور پر اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ کافی دن چڑھ آیا ہے۔ آنکھ کھلتے ہی اسے یہ خیال بھی آیا کہ ابھی اسے ایک نہایت مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا ہے مگر اس سے پہلے باہر سے سنائی دیتے شور کا سبب جاننا ضروری تھا۔ بستر چھوڑ کر وہ دبے قدموں دروازے کے قریب پہنچی اور کنڈی کھول کر دروازے کے پٹ میں ذرا سی جھری بناتے ہوئے باہر جھانکا۔ صحن میں دو تین پولیس والے، ملکہ اور نیلم کے رشتے دار نظر آ رہے تھے۔

''میں بتا چکی ہوں کہ وہ ہیجڑے جو اس کے ساتھی تھے، سویرے ہی یہاں سے نکل کر چلے گئے تھے۔ تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آ رہی؟'' نیلم کی سوتیلی ماں کی کرخت آواز اس تک پہنچی۔

''دیکھو بی بی! میں بھی بتا چکا ہوں کہ ہمارے آدمی ان کے اڈے پر آدھی رات سے موجود ہیں۔ وہاں کوئی نہیں پہنچا۔ اس مردود نے رات بھر مار کھانے کے بعد یہ سچ اگلا ہے کہ ہیجڑوں کے نام پر یہ جن دو بندوں کو تمہارے گھر چھوڑ کر گئے تھے، ان میں سے ایک ہیجڑا نہیں بلکہ لڑکی ہے جسے انہوں نے ہیجڑا بنایا ہوا تھا۔ ہمیں اس لڑکی کی تلاش ہے۔ بہت اوپر سے لڑکی کی بازیابی کے آرڈر آئے ہیں۔ ہم تمہاری زبانی

کلامی بات پر یقین نہیں کر سکتے۔ ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی لینی ہوگی۔'' ملکہ کی گدی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے پولیس والے نے اسے جواب دیا۔ ملکہ کی حالت سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت ہوئی ہے۔ شاید اس مرمت کے نتیجے میں ہی وہ اپنی راہنمائی میں پولیس والوں کو یہاں تک لے کر آئی تھی۔ دروازے کے پیچھے کھڑی شہزادی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پولیس والے کی زبانی اوپر سے آرڈر آنے کا سن کر وہ سمجھ گئی کہ کون لوگ ہیں جن کی وجہ سے پولیس اس کا سراغ لگاتے لگاتے یہاں تک پہنچ گئی ہے۔

''شریفوں کے گھروں کی تلاشی ایسے نہیں لی جاتی صاحب! پہلے وارنٹ دکھاؤ پھر تلاشی لینا۔'' نیلم کی سوتیلی والدہ نے اپنی قانون دانی بگھاری۔

''کیوں بے کار میں روڑے اٹکا رہی ہے رشیدہ! لینے دے انہیں تلاشی۔ تیرا کیا جا رہا ہے؟ بس بے کار میں ہر بات میں اپنی قابلیت جھاڑنے کا شوق ہے تجھے۔'' اسی وقت ایک مرد نے مداخلت کرتے ہوئے تیز و طرار رشیدہ کو جھڑکا۔ وہ مرد شاید نیلم کا باپ تھا۔

''تم چپ رہو۔ معلوم بھی ہے شادی والا گھر ہے۔ بری کے زیور، کپڑوں کے علاوہ دسیوں قیمتی چیزیں آئی رکھی ہیں۔ ان پولیس والوں کا کیا بھروسا کہ تلاشی کے بہانے کیا کچھ پار کرلیں۔ کوئی چیز کم ہوئی تو ہم سلطان کو کیا جواب دیں گے کہ اس کی بھجوائی ہوئی چیزیں کہاں گئیں؟'' وہ عورت یقیناً بدلحاظی میں اپنی مثال آپ تھی جو پولیس والوں سے بھی دبنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ عورت کے الفاظ سن کر اسے اندازہ ہوا کہ اب پولیس والے بُری طرح طیش میں آجائیں گے اور جھگڑا مزید بڑھ جائے گا، چنانچہ اس نے خود ہی باہر نکل کر ان لوگوں کے سامنے آجانا مناسب سمجھا۔

''یہ دیکھو... یہ رہی شہزادی۔ ان لوگوں نے نگار کو بھی کہیں اندر ہی چھپایا ہوا ہوگا۔'' سب سے پہلے ملکہ کی اس پر نظر پڑی اور وہ زور سے چیخی۔

''نگار اندر نہیں ہے۔ وہ صبح نیلم کو لے کر گھر سے جا چکی ہے۔'' اس نے پولیس آفیسر کے بالکل برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے نہایت اطمینان سے بتایا۔ اس کے اس انکشاف پر وہاں ہلچل سی مچ گئی۔

''کیا بک رہی ہے تو؟ کہاں لے کر چلا گیا وہ ہیجڑا نیلم کو؟'' رشیدہ نے اس پر جھپٹنے کی کوشش کی جسے ایک پولیس والے نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈنڈا درمیان میں اڑا کر ناکام بنا دیا۔

''وہاں، جہاں وہ اس ظلم سے محفوظ رہ سکے... جو تم اس کی شادی لالچ میں ایک بوڑھے سے کر کے اس پر ڈھانا چاہتی تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہائے ربا! ہم لٹ گئے... برباد ہو گئے۔ دیکھو نیلم کے ابا! تمہاری بیٹی تمہارے منہ پر کالک مل کر چلی گئی۔'' وہ سر پیٹ پیٹ کر واویلا کرنے لگی۔

''یہ کیا مسئلہ ہے بی بی؟'' پولیس والا اس سے مخاطب ہوا۔

''مسئلہ بہت صاف ہے آفیسر! یہ عورت نیلم کی سوتیلی ماں ہے جو اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی زبردستی ایک بڈھے سے کر رہی تھی۔ رات میرا نیلم سے سامنا ہوا تو وہ میری جاننے والی نکلی۔ میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ میں اسے یہاں سے نجات دلا دوں گی۔ وہ میرے کپڑے پہن کر نگار کے ساتھ یہاں سے نکل گئی۔ اب تک امید ہے کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوگی۔'' اس نے مختصراً سارا قصہ سنایا۔

''گرفتار کرلیں اسے انسپکٹر صاحب! اس پر اغوا کا پرچہ کاٹیں۔ اس نے میری بچی کو ورغلا کر گھر سے بھگا دیا۔'' رشیدہ نے شور مچایا۔

''پرچہ تو تمہارے خلاف کٹنا چاہیے۔ تم ایک عاقل و بالغ لڑکی کو حبسِ بے جا میں رکھ کر اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر رہی تھیں... یہ کتنا بڑا جرم ہے کچھ اندازہ ہے تمہیں؟'' اس نے دوبدو جواب دیا۔ پولیس کا تحفظ مل جانے کے باعث اس کا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا تھا اور وہ اپنی سابقہ جون میں لوٹ رہی تھی۔

''اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے بی بی! ابھی آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمیں اوپر والوں کو آپ کے مل جانے کی رپورٹ بھی دینی ہے۔'' انسپکٹر نے مداخلت کرتے ہوئے بحث کو بڑھنے سے روکا تاہم اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔ اس نے انسپکٹر کی بات مان لی۔ فوراً ہی ان لوگوں کی وہاں سے روانگی عمل میں آگئی۔ پیچھے نیلم کے خاندان والے شور کرتے رہ گئے۔

''ان لوگوں کے ساتھ گرو الماس بھی گرفتار ہوا یا نہیں؟'' راستے میں اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''نہیں، وہ ہمارے پہنچنے سے قبل ہی اڈے سے بھاگ چکا تھا۔ آپ بتائیں آپ کیسے ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئیں؟'' اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انسپکٹر نے اس کے بارے میں جاننا چاہا۔

''یہ ساری تفصیلات میں صرف انہی کو بتا سکتی ہوں جن کے حکم پر آپ نے مجھے تلاش کیا ہے۔'' اس نے انسپکٹر کو کچھ بھی بتانے سے گریز کیا۔ وہ اصرار نہیں کر سکا۔ جتنی اوپر سے آرڈر ملے تھے، اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت اونچے خاندان سے ہے۔ ایسے لوگوں کے معاملات کے بارے میں ضرورت سے زیادہ کھوج لگانے سے اجتناب ہی اس کے لیے مناسب تھا۔ اس کا تجسس اس کے لیے کسی مصیبت کا در کھول دیتا۔ اس کے مقابلے میں یہی مناسب تھا کہ وہ خاموش رہے اور لڑکی کی بازیابی کا کارنامہ انجام دینے کے صلے میں ملنے والے انعام یا ترقی کا انتظار کرے۔ تھانے پہنچ کر ملکہ کو حوالات میں دھکیلا گیا اور اسے احترام سے اپنے کمرے میں بٹھا کر انسپکٹر فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

''میں نے اوپر اطلاع کر دی ہے۔ وہاں سے آرڈر آجائے تو ہم آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔ تب تک آپ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ اگر کہیں تو ناشتا منگوالوں؟''

''نہیں۔ اب میں گھر پہنچ کر ہی ناشتا کروں گی۔'' اتنی غیر متوقع رہائی نے اسے ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ خالی پیٹ ہونے کے باوجود اس کیفیت میں اس کا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ صرف چائے منگوالیتا ہوں۔'' بے انتہا خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سنتری کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبایا مگر سنتری کی آمد سے قبل ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا اور دوسری طرف کی بات سن کر ''یس سر... یس سر'' ہی گردان کرتا رہا۔ فون بند ہوا تو وہ گھنٹی کی آواز پر اندر آنے والے سنتری کو اپنے پہلے ارادے کے مطابق حکم دینا بھول چکا تھا۔

''سب کو الرٹ کر دو۔ آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب خود ان خاتون کو لینے یہاں آرہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔'' اس حکم پر تھانے کی حدود میں تھرتھری سی پھیل گئی۔ پندرہ منٹ کے وقفے میں دوڑ دوڑ کر سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ انتظار کے پندرہ منٹ پولیس والوں کے ساتھ اس کے لیے بھی بڑے ہیجان خیز تھے۔ آخرکار یہ پندرہ منٹ گزر ہی گئے اور باہر سے بوٹوں کی مخصوص ٹھکا ٹھک سنائی دینے لگی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ آنے والے آچکے ہیں اور ماتحت افراد سے سیلیوٹ وصول کر رہے ہیں۔ انسپکٹر اپنے اعلیٰ افسران کے استقبال کے لیے خود کمرے سے باہر نکل کر جا چکا تھا۔

''آئیے سر پلیز! آپ کی مطلوبہ خاتون اندر موجود ہیں۔'' باہر سے اس کی آواز سنائی دی اور پھر چق ہٹا کر وہ دو افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنی خاطر وہاں آنے والے آئی جی اور ڈی آئی جی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان دونوں کے چہروں پر بہ یک وقت حیرت اور مایوسی کے تاثرات ابھرے۔

''تم... تم کون ہو؟'' ڈی آئی جی سجاد رانا نے سرسراتی آواز میں بہ مشکل یہ سوال کیا۔

☆☆☆

''اماں! میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھ سے بالکل بھی یہاں بیٹھا نہیں جا رہا۔ میں حویلی میں واپس جاؤں گی۔'' کشور نے منہ بناتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھی چھوٹی چودھرائن ناہید سے کہا۔ اس سمیت حویلی کی تمام خواتین اس وقت انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ بنیادی طور پر تو اس تقریب کو بہت سادگی سے منعقد کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا لیکن وہ پروگرام چودھری افتخار کو اپنے شایانِ شان محسوس نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑی چودھرائن اس افتتاح کے لیے خاص طور پر حویلی سے باہر نکلے گی، اس لیے تقریب بھی زوردار ہونی چاہیے۔ اس زوردار تقریب کا انتظام اس نے اپنے پلے سے کر دیا تھا۔ اس وقت بڑے سے پنڈال میں پورے گاؤں کی عورتیں جمع تھیں۔ ان عورتوں کے بیٹھنے کے لیے دریاں بچھائی گئی تھیں جبکہ حویلی کی معزز خواتین اوپر اسٹیج پر رکھی شان دار کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔

اسکول کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر پیش کیے جانے والے ورائٹی پروگرامز کی خبر حویلی تک بھی پہنچی تھی۔ اس تقریب کو بھی وہی رنگ دینے کے لیے بڑی چودھرائن نے فرمائش کی تھی کہ وہ عورتیں جن کی آواز اچھی ہے یا وہ ناچنا جانتی ہیں، اسٹیج پر آکر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ عورتوں میں تقسیم کرنے کے لیے وہ بہت سے تحائف بھی اپنے ساتھ پیک کروا کر لائی تھی۔ کشور کی مدد سے اس نے اس موقعے کے لیے ایک تقریر کی بھی تیاری کرلی تھی... یعنی اچھا خاصا لمبا پروگرام تھا جس میں کافی وقت لگتا جبکہ کشور نے دس منٹ سے بھی کم عرصے میں سر درد کی شکایت کرتے ہوئے حویلی واپس جانے کی فرمائش کر دی تھی۔ اس کی یہ فرمائش سن کر چھوٹی

چودھرائن پریشان ہوگئی اور آہستہ سے بولی۔

''ایسے کیسے واپس چلی جائے گی؟ وڈی چودھرائن کو بُرا لگے گا۔ فیر گڈی بھی تو ایک ہی کھڑی ہے باہر۔ دوسری تو چودھری صاحب نے واپس حویلی بلوالی تھی۔''

''اوہو اماں! گاڑی کا کیا ہے؟ مجھے چھوڑ کر واپس آجائے گی۔ باقی کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہونے دو۔ میرا درد سے بُرا حال ہورہا ہے۔ دوسروں کی ناراضی کا خیال کرکے کیا میں اپنی جان سے گزر جاؤں؟'' وہ جھنجلائی اور پھر ماں کا جواب سننے سے قبل ہی اشارے سے کچھ فاصلے پر کھڑی رانی کو بلاکر اس سے بولی۔ ''ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی قریب لے کر آئے۔ میں حویلی واپس جاؤں گی۔ اسے مجھے چھوڑ کر واپس یہیں آنا ہوگا اور ہاں... تم میرے ساتھ ہی چلوگی۔''

''جی اچھا بی بی!'' رانی جھٹ پٹ حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوگئی۔

''تو روز بہ روز بڑی ضدی ہوتی جارہی ہے کشور! ہر وقت اپنی مرضی کرتی ہے اور مشکل مجھے ہوتی ہے۔'' ناہید نے دبی آواز میں اسے گھرکا۔ وہ دونوں اسٹیج کی بالکل کونے والی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں اس لیے دوسروں تک ان کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ کشور ماں کی ڈانٹ سننے کے بعد بھی بے نیاز بنی بیٹھی رہی۔ ڈرائیور کے پاس پیغام لے کر جانے والی رانی لمحوں میں واپس آگئی۔

''گاڑی تیار ہے بی بی!'' قریب آکر اس نے اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سنتے ہی کشور اپنی چادر درست کرتی ہوئی اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔ بڑی چودھرائن اور دونوں بہنیں اس کی اس طرح روانگی پر حیران ہورہی ہوں گی، اسے خبر تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر ان میں سے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں سب کے سوالوں کے جواب دینے کا فریضہ بہ خوبی نبھالے گی۔ اس وقت اس پر جو دھن سوار تھی، اس کے سامنے اسے کسی کی ناراضی کی فکر نہیں تھی۔ آج تو وہ اس کے کہنے پر بھی رکنے والی نہیں تھی جس کی خاطر یہ خطرہ مول لے رہی تھی۔ قسمت سے جو موقع ہاتھ آیا تھا، وہ پھر ملتا تو بھی وہ بات نہ ہوتی جو آج ملنے جانے میں تھی۔

پنڈال کے باہر ڈرائیور نے اس طرح گاڑی لگائی تھی کہ اسے کھلے آسمان تلے دو قدم بھی نہیں چلنا پڑا۔ وہ جیسے ہی گاڑی کے کھلے دروازے سے گزر کر پچھلی نشست پر بیٹھی، رانی نے پھرتی سے دروازہ بند کردیا اور خود ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی نشست پر جا بیٹھی۔ ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھادی۔ کچے پکے راستوں سے گزرتے ہوئے وہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچے تو رانی نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''گاڑی یہیں روک دو شریف!'' ڈرائیور نے اس حکم کی تعمیل کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حکم دینے والی زبان بے شک ایک ملازمہ کی ہے لیکن حکم مالکہ کی طرف سے ہی جاری ہوا ہوگا۔

''تم یہیں رک کر ہمارا انتظار کرو۔ تھوڑی دیر بعد ہم یہیں واپس آئیں گے۔'' دروازہ کھول کر گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے رانی نے اسے دوسری ہدایت دی۔

''مم... مگر... میں دوسروں کو کیا جواب دوں گا؟ کسی کو معلوم ہوگیا تو میری کھال اتر جائے گی۔'' ڈرائیور سمجھ سکتا تھا کہ اس طرح چوری چھپے راستے میں اترنے کا کیا مطلب ہے۔ جہاں بہت زیادہ پابندیاں ہوں، وہاں اس طرح کے چور راستے تلاش کر ہی لیے جاتے ہیں۔ رانی یقیناً اپنی مالکن کی رازدار اور دستِ راست تھی جو اس کی خاطر خود کو خطرے میں ڈال رہی تھی لیکن وہ کیوں خوامخواہ اپنی گردن پھنساتا... اس لیے پیچھے بیٹھی مالکن کے لحاظ کے باوجود اپنے خدشے کو زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا۔

''کہہ دینا گاڑی خراب ہوگئی تھی، اسے ٹھیک کرنے میں دیر ہوگئی۔ کسی نے اگر تمہیں یہاں کھڑا دیکھ لیا تو اس سے گاڑی خراب ہونے کا بہانہ کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دینا کہ بی بی کا یوں بیچ راستے میں کھڑا ہونا مناسب نہیں تھا اس لیے رانی انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی ہے۔'' وہ یقینی طور پر ایک طے شدہ منصوبے پر عمل کررہی تھی اس لیے اس کے پاس سارے حل موجود تھے۔ سب سے زوردار اور طاقتور حل وہ نوٹ تھے جو اس نے اپنی بات کے اختتام پر ڈرائیور کی ہتھیلی پر رکھے تو وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود تعاون کے لیے آمادہ ہوگیا۔ اس کو آمادہ دیکھ کر کشور گاڑی سے نیچے اتر آئی۔

انہیں جہاں جانا تھا وہ جگہ یہاں سے قریب ہی تھی۔ اردگرد کوئی کھیت نہ ہونے اور گاؤں کی تمام عورتوں کے تقریب میں شرکت کے لیے چلے جانے کے باعث یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ کوئی کشور کو دیکھ کر پہچان لے گا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ دونوں ایک مکان کے سامنے جا کر رکیں۔ یہ وہی مکان تھا جو آفتاب اور اس کے ساتھی ٹیچرز کو رہائش کے لیے دیا گیا تھا۔ رانی نے دستک دینے کے لیے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہاتھ کے زور سے کھلتا چلا گیا۔ کھلے دروازے کے دوسری طرف صحن میں ٹہلتا ماسٹر آفتاب صاف نظر آرہا تھا۔ وہ

دونوں تیزی سے اندر داخل ہوگئیں۔ آفتاب نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پھر کشور کی طرف رخ کرتے ہوئے مصنوعی ناراضی سے بولا۔

''آخر آپ اپنی ضد پوری کرکے ہی رہیں۔''

''کبھی کبھی ہمیں بھی اپنی ضد منوانے کی اجازت ملنی چاہیے۔ ہمیشہ تو ہم آپ کے کہے پر عمل کرتے ہیں۔'' اس کی طرف دیکھتی ہوئی وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی تو وہ پل بھر کے لیے اسے گھورتا رہا اور پھر مسکرادیا۔

''مان لیا میں نے آپ کا یہ حق۔ چلیں اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' اس کا ہاتھ تھام کر وہ اپنے کمرے میں لے گیا۔ رانی تو اندر قدم رکھنے کے بعد فوراً ہی اندھی، بہری اور گونگی بن گئی تھی... کہ یہی مالکن سے حقِ وفاداری نبھانے کا طریقہ تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کشور کی نظر سب سے پہلے میز پر رکھے بڑے سے کیک اور اس کے ساتھ ہی رکھی دو کتابوں پر پڑی۔

''مجھے آنے سے اتنی سختی سے منع کررہے تھے اور یہاں پورا انتظام کر رکھا ہے۔ اگر میں نہ آتی تو آپ کا انتظار تو بیکار چلا جاتا نا۔'' ان چیزوں کو دیکھ کر وہ آفتاب کی طرف رخ کرتے ہوئے ناز سے بولی۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ ضرور آئیں گی۔'' وہ یقین سے بولا۔

''وہ کیوں بھلا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''محبت کرنے والوں کو یہاں سے خبر مل جاتی ہے کشور بی بی! اپنے محبوب کے ارادوں کی پختگی پرکھنے کے لیے یہ کافی ہوتا ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھ میں موجود کشور کا ہاتھ اپنے سینے پر بائیں جانب عین دل کے اوپر رکھا۔ وہ اپنے ہاتھ کے نیچے اس کے دل کی دھڑکن کو سننے لگی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے ہاتھ کے نیچے موجود دل کی ہر دھڑکن اس کا نام لے رہی ہو۔ وہ ڈوب ہی ہوگئی۔ آفتاب کے قریب آنے کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے دل کی دھڑکن سن سکے۔ اس کا شرمانا اور گھبرانا فطری تھا۔ اسی کیفیت کے باعث اس نے ذرا سا زور لگا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکی۔

''اونہوں۔ اب ایسی کوئی کوشش بے کار ہے۔ ایک ضد آپ نے کی تھی، میں نے اس کا احترام کیا۔ اب ایک ضد میرے دل کی ہے کہ اس کی مسیحا کا ہاتھ کچھ دیر یہیں رکھا رہے تاکہ اسے قرار ملے۔ آپ کو میرے دل کی اس ضد کا احترام کرنا ہوگا۔'' اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے اسے ٹوکا۔

''تو اب آپ بدلہ لیں گے ہم سے؟'' اس نے شکوہ کیا لیکن دوبارہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

''اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو لیجیے میں اپنی ضد سے دست بردار ہوجاتا ہوں۔'' آفتاب نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''میں تو مذاق کررہی تھی۔'' اس طرح ہاتھ چھوڑ دیے جانے پر اسے دھچکا لگا اور وہ فوراً صفائی دینے لگی۔

''میں بھی مذاق کررہا تھا۔ ہاتھ تو میں نے اس لیے چھوڑا ہے کہ آپ اپنی سالگرہ کا کیک کاٹ سکیں۔ صبح صبح آپ کی خاطر نورکوٹ جاکر بڑی مشکل سے یہ کیک لایا ہوں۔ آج اپنے اصول کے خلاف مجھے اسکول کی چھٹی بھی کرنی پڑی ہے۔'' اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلا کر اسے میز کے قریب لے جاتے ہوئے اس نے بتایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر ذرا اتراتے ہوئے بولی۔

''محبت اسی کا نام ہے ماسٹر صاحب! محبت اپنے اصول خود طے کرتی ہے۔ اس کے اصولوں کے سامنے آدمی کے ذاتی اصول بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اپنے اصول کے خلاف آپ کو اسکول کی چھٹی کرنی پڑی، یہ سن کر مجھے افسوس ہوا لیکن سچ جانیے کہ اس سے بھی بڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ ایسا آپ نے میری خاطر کیا۔ اپنی اس اہمیت پر میں بڑی نازاں ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ابھی باہر جاؤں اور سب کو بتا دوں کہ آفتاب احمد کو مجھ سے محبت ہے... اتنی ڈھیر ساری محبت کہ وہ میری خواہش کی تکمیل کے لیے اپنا ایک اصول قربان کرگئے۔''

''جی ہاں۔ بالکل، ضرور جاکر اپنا یہ شوق پورا کیجیے تاکہ آپ کے ابا حضور دھائیں دھائیں میرے سینے میں گولیاں اتار کر مجھے یہیں دفن کروادیں۔ بعد میں آپ میری قبر پر مجاورن بن کر بیٹھ جایئے گا۔'' اس کی بات سن کر وہ چڑانے والے انداز میں بولا تو اس نے فوراً ہی دہل کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور خفگی سے بولی۔

''اللہ نہ کرے... کیوں ایسی بری باتیں منہ سے نکالتے ہیں؟''

''میں نہ بھی کہوں تو کیا یہ سچ نہیں ہے کہ چودھری صاحب کے علم میں جیسے ہی یہ بات آئی، وہ میرے ساتھ کم سے کم بھی یہی سلوک کریں گے۔'' اپنے ہونٹوں پر رکھے اس کے ہاتھ کو چوم کر اپنے ہاتھ میں لیتا ہوا وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں ایسے کسی سچ کو نہیں سننا چاہتی۔ کم از کم آج کے دن تو ہرگز بھی نہیں۔ میں آپ کی کتاب شائع ہونے اور اپنی

سال گرہ کی خوشی سارے خدشے اور واہمے بھول کر منانا چاہتی ہوں۔ میں نے اتنا خطرہ مول لے کر یہاں تک آنے کی راہ اس لیے نہیں نکالی کہ میں ایسی بدشگونی کی باتیں سنوں۔'' اس کے لہجے کی خفگی قائم رہی۔

''ٹھیک ہے بابا! اب نہیں کروں گا ایسی باتیں۔ آپ کیک تو کاٹیں۔'' اس نے فوراً ہی معذرت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں چھری تھمائی اور کیک پر لگی موم بتیاں روشن کرنے لگا۔ کشور نے کیک کاٹا اور ایک چھوٹا سا پیس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ذرا سا کھا کر وہی پیس اپنے ہاتھ سے اسے کھلایا۔ وقت کے ان لمحات میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مگن ہر طرح کے اندیشوں سے آزاد اور بے فکر ہو گئے تھے۔

''لایئے اب میرا تحفہ دیجیے۔'' کشور نے اس سے فرمائش کی تو اس نے کیک کے قریب رکھی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس نے کتاب کھول کر دیکھی۔

''اپنی زندگی کی سال گرہ پر اس کے لیے چھوٹا سا تحفہ!'' پہلے ہی صفحے پر خوب صورت سنہری حروف میں یہ تحریر لکھی ہوئی تھی۔ کل رات فون پر گفتگو کے دوران اس نے کشور کو بتایا تھا کہ اس کے کالمز پر مشتمل کتاب چھپ کر آچکی ہے۔ فی الحال کتاب کی رونمائی کی تقریب ہونا باقی تھی لیکن پبلشر نے اسے کتاب کی چند جلدیں بھجوا دی تھیں۔

کشور اس کی زبانی یہ اطلاع سن کر بے چین ہو گئی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ کل اس کی سال گرہ ہے اور اس موقعے پر اسے یہ کتاب آٹوگراف سمیت تحفے میں دی جائے۔ مطالبے کے ساتھ ہی اس نے سارا منصوبہ بھی طے کر لیا کہ وہ کیسے انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب سے بہانہ کر کے نکلے گی اور اس تک پہنچ جائے گی۔ آفتاب نے بڑی کوشش کی کہ اسے اس ارادے سے باز رکھ سکے لیکن اس پر دھن سوار ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنی سال گرہ کے موقعے پر اس سے اپنا من پسند تحفہ، اپنی من پسند جگہ پر آ کر وصول کرنا اس کا حق ہے۔ آفتاب اس کے اس حق کو چیلنج نہیں کر سکا اور اب وہ نتیجتاً یہاں تھی۔

''یقین جانیے آفتاب... پوری زندگی میں نہ تو کبھی میری سال گرہ کا دن اتنا خوب صورت گزرا اور نہ ہی کوئی اتنا شان دار تحفہ ملا۔ شکریہ کہنا اگر محبت کے اصولوں کے خلاف نہ ہوتا تو میں آپ کا شکریہ ضرور ادا کرتی۔''

''شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ جواباً آپ بھی مجھے اس خوب صورت موقعے پر ایک تحفہ دے سکتی ہیں۔'' اس کی بات سن کر اس نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

''میں تو اپنے ساتھ کچھ لائی ہی نہیں۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''مجھے ساتھ لائی ہوئی کوئی چیز چاہیے بھی نہیں۔ بس اپنے ہاتھ سے چند لفظ لکھ کر میری اس کتاب کی قیمت بڑھا دیں۔'' اس نے کتاب کی دوسری جلد کھول کر اس کے سامنے رکھی اور اپنی جیب میں اٹکا پین نکال کر اسے تھمایا۔ وہ پین تھام کر لمحے بھر کے لیے کچھ سوچتی رہی پھر کتاب کے کھلے صفحے پر لکھنے لگی۔ وہ سامنے کھڑا اسے انہماک سے دیکھتا رہا۔ بہت سلیقے سے اوڑھی گئی چادر اب کچھ بے ترتیب ہو گئی تھی اور چادر کے نیچے سے جھانکتا اس کا ہلکے سبز رنگ کا لباس اسے متوجہ کر رہا تھا۔

''اگر آج کی تیاری میرے لیے کی گئی تھی تو پھر مجھے ہی کیوں محروم رکھا گیا؟'' وہ کتاب پر اس کے حسب فرمائش لکھنے کے بعد فارغ ہوئی تو اس نے شکوہ کیا۔ وہ فوراً ہی اس کا مطلب سمجھ گئی اور چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ تاہم اس نے آفتاب کی فرمائش رد نہیں کی اور بڑی سی چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ چادر کے نیچے اس نے جارجٹ کے لباس کا ہم رنگ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ دوپٹے کے کناروں پر بہت خوب صورت سی بیل لگی ہوئی تھی۔ جارجٹ کا یہ دوپٹا چادر کی طرح اس کے جسمانی خطوط کی پردہ پوشی کرنے میں ناکام تھا اور اس کے وجود کی رعنائیاں خوب خوب اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔ آفتاب نے پہلی بار اسے یوں بغیر چادر کے دیکھا تھا چنانچہ اپنی نظریں اس کے وجود سے ہٹانے میں ناکام رہا۔

''بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔'' وہ عورت تھی۔ اس کی نظروں کی زبان پڑھ لینا اس کے لیے بہت آسان تھا، چنانچہ کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی ہوئی گھبرائی، شرماتی ہوئی بولی اور ایک جانب رکھی اپنی چادر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''مت جاؤ... یہیں میرے پاس ہی رہ جاؤ۔'' وہ بے قرار ہو کر آگے بڑھا اور اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ کشور کسی مجسمے کی طرح ساکت ہو گئی۔ آفتاب کے ہونٹ اس کے چہرے کے خدوخال سے گفتگو کرنے لگے۔ یہ برسوں سے پیاسی زمین پر بارش کے چند چھینٹے پڑنے والی بات تھی جن کے سبب زمین سیراب ہونے کے بجائے مزید دہک اٹھتی ہے۔ وہ بھی جذبات کی شورش سے دہک رہی تھی۔ اس پر

نے والا بادل بھی ایسا تھا جو وادی وادی گھوم کر آنے کے وجود کسی سرزمین پر نہیں برسا تھا۔ یہ بادل کھل کر برس جاتا تو مین سیراب ہو جاتی لیکن اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ دونوں اپنی الجھی الجھی سانسوں کو سنبھالتے یک دم ہوش میں آ گئے۔

''اجازت ہے۔'' وہ جانتی تھی کہ دستک دینے والی رانی ے جس نے اسے وقت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے اس لیے پھرتی سے چادر اٹھا کر اپنے گرد لپیٹی اور جھکی نظروں ے آفتاب سے سوال کیا۔

''بالکل۔'' اس نے جواب دیا تو کشور نے قدم دازے کی طرف بڑھا دیے۔

''میری گستاخی ناگوار گزری ہو تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔''

وہ پیچھے سے آہستہ آواز میں بولا تو وہ تڑپ کر مڑی در شکوہ کناں انداز میں بولی۔ ''آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں کہ محبت میں شکریے کی طرح معذرت کرنا بھی اصول کے خلاف ہوتا ہے۔''

''بہت اچھی طرح یاد ہے لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ چھوٹی سی معذرت آپسی تعلق کو اور بھی مضبوط کر دیتی ہے۔ محبت میں انا نہیں ہوتی اور صرف آدمی کی انا ہی ہوتی ہے جو اسے اپنے قصور پر معذرت کرنے سے روک دیتی ہے۔ انا نہ ہو اور صرف محبت ہو تو آدمی بے قصور بھی بلا جھجک معذرت کر لیتا ہے۔'' اس نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا جسے سن کر وہ مسکرا دی اور مسکراتے ہوئے جھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولی۔

''تو جناب کا خیال ہے کہ درحقیقت آپ سے کوئی گستاخی نہیں ہوئی اور آپ بس یونہی ہم سے تعلق مضبوط رکھنے کے لیے معذرت کر رہے ہیں۔''

''آپ تو سچ مچ بہت ذہین ہیں۔ میرا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ گئیں۔'' وہ بلند آواز میں ہنسا۔ کشور نے بھی دھیمی آواز میں اس کی ہنسی کا ساتھ دیا اور پھر ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رانی چہرے پر پریشانی لیے سامنے کھڑی تھی۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے بی بی!'' اس نے اس کی شکل دیکھ کر فقط اتنا سا ہی جملہ کہا لیکن کشور کو احساس تھا کہ وہ اتنی دیر لگ جانے کے باعث پریشان ہو اٹھی ہے۔

''تھینک یو رانی! تمہاری وجہ سے آج مجھے اپنی زندگی کی بڑی ان مول خوشیاں ملی ہیں۔'' رانی کا ہاتھ تھام کر اس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے باہر نکل کر اس رستے پر چل پڑیں جو درختوں کے اس جھنڈ تک جا رہا تھا جہاں انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی سمیت چھوڑا تھا۔ دور ہی سے انہوں نے دیکھ لیا کہ گاڑی کا بونٹ اٹھا ہوا ہے اور قریب کھڑا ڈرائیور تشویش سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں کو آتا دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان چھا گیا۔ بونٹ گرا کر اس نے پھرتی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ان دونوں کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس تیز رفتاری سے وقت کے فرق کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ڈرائیور کا اضطراری عمل تھا کہ وہ لاشعوری طور پر ایسی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا پوزیشن ہے عبدالمنان! سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا؟'' گاڑی پیرآباد کی حدود میں داخل ہوئی تو اس نے عبدالمنان کا نمبر ملا کر اس سے پوچھا۔ پیرآباد میں جاری افتتاحی تقریب کے انتظامات سنبھالنے کے لیے عبدالمنان صبح سے وہاں پہنچا ہوا تھا جبکہ وہ خود نور پور کے دورے پر چلا گیا تھا۔ ایک تو اسے وہاں جاری ترقیاتی کاموں کا جائزہ لینا تھا، دوسرے وہ پیرآباد میں زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ تقریب میں شرکت کرنے کے باعث اسے اپنا وقت چودھری کے ساتھ گزارنا پڑتا... جبکہ چودھری اور وہ دو مختلف دنیاؤں کے بندے تھے، چنانچہ چودھری کو برداشت کرنا اس کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔ خود کو اس امتحان میں زیادہ دیر مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنا آج کا شیڈول اس طرح ترتیب دیا تھا کہ پیرآباد میں مختصر وقت کے لیے ہی ٹھہرنا پڑے اور اب طے شدہ شیڈول کے مطابق وہ مقررہ وقت پر پیرآباد کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

''ایوری تھنگ از آل رائٹ سر! تقریب ابھی جاری ہے۔ میرے ساتھ آنے والی خاتون صحافی اندر پنڈال میں موجود ہیں اور تقریب کی کوریج کر رہی ہیں۔ حویلی کی خواتین کے علاوہ جن خواتین کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، ان میں سے ایس پی صاحب اور ڈاکٹر مسعود کی مسز بھی کچھ دیر قبل یہاں پہنچ گئی ہیں۔ اندازہ ہے کہ آدھے گھنٹے میں تقریب ختم ہو جائے گی اور ہم فارغ ہو جائیں گے۔''

''اصولاً تو اب تک تقریب کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ چھوٹے سے انڈسٹریل ہوم کے افتتاح کے لیے اتنا زیادہ وقت خرچ کرنا میری سمجھ سے باہر ہے۔'' وہ عبدالمنان کی پیش کردہ رپورٹ کو سن کر جھنجلایا۔

''آپ چودھری صاحب اور ان کی فیملی کے مزاج کے

بارے میں تو جانتے ہی ہیں سر کہ کس قدر شوباز لوگ ہیں۔ پہلے چودھری صاحب نے تقریب کو اپنی بیگمات کے شایانِ شان منعقد کرنے کے چکر میں پھیلایا اور اب ان کی بیگم باقی کی کسر پوری کر رہی ہیں۔ میرا اندر موجود خاتون صحافی سے رابطہ ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ بڑی چودھرائن تقریب ختم کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ پہلے ورائٹی شو کے نام پر اچھا خاصا وقت لگایا گیا اور اب تصویریں کھنچوانے کا سلسلہ جاری ہے۔ چودھری صاحب کی طرف سے اخبارات میں حویلی کی خواتین کی تصویریں شائع کرنے پر پابندی ہے لیکن چودھرائن اپنا ذاتی کیمرا لے کر آئی ہے اور اب انہوں نے ہماری بھیجی ہوئی خاتون صحافی کو اپنا فوٹوگرافر بنا رکھا ہے۔'' عبدالمنان نے بے بسی سے بتایا۔

''اوکے! تم کوشش کرو کہ جلد از جلد تقریب ختم ہو جائے۔ میں پیر آباد پہنچ چکا ہوں اور اب حویلی پہنچنے ہی والا ہوں۔ تم فارغ ہوتے ہی وہاں آجانا۔'' عبدالمنان کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پایا اور اسے ہدایات دینے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اگلے دو منٹ میں وہ حویلی پہنچ چکے تھے۔

ڈرائیور نے گاڑی حویلی کے بڑے سے پھاٹک سے اندر داخل کی ہی تھی کہ ایک دوسری گاڑی بھی پیچھے سے چلی آئی۔ اس کے گاڑی سے اترنے سے قبل ہی پچھلی گاڑی سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو پوری طرح چادر میں چھپی ہوئی تھی لیکن دوسری کو اس نے پہچان لیا۔ وہ وہی ملازمہ تھی جس کو اس نے لاہور کے اسپتال میں آفتاب کے کمرے کے باہر دیکھا تھا۔ اس ملازمہ کو دیکھ کر وہ یہی قیاس کر سکتا تھا کہ چادر پوش لڑکی آفتاب کی محبوبہ کشور ہے۔ وہ گاڑی سے اترنے کے بعد جب تک اندر نہیں چلی گئی، وہ احتیاطاً اپنی گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ چودھری افتخار کی دختر کا اتنا احترام لازمی تھا۔

''تو خالی کشور بی بی کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے... باقی بیبیاں میری اکیلی گڈی میں کیسے واپس آئیں گی؟'' مشا برم خان نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا، تب اس کے کان میں پچھلی گاڑی کے ڈرائیور سے کہا گیا یہ جملہ پڑا۔

''میں بھی دوبارہ واپس جاؤں گا۔ بی بی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اس لیے وہ جلدی اٹھ آئی تھیں، پر نصیب کی خرابی کہ راستے میں گڈی ہی خراب ہو گئی۔ وڈی مشکل سے میں نے اسے ٹھیک کیا، تب کہیں جا کر ہم اِدھر پہنچ سکے۔ مجھے تو خود فکر ہو رہی ہے کہ اُدھر گڈی کا انتظار ہو رہا ہو گا۔ وڈی چودھرائن تو سخت خفا ہوں گی کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگائی... پر میں کیا کرتا؟ ان مشینوں کا کوئی بھروسا تھوڑی ہوتا ہے، اچانک سے آدمی کو دھوکا دے جاتی ہیں۔'' اندر جاتے ہوئے ڈرائیور کی بیان کردہ صورتِ حال اس کے کانوں میں بھی پڑی جس کو سن کر وہ سمجھ گیا کہ تقریب ختم نہ ہونے کے باوجود کشور کیوں جلدی واپس آگئی ہے۔ اس کا استقبال کرنے والے ملازم نے اسے حویلی کے شان دار ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔ وہاں چودھری کے ساتھ ایس پی معظم تارڑ پہلے سے موجود تھا۔ وہ دونوں شطرنج کی بازی جمائے ہوئے بیٹھے تھے۔

''آئیے اے سی صاحب! ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بڑی دیر لگا دی آپ نے۔'' اسے دیکھتے ہی چودھری نے پُرجوش انداز میں استقبال کرتے ہوئے شکوہ کیا۔

''جی ہاں، اصل میں آج مجھے نور پور کے دورے پر بھی جانا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ وہاں بھی ہمارے پروجیکٹس پر کام ہو رہا ہے۔ بس وہاں سے واپس آتے آتے کچھ تاخیر ہو گئی۔'' چودھری اور ایس پی دونوں سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے اس نے اپنے دیر سے آنے کی وجہ بتائی۔

''اتنی سی عمر میں آپ کن جھمیلوں میں پڑ گئے ہیں اے سی صاحب! ابھی تو یہ آپ کے کھیلنے کھانے کی عمر ہے۔ ابھی آپ لائف کو انجوائے کریں۔ بہت وقت پڑا ہے اس طرح کے سوشل ورکس کرنے کے لیے۔'' اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے چودھری نے اسے مشورہ دیا۔

''چودھری صاحب! میں ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتا ہوں جو وقت پر بھروسا کر کے اپنی عمریں برباد کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی ''ہم کھانے والوں'' میں سے نہیں ہیں اور ''کھیل'' بھی فیئر طریقے سے کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں اگر سامنے والا بے ایمانی پر اتر آئے تو پھر اس کی چالوں کا ہمارے پاس یہی توڑ رہ جاتا ہے کہ اس کی چال اسی پر الٹ دیں۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں چودھری کی بات کا جواب دیا اور بساط پر بکھرے مہروں کا جائزہ لینے لگا۔ مہروں کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ ایس پی کو مات ہونے ہی والی ہے۔

''کیا ایس پی صاحب کو مات ہونے سے بچانے کے لیے غور کر رہے ہیں اے سی صاحب؟'' چودھری نے اسے چھیڑا۔

''جی نہیں۔ آپ میں سے کسی کو بھی مات ہو، میرا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ آپ کھیل جاری رکھیے۔ میں دیکھتا

ک... ایس پی صاحب خود کو مات سے بچانے کے لیے کیا ...ب لڑاتے ہیں؟'' اس نے مسکرا کر اسی معنی خیز لہجے میں ...ب دیا جسے نہ سمجھتے ہوئے وہ دونوں ایک بار پھر کھیل کی ...ف متوجہ ہو گئے لیکن اس سے قبل ہی ڈرائنگ روم میں ...بچال سا آ گیا۔ بھونچال بن کر وہاں آنے والا اچھے تن و ...ش کا ایک نوجوان لڑکا تھا جس کے چہرے پر موجود مخصوص ...شت اس کی ذہنی معذوری کا اعلان کر رہی تھی۔

''میں یہاں کھیلوں گا۔ تم گندی ہو، مجھے کہیں بھی نہیں ...نے دیتیں۔'' وہ ہانپتی ہوئی ملازمہ سے مخاطب تھا جو ...ے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ملازمہ سے کہتا ہوا ...تھ میں پلاسٹک کے بلے سے ڈرائنگ روم میں سجے قیمتی ...یکوریشن پیسز کو بال کی طرح ہٹ کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی ...کھتے چار ڈیکوریشن پیس اس کے بلے کی زد میں آ کر زمیں ...ن ہونے کے بعد چکنا چور ہو گئے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہر ...ٹنے والے ڈیکوریشن پیس کے ساتھ ساتھ ملازمہ کے ...چہرے پر چھائے خوف اور بے بسی کے بادل گہرے ہوتے ...جا رہے تھے۔

''آپ اوپر چلیے چھوٹے شاہ جی! وہاں آپ کے ...بہت سارے کھلونے ہیں۔ اوپر جا کر میں آپ کے ساتھ ...کھیلوں گی۔'' ملازمہ کپکپاتی ہوئی آواز میں اس ایبنارمل ...نوجوان کو بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے پیچھے چل ...رہی تھی۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اسے نیچے پڑی ...کرچیوں سے زخمی ہو جانے والے پیروں کا بھی ہوش نہیں ...تھا۔ مہمانوں کے سامنے پیش آنے والی اس صورتِ حال پر ...چودھری کا موڈ بُری طرح خراب ہو گیا اور وہ جلال میں بھرا ...ملازموں کو پکارنے لگا۔ فوراً ہی تین چار ملازم وہاں آ پہنچے ...اس کے اشارے پر نوجوان کو قابو میں کر کے ڈرائنگ ...روم سے باہر لے گئے۔

''معاف کر دیں سرکار! معلوم نہیں کیسے چھوٹے شاہ جی ...میری آنکھ بچا کر نیچے اتر آئے۔ دوبارہ ایسی غلطی نہیں ہو ...گا۔'' زخمی پیروں والی ملازمہ فوری طور پر باہر جانے کے ...بجائے وہیں رک کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے چودھری سے ...معافی مانگنے لگی۔

''تیرا تو میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔ ابھی اپنی شکل گم کر ...دے سامنے سے۔'' چودھری غضب ناک ہو کر دہاڑا۔ وہ ...بے چاری اس کی بات سن کر اور بھی زیادہ بُری طرح لرزنے ...لگی تاہم اس میں مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے چپ ...چاپ باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد ایک دوسری ملازمہ آ کر وہاں موجود پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

چودھری کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس کا مزاج بُری طرح برہم ہو چکا ہے اور اسے اپنا موڈ بحال کرنے میں سخت دشواری پیش آ رہی ہے۔

''آپ لوگ تشریف رکھیں، میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔'' بالآخر وہ برداشت نہ کر سکا اور یہ کہتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

''کون تھے وہ صاحب زادے؟'' شہریار یہ تو سمجھ چکا تھا کہ لڑکے کا تعلق چودھری کے خاندان سے ہے، بس اس نے چودھری سے اس کا رشتہ معلوم کرنے کے لیے یہ سوال کیا۔

''چودھری صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا بہزاد شاہ تھا۔ بے چارہ ذہنی طور پر معذور ہے۔'' ایس پی نے بتایا تو وہ سر کو تفہیمی جنبش دے کر خاموش ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد چودھری بھی واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات قدرے پُرسکون تھے۔

''میں نے ملازموں کو کھانا لگانے کا کہہ دیا ہے۔ ہم لوگ چل کر کھانا کھا لیتے ہیں۔ خواتین تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گی تو ان کے لیے الگ دسترخوان لگ جائے گا۔ میں نے چودھرائن کو ہدایت کر دی تھی کہ تمام معزز خواتین کو اپنے ساتھ حویلی لے کر آئیں۔ مہمان صحافی خاتون سے ان کی تقریب کے بارے میں رائے بھی معلوم کر لی جائے گی تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اخبار کے لیے کیسی رپورٹ تیار کریں گی۔''

ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کھانا لگوانے کی اطلاع دینے کے ساتھ آگے کا پروگرام بھی بتایا۔ حویلی میں کھانے کا ذکر اب شہریار کی طبیعت پر ناگوار گزرنے لگا تھا۔ پچھلی ایک دو ملاقاتوں میں تو اس نے وہاں کچھ بھی کھانے پینے سے سخت اجتناب کیا تھا لیکن آج ایسی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو چھپائے وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہاں بیٹھا رہا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی وائبریشن سے اسے پتا چلا کہ کوئی اسے کال کر رہا ہے۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ سجاد رانا کی کال آ رہی تھی۔ ''یس'' کا بٹن دباتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

''کہاں تھے شیری؟ میں کافی دیر سے تمہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفس سے معلوم ہوا کہ تم دورے پر ہو اور موبائل پر کال کرنے پر کوئی رسپانس ہی نہیں مل رہا تھا۔''

''فی الحال تو میں پیر آباد میں ہوں۔ اس سے پہلے نور پور میں تھا۔ شاید آپ نے اس وقت مجھے کال کی ہوگی اسی لیے رابطہ نہیں ہوسکا۔ نور پور میں موبائل سروس کام نہیں کرتی ہے۔ آپ بتائیں کہ سب ٹھیک تو ہے؟ کوئی نئی خبر...؟'' اپنے بارے میں وضاحت دینے کے بعد اس نے ان سے سوال کیا۔ اس وقت ان کی کال آنے پر لامحالہ اس کے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ وہ شینا کے حوالے سے کوئی خبر دینا چاہتے ہیں مگر انہوں نے اسے جو اطلاع دی اسے سن کر وہ بہ مشکل خود کو اچھل پڑنے سے روک سکا۔ سجاد رانا جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ بالکل اَن ہونی بات تھی۔

''آپ فی الحال اسے اپنے پاس رکھیں۔ میں فوری طور پر پہنچتا ہوں۔'' مکمل تفصیلات جاننے کا یہ موقع محل نہیں تھا اس لیے اس نے ان سے کہا اور موبائل آف کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''خیریت اے سی صاحب؟'' چودھری اور ایس پی جو اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی سمجھنے میں ناکام رہے تھے، اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''ایک ایمرجنسی ہے، مجھے فوری طور پر جانا ہوگا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ کھانے پر آپ لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' اس نے مختصر الفاظ میں بتایا اور دونوں سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنی گاڑی تک جاتے ہوئے اس کے حساس کانوں نے کسی عورت کی گھٹی گھٹی چیخیں سنیں۔

''چھوڑ دو... ماف کردو مجھے۔ اب کبھی ایسی بھول نہیں ہوگی۔'' وہ روتے ہوئے کسی سے التجا کررہی تھی۔ اس آواز پر اس کا دھیان فوراً اس ملازمہ کی طرف گیا جس کی غفلت کی وجہ سے بہزاد شاہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا تھا اور وہاں توڑ پھوڑ مچاوی تھی۔ یقیناً اس ملازمہ کو اس کی کوتاہی پر سزا دی جارہی تھی۔ چودھری تھوڑی دیر کے لیے ڈرائنگ روم سے شاید اسی کام کے لیے باہر نکلا تھا کہ ملازمہ کے لیے سزا کا تعین کرسکے، تب ہی جب وہ واپس آیا تھا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ انسانیت کے ساتھ روا اس ناانصافی پر جلتا کڑھتا وہ اپنی گاڑی میں آبیٹھا۔

''بنگلے پر چلو۔ وہاں سے ہم لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے مشابرم خان کو حکم دیا۔ لاہور جانے کے لیے اپنے ذاتی سامان کو لینے کے علاوہ گاڑی کو بھی ایک بار چیک کرنا ضروری تھا اس لیے یہیں سے براہِ راست روانگی کے بجائے کچھ دیر نور کوٹ میں اپنے بنگلے پر رکنا لازمی تھا۔

''میں ایک ضروری کام سے فوری طور پر لاہور جارہا ہوں۔ تم یہاں کے سارے معاملات خود ہی سنبھال لینا۔'' گاڑی کے چلتے ہی اس نے عبدالمنان کو فون کر کے اسے ہدایت دی۔ تجربہ کار مشابرم خان صاحب لوگوں کے مزاج کو سمجھنے میں ماہر تھا۔ اس وقت بھی اس نے اندازہ لگالیا کہ شہریار عجلت میں ہے اس لیے بہت مشاقی کے ساتھ فل اسپیڈ میں گاڑی دوڑادی۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی پیر آباد کے قبرستان کے قریب سے گزری تو وہ کسی معمول کی طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس قبرستان میں ایک قبر ایسی بھی تھی جس پر ماہ بانو کے نام کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس قبر میں دفن ہستی کے لیے دعائے مغفرت کی اور راستے کی طرف توجہ مبذول کرلی۔ جانے پہچانے راستوں سے گزرتی اس کی گاڑی بنگلے پر پہنچ گئی۔

''دفتر سے فون آیا تھا۔ کوئی سرمد صاحب آپ سے بات کرنے کے خواہش مند تھے۔ شاید کوئی بہت اہم معاملہ تھا۔ انہوں نے آپریٹر کو اپنا نمبر دے کر ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی آپ آئیں، ان سے رابطہ کرلیں۔ آپریٹر نے احتیاطاً فون کر کے مجھے بھی نمبر نوٹ کروادیا تھا کہ اگر آپ آفس کے بجائے یہاں پہنچیں تو آپ کو پیغام دے دیا جائے۔'' بنگلے میں داخل ہوتے ہی بیٹ مین نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے پیام دیا تو وہ تھوڑا سا الجھ گیا۔ فوری طور پر اسے بالکل بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ سرمد نامی شخص کون ہے؟

''میں لاہور جارہا ہوں۔ تم میرا سامان ریڈی کردو۔'' سرمد کے بارے میں یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بیٹ مین کو حکم دیا اور ٹیلی فون کے ساتھ رکھے نوٹ پیڈ پر درج سرمد کے نمبر کو دیکھنے لگا...... یہ موبائل نمبر تھا۔ بیٹ مین کے سامان پیک کرنے تک ملنے والی مہلت میں اس نے اس نمبر پر کال کر کے اپنی الجھن کو دور کرلینا مناسب سمجھا۔

''میں اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل بات کررہا ہوں۔ آپ یقیناً سرمد صاحب بات کررہے ہیں؟ فرمایئے! آپ کو کس سلسلے میں مجھ سے فوری طور پر بات کرنی تھی؟'' رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ جواباً وہ بہت پُرجوش انداز میں اپنے فون کرنے کی وجہ بتانے لگا۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

بحری جہاز پر قدم رکھتے ہی کروگر کو احساس ہوگیا تھا
حول میں کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے لیکن وہ اس کی
بت کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا تاہم اس سے پہلے بھی
اس کی چھٹی حس نے صحیح طور پر اسے قبل از وقت خطرات
ے خبردار کیا تھا اس لیے وہ اس پر اعتبار کرتا تھا۔
ایک اسٹیوارڈ اس کا پرانا سا سوٹ کیس اٹھائے اس
ے آگے چل رہا تھا۔ جب وہ اس مقام تک پہنچا جہاں
ڈیک میں بڑا سا شگاف تھا جس سے مستول گزرنے
ے بعد بھی اردگرد کافی جگہ خالی تھی، تو یک لخت اسے کچھ
ہ شدت سے خطرے کا احساس ہوا۔ اس کے جسم میں جھرجھری سی آگئی اور وہ اضطراری سے انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور عین اسی لمحے اوپر سے گرتی ہوئی کوئی چیز اسے ایک سیاہ سائے کی طرح نظر آئی۔ وہ چیز زوردار آواز کے ساتھ اس کے قدموں میں گری اور گویا کئی حصوں میں تقسیم ہوکر رہ گئی۔

کروگر کا ہاتھ مشینی انداز میں پتلون کی پچھلی جیب کی طرف جاچکا تھا جس میں اس کا ریوالور موجود تھا لیکن ریوالور نکالنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اوپر شگاف کی طرف دیکھ لیا تھا۔ وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ تب اس نے اپنے قدموں میں پڑی ہوئی چیز کی طرف دیکھا۔

مجرمانہ سرگرمیوں کا ساتھ دینے والی خوبیوں اور خامیوں کا انکشاف

فطرت کے بدلتے رنگوں کے ہمراہ زندگی کا سفر چلتا رہتا ہے... مسافتیں بدلتی رہتی ہیں... انسان مختلف مراحل طے کرتا ہے... عمر کی گزرتی دہائیوں کی طرح عادات کے بدلنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے... مگر کچھ عادتیں انسانی طبیعت میں اس طرح رچ بس جاتی ہیں کہ وہ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتیں... مخصوص عادات کے مالک اشخاص کا دلچسپ و حیرت انگیز ماجرا.

عادت

ثمر عباس

وہ دراصل بھاری بھاری آہنی اوزاروں، نٹ بولٹوں اور اسی قسم کے دوسرے گریس زدہ کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی ایک بالٹی تھی جیسی عموماً بحری جہاز کے مستریوں کے پاس ہوتی ہے۔ نیچے گرنے سے بالٹی میں بھرا ہوا بیشتر کاٹھ کباڑ ادھر اُدھر بکھر کر رہ گیا تھا لیکن اگر عین صحیح لمحے پر کروگر کی چھٹی حس نے اسے زیادہ مضطرب نہ کیا ہوتا اور وہ ایک قدم پیچھے نہ ہٹا ہوتا تو وہ بالٹی سیدھی اس کے سر پر گری ہوتی اور اس کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی ہوتی۔

کروگر نے پتلون کی پچھلی جیب سے ریوالور نکالے بغیر ہاتھ کھینچ لیا۔ اس سے چند قدم آگے جاتا ہوا اسٹیوارڈ رک چکا تھا اور مڑ کر بے یقینی کے سے عالم میں بالٹی کو اور کبھی کروگر کو دیکھ رہا تھا۔ جہاز کے دوسرے حصوں میں مختلف کاموں میں مصروف دیگر اسٹیوارڈ بھی حیرت سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ... یہ کیا ہوا تھا سر؟'' کروگر کا سوٹ کیس لے جانے والے اسٹیوارڈ نے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا۔'' کروگر نے برہمی سے جواب دیا۔ ''کسی احمق کی ذرا سی غلطی سے میں مرتے مرتے بچا ہوں۔''

اسٹیوارڈ نے ایک بار پھر بالٹی کی طرف دیکھا اور ناگواری سے کہا۔ ''یہ مستری اور خلاصی دن بہ دن کچھ زیادہ ہی بے پروا ہوتے جارہے ہیں۔'' وہ ہسپانوی میں بات کررہا تھا اور کروگر اسے ہسپانوی میں ہی جواب دے رہا تھا۔ کروگر کو سات زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اس کے پیشے میں یہ بھی ایک اضافی قابلیت تھی جو قدم قدم پر اس کے کام آتی تھی۔

اس نے گہری سانس لی اور اسٹیوارڈ کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے اعصاب پُرسکون ہوچکے تھے۔ بالٹی کا گرنا یقیناً ایک حادثہ تھا۔ کروگر کی خوش قسمتی تھی کہ یہ حادثہ اس کے لیے مہلک ثابت نہیں ہوا تھا۔ کوئی خلاصی یا مستری ڈیک پر مستول کے شگاف کے قریب وہ بالٹی رکھ کر بھول گیا تھا اور وہ کسی طرح کھسکتی ہوئی شگاف سے نیچے آگری تھی۔

اسٹیوارڈ نے اسے اس کے سیکنڈ کلاس کیبن میں پہنچا دیا اور ٹپ لے کر رخصت ہوگیا۔ کروگر نے سرسری سی نظر میں کیبن کا مکمل جائزہ لے لیا۔ کیبن ایسا ہی تھا جیسے عموماً پرانے جہازوں کے سیکنڈ کلاس کیبن ہوا کرتے ہیں۔ دیوار میں ایک بیضوی روشن دان تھا جس کا شیشہ بری طرح دھندلایا ہوا تھا۔ یقیناً کسی نے ایک مدت سے اسے صاف کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

دائیں طرف ایک چھوٹا سا سنک تھا اور بائیں طرف الماری۔ اس کے ساتھ ہی دیوار گیر بستر جسے دیکھنے سے ہی اس کے غیر آرام دہ ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ کروگر نے اسٹیوارڈ کے سامنے کسی چیز پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی سفر کے بارے میں کسی قسم کی بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بعد میں اگر اسٹیوارڈز سے کوئی پوچھ گچھ کرے تو انہیں ایسے ہی تبصروں وغیرہ کی وجہ سے مسافر کے بارے میں بہت سی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ سفر کے دوران وہ کبھی ایسا مسافر بننا نہیں چاہتا تھا جسے بعد میں کوئی یاد رکھے۔

کچھ دیر بعد وہ دروازے کا بولٹ چڑھانے کے لیے اٹھا لیکن یہ دیکھ کر اپنی جگہ رک گیا کہ دروازے میں بولٹ ہی نہیں ہے۔ سیکنڈ کلاس کے کیبنوں میں یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ان میں عموماً کوئی بھی چیز صحیح حالت میں نہیں ہوتی لیکن کروگر ایک عمر سے انہی حالات سے نباہ کرتا آرہا تھا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والے اس کی فیس تو بے چون و چرا ادا کردیتے تھے لیکن اخراجات کے معاملے میں تھوڑی بہت بچت کرنے کی ضرور کوشش کرتے تھے اور چند ڈالرز بچا کر سمجھتے تھے کہ انہوں نے دہری کامیابی حاصل کرلی ہے۔

کروگر نے جیب سے گتے کی ماچس نکالی اور اسے توڑ موڑ کر دروازے کے نیچے پھنسا دیا۔ اس طرح دروازہ خاصی مضبوطی سے بند ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے سوٹ کیس سے ٹیپ نکال کر اس کے خاصے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹے۔ ان ٹکڑوں کی مدد سے اس نے اپنا ریوالور سنک کے نیچے پائپ کی آڑ میں چپکا دیا۔

اسے معلوم تھا کہ سیکنڈ کلاس کے مسافر جب اپنے کیبن میں نہیں ہوتے تو اسٹیوارڈ عموماً ان کے سامان کو کھنگالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اسٹیوارڈ کو اس کے سامان میں ریوالور بھی ملے۔

اپنے کام کے سلسلے میں وہ آتشیں اسلحے پر زیادہ بھروسا اور انحصار نہیں کرتا تھا۔ آتشیں ہتھیار استعمال کرنے والوں کی طرف لوگوں کے متوجہ ہونے کا بہت زیادہ امکان رہتا ہے اور ان کا کچھ نہ کچھ سراغ بھی باقی رہتا ہے۔ ریوالور وہ صرف ذاتی دفاع یا انتہائی ہنگامی ضروریات کے لیے اپنے پاس رکھتا تھا ورنہ اپنے اصل کام کے لیے تو وہ نہایت سیدھے سادے 'حادثات' کا بندوبست کرتا تھا جن کے پیچھے کوئی چالاکی، عیاری یا سازش کارفرما نظر نہیں آتی تھی۔

اس کی عمر چوّن سال تھی۔ حلیے اور شخصیت کے اعتبار سے وہ کوئی سینئر کلرک یا درمیانے درجے کا دکان دار نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک اجرتی قاتل ہے۔ تیس برس سے اس کا پیشہ یہی تھا۔

دیوار گیر بستر پر بیٹھ کر وہ اس شخص کے بارے میں سوچنے لگا جس کو اسے اس جہاز پر ہی ٹھکانے لگانا تھا۔ بے خیالی میں اس کا ہاتھ اٹھا اور وہ اپنے دائیں کان کی لَو مسلنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اس میں یہی ایک بُری عادت تھی... اور اس کے پیشے میں کسی بھی مخصوص عادت کو اپنائے رکھنا بے حد خطرناک تھا۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ عادات انسان کی نشان دہی کردیتی ہیں۔ کسی بھی عادت کی بنا پر انسان کا کوئی بھی دشمن، کوئی حریف قاتل اسے آسانی سے تلاش کرسکتا ہے، پہچان سکتا ہے اور وار کرسکتا ہے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے ایک پرانے دوست کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس کا نام ڈیلوف تھا۔ غیر محسوس طور پر اس نے بار بار ٹائی کی ناٹ درست کرتے رہنا اپنی عادت بنالی تھی۔ تمام متعلقہ حلقوں میں اس کی یہ عادت مشہور ہوچکی تھی اور دنیا کی کئی سیکرٹ سروسز اور خفیہ تحقیقاتی ایجنسیوں میں جہاں بھی اس کا تھوڑا بہت ریکارڈ موجود تھا، اس میں اس کی اس عادت کا تذکرہ موجود تھا۔ وہ خواہ کوئی بھی نام، کوئی بھی بہروپ اختیار کرتا، اس عادت کی بدولت پہچانا جاسکتا تھا اور بالآخر اسی عادت کی وجہ سے وہ مارا گیا تھا۔

اس کے علاوہ کروگر ایک اور ایجنٹ کو بھی جانتا تھا جسے سگریٹ درمیان سے توڑنے کی عادت تھی۔ ایک اور ایجنٹ تھا، اسے کروگر ہی کی طرح ایک کان کو مسلنے کی عادت تھی۔ وہ بھی اپنی عادت کی بنا پر موت کے منہ میں پہنچ چکا تھا۔ بہ ظاہر وہ بھی 'حادثات' کا شکار ہوئے تھے۔

کروگر کے پیشے میں ایک اور شخص بڑا مشہور تھا۔ ویسے تو اس کے نہ جانے کتنے نام تھے لیکن، ہم پیشہ حلقوں میں وہ 'مسٹر ایم' کے نام سے مشہور تھا۔ کروگر نے کبھی اسے دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ اس کی نظر میں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اگر کوئی پارٹی اسے شایانِ شان معاوضہ دیتی تو وہ دو تین ماہ کے اندر اندر مسٹر ایم کو تلاش کرکے ٹھکانے لگا سکتا تھا... خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں موجود ہوتا کیونکہ اس کی بھی ایک عادت مشہور تھی۔ سنا تھا کہ وہ گتے کی ماچس پر چاروں طرف ناخنوں سے سیدھی لکیریں کھینچتا رہتا تھا۔

خوش قسمت

''آپ ہماری حادثاتی بیمہ پالیسی خرید لیں۔'' انشورنس ایجنٹ نے کہا۔

''کیوں خرید لوں؟''

''دیکھیں..'' ایجنٹ نے سمجھایا۔ پچھلے دنوں ایک شخص نے ہماری حادثاتی پالیسی لی اور پھر دو مہینے بعد ایک حادثے میں اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ ہم نے اس پالیسی پر تیس لاکھ روپے ادا کیے تھے۔ اب سوچیں، ہوسکتا ہے اگلے خوش قسمت آپ ہی ہوں!''

مسجد کے امام صاحب نے ایک چھوٹے سے بچے کو مسجد کے صحن میں روتے دیکھا تو اس سے رونے کا سبب پوچھا۔

بچے نے اوپر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے ابا مجھے اکیلا چھوڑ کر وہاں چلے گئے ہیں۔''

امام صاحب کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ''رنج نہ کرو میرے بچے۔ وہ وہاں فرشتوں اور حوروں کے پاس آرام سے بیٹھے ہنس رہے ہیں۔''

''ابا فرشتوں اور حوروں کے پاس نہیں گئے۔'' بچے نے کہا۔ ''وہ تو اوپر مسجد کی چھت دھو رہے ہیں۔''

انہی مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے کروگر کو احساس تھا کہ اسے اپنے کان کی لَو مسلنے کی عادت مکمل طور پر ترک کرنا ہوگی اور کوشش کرنا ہوگی کہ عادات و اطوار کے لحاظ سے وہ اس قدر عام اور اس قدر غیر اہم انسان نظر آئے کہ کوئی پچاسوں مرتبہ بھی اسے دیکھنے کے بعد اس کے بارے میں کوئی خاص بات یاد نہ رکھ سکے۔

جہاز کا انجن اسٹارٹ ہوچکا تھا اور در و دیوار میں ارتعاش پیدا ہوچکا تھا۔ روانگی کی وسل دی جارہی تھی۔ کروگر نے فیصلہ کیا کہ اب اسے بھی اپنا کام شروع کردینا چاہیے... یعنی اپنے شکار کی تلاش!

☆☆☆

کروگر بحری جہاز کے ڈائننگ روم میں بیٹھا تھا جس کے در و دیوار اور فرش پر گندگی کے آثار نمایاں تھے۔ ہوا میں کھانوں وغیرہ کی ایسی بُو رچی ہوئی تھی جس سے اشتہا بڑھنے کے بجائے کوفت کا احساس ہوتا تھا... مگر کروگر کبھی کسی چیز کے بارے میں شکایت کرکے کسی کی غیر ضروری توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کراتا تھا۔

کروگر ایک موٹی سی خاتون اور ایک اطالوی پادری کے

درمیان پھنسا بیٹھا تھا۔ نیپکن گود میں پھیلانے کے بعد اس نے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو مخاطب کیا۔ ''اگر آپ نے مینیو دیکھ لیا ہو تو براہِ کرم مجھے عنایت فرما دیجیے۔''

جس شخص کو اس نے مخاطب کیا... وہ بالکل عام سی شکل و صورت کا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی تاہم اس کا سر بالوں سے محروم ہو چلا تھا۔ وہ باریک فریم کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ اس کا نام ایمس بیکر تھا۔ اس شخص کو ایک مہلک 'حادثے' کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہونا تھا اور اس حادثے کا بندوبست کروگر کو کرنا تھا۔

کروگر غیر محسوس طور پر اس کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ شخص اس قدر بے ضرر اور غیر اہم نظر آتا تھا کہ کروگر کو اس کی موت کا فرمان جاری ہونے پر حیرت تھی۔ وہ اس قابل نظر ہی نہیں آتا تھا کہ کوئی اسے قتل کروانے کی ضرورت محسوس کرتا۔ وہ کسی سرکاری دفتر کا معمولی سا ملازم معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال، وہ جو کوئی بھی تھا اور جیسا بھی نظر آتا تھا اس نے یقیناً کوئی ایسی غلطی کی تھی کہ ہلاکت اس کا مقدر ہو کر رہ گئی تھی... وہ یقیناً کسی معاملے میں 'پارٹی' کی راہ میں رکاوٹ بنا تھا اور اس رکاوٹ کو دور کرنے کی ذمے داری کروگر کو سونپی گئی تھی۔

غیر ارادی طور پر کروگر نے کان کی لو مسلنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن بروقت وہ ہوشیار ہو گیا۔ اپنے آپ پر لعنت بھیجتے ہوئے اس نے ہاتھ کان کی طرف لے جانے کے بجائے سر کھجانا شروع کر دیا۔

مینیو میں اس کی پسند کی دو چیزیں موجود تھیں۔ کستورا مچھلی کا سالن اور امریکی پکوڑے... اس نے ان دونوں کا آرڈر دیا اور ایک عام آدمی کی طرح وقت گزاری کے لیے اطالوی پادری سے عامیانہ سی گفتگو کرنے لگا لیکن اس کا ذہن اپنے شکار ہی میں الجھا ہوا تھا... وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے لیے کون سا 'حادثہ' مناسب رہے گا۔

بحری جہاز پر عموماً کروگر اس 'حادثے' کو ترجیح دیتا تھا کہ اس کا شکار عرشے پر سے پھسل کر سمندر میں گر جائے... اس حادثے کی تکمیل کے لیے کئی طریقے اختیار کیے جا سکتے تھے۔ مثلاً شکار سے دوستی پیدا کی جا سکتی تھی اور کسی روز رات گئے اسے عرشے پر چہل قدمی کے لیے آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ تنہائی میسر آتے ہی جوڈو کا ایک وار کر کے اسے سمندر میں پھینکا جا سکتا تھا۔ اگر کروگر کا شکار شراب نوشی کا شوقین ہوتا تو وہ ایسا طریقہ کار اختیار کرتا... کہ حادثے کی شام وہ شخص بار میں خوب شراب پیتا نظر آئے تاکہ بعد میں لوگ رائے قائم کر سکیں کہ نشے میں دھت ہونے کے باعث وہ عرشے پر اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا ہوگا اور جنگلا موجود ہونے کے باوجود غالباً اپنی کسی احمقانہ حرکت کے باعث سمندر میں جا گرا ہوگا۔

دوسرا طریقہ ایسا تھا جس میں کروگر اپنے شکار سے راہ و رسم ہی نہیں رکھتا تھا جس کی وجہ سے بعد میں کوئی یہ شہادت نہیں دے سکتا تھا کہ اس شخص سے کروگر کا کوئی تعلق تھا۔ وہ رات کے کسی پہر خاموشی سے شکار کے کیبن میں گھستا۔ ایک نہایت سریع الاثر دوا کے انجکشن سے اسے بے ہوش کرتا اور اٹھا کر کسی قریب ترین اور محفوظ ترین راستے سے سمندر میں پھینک دیتا... اس قسم کے کٹارا جہازوں سے کبھی نہ کبھی کسی مسافر کے سمندر میں گر جانے کے واقعات رونما ہوتے ہی رہتے تھے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

اسٹیوارڈ، کروگر کے لیے مچھلی کا سالن لے آیا۔ وہ چھری کانٹا سنبھال کر کھانا شروع ہی کرنے لگا تھا کہ میز کے نیچے اپنی ٹانگ پر اسے کسی نرم چیز کی رگڑ کا احساس ہوا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت سی بلی تھی جو غالباً مستقل طور پر جہاز پر ہی رہتی تھی۔

کروگر اسے پچکارنے لگا۔ اسے جانوروں سے بے حد محبت تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے انسانوں سے محبت کرنے کے مواقع بہت کم ملے تھے۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ زندگی نے اگر کبھی اسے گھر بسانے کی مہلت دی تو اس گھر میں بیوی بچوں کے علاوہ بہت سے پالتو جانور بھی ہوں گے۔

دفعتاً ایک اسٹیوارڈ نے ڈائننگ روم میں جھانکا اور ہانک لگائی۔ ''کیا مسٹر رینڈل یہاں موجود ہیں؟''

''ہاں... میں یہاں ہوں۔'' کروگر نے فوراً جواب دیا۔ وہ کسی بھی مہم کے دوران جو بھی فرضی نام اختیار کرتا تھا، فوری طور پر اس کا اتنا عادی ہو جاتا کہ اس نام سے مخاطب کیے جانے پر فوراً متوجہ ہو جاتا... مہم ختم ہونے کے بعد فوراً ہی وہ اس نام کو ذہن سے جھٹک دیتا اور اسے بھول جاتا۔

''کیپٹن آپ سے ذرا دیر کے لیے ملنا چاہتے ہیں۔'' اسٹیوارڈ نے بتایا۔ کروگر کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

بات کوئی خاص نہیں تھی۔ دراصل وہ آہنی کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی بالٹی گرنے اور کروگر کے بال بال بچنے کا قصہ کیپٹن تک پہنچ چکا تھا اور وہ معذرت کر رہا تھا۔ کروگر نے ہنس کر بات ختم کر دی۔ جہازوں پر اس قسم کے واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ واقعہ کیپٹن کے ذہن سے محو ہو جائے... اس نے کیپٹن کے پیش کردہ سگار کے چند

کش لیے، کچھ دیر اس سے گپ شپ کی اور ڈائننگ روم میں واپس آ گیا... لیکن یہاں چند منٹ کی اس کی عدم موجودگی میں کچھ ہو چکا تھا۔

مسافر اور ڈائننگ روم کا عملہ اس میز کے گرد جمع تھا جس پر کچھ دیر پہلے کروگر چند دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ان سب کی مرکزِ نگاہ وہ بلی تھی جسے کچھ دیر پہلے کروگر نے پیار کیا تھا۔ بلی اب فرش پر پڑی جاں کنی کے عالم میں جھٹکے لے رہی تھی اور اس کے منہ سے بدرنگ سا سیال اور جھاگ بہہ رہا تھا۔

''اوہ... مسٹر رینڈل...!'' کچھ دیر پہلے متعارف ہونے والا پادری، کروگر کو دیکھتے ہی چلّا اٹھا۔ ''مجھ سے بڑی سنگین غلطی ہو گئی... آہ... یہ میں نے کیا کر دیا... لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ میری یہ غلطی تمہارے حق میں کتنی اچھی ثابت ہوئی...''

کروگر ایک ٹک، دم توڑتی بلی کو گھور رہا تھا۔

''تمہارے جانے کے بعد یہ اچک کر تمہاری کرسی پر بیٹھ گئی۔'' پادری نے بات جاری رکھی۔ ''یہ تمہارا سالن کھانا چاہتی تھی۔ کافی دیر تک تو میں نے اسے باز رکھا لیکن پھر تمہارے سالن میں مکھی پڑ گئی۔ چنانچہ میں نے مکھی نکال کر وہ پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی اور چند لمحے کے اندر اندر اس کی یہ حالت ہو گئی۔''

کروگر نے مسافروں سے درخواست کی کہ وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں پھر وہ اسٹیوارڈ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ ''سالن میں کیا تھا؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اسٹیوارڈ حقیقتاً پریشان اور بدحواس نظر آ رہا تھا۔ ''میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں سر!'' وہ حیرانی سے بولا۔ ''مچھلی تو سیل بند ڈبے سے نکالی گئی تھی۔''

''وہ ڈبّا مجھے دکھاؤ۔'' کروگر نے مطالبہ کیا۔

کچن میں جا کر اس نے ڈبّا دیکھا، اسے سونگھا۔ اس میں سے کچھ ایسی بو آ رہی تھی جیسے خوراک مقررہ مدت سے زیادہ عرصے تک اس میں رہنے کے باعث زہریلا پن پیدا ہو گیا ہو۔

''کسی اور نے بھی اس مچھلی کا آرڈر دیا تھا؟'' کروگر نے پوچھا۔

''جی نہیں... اس سفر کے دوران پہلی مرتبہ اس مچھلی کا آرڈر صرف آپ نے ہی دیا تھا۔''

''معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک حادثہ ہے۔'' بالآخر کروگر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ کاش کہ وہ اس ڈبے اور خصوصاً مردہ بلی کا طبی تجزیہ کرا سکتا لیکن جہاز پر یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ اپنے کیبن میں آیا تو خوف سے زیادہ اس پر طیش کا غلبہ تھا۔ بند ڈبوں میں کبھی کبھی خوراک کے زہرآلودہ ہو جانے کے واقعات سامنے آتے رہتے تھے اور کسی شخص کا ایسی خوراک کھا لینا محض حادثہ ہی سمجھا جا سکتا تھا لیکن اگر اس بالٹی والے حادثے کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا تو ایک دن میں دو دو حادثوں کی بات کچھ عجیب ہی لگتی تھی۔

وہ سنک کے پاس پہنچا اور اکڑوں بیٹھ کر اس نے سنک کے اس حصے کا جائزہ لیا جہاں اس نے ٹیپ کے ٹکڑوں سے ریوالور چپکایا تھا۔ ریوالور وہاں سے غائب تھا البتہ ٹیپ کے ٹکڑے پہلے سے مختلف انداز میں چپکے ہوئے تھے۔

بے اختیار اس کا ہاتھ کان کی لَو کی طرف اٹھ گیا اور اس بار وہ اپنے آپ کو اس مخصوص عادت سے باز نہ رکھ سکا۔ یہ بہت زیادہ سوچ بچار کرنے اور نہایت محتاط طرزِ عمل اختیار کرنے کا وقت تھا۔ اگر وہ بالٹی گرنے اور سالن زہرآلود ہو جانے کو اتفاقات یا حادثات میں شمار کر بھی لیتا، تب بھی کیا ریوالور غائب ہونے کا بھی کوئی ایسا جواز پیش کیا جا سکتا تھا؟

اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے؟ ریوالور کے بارے میں کسی اسٹیوارڈ سے کچھ پوچھنا تو فضول تھا۔ وہ سب کے سب یقیناً فرشتوں کی طرح معصوم بن جاتے۔ وہ بھلا کس طرح تسلیم کر سکتے تھے کہ مسافروں کی عدم موجودگی میں وہ ان کے کیبنوں کی تلاشی لیتے ہیں۔

موجودہ مہم کے خاتمے تک اسے بے پناہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ زیادہ امکان یہی نظر آ رہا تھا کہ اس بار پارٹی نے اپنے معتوب کے بارے میں اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے۔ وہ اتنا غیراہم اور بے ضرر نہیں تھا، جتنا سمجھا گیا تھا۔ پارٹی کو یقیناً اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا ورنہ اس نے ضرور کروگر کو محتاط رہنے کی خصوصی ہدایت کی ہوتی... یا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس بار پارٹی نے خود کروگر ہی کا صفایا کروانے کی ٹھان لی تھی؟ آخر اس کے سینے میں بھی تو پارٹی کے بہت سے راز جمع ہو گئے تھے... لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ ایسا سوچنا درست نہیں... پارٹی کو معلوم تھا کہ وہ دل سے ان کا وفادار ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے پیشے میں ماہر ترین آدمی بھی تو تھا۔ ایسے کام کے آدمی سے محروم ہونا پارٹی کس طرح گوارا کر سکتی تھی؟

اس نے ایک بار پھر ماچس تہ کر کے دروازے کے نیچے پھسا دی۔ اس سے اطمینان نہ ہوا تو اس نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس دروازے کے ساتھ لگا کر اس کے اوپر سے ٹیپ گزار کر چوبی فرش پر چپکا دیا۔ کوئی اندر آنا چاہتا تو اب بھی آ سکتا تھا لیکن اس طرح کافی آواز پیدا ہوتی جس سے کروگر خبردار ہو سکتا تھا۔

اس نے کپڑے اتارے اور بستر میں گھس گیا۔ چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ اونی کمبل کچھ زیادہ ہی چبھ رہا ہے حالانکہ اس پر سوتی کپڑے کا غلاف سا بھی چڑھا ہوا تھا۔ اس کپڑے کی موجودگی میں تو کمبل اتنا نہیں چبھنا چاہیے تھا۔ پھر ایک اور انکشاف نے اسے زیادہ چوکنا کر دیا... کہیں کہیں سے کمبل اسے خود بہ خود ہی حرکت کرتا محسوس ہوا۔ پھر اسے اپنے ننگے پیٹ پر کچھ زیادہ ہی چھیڑ چھاڑ اور چبھن کا احساس ہوا جیسے کپڑے میں لپٹا ہوا کوئی خاردار سا گولا اس کے پیٹ میں گھس جانے کے لیے بے قرار ہو۔

اس نے کمبل اس طرح اوپر اٹھایا کہ غلاف اس کے پیٹ پر ہی پڑا رہے، تب وہ چیز زیادہ آسانی سے حرکت کرنے لگی کیونکہ اب اس پر کمبل کا وزن نہیں رہا تھا۔ کروگر واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ بہت سی ٹانگوں والی کوئی چیز ہے جو اس کی پسلیوں پر سے گزرتی ہوئی تیزی سے گردن کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اس نے جھٹکے سے کمبل اور غلاف ایک طرف پھینکا اور دہشت کے عالم میں اٹھ کر سوئچ بورڈ کی تلاش میں دیوار پر ہاتھ مارا۔ روشنی ہوتے ہی اسے کمبل کے سفید غلاف پر ایک بڑی سی سیاہ خوفناک زہریلی مکڑی 'ٹرنٹولا' تیزی سے حرکت کرتی نظر آئی۔ جسامت میں وہ عام کبوتر سے کچھ ہی کم تھی۔

کروگر نے جوتا اٹھایا اور اس پر برسانے لگا۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں مری۔ حیرت، دہشت اور اس کو مارنے کی مشقت میں کروگر کو پسینا آ گیا۔ بالآخر اس نے جوتا ایک طرف پھینکا اور سنک پر ہاتھ منہ دھو کر تولیے سے خشک کرنے لگا۔ اسٹیوارڈ کو بلانے کے لیے کیبن میں کال بٹن نہیں تھا اس لیے اس نے دروازے سے اپنا سوٹ کیس وغیرہ ہٹا کر باہر جھانک کر اسے بلانے کے لیے آواز لگائی۔

چند لمحے بعد ایک اسٹیوارڈ آنکھیں ملتا ہوا آن پہنچا۔ ٹرنٹولا کو دیکھ کر اس نے کچھ زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کیا اور معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا۔ ''سر! اس قسم کی چیزیں کارگو کے ساتھ آ جاتی ہیں... جہاز پر اس مرتبہ پھل لدا ہوا ہے۔ پھلوں کے ساتھ زہریلے کیڑے مکوڑے بھی آ جاتے ہیں۔ خصوصاً کیلوں کے ساتھ... بعض اوقات ایسی کوئی چیز مال خانے سے رینگتی رینگتی کیبنوں تک بھی آ پہنچتی ہے...''

کروگر کو ایسی ہی کسی معقول وضاحت کی توقع تھی جس کے بعد بحث و تمحیص کی گنجائش نہ رہ جاتی لیکن معاملہ اب اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ غصے کے عالم میں کان کی لَو مسلتے ہوئے اور جوتوں میں پاؤں ٹھونستے ہوئے وہ غرایا۔

''میں کیپٹن سے بات کرتا ہوں۔'' اسٹیوارڈ لاتعلقی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

کیپٹن سے ملنا بھی بے سود ہی ثابت ہوا... وہی معذرتیں... وہی عملے کی بے پروائی کا رونا... وہی پھلوں کی باربرداری کے سلسلے کی مشکلات کا تذکرہ وغیرہ...

''دیکھو کیپٹن!'' کروگر نے ایک بار پھر برہمی سے کان کی لَو مسلتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک شریف اور سکون پسند آدمی ہوں لیکن میں صرف اس وقت تک ہی حادثات کے بارے میں صبر و ضبط کا مظاہرہ کر سکتا ہوں جب تک وہ ممکنات کی حدود میں رہیں... یہ حادثات صرف مجھے ہی پیش آ رہے ہیں... غضب خدا کا... ایک دن میں تین حادثات!''

''کیا آپ یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاز پر کوئی آپ کو ہلاک کرنے کے لیے کوشاں ہے مسٹر رینڈل؟'' کیپٹن نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''کیا آپ جیسے شرفاء کا کوئی جانی دشمن بھی ہو سکتا ہے؟''

یہ کروگر کی دکھتی ہوئی رگ تھی۔ وہ کیسے تسلیم کر سکتا تھا کہ اس جیسے شریف، امن پسند اور بے ضرر شہری کا کوئی جانی دشمن بھی ہو سکتا ہے... اگر وہ تسلیم کرتا تو پھر شکوک و شبہات اور لامتناہی وضاحتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ ''میں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی مجھے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ بدقسمتی سے تمہارے جہاز پر صرف مجھے ہی حادثات پیش آ رہے ہیں اور مجھے ان حادثات سے تحفظ فراہم کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔''

''یہ درست ہے۔'' کیپٹن نے نہایت شائستگی سے تسلیم کیا۔ ''میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ آپ مجھ سمیت عملے میں سے کسی کا بھی کیبن پسند کر لیں اور وہ میں آپ کو دے دوں۔ اس کے علاوہ میں کسی مستعد شخص کو نگرانی و حفاظت کے لیے آپ کے کیبن پر تعینات کر سکتا ہوں۔''

''نہیں... نہیں...'' کروگر بے تابی سے بول اٹھا۔ ''یہ سب کچھ ضروری نہیں... میں جہاز پر قیدیوں کی طرح سفر نہیں کرنا چاہتا... مجھے صرف کسی بھی ایسے کیبن میں منتقل کر دو جس کے دروازے میں تالا اور بولٹ موجود ہو۔''

نیوی گیشن ڈیک سے واپس آتے وقت کروگر سوچ رہا تھا کہ اگر بار کھلا ہو تو اسے ایک آدھ جام پی لینا چاہیے۔ اس کے اعصاب اتھل پتھل ہو چکے تھے اور وہ اپنی تمام احتیاطیں اور اصول جن پر وہ سختی سے عمل کرتا آیا تھا، بھول چکا تھا۔ وہ گویا چیخ چیخ کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا تھا۔

دفعتاً وہ رک گیا۔ ملگجے اندھیرے میں درمیانی عرشے پر لائف بوٹ نمبر ایک کے عین نیچے کوئی شخص جنگلے پر جھکا ہوا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں بھی کروگر کو اس کے خدوخال کچھ شناسا سے محسوس ہوئے۔ وہ بے آواز قدموں سے ذرا آگے بڑھا اور پھر اس نے پہچان لیا... بلاشبہ وہ ایمس بیکر ہی تھا۔

کروگر نے پیشہ ورانہ مشاقی سے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ ایمس بیکر جنگلے کے اختتام سے کچھ اِدھر اس مقام پر کھڑا تھا جہاں جنگلے کی حفاظتی زنجیریں بھی موجود نہیں تھیں اور یوں جنگلا بہت ہی نیچا رہ گیا تھا۔ اس کے سر سے تقریباً دو فٹ کی بلندی پر لائف بوٹس اس طرح قطار سے اپنے خانوں میں فٹ تھیں کہ ان کے پچھلے حصے چھجوں کی طرح باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ انہی میں سے پہلی بوٹ کے چھجے تلے ایمس بیکر کھڑا تھا۔ اس کی پشت کروگر کی طرف تھی۔

کروگر کے تو گویا دل کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ ایسا موقع بھلا پھر کہاں مل سکتا تھا؟ آس پاس اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ایمس بیکر کا قصہ پاک کرنے کے بعد وہ اپنی بقا کے مسئلے پر یکسوئی سے توجہ دے سکتا تھا اور اگر وہ واقعی حادثات تھے جو اسے پیش آرہے تھے تو ان سے بچاؤ اور ان کے سدِباب کی کوشش کر سکتا تھا۔

کروگر بلی کی طرح بے آواز قدموں سے ایمس بیکر کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھیں بھی اس بلی ہی کی طرح چمک رہی تھیں جسے اپنا مرغوب شکار نہایت بے خبری کے عالم میں کسی کونے کھدرے میں بیٹھا نظر آ گیا ہو۔ جب درمیانی فاصلہ بے حد کم رہ گیا تو وہ درندے کی طرح ایمس بیکر پر جھپٹا...

☆☆☆

تمام لائف بوٹس لاش کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس آ چکی تھیں اور کیپٹن ان بوٹس میں جانے والوں کی رپورٹیں سن چکا تھا۔ وہ اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔

''بلاشبہ یہ ایک افسوسناک حادثہ ہے مسٹر بیکر!'' کیپٹن نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص ایمس بیکر کو مخاطب کیا۔ ''اور یہ بھی افسوس کی بات ہے کہ اس کا تعلق آپ کی ذات سے بن گیا لیکن آپ ہرگز اپنے آپ کو اس حادثے کا ذمے دار نہ سمجھیں... ظاہر ہے اس میں آپ کا تو قطعاً کوئی قصور نہیں... آپ نے تو اس شخص کے سمندر میں گرتے ہی مدد کے لیے شور مچا دیا... حتیٰ کہ اسے بچانے کے لیے لائف بوٹ بھی پھینکی... آپ کا طرزِ عمل یقیناً قابلِ تحسین ہے۔''

ایمس بیکر سر جھکائے بیٹھا تھا اور بے حد مغموم و مضمحل نظر آ رہا تھا۔ کیپٹن کی باتوں سے گویا اس کا کچھ حوصلہ بڑھا۔ اس نے سر اٹھا کر ممنون سی نظروں سے کیپٹن کی طرف دیکھا۔ کیپٹن نے اسے سگریٹ باکس اور ماچس پیش کی۔

سگریٹ سلگاتے وقت ایمس بیکر کے ہاتھ کانپ رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے اعصاب پر ابھی تک حادثے کا اثر باقی ہے۔

''وہ... وہ یقیناً ذہنی توازن کھو چکا تھا...'' بالآخر ایمس بیکر نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''میں تو اس سے واقف بھی نہیں تھا... پہلی مرتبہ میں نے آج رات ہی اسے ڈائننگ روم میں دیکھا تھا... دوبارہ بس آج رات عرشے پر ہی دیکھا...'' بیکر نے جھرجھری سی لی۔ ''میں اطمینان سے جنگلے کے قریب کھڑا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا اور اپنے آپ میں مگن تھا کہ میں نے عقب میں عجیب سی آہٹ سنی... مڑ کر دیکھا تو وہ درندے کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا... عجیب وحشت تھی اس کے چہرے پر... اور آنکھیں تو بالکل کسی درندے ہی کی طرح چمک رہی تھیں... شاید وہ دیوانگی کی چمک تھی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں مسٹر بیکر!'' کیپٹن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''یہاں سب ہی نے محسوس کر لیا تھا کہ مسٹر ریندل کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ ان کے دل میں وہم بیٹھ گیا تھا کہ اس جہاز پر کوئی انہیں قتل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے... ظاہر ہے، یہ وہم کے سوا کچھ نہیں تھا... آپ کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت وہ آپ پر حملہ آور ہوا آپ اضطراری طور پر ایک طرف ہٹ گئے اور وہ اپنی جھونک میں سمندر میں جا گرا ورنہ وہ آپ کو اپنی دیوانگی کا نشانہ بنا چکا ہوتا بلکہ شاید اس صورت میں بھی وہ آپ کو اپنے ساتھ ہی لے کر ڈوبتا... جس انداز میں وہ آپ کے بیان کے مطابق بڑھ رہا تھا اس طرح آپ دونوں ہی کے سمندر میں گرنے کا قوی امکان تھا...''

ایمس بیکر نے مغموم انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور قالین کو گھورنے لگا... ساتھ ہی وہ گتے کی ماچس کو انگلیوں میں دبائے بے دھیانی کے سے عالم میں اس کے چاروں کناروں پر ایک انگلی اور انگوٹھے کے ناخن سے لکیریں کھینچے جا رہا تھا... غالباً یہ اس کی عادت تھی!

جائے پناہ

ب برنعیم

کسی بھی واقعے کے رونما ہونے کے بعد اس کا ردِ عمل ضرور سامنے آتا ہے ...اسی ردِ عمل کے نتیجے میں انسان کی شخصیت شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہے ...ایک ایسی ہی کہانی کے کردار جو اپنی اپنی جگہ اسرار کے پردے میں مخفی تھے۔

شکستِ ذات کا ماتم اور ہیجانی و نفسانی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کا جفا گزیدہ ماجرا

میری بیوی اچانک ہی غائب ہو گئی تھی اور میں پولیس اسٹیشن میں اس واقعے کی رپورٹ درج کروانے آیا تھا۔ وہ کچن کی میز پر ایک پوسٹ کارڈ چھوڑ گئی تھی جس کی پشت پر درج تھا۔ ''مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا۔ اسی میں ہماری بہتری ہے کیونکہ ہمارے بیچ اب کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا اور ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ سچ ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے... شیل۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ وہ غائب ہو گئی ہے جبکہ اس تحریر سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی مرضی سے تمہیں چھوڑ کر گئی ہے۔'' میرے سامنے بیٹھے ہوئے پولیس آفیسر نے اس پوسٹ کارڈ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ تحریر نہ ہوتی تو میں تمہیں مشورہ دیتا کہ اس کے دوستوں اور ملنے والوں سے معلوم کرو... بلکہ اسپتالوں کو بھی چیک کر لو لیکن اب میں تمہیں انتظار کرنے کا ہی مشورہ دے سکتا ہوں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

’’مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے جلد ہی رابطہ کرے گی۔‘‘
اس کی بات سن کر مجھے غصہ آگیا اور میں جھلاّتے ہوئے بولا۔ ’’کیا یہاں تمہارے علاوہ کوئی اور شخص ہے جس سے میں بات کرسکوں... مثلاً کوئی سراغ رساں یا سینئر آفیسر؟‘‘
’’وہ بھی بالکل یہی بات کہیں گے۔ اگر تمہاری بیوی نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو پولیس بھی کچھ نہیں کرسکے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ گھر جاکر آرام کرو اور اگر تنہائی سے گھبراؤ تو کسی پب میں چلے جانا۔‘‘
میرا دل چاہا کہ اس کی ناک پر ایک زوردار گھونسا رسید کروں لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا لہٰذا اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ’’تم نے میری بات غور سے نہیں سنی۔ میری بیوی اغوا ہوگئی ہے۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟‘‘
’’اس لیے کہ وہ ایک تحریر چھوڑ کر گئی ہے جس پر اس کے دستخط ہیں۔‘‘
’’یہی تو اصل مسئلہ ہے۔‘‘ میں نے اسے چوتھی بار سمجھاتے ہوئے کہا۔ ’’میری بیوی کا نام شیل نہیں بلکہ مچل ہے۔ اس نے کبھی دستخط کرتے وقت شیل نہیں لکھا۔‘‘
میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور مجھے مایوس لوٹنا پڑا۔ ڈیسک سارجنٹ کا مشورہ تھا کہ میں کم از کم اڑتالیس گھنٹے انتظار کرلوں۔ ممکن ہے کہ اس دوران میری بیوی واپس آجائے۔ گھر واپس آنے کے بعد میں نے ایک بار پھر تمام کمروں کا جائزہ لیا کہ کہیں مجھے کسی قسم کی گڑبڑ کے آثار نظر آجائیں لیکن سب کچھ اپنی اصلی حالت میں تھا... البتہ مجھے کسی کمی کا احساس ہوا۔ مثلاً وہ سوٹ کیس تو اپنی جگہ موجود تھا جو میں کانفرنس میں جاتے وقت اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن دوسرا سرخ رنگ کا سوٹ کیس مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ اسی طرح الماری اور درازوں میں بھی مجھے خالی پن کا احساس ہوا۔ اس کے کئی ملبوسات اپنی جگہ پر موجود نہیں تھے۔ اسی طرح اس کی جیولری، ذاتی استعمال کی اشیا اور بستر کے سرہانے رکھا ہوا ناول بھی غائب تھا لیکن اس کے باوجود میرا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مچل ہی اس کی ذمے دار ہے۔
اڑتالیس گھنٹے گزر جانے کے بعد میں دوبارہ پولیس اسٹیشن گیا۔ اس دوران میرا زیادہ وقت مچل کے دوستوں کو فون کرنے میں گزرا لیکن کسی سے کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ اس کی ماں ایک کیئر ہوم میں زندگی کے آخری دن گزار رہی تھی اور اس سے کچھ کہنا سننا فضول ہی تھا۔ البتہ ایک بہن تھی جس سے بات کی جاسکتی تھی۔ جب میں نے اسے مچل کی گم شدگی کے بارے میں بتایا تو وہ بالکل بھی پریشان نہیں ہوئی بلکہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ’’میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔‘‘
’’کیا میں اس سے بات کرسکتا ہوں؟‘‘
’’وہ یہاں نہیں ہے ویلس۔‘‘
’’پھر تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ خیریت سے ہوگی؟‘‘ میں نے جرح کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم ضرور اس کے بارے میں جانتی ہو۔‘‘
اس نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کردیا اور میں ایک بار پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا۔
جمعرات کی شام پولیس اسٹیشن میں میری ملاقات ایک سراغ رساں سے ہوئی۔ اس نے بھی کم وبیش وہی سوالات دہرائے جن کے جوابات میں ڈیسک سارجنٹ کو دے چکا تھا۔ میں نے ان اڑتالیس گھنٹوں کے درمیان ہونے والی پیش رفت سے بھی اسے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں اس کے تقریباً سبھی جاننے والوں کو فون کرچکا ہوں لیکن کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ سراغ رساں ایک جوان عورت تھی جو میک اپ نہ کرنے کے باوجود خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مزید کچھ سوالات کیے۔
’’مسٹر ویلس! کیا تم دونوں کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا؟‘‘
’’ہاں، ہم دونوں کا مشترکہ سیونگ اکاؤنٹ تھا۔‘‘
’’کیا اس اکاؤنٹ سے حال ہی میں کچھ رقم نکالی گئی ہے؟‘‘
’’ہاں، اس میں سے آدھی رقم نکال لی گئی ہے۔ اسی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ لوگ کتنے چالاک ہیں۔ اگر وہ پوری رقم نکال لیتے تو مجھے اور پولیس کو شبہ ہوسکتا تھا۔‘‘
’’وہ کون؟‘‘ سراغ رساں نے حیرت سے پوچھا۔
’’وہی جو اسے اغوا کرکے لے گئے ہیں۔‘‘
’’اب تک کے شواہد تو یہی بتارہے ہیں کہ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ وہ خود گئی ہے۔ خیر، یہ بتاؤ کہ وہ کہیں کام کرتی ہے؟‘‘
’’ہاں، وہ لائبریرین ہے لیکن اس کے ساتھیوں سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے گزشتہ سوموار کو استعفا دے دیا تھا۔‘‘
’’ہوں۔‘‘ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ’’مسٹر ویلس! مجھے افسوس ہے کہ پولیس اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی۔‘‘
’’کیا تم نے اس کی ہینڈ رائٹنگ پر غور کیا؟ مجھے لگتا

ہے کہ کسی نے اس کی ہینڈ رائٹنگ کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔‘‘
’’میں نہیں سمجھتی کہ کسی کی ہینڈ رائٹنگ کی نقل کرنا اتنا آسان ہوسکتا ہے۔‘‘
’’لیکن اس کا نام مچل ہے... وہ کبھی بھی اپنے آپ کو شیل کہلانا پسند نہیں کرے گی۔‘‘
وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’بعض اوقات نئی زندگی شروع کرنے کے لیے لوگ نام بھی بدل لیتے ہیں۔ اس نے بھی شیل کا نام اختیار کرکے ماضی سے تعلق توڑلیا ہے۔‘‘
’’میں چاہتا ہوں کہ کسی ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ سے اس تحریر کی تصدیق کروائی جائے۔‘‘ میں نے تجویز پیش کی۔
اس نے ایک طویل سانس لیا اور بولی۔ ’’اس کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے اور ہم پولیس کے وسائل کو اس طرح کے کیسز میں ضائع نہیں کرسکتے۔ ویسے اگر تم چاہو تو اپنے طور پر یہ انتظام کرسکتے ہو۔‘‘
’’اور اگر میری بات درست ثابت ہوئی تو...؟‘‘
’’اگر تم نے یہ ثابت کردیا کہ یہ تحریر جعلی ہے تو یقیناً ہم اس کیس کو دوسرے انداز سے دیکھیں گے۔‘‘
میں ذہنی طور پر خاصا منتشر تھا اور اپنے آپ کو کام پر جانے کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے اپنے ڈاکٹر سے رجوع کیا اور اس نے میری داستانِ الم سننے کے بعد ایک مہینے کا آرام تجویز کردیا۔ اب میں زیادہ دل جمعی سے مچل کو تلاش کرسکتا تھا لیکن اس کے لیے پہلے کسی ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کو تلاش کرنا ضروری تھا۔ میں نے ڈائریکٹری کے زرد صفحات کھنگال ڈالے لیکن وہاں اس پیشے سے متعلق کوئی نام نظر نہیں آیا۔ مجبوراً مجھے ایک بار پھر پولیس اسٹیشن جانا پڑا تاکہ وہاں سے کسی ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کا پتا معلوم کرسکوں۔ اس بار میری ملاقات ایک سراغ رساں سارجنٹ سے ہوئی۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب جین کا قتل ہوا تھا۔ ان دنوں وہ کانسٹیبل ہوا کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ مس پیٹرسن کی تیار کردہ رپورٹ پڑھ چکا ہے۔
’’اس نے تم سے ملنے کے بعد اپنے طور پر بھی کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ پہلے وہ لائبریری گئی جہاں سے یہ تصدیق ہوگئی کہ جب تمہاری بیوی نے استعفا دیا تو وہ بالکل نارمل تھی۔ اس کے چہرے سے خوف کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہورہی تھی اور نہ ہی یہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ کسی کے ڈرانے یا دھمکانے پر ملازمت چھوڑ رہی ہے... یا لائبریری کے باہر کوئی اس کا انتظار کررہا ہے۔ اس کے بعد مس پیٹرسن نے تمہاری بلڈنگ سوسائٹی کا رخ کیا۔ یہ تو تم بھی جانتے ہوگے کہ وہاں سب کچھ کلوزڈ کیمرا ٹی وی پر ریکارڈ ہوتا ہے۔ اس نے وہ فوٹیج بھی دیکھی جس میں تمہاری بیوی جوائنٹ اکاؤنٹ سے پیسے نکال رہی ہے۔ اس وقت بھی وہ بالکل پُرسکون تھی اور اس کے چہرے پر کسی قسم کے خوف یا گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے۔‘‘
’’یہ سب تم مجھے کیوں بتارہے ہو؟‘‘
’’تاکہ تمہیں یقین آجائے کہ تمہاری بیوی کو کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔‘‘ وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے بولا پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ ’’کیا تم نے کسی ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ سے رجوع کیا؟‘‘
’’نہیں۔‘‘ میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’کوشش کے باوجود ابھی تک کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرسکا۔ میں یہاں اسی لیے آیا تھا کہ کسی کا پتا چل جائے۔‘‘
اس نے ایک کاغذ پر کسی کا نام اور فون نمبر لکھا اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ’’یہ معقول لوگ ہیں اور مناسب معاوضے پر تمہارا کام کردیں گے۔‘‘
گھر آکر میں نے فون پر ان لوگوں سے رابطہ کیا اور تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد تحریر والا کارڈ اور مچل کی رائٹنگ کا ایک نمونہ انہیں ڈاک کے ذریعے بھیج دیا اور..... بے چینی سے ان کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ نہ جانے مچل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ یہ

مگن مشہور شاعر

ایک دفعہ ایک مشہور شاعر کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے گھر سے نکلے۔ راستے میں ایک دوست مل گئے۔ انہیں بھی ساتھ لیا۔ ہوٹل پہنچ کر شاعر صاحب نے پوچھا۔ ’’کیا کھاؤ گے؟‘‘
ان صاحب نے جواب دیا۔ ’’میں تو کھانا کھا کر آیا ہوں۔ اگر آپ اتنا ہی اصرار کررہے ہیں تو دودھ پی لیتا ہوں۔‘‘
انہوں نے اپنے لیے مرغی اور دوست کے لیے دودھ منگوایا۔ جب شاعر صاحب مرغی کھاچکے تو اس کی ہڈیوں پر زور آزمائی کرنے لگے۔ جب ہڈیوں میں سے کڑاک کڑاک کی آوازیں آنے لگیں تو ان کے دوست نے ان سے طنزیہ پوچھا۔ ’’آپ کے شہر کے کُتّے کیا کرتے ہیں؟‘‘
شاعر نے اپنے کام کو بڑے اطمینان وسکون سے جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’بھئی وہ دراصل دودھ پیتے ہیں۔‘‘

صحیح ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے ہماری ازدواجی زندگی میں کچھ تلخیاں پیدا ہو گئی تھیں لیکن ایسا تو ہر کسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہماری شادی کو انیس سال ہو چکے تھے اور اتنا عرصہ ساتھ گزارنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم نے ایک دوسرے سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ پھر مچل نے یہ کیوں لکھا کہ ہمارے بیچ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا؟ ممکن ہے کہ اس کے خیالات بدل گئے ہوں اور وہ یہ سوچ رہی ہو کہ یہ اس کے لیے علیحدگی حاصل کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ کئی سال پہلے ہم دونوں ٹرین کے ذریعے سفر کر رہے تھے کہ وہ راستے میں کسی نامعلوم مقام پر رک گئی جو ایک ویرانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں پتھروں کے ڈھیر، ایک ٹیلی فون کے کھمبے اور ایک جنکشن باکس کے سوا کچھ نہ تھا اور اس جگہ کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑ کھینچ دی گئی تھی اور اس باڑ کے ساتھ ہی لکڑی کے بورڈ پر لکھا ہوا تھا... ''ڈولفن جنکشن!'' مچل نے اپنی عادت کے مطابق اس لفظ کو دہرایا اور بولی۔ ''اگر تم نے یہ نام پہلے سنا ہوا ہے تو یقیناً تمہارے ذہن میں اس جگہ کی تصویر ابھر رہی ہوگی لیکن یہ تو اس سے بالکل مختلف ہے۔''

اس کے بعد یہ نام ہماری پرائیویٹ گفتگو کا حصہ بن گیا۔ جب ہم کسی ایسی جگہ جاتے جو ہماری توقع کے مطابق نہ ہوتی یا وہاں جا کر مایوسی ہوتی تو ہمارے ذہن میں ڈولفن جنکشن کا نقشہ ابھرتا اور ہم مزے لے لے کر اس جگہ کا احوال بیان کرتے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مچل بھی کسی ایسی جگہ نہ چلی گئی ہو جو اس کی توقع کے برعکس ہو اور جہاں جا کر..... اسے مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ نہ ملے۔

چند دنوں بعد وہ کارڈ واپس آ گیا اور اس سے پہلے کہ میں لفافہ کھول کر ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کی رپورٹ پڑھتا، ڈور بیل کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ شاید مچل واپس آ گئی ہے لیکن اس کے پاس تو چابی ہوتی ہے پھر اس نے گھنٹی کیوں بجائی؟

دروازہ کھولا تو سامنے ڈینس فارلو کھڑا تھا۔ کبھی وہ میرا قریبی دوست ہوا کرتا تھا لیکن اس نے مجھ پر اپنی بیوی کے ساتھ زیادتی اور قتل کا الزام لگایا تھا جو ثابت نہ ہو سکا پھر وہ دس سال تک ملک سے باہر رہا۔ اس نے ایک اور شادی کی جو ناکام ہو گئی۔ ایک سال پہلے وہ واپس آ گیا تھا اور اب ہم دونوں ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے اچانک مل جائیں۔

''ویلس! مجھے بہت افسوس ہوا۔'' یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں اسے اپنے ساتھ لے کر کچن میں آ گیا اور اسے چائے بنا کر دیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔''

''تم کم از کم مجھے فون تو کر سکتے تھے۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

میں جواب میں خاموش رہا لیکن میرے لیے ان تلخ یادوں کو بھلانا اتنا آسان نہیں تھا۔ بارہ سال پہلے اس کی بیوی جین فارلو کے ساتھ کسی نے زیادتی کی اور اسے قتل کردیا۔ یہ واقعہ قریبی جنگل میں پیش آیا تھا۔ اس سے ایک سال پہلے جین، ڈینس، مچل اور میں نے کورفو کے مقام پر اکٹھے تعطیلات گزاری تھیں... جہاں دوسرے مشاغل کے علاوہ فوٹوگرافی بھی ہوئی اور ہماری کئی تصویریں ایک ساتھ کھنچی ہوئی تھیں۔ اس لیے جین کی موت کے بعد پولیس نے مجھے بھی شاملِ تفتیش کرلیا۔ نہ جانے ڈینس کو یہ شک کیوں ہوا کہ میں اس واقعے میں ملوث ہوں تاہم پولیس نے کوئی ثبوت نہ ملنے پر مجھے بری کردیا۔

وہ کچھ دیر بیٹھا مجھے تسلیاں دیتا رہا پھر اچانک ہی بولا۔ ''کیا وہ تمہارے لیے کوئی خط چھوڑ گئی ہے؟''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ خبر پہنچانے والے نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی۔ ہاں، وہ ایک خط چھوڑ گئی تھی۔''

اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ دیر پہلے ڈاک سے موصول ہونے والے لفافے کا خیال آیا جو میں نے بے دھیانی میں کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے ڈینس کی موجودگی کا خیال کیے بغیر وہ لفافہ کھول لیا اور میری نظریں اس رپورٹ پر جم کر رہ گئیں جس میں تصدیق کی گئی تھی کہ یہ تحریر مچل ہی کی ہے۔ میں نے اس کاغذ کو موڑ کر فرش پر پھینک دیا۔

''کیا کوئی بُری خبر ہے؟'' ڈینس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں لیکن توقع سے زیادہ نہیں۔'' میں نے جل کر جواب دیا۔

''یہ میرا نیا موبائل نمبر ہے۔'' اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ تمہیں فون کرے یا اس کے بارے میں کوئی بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتانا۔''

''ضرور... ضرور! کیوں نہیں۔'' میں نے منافقت سے کہا۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ نوٹ پیڈ کے

ہوتے ہوئے مچل نے اس پوسٹ کارڈ کا انتخاب کیوں کیا جو عرصہ دراز سے فریج کے دروازے پر چسپاں تھا؟ اسے اس پوسٹ کارڈ کی پشت پر ہی وہ پیغام لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میں نے غور سے کارڈ پر بنی ہوئی تصویر کو دیکھا تو مجھے بہت کچھ یاد آ گیا۔

دی یارڈ آف ایل، ساڑھے چار سو سالہ قدیم پب تھا جس کا پورا ڈھانچا لکڑی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ پوری عمارت میں کہیں بھی لوہے اور سیمنٹ کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس لکڑی پر اتنی نفیس اور عمدہ پالش کی گئی تھی کہ آپ اس میں اپنا عکس دیکھ لیں۔ چار سال پہلے میں اور مچل وہاں ٹھہرے تھے۔ ہم دونوں بہار کا موسم کسی کھلی اور پُرفضا جگہ پر گزارنا چاہ رہے تھے۔ انٹرنیٹ پر تلاش کرنے سے ہمیں اس جگہ کے بارے میں معلوم ہوا۔ ناشتے کے بعد ہم وادی میں چڑھائی کی جانب سفر کر کے کوہ پیمائی کا شوق پورا کرتے اور شام میں ڈٹ کر کھانا کھاتے۔ وہاں گزرے ہوئے دن بے حد پُرلطف اور یادگار تھے چنانچہ جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو مچل نے نشانی کے طور پر کاؤنٹر سے وہ پوسٹ کارڈ اٹھایا اور گھر آ کر فریج کے دروازے پر چسپاں کردیا۔

ڈینس کے جانے کے بعد بھی میری نظریں اس کارڈ پر جمی رہیں۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور میں ایک گھنٹے پہلے ہی گھر سے باہر نکلا تھا۔ گوکہ ٹیلی ویژن پر بارش کی پیش گوئی کر دی گئی تھی لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی اور اپنے راستے پر چل نکلا لیکن کچھ دور آگے مجھے ایک پولیس والے نے روک کر متبادل راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا جس سے میرا سفر مزید طویل ہو سکتا تھا اور اس بات کی بھی گارنٹی نہیں تھی کہ اس سڑک کے اختتام پر مجھے منزل تک پہنچنے کا راستہ مل جائے۔

''ایسی صورت میں مجھے اپنے قیام کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنا ہوگی۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

اس نے مجھے ایک ہوٹل کا پتا بتایا جو چند میل کے فاصلے پر تھا۔ بارش کی وجہ سے راستے بند ہو گئے تھے اور وہاں عارضی طور پر قیام کرنے والوں کا رش بڑھ گیا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک کمرا مل گیا اور میں کپڑے تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر لیٹ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش نہ ہو رہی ہوتی تو اب تک میں دی یارڈ آف ایل، پہنچ چکا ہوتا اور وہاں موجود لوگوں کو مچل کی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا۔ میں اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ مچل نے اس کارڈ کی پشت پر وہ پیغام لکھ کر مجھے ایک

ہر شمارہ خاص شمارہ
سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ سرگزشت

جنوری 2010ء نیا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے
فسوں گر حقائق و تخیلات کے حامل شمارے کی ایک جھلک
نقش سلیمانی
ایک مایہ ناز ہستی کا زندگی نامہ جس کی تصنیف امر ہو گئی
سفر کرکٹ
کرکٹ کے شائقین کے لیے ایک انوکھا سفرنامہ
پومپیائی
ایک لمحے میں پورا شہر پتھر کا بن گیا تھا
شاعر زنداں
ایک صاحبِ طرز شاعر کی زندگی کا مختصر سا عکس
اور علاوہ
حالات کے اسیر افراد کی سچ بیانیاں، دلچسپ و معلوماتی قصے
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ جسے پڑھنا چاہئے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون 5895313 فیکس 5802551

اشارہ دیا ہے۔ اگر وہ یہ نہ چاہتی کہ میں اس کا پیچھا کروں تو وہ ایسا کیوں کرتی؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ تحریر اسی کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی، تب بھی اس میں ایک پیغام پوشیدہ تھا اور وہ کسی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی اور اس کے پیچھے چھپا ہوا درد صرف میں ہی محسوس کرسکتا تھا۔

میں نے ٹی وی آن کیا لیکن میرا ذہن اتنا منتشر تھا کہ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ پینے کی طلب محسوس ہوئی تو میں ہوٹل سے باہر نکلا اور سڑک کے پار واقع بار سے ایک اسکاچ کی بوتل لے آیا۔ کہتے ہیں کہ نشہ انسان کو دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیتا ہے لیکن مجھ پر شراب کا بھی اثر نہ ہوا۔ ذہن میں امڈنے والے یادوں کے بگولے مجھے بے چین کررہے تھے۔ ڈینس کی آمد بلاسبب نہیں تھی۔ وہ اپنی بیوی کے قتل کو نہیں بھولا ہوگا۔ مجھے یاد آیا کہ اس کی بیوی کی لاش ملنے کے دس دن بعد ایک اور حادثہ پیش آیا تھا اور بالکل اسی مقام پر ایک اور عورت کی لاش دریافت ہوئی تھی۔ میں ان دنوں ایک کانفرنس کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔ اس لیے مقامی اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں نہ دیکھ سکا لیکن طریقۂ واردات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دونوں عورتوں کا قاتل ایک ہی شخص ہے۔ پھر اس کے چند دنوں بعد ایسا ہی ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے یہ بات طے ہوگئی کہ جین کے قتل کے پیچھے کوئی خاص محرک نہیں تھا بلکہ وہ کسی جنونی شخص کی دیوانگی کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ڈینس نے اپنی بیوی کے قتل کا الزام مجھ پر عائد کیا۔ گو کہ ہمارے درمیان کئی سالوں سے دوستی چلی آرہی تھی لیکن صدمے نے اس کا دماغ ماؤف کردیا تھا اور اسے گمان گزرا کہ میری اس کی بیوی پر بری نظر تھی۔ یقیناً پولیس مجھ سے بھی اسی طرح پوچھ گچھ کرتی جیسے وہ جین کے دوسرے مرد دوستوں سے کررہی تھی لیکن ڈینس کے اس بیان کے بعد میں پولیس کی نظروں میں خاصا مشکوک ہو گیا تھا۔ پھر اسی نوعیت کے دو قتل اور ہوئے تو پولیس کی تفتیش کا دائرہ بھی پھیل گیا۔ اس کے باوجود کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی اور کچھ عرصے بعد ڈینس بھی بیرونِ ملک چلا گیا۔

وہ کئی سالوں بعد انگلینڈ واپس آیا تو اس میں کئی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ وہ پہلے کے مقابلے میں خاموش اور جذباتی نظر آرہا تھا... گو کہ ہمارے درمیان پہلے جیسی دوستی نہیں تھی لیکن مچل کے دل میں اس کے لیے خاصی ہمدردی تھی۔ شاید اس لیے کہ جین مر چکی تھی اور ڈینس کی دوسری شادی بھی ناکام رہی تھی لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل ہوچکی تھی جسے ماضی کو بھلانے کی ظاہری کوششوں کے باوجود نہیں گرایا جاسکتا تھا۔ ممکن ہے کہ ڈینس نے مجھ سے بدلہ لینے کی خاطر مچل سے تعلقات بڑھائے ہوں لیکن یہ سب میرا وہم بھی ہوسکتا تھا اور جب تک کوئی واضح ثبوت نہ ملتا، میں اس پر جوابی الزام عائد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

دوسری صبح بارش رک چکی تھی۔ سڑکوں پر پانی کھڑا تھا تاہم میں اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ پانی کی وجہ سے راستے میں جگہ جگہ رکاوٹ پیش آئی تاہم میں کسی نہ کسی طرح دی یارڈ آف ایل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں تین کاریں اور کھڑی تھیں۔ مجھے کاروں کی زیادہ پہچان نہیں لیکن ان میں سے ایک گاڑی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہاں آس پاس کوئی اور فرد موجود نہیں تھا۔ میں سڑک کی جانب بڑھنے کے بجائے اس کار کو غور سے دیکھنے لگا پھر میں اس گاڑی کے قریب گیا اور اس کے ونڈ اسکرین پر لگے پارکنگ پرمٹ کو دیکھ کر سب سمجھ گیا۔ وہ ڈینس فارلو کی کار تھی۔

میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے واپس چل دیا اور اندھیرا ہونے تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ میں نے کچھ خریداری بھی کی جس میں ایک ٹارچ، واٹر پروف جیکٹ، بیس بال کیپ اور ایک چاقو بھی شامل تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں کررہا ہوں لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ مجھے ان چیزوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

میں اتفاقات پر یقین رکھتا ہوں لیکن کیا ڈینس کی میرے گھر آمد بھی محض ایک اتفاق تھی؟ اس نے یقیناً وہ پوسٹ کارڈ دیکھ لیا ہوگا جس پر تصویر کے ساتھ پب کا نام بھی لکھا ہوا تھا اور وہ بھی میری طرح مچل کی تلاش میں یہاں آیا ہو... اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے پہلے سے ہی اس جگہ کا پتا ہو اور اس نے یہاں آنے کا پروگرام بنا رکھا ہو۔ لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا مگر ایک بات طے تھی کہ اگر موسم خراب نہ ہوتا تو میں اس سے پہلے یہاں پہنچ سکتا تھا۔

اس مرتبہ میں نے پب سے آدھے میل کے فاصلے پر گاڑی پارک کی اور نئی خریدی ہوئی چھوٹی سی ٹارچ کی مدد سے راستہ دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ جب میں کار پارکنگ تک پہنچا تو سوا چھ بج رہے تھے اور ڈینس کی کار ابھی تک وہاں موجود تھی۔ میں سخت سردی میں باہر کھڑا تقریباً ساڑھے چار گھنٹے تک انتظار کرتا رہا۔ جب بھوک زیادہ ستانے لگی تو واپس اپنی کار تک آیا اور اس میں بیٹھ کر قریبی پیٹرول اسٹیشن تک گیا جہاں سے میں نے کچھ اسنیکس لیے اور واپس آگیا۔ میں نے باہر کھڑے ہونے کے بجائے کار کی

پچھلی سیٹ پر لیٹنا زیادہ بہتر سمجھا۔ پھر میں نے دی یارڈ آف ایل کا فون نمبر ملایا اور مسز فارلو سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہاں مسز فارلو نہیں بلکہ مسٹر فارلو ٹھہرے ہوئے ہیں۔

دوسری صبح سات بجے میری آنکھ کھلی لیکن مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے سورج کی روشنی بہت کم تھی۔ میں اپنی گاڑی پب کے قریب لے کر آیا۔ اب مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے میں ڈینس کی گاڑی پر نظر رکھ سکوں۔ میں کافی دیر گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ میری سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ کہیں وہ میری نظروں میں آئے بغیر یہاں سے چلا نہ جائے اور دوسری یہ کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کے تعاقب میں چل دیا۔

اس سے پہلے میں نے زندگی میں کسی کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود میں بڑی ہوشیاری سے فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ اس دوران میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی دوسری گاڑی کو اپنے اور اس کے درمیان نہ آنے دوں اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا لیکن ایک جگہ مجھ سے چوک ہوگئی اور میں سڑک پر لگے ہوئے نشانات پر توجہ نہ دے سکا۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس راستے پر جارہے ہیں۔ اس نے اچانک ہی گاڑی ایک جانب موڑ لی اور میں آگے نکل گیا۔ تقریباً سو گز آگے جانے کے بعد میں نے گاڑی روکی اور اپنے سامان سمیت تیزی سے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ میں نے واٹر پروف جیکٹ پہنی اور سر کو ٹوپی سے ڈھانپ لیا۔ آگے چل کر ایک موڑ پر مجھے ڈینس نظر آگیا۔ وہ چڑھائی کی طرف بڑھ رہا تھا اور لگتا تھا کہ بہت جلدی میں ہے یا کوہ پیمائی کا کوئی نیا ریکارڈ قائم کرنا چاہ رہا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اسے کوہ پیمائی یا ورزش کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ وہ ایک خاص منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی سرخ جیکٹ بار بار میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی لیکن میں اپنی رفتار بڑھا کر اسے اپنی نظروں کے حصار میں لے لیتا۔

کچھ دیر بعد وہ فٹ پاتھ ختم ہوگئی اور مجھے ایک پگڈنڈی پر اترنا پڑا۔ بارش کی وجہ سے کچی زمین پر چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور کیچڑ میں پاؤں دھنس رہے تھے پھر اچانک ہی ایک گرا ہوا درخت میرے راستے میں آگیا۔ بے خیالی میں ٹھوکر لگی، میں اپنے ہی زور میں نیچے گر گیا اور میرا سر اس کے تنے سے ٹکرایا۔ بہ مشکل تمام اٹھ

جاسوسی ڈائجسٹ
سسپنس ڈائجسٹ
رسائل نہیں ملتے
ماہنامہ پاکیزہ
ماہنامہ سرگزشت
اندرونِ ملک چھوٹے شہروں اور قصبوں کے معزز قارئین کی یہ شکایت دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔
ہاکرز اور بک اسٹال والے صرف اتنی کاپیاں خریدتے ہیں جن کے بک جانے کا انہیں سو فیصد یقین ہو کیونکہ بچ رہنے والی ایک کاپی ان کی کئی کاپیوں کا نفع کھا جاتی ہے۔
کوئی بھی خسارے کا ایسا سودا پسند نہیں کرتا
رسائل کے یقینی حصول کے دو طریقے ہیں
اپنے ہاکر یا بک اسٹال والے کو تاکید کردیں کہ وہ ہر مہینے باقاعدگی سے آپ کو رسالہ فراہم کرے وہ اپنی تعداد بڑھا لے گا۔
یا
آپ ادارے کو صرف 600 روپے (ڈاک خرچ اس میں شامل ہے) بھیج کر ہمارے کسی بھی پرچے کے سالانہ خریدار بن جائیں اور مزید کسی خرچ یا بھاگ دوڑ کے بغیر 12 شمارے رجسٹرڈ ڈاک سے بروقت اپنی دہلیز پر حاصل کرتے رہیں۔
اس شرح سے آپ زائد سالوں اور چاروں پرچوں کے لیے بہ یک وقت زرِ سالانہ ارسال کرکے بے فکر ہوسکتے ہیں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551

کر نظریں دوڑائیں لیکن ڈینس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرنے لگا۔ آگے چل کر اس وادی نے گھوڑے کی نعل کی شکل اختیار کرلی۔ وہ جگہ چاروں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ پھر مجھے اچانک ہی ایک جھاڑی سے سرخ رنگ کی پٹی جھانکتی نظر آئی۔ یقیناً ڈینس بارش سے بچنے کے لیے اسی جھاڑی میں پناہ لیے ہوئے ہوگا۔ کیا واقعی ایسا ہی تھا یا وہ میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا؟ میں دبے پاؤں اس جھاڑی تک پہنچا لیکن ڈینس وہاں نہیں تھا البتہ اس کی جیکٹ ضرور جھول رہی تھی۔ پھر اچانک ہی مجھے گردن کے پچھلے حصے میں چبھن کا احساس ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے مختلف قسم کے رنگ گڈمڈ ہونے لگے۔

جب آنکھ کھلی تو میں نے خود کو کنکریٹ کے فرش پر پڑے تین انچ موٹے گدے پر لیٹا ہوا پایا۔ اس کمرے میں روشنی آنے کا واحد راستہ وہ کھڑکی تھی جو ڈینس کے سر سے نو فٹ اونچائی پر واقع تھی اور اس کے عقب میں کوئی چیز رکھی تھی جو میں اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا۔ میں نے تکلیف سے کراہتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''وہ مرچکی ہے۔'' ڈینس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی اور مجھے یقین آگیا کہ ڈینس نے مچل کو اغوا کر کے قتل کردیا ہے۔ میں غصے کے عالم میں بولا۔ ''تو یہ تمہارا منصوبہ تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ باتوں کی وضاحت کی ضرورت ہے۔''

اور یہی وہ وقت تھا جب مجھے احساس ہوا کہ ڈینس کے عقب میں اجنبی دکھائی دینے والی شے ایک سیڑھی تھی۔ اس کمرے میں آنے جانے کے لیے کوئی دروازہ نہیں تھا اور اس کام کے لیے یہی سیڑھی استعمال کی جاتی تھی جس کا آخری سرا چھت میں بنے ہوئے سوراخ تک تھا۔

''میرا اشارہ تمہاری نہیں بلکہ اپنی بیوی کی جانب ہے۔'' ڈینس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی سنائی دی۔

پھر مجھے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ مچل کہہ رہی تھی۔ ''میں نے لاکٹ تلاش کرلیا۔ مجھے یقین تھا اور بہت عرصے سے جانتی تھی کہ تمہاری نظر جین پر ہے لیکن کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم اپنی ہوس کی پیاس بجھانے کے بعد اسے مار ڈالو گے۔''

میں اس کی بات کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن کیا کہتا... یہی کہ میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان حالات میں اسے قائل کرنا مشکل ہے۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کا ثبوت یہ لاکٹ ہے جو تم نے اتنے عرصے چھپائے رکھا۔ یہ مجھے باتھ روم کے ٹائل کے پیچھے سے ملا ہے۔''

'اوہ میرے خدا! یہ سب کیا ہے؟' میں نے حیرت سے سوچا۔ یہ سچ ہے کہ میں اور جین ایک دوسرے کے بے حد قریب آگئے تھے۔ ہر تعلق میں انسان سے کوئی غلطی ضرور سرزد ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں نے بھی اس کو سمجھنے میں غلطی کی ہو لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔

''اور وہ دوسری عورتیں جنہیں تم نے اس طرح قتل کیا کہ یہ سب اتفاقیہ نظر آئے۔ ایسی صورتِ حال میں، میں کس طرح تمہارے ساتھ رہ سکتی تھی کیونکہ دوسرے لوگ بھی یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں تمہاری حرکتوں کے بارے میں سب جانتی تھی۔''

'میں بھی تمہارے بارے میں یہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔' میں یہ جملہ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش رہا۔

ڈینس بولا۔ ''مچل ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ تم نے جو کچھ کیا، اس کا اثر اس کی زندگی پر بھی پڑے گا۔ تم نے میری زندگی تباہ کی، جین کو قتل کیا اور اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے دو بے قصور عورتوں کو بھی مار ڈالا... لیکن تم مچل کی زندگی تباہ نہیں کرسکتے۔ ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔''

آخر کار میں نے اپنی خاموشی توڑ دی اور بولا۔ ''کیا تم مجھے مار ڈالو گے؟''

''نہیں۔'' ڈینس نے کہا۔ ''ہم تمہیں یہاں تنہا چھوڑ کر جارہے ہیں۔''

میں کبھی کبھی سوچتا کہ شاید کوئی مجھے تلاش کررہا ہو لیکن جلد ہی انہیں یقین آگیا ہوگا کہ میں کسی حادثے میں..... ہلاک ہوگیا ہوں۔ سبھی جانتے تھے کہ میں مچل کی تلاش میں نکلا تھا اور اس نے بھی واپس پہنچ کر یہی کہا ہوگا۔ ''میں نہیں جانتی تھی کہ اس نے میری گم شدگی کا اتنا اثر لیا اور اپنی جان گنوادی۔''

اس دوران میں ایک سو بتیس لیٹر پانی پی چکا ہوں اور مچھلی، گوشت اور بھنے ہوئے چنوں کے کئی ٹن ختم کرلیے ہیں جبکہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں بند ڈبوں میں خوراک موجود ہے۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ انہوں نے تاحیات سپلائی کا بندوبست کر رکھا ہے۔ اب مجھے ڈولفن جنکشن کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہے۔

♣

میگن اس دکان میں داخل ہوا تو وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کی دھمکی یاد تھی۔ اس نے میگن کو گردن سے پکڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''اگر آج تم ناکام رہے تو یاد رکھنا، میں تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک کروں گا۔''

میگن کا باپ راجر ایسا ہی شخص تھا۔ وہ معصوم اور کمزور سے میگن کو اتنی بُری طرح پیٹتا... کہ اس کے پڑوسیوں کے دل دہل جاتے... مگر اس کے باپ کو اس پر ذرا بھی ترس نہیں آتا تھا۔ میگن نے ہوش سنبھالنے کے بعد بس اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ اس کی ماں کہاں تھی، زندہ تھی یا مرگئی تھی... میگن کو راجر نے کبھی نہیں بتایا۔ ایک دو بار اس نے پوچھا بھی تھا لیکن جواب میں راجر نے اس کو اتنا مارا کہ اس کے بعد پھر اس کی جرأت نہیں ہوئی۔ البتہ اسے تجسس ضرور تھا کہ اس کی ماں

کھوئی ہوئی جنت کی تلاش میں دربدر بھٹکتے ماں بیٹے کا احوال

عورت کی ذات اور وجود ایک معما ہے... عورت بھی اپنے زندہ ہونے کا ادراک چاہتی ہے... ایک شوہر کے ظالمانہ رویے کی عکاسی کرتی پُر افسوس کہانی۔ جو اپنی بیوی سے ہر حق چھین لینا چاہتا تھا۔

گمشدہ جنت

محمد عمر نعمان

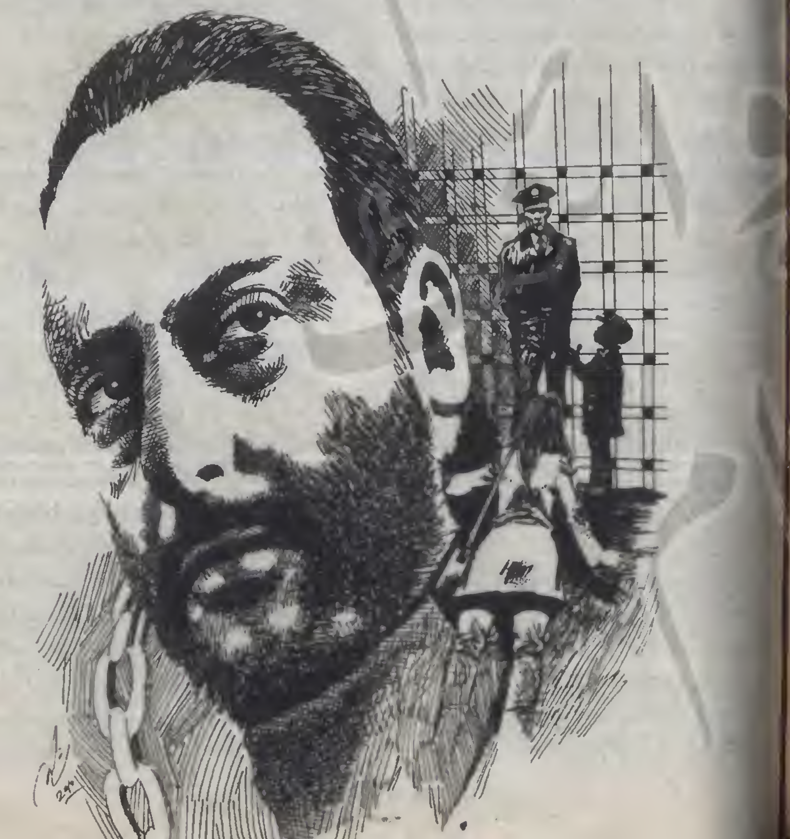

کہاں گئی؟ وہ زندہ تھی تو کہاں تھی؟ اسے یقین تھا کہ اس کی ماں ابھی زندہ ہے اور وہ راجر کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس جیسے آدمی کے ساتھ رہنا آسان کام نہیں تھا۔ جو شخص اپنے بچے پر ترس نہ کھائے، وہ بیوی کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کرتا ہو گا۔ البتہ ایک بات میگن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اس کی ماں اسے کیوں چھوڑ گئی تھی؟ ماں کی محبت اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی لیکن اسے معلوم تھا کہ اولاد ...... سے اس کی ماں سے زیادہ کوئی پیار نہیں کر سکتا۔

اگر اس کی ماں اسے خود چھوڑ کر گئی تھی تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے باپ کی وجہ سے اس سے وابستہ ہر چیز سے نفرت کرنے لگی تھی۔ ان میں وہ بھی شامل تھا ورنہ کوئی ماں اپنے بچے کو کہاں چھوڑتی ہے۔

میگن ابھی صرف نو سال کا تھا لیکن حالات نے اسے... باشعور بنا دیا تھا اور وہ زندگی کے بارے میں اپنی عمر سے بڑھ کر سوچتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے باپ جیسے شخص کے ساتھ گزارہ بہت مشکل کام ہے۔ خود اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ جائے لیکن ساتھ ہی اسے احساس بھی تھا کہ اس دنیا میں باپ کا گھر ہی اس کی واحد پناہ گاہ ہے۔ بے شک اس کا باپ ظالم صحیح اور وہ اتنی سی عمر میں اس سے کام بھی لیتا تھا لیکن وہی اس کا سہارا تھا۔ اگر وہ اس گھر سے بھاگ نکلتا تو نہ جانے کن لوگوں کے ہاتھوں لگ جاتا... اور سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ پولیس اسے پکڑ کر دوبارہ اس کے باپ کے حوالے کر دیتی اور وہ اسے گھر سے فرار ہونے کا اچھی طرح سے مزہ چکھا دیتا۔

وہ جس عمارت میں رہتے تھے، اس میں زیادہ تر راجر جیسے لوگ ہی رہتے تھے... جرائم پیشہ اور ظالم قسم کے! وہ اپنے گھر والوں کو نہیں بخشتے تھے لیکن ان میں کوئی راجر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی اپنے بچوں کے حق میں اتنا ظالم نہیں تھا اور نہ ہی وہ لوگ اپنے بچوں کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں میں استعمال کرتے تھے۔ راجر نہایت بدحرام شخص تھا۔ وہ صرف آرام کرتا تھا اور شراب پیتا رہتا... جب تک میگن چھوٹا تھا، وہ مجبوراً کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلاتا رہتا تھا لیکن جب وہ سات سال کا ہوا تو راجر نے اسے جرائم کی راہ پر ڈال دیا اور اس کی مدد سے کمانے لگا۔ وہ ہفتے میں دو تین بار کام کرتے تھے اور راجر کو اتنا مل جاتا... کہ وہ اس سے اپنی شراب کا خرچ پورا کرنے کے ساتھ کھا پی بھی لیتے تھے۔ وہ جس ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں رہتے تھے، وہ راجر کا اپنا تھا۔ اس کمرے میں ایک ہی بیڈ تھا اور اس پر راجر سوتا تھا۔ میگن کو نیچے سونا پڑتا تھا بلکہ کبھی کبھی راجر کو کوئی سستی سی کال گرل مل جاتی... تو اس رات میگن کو باہر گیلری میں سونا پڑتا۔

راجر نہایت شاطر تھا۔ وہ جرائم پیشہ ضرور تھا لیکن اس نے کبھی جرم کے لیے تشدد کا سہارا نہیں لیا۔ وہ کسی ایسے طریقے کے خلاف تھا جس میں معاملہ لڑائی بھڑائی یا تشدد کیا جائے۔ وہ عام طور سے فراڈ کر کے رقم کماتا... وہ اداکاری سے لے کر مکاری تک دونوں کاموں میں ماہر تھا۔ اس نے میگن کی تربیت بھی اسی طرح کی تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر ہر طرح کی اداکاری کر لیتا۔ اصل میں اس کا کام ہی اداکاری تھا۔ راجر کسی بھی کام سے پہلے اپنے پلان کے مطابق میگن سے اتنی ریہرسل کراتا... کہ کیا فلم، ٹی وی اور تھیٹر والے اپنے اداکاروں سے کراتے ہوں گے۔

اس بار بھی راجر نے اسے پکا کر کے بھیجا۔ یہ دکان راجر نے کئی دن پہلے ہی تاڑ لی تھی۔ یہ کسی بڑی مارکیٹ سے دور مقامی دکان تھی جہاں زیادہ تر محلے کے لوگ پھلوں وسبزیوں اور مختلف اقسام کے گوشت کی خریداری کرنے آتے تھے اور ان میں سے زیادہ تر نقد خریداری کرتے تھے۔ راجر عام طور سے ایسی دکانوں یا جگہوں کا انتخاب کرتا تھا جہاں لوگ نقد خریداری کرتے ہوں۔ وہ جگہ کسی مصروف شاہراہ پر نہ ہو اور وہاں عام طور سے پولیس کا گشت نہ ہو۔ ایسی جگہیں کم ہی ہوتی ہیں لیکن اسے اپنے مطلب کی کوئی نہ کوئی جگہ مل ہی جاتی۔ یہ دکان بھی کچھ ایسی ہی جگہ پر تھی۔

میگن نے اندر داخل ہو کر گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے پھلوں والے ریکس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ریکس کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان میں موجود پھلوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت دکان میں بے پناہ رش تھا۔ دراصل صبح کا وقت تھا اور بے شمار خواتین خریداری کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ میگن ان کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ دکان میں موجود مالک اور اس کے دو ملازمین بہت زیادہ مصروف تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ خاص طور سے ایک بچے پر نظر رکھتے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

میگن آہستہ آہستہ ان ریکس کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں خوب صورت ٹریز میں چکن، مٹن اور بیف کا تیار گوشت رکھا ہوا تھا۔ گاہک اپنی پسند کا گوشت اٹھا کر ادائیگی کے لیے گوشت والے کاؤنٹر پر جا رہے تھے۔ اس وقت وہاں ادائیگی کرنے کے لیے خواتین اور مردوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی اور کیش وصول کرنے والوں کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ میگن ایک ٹرے کے قریب ہوا اور اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر بیف کے گوشت کا ایک خاصا بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر پھرتی سے اپنی کمر کے ساتھ لٹکے بیگ میں ڈال لیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نے اسے ایسا کرتے نہیں دیکھا ہے۔ وہ مطمئن ہو کر جانے لگا تو ایک شخص نے اسے روک لیا۔

''برخوردار! یہ کیا حرکت ہے؟'' اس نے خاصی بلند آواز میں کہا۔

میگن کو روکنے والا شخص معزز نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی تھی اور آنکھوں پر ریم لیس عینک پہن رکھی تھی۔ اس نے آف وہائٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور اپنے حلیے سے آسودہ حال لگ رہا تھا۔ اس کی آواز نے سب کو متوجہ کر لیا۔ میگن کا چہرہ فق ہو گیا۔ دکان کے مالک نے ان کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے بولا۔

''مسٹر آرمر! کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

دکان دار مسٹر آرمر کو جانتا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے مستقل اس کی دکان پر آ رہا تھا اور اس کی دکان کے مالک سے اچھی واقفیت ہو گئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ حال ہی میں اس علاقے میں آیا ہے اور کسی فرم میں اچھے عہدے پر کام کرتا ہے۔ اس لیے جب اس نے میگن کو روکا تو دکان کا مالک فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ خود کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر آ گیا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر آرمر ذرا پریشان ہوا۔ پھر اس نے دکان کے مالک کو بازو سے پکڑا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اس بچے نے بغیر ادائیگی کے گوشت کا ایک ٹکڑا نکال لیا ہے اس ٹرے سے۔'' آرمر نے بیف کی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

آرمر کی آواز دھیمی تھی لیکن دکان میں موجود تقریباً ہر فرد نے سن لیا تھا اور سب کی نظریں ننھے میگن پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ کسمسا رہا تھا لیکن اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس وہ شرمندہ لگ رہا تھا جیسے سچ مچ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

''سچ مسٹر آرمر؟'' دکان کے مالک نے بے یقینی سے کہا کیونکہ میگن چہرے سے بہت معصوم لگ رہا تھا۔

''ہاں تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' آرمر نے خفگی سے کہا۔ ''اگر میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے گوشت کا پیس اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈالتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں یہ بات کہہ سکتا تھا؟ مجھے کسی پر جھوٹا الزام لگانا بالکل بھی پسند نہیں ہے اور وہ بھی اتنے چھوٹے بچے پر!''

دولت

نواب آصف الدّولہ ایک دن اپنے خادم پر جس کا نام دولت تھا خفا ہوئے اور حکم دیا کہ اسے نکال دو۔ چنانچہ اس کو نکال دیا گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن وہ خادم محل کے دروازے پر پہنچا اور نواب کی خدمت میں کہلوا بھیجا کہ دولت درِ دولت پر حاضر رہے یا جاوے؟

نواب کو کہنا پڑا کہ رہے۔

کیونکہ یہ کہنا بدشگونی ہوتا کہ دولت جاوے۔

(انتخاب، خالد اقبال راؤ، L-2/1-1 ون ایل)

دکان کا مالک بوکھلا گیا۔ آرمر اس کا ایک معزز گاہک تھا اور وہ اسے ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا مسٹر آرمر... میرا مطلب ہے یہ بچہ بہت چھوٹا ہے۔''

''اس کا آسان سا حل ہے کہ تم اس کے بیگ کی تلاشی لے لو۔'' آرمر نے کہا۔ ''تمہیں خود پتا چل جائے گا۔''

دکان کا مالک بہت محتاط آدمی تھا اور وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا جو بعد میں اس کے لیے مصیبت بن جائے۔ اگر بچے کے بیگ سے گوشت کا ٹکڑا نہ نکلتا اور اس کے ماں باپ دکان کے مالک پر مقدمہ کر دیتے تو وہ مشکل میں پڑ جاتا۔ اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ پہلے بچے سے بات کرے۔ وہ میگن کی طرف جھکا۔

''بیٹے! تم جانتے ہو نا کہ چوری کسے کہتے ہیں؟''

میگن نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''یس سر!''

''مسٹر آرمر نے تمہیں گوشت کا ایک پیس اپنے بیگ میں رکھتے دیکھا ہے... کیا یہ بات درست ہے؟''

میگن نے آرمر کی طرف دیکھا اور غیر متوقع طور پر اثبات میں سر ہلایا۔ ''درست ہے سر!''

دکان والے نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم نے سچ مچ گوشت لیا ہے؟''

''جی سر!''

آرمر نے فاتحانہ نظروں سے دکان کے مالک کی طرف دیکھا۔ ''دیکھا، میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا؟''

دکان کے مالک نے اس بار جرأت سے کام لیا اور میگن کے بیگ سے گوشت نکال لیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے تھے مسٹر آرمر!'' اس نے ندامت سے کہا۔

''بیٹے! تم نے یہ کام کیوں کیا؟'' آرمر نے خلافِ توقع میگن سے نرمی سے پوچھا تو وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ

کر رونے لگا۔ بعض بچے روتے ہیں تو سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتے ہیں۔ میگن کا رونا ایسا ہی تھا۔ وہاں موجود سب ہی لوگ اور خاص طور سے خواتین اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اس کے رونے کے انداز میں کچھ ایسی اپیل تھی کہ خواتین ممتا کے جذبے سے سرشار ہو گئیں اور ایک عورت آگے آئی۔ اس نے میگن کو گلے سے لگالیا۔

''رومت بیٹے... رومت۔''

وہ اس کے آنسو صاف کرنے لگی لیکن میگن چپ ہونے کے بجائے اور بھی زور و شور سے رونے لگا۔ آرمر نے کہا۔ ''مجھے تو اس پر ترس آرہا ہے۔ مسٹر کارٹر! کیا تم اسے پولیس کے حوالے کرو گے؟''

''پولیس!'' کارٹر سوچ میں پڑ گیا۔ ''یہ تو بہت کم عمر ... ہے۔''

''بالکل!'' میگن کے آنسو صاف کرنے والی عورت بولی۔ ''پولیس اسے گرفتار نہیں کرسکتی۔''

''اور ویسے بھی تمہارا نقصان تو ہوا نہیں ہے۔'' ایک اور عورت نے کہا۔ ''اس لیے اسے جانے دو۔''

میگن اب تک ہلکے سروں میں رو رہا تھا۔ دکان کے مالک کارٹر نے اس کی صورت دیکھی اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا ہے اور یہ بچہ ہے اس لیے میں اسے پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔''

یہ سنتے ہی میگن نے زور و شور سے رونا شروع کردیا۔ آنسو صاف کرنے والی عورت نے بے تاب ہو کر اسے پھر گلے سے لگالیا۔ ''تم کیوں رو رہے ہو؟ دیکھو مسٹر کارٹر نے تمہاری غلطی معاف کردی ہے۔ اب یہ تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کریں گے۔''

میگن نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت اچھے ہیں... لیکن میرا باپ بہت ظالم ہے... اگر میں اس کے لیے کھانے... کو کچھ... کچھ لے کر نہ گیا تو وہ مجھے مارے گا... وہ مجھے بہت بے دردی سے مارتا ہے۔''

آرمر کو غصہ آگیا۔ ''وہ بہت ظالم آدمی ہے... وہ تم سے چوری کراتا ہے۔ وہ خود کیوں نہیں کام کرتا؟''

''وہ چل نہیں سکتا۔'' میگن نے معصومیت سے کہا۔ ''میرے باپ کی ایک ٹانگ کٹ گئی ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس لیے مجھے کہتا ہے کہ میں کھانے کی چیزیں چوری کر کے لاؤں۔''

''ظالم آدمی!'' آنسو صاف کرنے والی عورت غصے سے بولی۔ ''اسے تو پولیس کے حوالے کردینا چاہیے۔''

''مجھے...؟'' میگن نے سہم کر کہا۔

''تمہیں نہیں۔'' عورت نے اسے پیار کیا۔ ''تمہارے باپ کو... جو اتنے سے بچے سے چوری جیسا گھٹیا کام کراتا ہے۔''

میگن نے پھر رونا شروع کردیا۔ ''لیکن اب کیا ہوگا... جب میں خالی ہاتھ جاؤں گا تو وہ مجھے بہت مارے گا۔ جب اسے بھوک لگتی ہے تو وہ غصہ کرتا ہے... یہ دیکھو۔'' میگن نے اپنی خستہ حال شرٹ کمر سے اوپر کردی۔ اس پر نیل نمایاں تھے۔ ''میرا باپ مجھے چھڑی سے مارتا ہے۔''

''ظالم درندہ!'' عورت نے غصے سے کہا۔ اس کی کمر کے نشان دیکھ کر دکان میں سب ہی افراد اس کے باپ کے ظلم کے قائل ہو گئے تھے۔ معصوم بچے پر اس طرح کا تشدد کوئی درندہ صفت شخص ہی کرسکتا تھا۔

''میں گھر نہیں جاؤں گا۔ آپ مجھے پولیس کے حوالے کردیں سر!'' میگن نے کارٹر کی طرف دیکھا۔

''ہرگز نہیں۔'' عورت بولی۔ ''تمہارا کیا قصور ہے؟''

''بالکل۔'' آرمر نے عورت کی تائید کی۔ ''ہم تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرسکتے۔''

''لیکن اس کے باپ کا تو سوچو... وہ اس بے چارے کے ساتھ کیا کرے گا؟'' ایک اور عورت نے ہمدردی سے کہا۔ ''بے چارے کی کمر دیکھو، کیسے نیل پڑے ہیں۔''

اس وقت سب خریداری بھول کر میگن کے مسئلے میں الجھ گئے تھے اور یہ بات کارٹر کو بالکل پسند نہیں آرہی تھی۔ یہ اس کی سیل کا وقت تھا اور اس کی دکان سب سے زیادہ چلتی ہی اس وقت تھی۔ باقی دن میں تو اِکا دُکا گاہک آتے تھے۔ آرمر نے میگن کی طرف دیکھا۔ ''کیا تمہارا باپ کام کرنے کے قابل نہیں ہے؟''

''نہیں سر... جب سے اس کی ٹانگ کٹی ہے، وہ بس بیٹھ سکتا ہے۔''

آرمر نے سوچا اور اپنی جیب سے پرس نکالا۔ اس نے پرس میں سے بیس ڈالرز کے دو نوٹ نکالے۔ ''میرا خیال ہے کہ اس سے تمہارا چند دن تو گزارہ ہو جائے گا۔''

میگن نے ہچکچاتے ہوئے اس سے نوٹ لے لیے اور پھر شرماتے ہوئے اس کے گال پر پیار کیا۔ ''آپ کا شکریہ مسٹر آرمر... آپ نے مجھے مار سے بچالیا۔''

''اور یہ میری طرف سے!'' اس کے آنسو صاف کرنے والی عورت نے پچاس ڈالرز اس کی طرف بڑھائے۔ اس کے بعد وہاں موجود کافی لوگوں نے اسے رقم دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میگن کے پاس کئی سو ڈالرز جمع ہو گئے۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے سب کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں دل کو چھو لینے

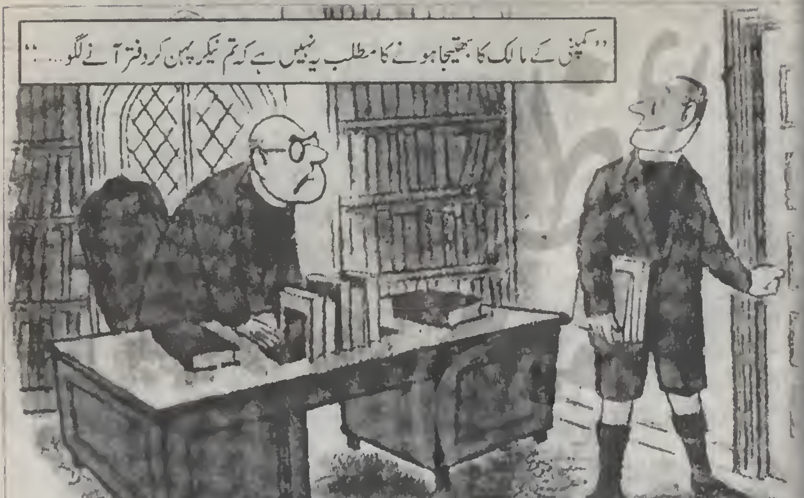

''کمپنی کے مالک کا بھتیجا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نیکر پہن کر دفتر آنے لگو...''

والی شکر گزاری تھی، اس میں لالچ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ پھر مسٹر کارٹر نے اسے گوشت اور سبزیاں بھی دیں۔

''یہ لے جاؤ۔''

''شکریہ مسٹر کارٹر! آپ بھی بہت اچھے ہیں۔ میں نے آپ کی دکان میں چوری کی اور آپ نے مجھے معاف کر دیا۔'' اس نے کارٹر کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹے... تم نے مجبور ہو کر یہ کام کیا ہے۔ اب تم جاؤ۔'' کارٹر نے کہا تو وہ سب چیزیں لے کر ست روی سے دکان سے نکل گیا۔ مسٹر آرمر اور دوسرے لوگوں کے تاثرات بتا رہے تھے انہیں بچے کو اتنی جلدی وہاں سے رخصت کرنا بالکل پسند نہیں آیا ہے۔ لیکن یہ دکان مسٹر کارٹر کی تھی۔ اس کے جانے کے بعد آنسو صاف کرنے والی عورت نے کہا۔

''کتنا اچھا بچہ ہے، ورنہ کوئی اور ہوتا تو اتنا کچھ لے کر بنا شکریہ ادا کیے چل پڑتا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ اچھے ماں باپ کی اولاد ہے جو حالات کا شکار ہو گئی ہے۔'' ایک آدمی نے کہا۔

''لیکن اس کا باپ بالکل بھی اچھا آدمی نہیں ہے۔'' مسٹر آرمر نے کہا۔ ''آپ سب نے دیکھا کہ وہ اسے کتنی بے دردی سے مارتا ہے۔''

''خدا ہی اس کے حال پر رحم کرے۔'' کسی نے کہا پھر سب خریداری میں لگ گئے۔ مسٹر کارٹر اور اس کے ملازم انہیں نمٹانے لگے...... آرمر نے کچھ پھل لیے اور پھر وہ دکان سے نکل گیا۔ اس کا رخ بس اسٹاپ کی طرف تھا۔ اگرچہ ... اسے زیادہ دور نہیں جانا تھا لیکن طبیعتاً وہ کاہل آدمی تھا۔ اس نے اپنے اسٹاپ پر بس سے اترنے کے بعد ایک چھوٹی سی گلی کا رخ کیا۔ اس تنگ گلی میں زیادہ تر گندی عمارتیں تھیں۔ وہ ایک عمارت کی گندی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور تیسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ یہ ایک کمرے کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ جیسے ہی وہ اندر آیا، میگن سہم گیا۔ اس نے باپ سے کہا۔

''پاپا! آج میں نے ٹھیک کام کیا نا؟''

اس وقت آرمر جو اصل میں راجر تھا، اس کی شخصیت بالکل بدل گئی تھی۔ اس نے اپنی نفیس عینک اتار دی اور اس کے چہرے کے نرم تاثرات بھی جیسے غائب ہو گئے۔ اس نے درشت نظروں سے میگن کو دیکھا اور غرایا۔ ''بہت اچھا کام کیا... تمہیں وہاں سے نکلنے کی اتنی جلدی کیا تھی؟ بہت سارے لوگوں نے تمہیں کچھ نہیں دیا تھا۔''

میگن نے سر جھکا لیا۔ اس کا کمزور سا جسم خوف سے لرزنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی اس کا باپ اپنی مخصوص چھڑی پکڑ لے گا اور اس کے بعد اس کی شامت آجائے گی۔ اس نے منمنا کر کہنا چاہا۔ ''پاپا... پلیز پاپا! میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

راجر نے پہلے اس سے ساری رقم وصول کی۔ اسے معلوم تھا کہ میگن ایک ڈالر بھی اس سے نہیں چھپاتا۔ اس کے باوجود اس نے رقم گنی۔ یہ کُل چار سو بتیس ڈالرز تھے۔ اسے پھر غصہ آنے لگا۔ اگر میگن کچھ دیر اور وہاں رک جاتا تو یہ رقم پانچ سو ڈالرز سے اوپر چلی جاتی اور اتنی رقم سے وہ پورے ہفتے بہترین شراب پی سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ویک اینڈ پر کسی کال گرل کو بھی لا سکتا تھا۔ اب اسے کم سے کم کال گرل کا پروگرام منسوخ کرنا ہی پڑتا۔ اس کے خیال میں یہ سب میگن کا قصور تھا۔ اس لیے اسے سزا دینا ضروری تھا۔ اس نے اپنی چھڑی اٹھائی اور میگن سے کہا۔

''اپنی شرٹ اتار دو۔''

''پاپا... پلیز پاپا!'' وہ لرزنے لگا مگر اسے شرٹ اتارنی پڑی..... اسے معلوم تھا کہ وہ جتنی دیر کرے گا، اس کے باپ کا غصہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا اور اسے اتنی ہی زیادہ مار پڑے گی۔ وہ قمیص اتار کر اس کے سامنے جھک گیا اور شائیں کی آواز کے ساتھ پہلی چھڑی اس کی کمر سے لگی۔ اس نے برداشت کیا۔ دوسری اور تیسری چھڑی بھی برداشت کر لی لیکن اس کے بعد پہلے وہ کراہا اور پھر چیخنے لگا۔ جیسے جیسے چھڑی اس کی کمر سے ٹکرا رہی تھی، اس کی چیخیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کب راجر نے اس کی کمر پر تازیانے برسانے بند کر دیے..... وہ بے حال ہو کر وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ضبط کے باوجود اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ راجر نے اپنے لیے شراب کی ایک بوتل کھولی اور ایک لمبا گھونٹ لے کر بولا۔

''اب تم خیال رکھو گے اور کہیں سے بھی نکلنے میں اتنی جلدی نہیں کرو گے۔''

راجر نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ فی الحال اسے میگن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے اسے پروا نہیں تھی کہ وہ کتنا زخمی ہوا ہے بلکہ ایک طرح سے یہ زخم اس کے لیے ضروری تھے تاکہ اگلی بار جب وہ کہیں ڈرامے کے دوران اپنے زخم دکھائے تو لوگ ضرور متاثر ہوں۔ کچھ دیر پینے کے بعد وہ اسے اسی حال میں چھوڑ کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اینگس نہایت خوب صورت عورت تھی۔ اس کی قسمت خراب تھی جو راجر جیسے شخص پر اعتبار کر بیٹھی۔ اصل میں راجر چہرے سے ایک معقول اور شریف آدمی نظر آتا تھا۔ اس کی اصلیت تو شادی کے بعد سامنے آئی تھی۔ پہلے تو اینگس کو پتا چلا کہ اس نے اسے اپنے بارے میں جو بتایا ہے، اس میں سے نوّے فی صد جھوٹ تھا۔ وہ کسی کمپنی میں اچھے عہدے پر نہیں تھا بلکہ سرے سے کسی فرم میں کسی معمولی سے عہدے پر بھی نہیں تھا۔ وہ بے روزگار تھا اور گزشتہ چار سال سے اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کا گزارہ جھوٹ، فریب اور دھوکے بازی سے ہوتا تھا۔

دوسرا جھوٹ یہ تھا کہ اس کا کوئی شان دار اپارٹمنٹ نہیں تھا بلکہ وہ ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا جو ایک کھولی سے زیادہ نہیں تھا۔ ان کی ملاقات ہمیشہ اینگس کے گھر ہوتی تھی۔ اینگس نے راجر کے پس منظر کی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ صورت سے اتنا معزز اور نیک نظر آتا تھا کہ اس کی کسی بات پر شبہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اینگس بھی اس کے جال میں پھنس گئی۔

پھر جب اینگس پر اس کی اصلیت کھلی تو اس نے راجر سے اس کی غلط بیانیوں کی پوچھ گچھ کی۔ تب اس کی ایک اور خصوصیت کا بھی علم ہوا کہ وہ نہایت بے رحم اور سفاک آدمی ہے۔ اس نے اینگس پر تشدد کیا اور اسے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو راجر نے اس سے غراتے ہوئے کہا۔

''اب اگر تم نے مجھ سے بکواس کی یا اس بات کا کسی سے ذکر کیا... یا پولیس کو کال کی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا اور اس کے بعد میرے لیے غائب ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''میں کسی سے نہیں کہوں گی۔'' اینگس خوف زدہ ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ واقعی وہ اسے قتل کر کے غائب ہو جائے گا۔ اصل میں اس نے جس طرح چولا بدلا تھا، اس سے اینگس کو شاک پہنچا تھا اور وہ اس کے زیرِ اثر آ گئی تھی۔ اس کے بعد راجر جیسا چاہتا اینگس ویسا ہی کرتی تھی۔ وہ اس کے گھر میں ہی رہنے لگا اور اس نے اینگس سے صاف کہہ دیا کہ وہ ملازمت کرے اور گھر چلائے۔ اس سے کوئی توقع مت رکھے۔

''مگر میں اکیلے کیوں گھر کی گاڑی چلاؤں؟'' اینگس نے اعتراض کیا۔ ''تم بھی کام کر سکتے ہو۔''

''ہاں کر سکتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

اینگس پہلے بھی ملازمت کرتی تھی۔ وہ دواؤں کی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اس کی تنخواہ بھی معقول تھی۔ اس کے

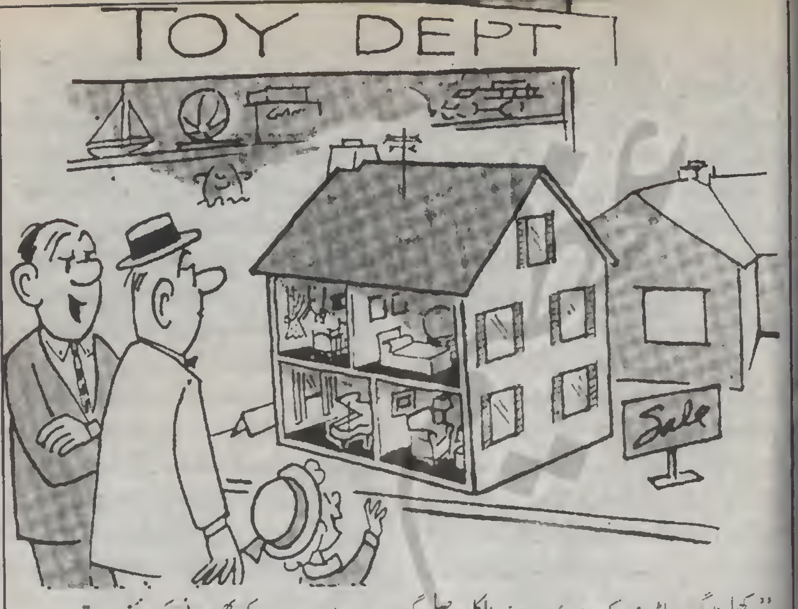

''یہ کھلونا گھر، بلڈرز کے بنائے ہوئے بالکل اصلی گھروں جیسا ہے۔ اس کی بھی پانی کی لائنیں رستی ہیں.... دیواریں سیلن زدہ ہو جائیں گی۔ کوئی چیز صحیح کام نہیں کرے گی اور قیمت سن کر آپ کی سانس رکنے لگے گی.....''

پاس اپنا گھر اور گاڑی بھی تھی۔ اب تک وہ بڑے اچھے طریقے سے گزارہ کرتی آئی تھی لیکن جیسے ہی اس نے راجر سے شادی کی، اس کے لیے حالات خراب ہونا شروع ہو گئے اور وہ مالی مشکلات کا شکار ہو گئی۔ راجر کام کا قائل نہیں تھا لیکن اس کے شوق اونچے درجے کے تھے۔ وہ اسکاچ شیمپین پیتا تھا اور کسی پیمانے سے نہیں پیتا بلکہ اسے روز بوتل درکار ہوتی تھی۔ اینگس نے کچھ دن تو برداشت کیا لیکن پھر اس نے انکار کر دیا۔

''تمہیں روزانہ شراب فراہم کرنا میری ذمے داری نہیں ہے، اگر تم پینا چاہتے ہو تو خود کما کر پیو۔''

''مجھے کمانے کی عادت نہیں ہے۔''

''اس صورت میں میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

اینگس کے انکار کے بعد راجر نے دوسرا کام کیا۔ اس نے گھر کا سامان بیچنا شروع کر دیا۔ جب گھر سے کئی اچھی اور قیمتی اشیاء غائب ہوئیں تو اینگس کو پتا چلا کہ راجر کہاں سے شراب حاصل کر رہا ہے۔ اس نے راجر سے جھگڑا کیا تو اس نے پھر اینگس کو مارا۔ اس کے بعد تو مار پیٹ معمول بن گئی۔ وہ اس سے رقم چھین لیتا تھا اور جب اینگس کے پاس رقم نہیں ہوتی تھی تو وہ گھر کی کوئی چیز بیچ دیتا تھا۔

اینگس اس سے جان چھڑانے کی فکر میں تھی۔ اسی دوران میں وہ امید سے ہو گئی۔ جب تک اسے پتا چلا تو خاصی دیر ہو گئی تھی اور وہ اس بچے سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی جس سے اسے بنا دیکھے ہی نفرت ہو گئی تھی کیونکہ وہ راجر کا بچہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے بات کی مگر اس نے خبردار کیا کہ اس صورت میں اس کی جان کو خطرہ ہوگا۔

''بہتر ہے کہ تم اس بچے کو پیدا کرو۔ خدا کے دیے اس تحفے کی ناقدری مت کرو۔''

''بچے مجھے بھی اچھے لگتے ہیں لیکن یہ جس شخص کا بچہ ہے اس سے مجھے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت ہے۔''

اینگس اس وجہ سے بھی اس بچے سے نفرت کرنے لگی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ فوری طور پر راجر سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اب اسے بچے کی پیدائش تک انتظار کرنا تھا۔ اس دوران راجر اس کی زندگی پر مسلط رہتا۔ جب وہ آخری دنوں سے تھی، تب بھی راجر کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ کمانے کے لیے بچے کی پیدائش سے ایک ہفتے پہلے تک کام پر جاتی رہی۔ جب میگن پیدا ہوا تو اس نے اس کی صورت دیکھنے سے اور اسے اپنا دودھ پلانے سے انکار کر دیا۔ اینگس اس وقت بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس نے

اسپتال کے اسٹاف سے کہا۔

''اسے میرے پاس بھی مت لانا... ورنہ میں کہیں اس کا گلا نہ گھونٹ دوں۔''

اسپتال والے حیران تھے کہ یہ کیسی ماں ہے جسے اپنے بچے سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اس نے میگن کو دیکھنے سے بھی انکار کردیا تھا اور دوسرے دن وہ اسپتال سے چلی گئی تھی۔ اسپتال والوں کو بچہ مجبوراً راجر کے حوالے کرنا پڑا۔ وہ پہلے ہی اینگس کے غائب ہونے سے بھنا رہا تھا، اب بچہ بھی اس کے سر پڑ گیا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ اس کا باپ تھا، اسے کہیں پھینک بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس نے میگن کی پرورش کے لیے کوئی خاص تگ و دو نہیں کی۔ شروع کے دو سال اس نے میگن پر کچھ توجہ دی۔ اس کے بعد وہ بے چارہ خود ہی جیسے تیسے پلتا رہا۔

اینگس نے اسپتال سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے عدالت کے ذریعے راجر سے طلاق لی۔ اس کے بعد اس نے اپنا مکان فروخت کیا کیونکہ راجر وہیں براجمان تھا۔ اس سے مکان خالی کرانے کے بجائے اینگس نے بہتر سمجھا کہ سامنے آئے بغیر مکان فروخت کردے۔ اس کے لیے اس نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ دی اور ایک اور کمپنی میں ملازمت کرلی۔ اس کے پاس تجربہ تھا اس لیے اسے آرام سے ملازمت مل گئی۔

بہت دنوں تک اس کے ذہن میں یہ خوف رہا کہ راجر اسے تلاش نہ کررہا ہو۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اینگس نے اس سے الگ ہونے کی کوشش کی تو وہ اسے مار ڈالے گا مگر جب راجر اسے دوبارہ نظر نہیں آیا اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تو رفتہ رفتہ اس کا خوف ختم ہوتا چلا گیا۔ چند مہینوں بعد اس نے ایک اور جگہ مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے نئی جگہ اچھی جاب مل گئی۔ تنخواہ بھی بہتر تھی اور اسے آنے جانے میں آسانی بھی رہتی تھی۔

راجر کے ساتھ تلخ زندگی گزارنے کا تجربہ ایسا تھا کہ اینگس نے پھر کسی مرد سے تعلق جوڑنے کا نہیں سوچا۔ اس دوران میں کئی افراد اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ سے اس کی دوستی بھی ہوئی لیکن اس نے کسی کو بھی اتنا سنجیدہ نہیں لیا۔ راجر سے علیٰحدگی کے کوئی آٹھ سال بعد اس کی ملاقات کورل سے ہوئی۔ کورل مارٹ ایک تاجر تھا اور وہ اکثر اپنے کام کے سلسلے میں دواؤں کی اس کمپنی کے دفتر میں آتا تھا جہاں اینگس کام کرتی تھی۔ کام کے سلسلے میں اس کا واسطہ اینگس سے ہی پڑتا تھا۔ اس لیے ان میں بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ پھر یہ بات چیت بے تکلفی میں شامل ہوئی اور ایک دن کورل نے اینگس کو ڈنر کی دعوت دے دی۔

اینگس اکیلے پن سے اکتا گئی تھی اور ان دنوں اسے اپنا بیٹا بھی یاد آرہا تھا جسے اس نے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی اسے شدید پچھتاوا ہوتا کہ اس نے اپنی اولاد کو ٹھکرا دیا تھا۔ حالانکہ اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا بلکہ اصل قصوروار تو خود اینگس تھی جس نے اس معاملے میں آنکھ بند کرکے فیصلہ کیا تھا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے راجر سے شادی کرلی اور اس کا خمیازہ بھگتا تھا مگر بیزار اس نے اس ننھی سی جان کو دی جو اس کی توجہ اور محبت کی مستحق تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے راجر کی زندگی سے نکل گئی تھی۔

کورل سے چند ملاقاتوں کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ وہ نیک فطرت انسان ہے اور شاید اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ وہ پہلے بھی ایک بار شادی کرچکا تھا اور دو سال پہلے اس کی بیوی سے علیٰحدگی ہوچکی تھی۔ اس نے اینگس کو بتایا کہ اس کے پاس کاروبار کی وجہ سے وقت کم ہوتا تھا اور اس کی بیوی کو یہ بات گوارا نہیں تھی۔

''وہ چاہتی تھی، میں روزانہ چھ بجے گھر پر ہوں اور یہ ممکن نہیں تھا۔ ایک کاروبار کرنے والا آدمی کس طرح ایک ملازمت پیشہ کی طرح ٹھیک وقت پر گھر آسکتا ہے؟''

''یہ خیال اسے شادی کے چھ سال بعد آیا تھا؟''

''ہاں... اس کا کہنا تھا کہ وہ شروع میں برداشت کرتی رہی لیکن اب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا ہے۔ پھر ہمارا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ اگر اولاد ہوجاتی تو شاید ملینڈا علیٰحدگی کا نہ سوچتی۔''

اینگس کو خیال آیا کہ وہ تو اولاد ہونے کے بعد شوہر سے الگ ہوئی تھی۔ اس نے بھی کورل کو اپنے بارے میں بتا دیا لیکن اس نے بیٹے کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے بس یہی بتایا کہ اس کی راجر سے نہیں بنی اس لیے وہ اس سے الگ ہوگئی۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اس سے کس طرح الگ ہوئی تھی۔ اس نے بات کو بہت سادہ اور آسان سا بنا کر پیش کیا تھا۔ کورل کو تجسس تھا کہ اس کے اور راجر کے درمیان علیٰحدگی کی وجہ کیا تھی۔ شاید وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ جس عورت میں دلچسپی لے رہا ہے، وہ کس وجہ سے طلاق کی حد تک چلی گئی تھی۔ دونوں اپنے معاملات بہت احتیاط سے آگے بڑھا رہے تھے۔

تنہا ہونے کے بعد اینگس نے جب دوبارہ گھر خریدا تو اس بار اس نے مکان کے بجائے ایک اپارٹمنٹ لیا۔ یہ اگرچہ بڑا نہیں تھا لیکن ایک اچھی عمارت میں اور محفوظ جگہ پر تھا۔ یہاں سیکیورٹی اچھی تھی اس وجہ سے اسے کوئی خوف بھی نہیں تھا۔ شاید لاشعوری طور پر اس نے راجر کے خوف سے ایسی جگہ لی تھی جہاں اسے تحفظ کا احساس ہو۔ یہ رہائشی علاقہ تھا اور یہاں ماحول پُرسکون تھا۔ اینگس چھٹی والے دن سودا لینے جاتی تھی کیونکہ باقی چھ دنوں میں وہ دفتر سے گھر آکر صرف کھانا بناتی تھی اور گھر کے دوسرے کام نمٹاتی تھی۔

اس صبح وہ خریداری کرنے گھر سے نکلی اور ایک دکان سے گوشت اور سبزی لے رہی تھی کہ اسے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ اسے شبہ ہوا کہ اس کے کانوں کو دھوکا ہوا ہے۔ راجر کی آواز اتنے عرصے بعد پہچاننے میں غلطی ہوسکتی تھی لیکن جب اس نے اس شخص کو دیکھا تو اسے کسی قسم کا شک نہیں رہا۔ وہ راجر ہی تھا جو ایک چھوٹے سے بچے کو پکڑے ہوئے تھا اور اس پر گوشت کی چوری کا الزام لگا رہا تھا۔ بچہ بہت سہما ہوا لگ رہا تھا۔ اینگس کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس بے چارے نے چوری کا اعتراف کرلیا اور اس کے بیگ سے دکان دار نے گوشت بھی برآمد کرلیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ حیرت انگیز تھا۔ بچے نے رو کر سب کی ہمدردی حاصل کرلی اور سب نے اسے رقم دی۔

اینگس حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ راجر کا یہ حلیہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن وہ جو کررہا تھا، وہ اینگس کے لیے نیا ضرور تھا۔ اسے لگا کہ اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ راجر نہایت ذلیل شخص تھا۔ وہ بچے کو تو کیا دنیا میں کسی بھی شخص کو ایک ڈالر نہیں دے سکتا تھا، وہ دینے والا فرد ہی نہیں تھا۔ اسے صرف لینا آتا تھا۔ اینگس ایک تو پیچھے تھی اور پھر آٹھ سال میں اس میں کئی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اس نے گزشتہ دنوں اپنے بال بھی رنگوائے تھے۔ اس لیے بھی اس کی شخصیت میں تبدیلی آئی تھی اور اسے آٹھ سال پہلے دیکھنے والا اب آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے خود کو کچھ عورتوں کے پیچھے کرلیا اور وہاں سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔

اس کے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ راجر یہ سب کیوں کررہا تھا؟ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ جب اس نے بچے کو رقم دی تو اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دوسروں کو بھی ترغیب دے رہا ہو کہ وہ بھی بچے کو رقم دیں... اور ایسا ہی ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچے کو کم و بیش کوئی پانچ سو ڈالر مل گئے۔ پھر دکان والے نے اسے اپنی طرف سے اچھا خاصا گوشت اور سبزیاں بھی دیں۔ بچہ ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوا دکان سے نکل گیا۔ اینگس نے کچھ دیر سوچا پھر وہ بھی باہر نکلی۔ اس نے اپنی کار کچھ دور پارک کی ہوئی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ کر بچے کے تعاقب میں چل پڑی۔ وہ بس میں بیٹھا اور اینگس بس کا تعاقب کرتی رہی۔ بچہ کچھ دور ایک اسٹاپ پر اتر گیا۔ پھر وہ تنگ سے گلی میں مڑا اور ایک عمارت میں چلا گیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھی رہی۔ اسے انتظار تھا۔ چند منٹ بعد اس کی توقع کے عین مطابق راجر بھی آیا اور اسی عمارت میں داخل ہوگیا۔ اینگس اندر سے مارے غصے کے پھنکنے لگی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بچہ کون ہے اور راجر اسے کس طرح استعمال کررہا ہے۔

''ذلیل شخص!'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس دن چھٹی تھی اور اسے دفتر نہیں جانا تھا اس لیے وہ وہیں موجود رہی۔ اسے انتظار تھا کہ راجر گھر سے نکلے تو وہ اندر جائے۔ راجر اسے ایک گھنٹے بعد نکلتا نظر آیا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ اینگس اس کی خوشی کی وجہ سمجھتی تھی، اس کی جیب میں نوٹ آگئے تھے۔ اس لیے اب وہ انہیں خرچ کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا، اینگس کار سے اتر کر عمارت کی طرف بڑھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ راجر کا فلیٹ کون سا ہے۔ سیڑھیوں پر اوپر سے آتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص نے اسے راجر کا فلیٹ بتایا اور ساتھ ہی اسے بتایا۔

''وہ عورتوں سے صرف رات کو ملتا ہے۔''

اینگس اس کی بات پر توجہ دیے بغیر دروازے پر دستک دینے لگی۔ تیسری یا چوتھی دستک پر دروازہ خود بہ خود کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو بچہ اسے فرش پر اس حال میں اوندھے منہ لیٹا نظر آیا کہ اس کی کمر پر نیل ہی نیل تھے۔ وہ تڑپ کر بے ساختہ اس کی طرف بڑھی۔

''میگن... میرے بچے۔''

میگن نیم غشی میں تھا لیکن اینگس نے اسے پانی پلایا تو اسے ہوش آگیا۔ اس نے اجنبی نظروں سے اینگس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کون ہیں میڈم؟''

''میں...'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ''تمہیں کس نے اتنی بے دردی سے مارا ہے؟''

''میرے پاپا نے!'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''مگر کیوں؟'' اس نے تڑپ کر پوچھا۔

''پتا نہیں... جب پاپا کا دل چاہتا ہے تو وہ مجھے مارتے ہیں۔''

اینگس کا دل پگھلنے لگا۔ اس نے اپنے دل کے ٹکڑے کو کس درندے کے حوالے کردیا تھا۔ ''اور تمہاری ماں...؟''

میگن نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ مجھے اس وقت چھوڑ گئی تھی جب میں بہت چھوٹا تھا۔ پاپا بتاتے ہیں، اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔''

''کیا تمہیں اپنی ماں یاد نہیں آتی؟''

''آتی ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟''

''اگر تمہیں پتا چل جائے کہ تمہاری ماں کہاں ہے تو کیا تم اس کے پاس چلے جاؤ گے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''اگر ماما نے مجھے رکھنا ہوتا تو وہ مجھے چھوڑ کر کیوں جاتیں؟''

اب اینگس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اسے سینے سے لگا کر رونے لگی۔ میگن کسمسانے لگا۔ ''میڈم! آپ کون ہیں؟''

''میں تمہاری ماں ہوں۔'' اینگس نے روتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

راجر رات گئے واپس آیا تو میگن فرش پر اپنا بستر بچھا کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ راجر نے ایک ادھ بچا برگر اس کی طرف اچھال دیا۔ ''لو... یہ کھا لو برخوردار!''

میگن اٹھ کر بیٹھ گیا اور برگر کھانے لگا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ راجر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بہترین ڈنر کے ساتھ بہترین شراب بھی جی بھر کر پی کے آیا ہے۔ میگن نے آہستہ سے اسے پکارا۔

''پاپا!''

''کیا بات ہے؟''

''پاپا! میری ماں کہاں ہے؟''

''وہ... وہ تمہیں کہاں سے یاد آ گئی؟'' راجر چونکا۔

''بس پاپا... مجھے وہ یاد آ رہی ہیں۔''

''وہ ایسی عورت نہیں تھی جسے یاد کیا جائے۔'' راجر نے نفرت سے کہا۔ ''وہ مجھے اور تمہیں چھوڑ کر ایک شخص کے ساتھ بھاگ گئی۔''

''سچ پاپا؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''تو کیا میں تم سے جھوٹ بولوں گا؟'' راجر غرایا۔ ''اب بکواس بند کرو اور مجھے سونے دو۔''

''جی پاپا!'' میگن نے سہم کر کہا۔

کئی دن تک راجر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ میگن اب صحت یاب ہو جائے تاکہ وہ اسے پھر کسی کام پر روانہ کر سکے۔ ایک ہفتے بعد اس نے پھر میگن کو تیار رہنے کو کہا۔

''اس بار تم نے پہلے والی غلطی دہرائی تو یاد رکھنا کہ میں مار مار کر تمہاری کھال اتار دوں گا۔''

میگن کو معلوم تھا، اس کے باپ کو اس کی کھال اتارنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ''میں خیال رکھوں گا پاپا!''

اس بار اس نے چھوٹے سپر اسٹور کا انتخاب کیا تھا۔ میگن وہاں پہنچا تو راجر پہلے سے ہی معزز گاہک بن کر وہاں موجود تھا اور سپر اسٹور کی ایک سیلز گرل سے گپ شپ کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہی ڈراما ہوا جو راجر نے ترتیب دیا تھا۔ میگن کو اچھے خاصے ڈالرز مل گئے تھے۔ یہ کم سے کم بھی سات آٹھ سو ڈالرز تھے۔ راجر اپنی خوشی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بار اس کی صحیح کمائی ہوئی تھی۔ لیکن جب سب ہو گیا اور میگن وہاں سے جانے لگا تو ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ایک عورت دو پولیس والوں کے ہمراہ وہاں آئی اور اس نے میگن کو روک لیا۔ اس کے بعد اس نے راجر کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے گرفتار کر لیں... یہ اس بچے کا باپ ہے اور اس کی مدد سے یہ فراڈ کر کے لوگوں سے رقم حاصل کرتا ہے۔''

اس اعلان نے سنسنی پھیلا دی۔ راجر نے فرار ہونے کی کوشش کر کے اس الزام کو درست ثابت کر دیا۔ پولیس والوں نے اسے پکڑ کر ہتھکڑی پہنا دی۔ اتنی دیر میں راجر، اینگس کو پہچان چکا تھا۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''تم... تمہیں اب خیال آ رہا ہے اس بچے کا؟''

''مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔'' اینگس بولی۔ ''لیکن اب میں اس کوتاہی کی تلافی کر دوں گی۔''

راجر نے میگن کی طرف دیکھا۔ ''یہ ہے تمہاری ماں جو تمہیں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔''

''اب تمہارا جھوٹ نہیں چلے گا۔ میں میگن کو سب بتا چکی ہوں۔'' اینگس مسکرائی۔ ''میں اس سے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگ چکی ہوں۔ اس لیے اب تم اپنی فکر کرو۔''

''تم نے جو جرم کیا ہے اس پر تمہیں کم سے کم بھی دو سال کی سزا ہو گی۔'' راجر کو گرفتار کرنے والے پولیس افسر نے اسے آگاہ کیا۔ ''اور میری کوشش ہو گی کہ تم پر سارے کیس چلیں۔ جہاں جہاں تم نے لوگوں کو دھوکا دیا ہے، وہ سب تمہارے کھاتے میں آئے۔''

''مجھے امید ہے کہ تم کئی سال جیل میں گزارو گے۔'' اینگس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور یہ اس کی کم سے کم سزا ہو گی جو تم اپنے معصوم بچے کے ساتھ کرتے رہے ہو۔''

پولیس والے راجر کو کھینچ کر وہاں سے لے گئے۔ میگن دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔ اینگس نے اسے آغوش میں لے لیا۔ ''میرا بیٹا... میری جان!''

میگن کو اس کی گم شدہ جنت واپس مل گئی تھی۔

۳ پہلا رنگ

زیرِ گردش

کاشف زبیر

وقت کے ساتھ ہر چیز میں تغیّر و تبدّل رونما ہوتا ہے ...زمانے کے ان بدلتے ہوئے اثرات سے انسان بچ نہیں سکتا ...لیکن کچھ قدریں اس نوعیت کی ہوتی ہیں ... جنہیں نظر انداز کرنے سے انسان محض خسارے میں رہتا ہے . اخلاق ، شرافت کسبِ حلال یہ عناصر زندگی میں بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ معاشرے میں بسنے والے چند ایسے کرداروں کے چہروں کو بے نقاب کرتی تحریر جو اپنی زندگی کو تعیّشات سے بھرپور دیکھنے کے لیے ہر طریقہ اختیار کر لینے کو اپنا حق سمجھتے تھے .

جذباتی ناانصافی اور اعتبارِ ذات کے ملے جلے جذبات کی عکاس ایک چشم کشا تحریر

عامر، محسن اور فرید کے ساتھ بیٹھا تھا۔ فرید نے عامر کو کہنی ماری اور کسی قدر بلند آواز سے بولا۔ ''وہ آگئی تیری...''

''ابے چپ کر۔'' عامر نے گھبرا کر کہا۔ ''وہ سن

لے گی۔“

مگر رومانہ نے نہیں سنا۔ وہ کتابیں سینے سے لگائے سر جھکائے ان کے پاس سے گزر گئی۔ اس کے قریب آنے پر تینوں ہی خاموش ہو کر اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ یہ ان کا محلّہ تھا اور یہاں وہ اتنی آزادی سے کسی لڑکی کو نہیں گھور سکتے تھے۔ خاص طور سے جب وہ محلے کی ہی ہو...

ائرپورٹ کے ساتھ آباد ماڈل کالونی ایک پرانی آبادی ہے۔ یہاں لوگ نسلوں سے آباد ہیں۔ بیشتر گھرانے ایسے ہیں جن کے دادا نانا یہاں آئے تھے اور اب ان کی تیسری نسل بھی یہاں آباد ہے۔

یہی وجہ ہے یہاں اب بھی اچھا... ماحول ہے۔ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کوئی بیمار ہو جائے تو گلی کے لوگ دیکھنے کو آتے ہیں اور مر جائے تو آخری رسومات میں اہلِ محلّہ ضرور شرکت کرتے ہیں۔ ایسا ممکن نہیں کہ پڑوس میں کوئی مر جائے تو پڑوسی کو علم ہی نہ ہو۔

عامر، محسن اور فرید مین روڈ کے پاس کے علاقے میں رہتے ہیں۔ مین روڈ پر ہر وقت چہل پہل رہتی ہے مگر اندر گلیوں میں ایک سکون آمیز سناٹا چھایا رہتا ہے۔ عامر مین روڈ سے کچھ دور رہتا تھا۔ اس کا معمولی سا دومنزلہ مکان تھا جس کی نچلی منزل انہوں نے کرائے پر دے رکھی تھی اور اوپر عامر اور اس کے گھر والے رہتے تھے۔ عامر کے والد شاہد اکرم کئی سال پہلے ایک ہنگامے میں چلنے والی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ وہ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ اس بات کو تیرہ سال گزر چکے تھے۔ چوبیس سالہ عامر اس وقت گیارہ سال کا تھا جبکہ حنا تو صرف چھ سال کی تھی۔

شکیلہ کے لیے وہ بہت مشکل وقت تھا۔ شوہر ہی ان کا واحد سہارا تھا۔ بچے ابھی چھوٹے تھے اور ان کے جوان ہونے میں کافی سال باقی تھے لیکن انہوں نے ہمت کی اور بچوں کو خود پالنے کا عزم کیا۔ ایک بھائی تھے، انہوں نے تجویز پیش کی کہ شکیلہ مکان بیچ کر ان کے ساتھ آجائے اور مکان سے ملنے والی رقم کہیں انویسٹ کر کے اس سے گزارہ کرے۔ لیکن شکیلہ نے بھابھی کے تیور دیکھ کر انکار کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اپنے بل بوتے پر بھی رہیں گی تب بھی وہ اور ان کے بچے مشکلات کا شکار رہیں گے تو یہ مشکل اپنے گھر میں کیوں نہ برداشت کریں۔ دوسرے یہ گھر ان کے بچوں کا مستقبل تھا۔ وہ اسے بیچ دیتیں تو آگے کیا کرتیں؟ ان کے شوہر مذہبی آدمی تھے اور سود کے خلاف تھے اس لیے وہ بھی سود کا کام نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

شاہد اکرم نے اچھے وقت میں یہ مکان لے لیا تھا۔ ایک سو بیس گز کے اس مکان کا نچلا حصہ کافی حد تک بنا ہوا تھا۔ جب شکیلہ نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے کچھ قرض لے کر اور کچھ زیور بیچ کر اوپر دو کمرے سیمنٹ کی شیٹوں والے ڈلوا لیے۔ خود اوپر آگئیں اور نیچے کا حصہ کرائے پر اٹھا دیا۔ کرائے پر مکان لینے والے ندیم، شاہد اکرم کے ایک دوست تھے جو پی آئی اے میں ملازمت کرتے تھے۔ ندیم سہیل کا تعلق لاہور سے تھا اور ملازمت کی وجہ سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ شاہد اکرم سے ان کی دوستی ہو گئی تھی، شکیلہ ان پر پورا اعتماد کرتی تھیں۔

شکیلہ خدا کا شکر ادا کرتی نہیں تھکتی تھیں کہ انہیں ندیم بھائی اور عظمیٰ بھابھی جیسے کرائے دار ملے۔ اس کرائے کی مدد سے انہوں نے نہ صرف اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی تھی... بلکہ اوپر والے حصے میں بھی لینٹر کرا لیا تھا۔

شکیلہ کا خیال تھا کہ عامر گریجویشن کے بعد کوئی ملازمت کر لے گا۔ وہ خود شوہر کے انتقال کے بعد ایک اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ تنخواہ اگرچہ معمولی سی تھی مگر ان کے بہت سارے کام اس سے نکل جاتے تھے۔ پھر گھر میں بھی کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھا لیا کرتیں۔ اس کے بعد گھر بھی دیکھنا ہوتا تھا۔ اتنی محنت وہ اس امید پر کر رہی تھیں کہ جب عامر کام کرنے لگے گا تو انہیں سکون ملے گا مگر اسے گریجویشن کیے دو سال سے اوپر ہو چکے تھے اور اس نے ابھی تک کہیں کوئی نوکری نہیں کی تھی۔ چند چھوٹے موٹے کام کیے تھے لیکن جلد انہیں بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب بھی وہ فارغ تھا۔ شکیلہ اس سے کام کرنے کو کہتی تھیں تو وہ جواب دیتا۔

”میں یہ چھوٹی موٹی نوکری نہیں کرنا چاہتا، اس میں ملتا ہی کیا ہے؟“

”تو بیٹا تمہیں شروع میں کوئی منیجر اور ڈائریکٹر بنانے سے تو رہا۔ جب کام کرو گے اور تجربہ آئے گا، تب ہی آگے بڑھو گے۔“

عامر چپ ہو جاتا۔ وہ نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور اپنا کوئی کام کرنے کے لیے بہت سارا پیسا درکار تھا۔ وہ اس کے پاس تھا نہیں۔ وہ صبح سو کر اٹھتا اور ناشتا کر کے نکل جاتا۔ اس کے دونوں دوست محسن اور فرید بھی اسی کی طرح تھے۔ محسن کے باپ سعودیہ میں تھے اس لیے وہ بے فکر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب اس کے کام کا وقت آئے گا تو باپ اسے سعودیہ بلوا لے گا جبکہ فرید بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور بھائیوں سے زیادہ بھابھیوں کا لاڈلا تھا، اس لیے ابھی تک کام کرنے سے بچا ہوا تھا۔ اگر ان کا دن میں کوئی پروگرام نہیں ہوتا تو وہ شام کو ضرور نکلتے تھے۔ ان کی بیٹھک عام طور سے مین روڈ کے ساتھ والی گلی کے کونے پر ہوتی تھی۔

عامر کو وہیں سے آتی جاتی رومانہ اچھی لگنے لگی تھی۔ اس نے یہ بات دوستوں کو بھی نہیں بتائی تھی۔ رومانہ کو معلوم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے چپکے چپکے اور سب سے چھپ کر دیکھتا تھا۔ رومانہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کی والدہ زبیدہ، شکیلہ کی سہیلی تھیں اور دونوں گھروں میں آنا جانا تھا۔ مہینے میں ایک بار تو کسی نہ کسی کا چکر لگتا تھا۔ وہ بچپن سے رومانہ کو دیکھتا آرہا تھا لیکن یہ انوکھا احساس کچھ عرصے پہلے ہی جاگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی کو نہیں پتا ہے مگر ایک دن محسن اور فرید نے اسے پکڑ لیا۔

”یہ کیا چکر ہے؟“ فرید نے کہا۔

”کیسا چکر؟“ وہ انجان بن گیا۔

”ابے! یاروں سے یاری۔“ محسن نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”کب سے معاملہ چل رہا ہے؟“

”اور آگ یک طرفہ ہے یا دونوں طرف لگی ہے۔“

اسے ان لوگوں کے سامنے اقرار کرنا پڑا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ رومانہ کو پسند کرتا ہے لیکن اس نے ابھی تک اس سے بات کرنے کا بھی نہیں سوچا ہے۔ فرید نے اکسایا۔ ”تو بات کر۔“

”نہیں یار! مجھے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ اگر میں نے کبھی ایسی کوشش کی تو اپنے گھر والوں کی طرف سے کروں گا۔“

”یعنی تو باضابطہ رشتہ بھیجے گا؟“ محسن نے سوال کیا۔

”ہاں... میں ان چکروں کا قائل نہیں ہوں۔“ عامر بولا۔

”محبت پھر بھی کر لی؟“ فرید ہنسا۔

”لیکن یہ سوچ... کہ جب تک تو کوئی کام نہیں کرے گا، تیری اماں رشتہ کیوں لے کر جائے گی۔“

”یہی میں سوچ رہا ہوں۔“ عامر نے سر ہلایا۔ ”لیکن میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔“

”کاروبار کرے گا؟“ محسن نے اسے گھورا۔ ”اس کے لیے پیسے چاہئیں۔“

”ہاں، کوئی کام پیسوں کے بغیر کہاں ہوتا ہے؟“ عامر نے سرد آہ بھری۔

”ایک کام ہو سکتا ہے۔“ فرید بولا۔ ”لالہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ مل کر کوئی اسٹیٹ ایجنسی کھول لوں۔“

”موضوعِ سخن“

ریاضی کے ٹیچر نے کلاس روم میں نیا سوال شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ایک کار کی لمبائی دس فٹ ہو اور ایک سڑک پر ایک لاکھ کاریں آگے پیچھے ایک دوسرے سے جڑی کھڑی ہوں...“

ایک لڑکا بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اچھا... اچھا... آپ روزانہ شام کو چھٹی کے وقت بندر روڈ پر ٹریفک جام کی بات کر رہے ہیں۔“

لالہ، فرید کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ محسن نے منہ بنایا۔ ”اس کے بعد کمیشن کے لیے لوگوں کے پیچھے خوار ہوتے پھرو۔“

”وہ دور گیا... آج کل تو یہ اچھا کام ہو گیا ہے۔“ فرید بولا۔ ”اب شاکر رانا کو دیکھ لو۔ اسی کام سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اب تو اس کے بیٹے بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔“

عامر نے اسے گھورا۔ ”ان کی حرکتوں کا پتا ہے، لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کر کر کے بیچا ہے اور اس سے دولت کمائی ہے۔ کتنی غریب بیواؤں اور یتیموں کی زمین جائداد بیچ کر کھا گئے۔“

”ہاں، ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔“ محسن نے تائید کی۔

”لیکن صاف ستھرا کام تو کر سکتے ہیں۔“ فرید نے اصرار کیا۔ ”دیکھ یار! ہم بے کار میں وقت ضائع کرتے ہیں، اس سے بہتر ہے کہ کوئی کام ہی کر لیتے ہیں۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ عامر نے غور کیا۔ ”بہ قول امی کے ہم آوارہ پھرتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کچھ کر لیں۔“

”چل ٹھیک ہے، ہم اسٹیٹ ایجنسی کا کام کر لیتے ہیں لیکن اس کے لیے بھی تو کچھ پیسا چاہیے۔“

”بہت زیادہ نہیں، پندرہ ہزار سے کام چل جائے گا اور اس میں سے بھی دس ہزار دکان کا ایڈوانس ہو گا۔“ فرید بولا۔

”تو نے دکان بھی دیکھ لی ہے؟“ محسن چونکا۔

”ہاں، دکان کے بغیر یہ کام کہاں سے ہو گا؟ لالہ نے بتائی تھی، ان کے دوست کی ہے۔“ فرید نے سامنے والی دکانوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ مل رہی ہے۔“

”کرایہ کتنا ہے؟“ عامر نے پوچھا۔

”پندرہ سو روپے ہے۔ بل ملا کر دو میں پڑ جائے گی۔“

”مگر دکان کے لیے فرنیچر چاہیے۔“ محسن نے یاد دلایا۔

”میرے گھر میں ایک بڑی آفس میز اور اس کی چھ کرسیاں پڑی ہیں۔ ہمیں قالین اور گلاس ڈور کا بندوبست کرنا ہوگا۔“ فرید نے بتایا۔

”ایک پنکھا میرے ہاں پڑا ہے۔“ عامر بولا۔ ”بلکہ اگر سادہ قالین درکار ہے تو وہ بھی اوپر پڑا ہے، اسے دھلوانا ہوگا۔“

”میں بائک لاسکتا ہوں۔“ محسن نے کہا۔ اس کے باپ نے اسے بائک دلائی تھی مگر اس کی ماں اسے مشکل سے ہی چلانے کے لیے دیتی تھی۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے طے کرلیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ فرید خوش تھا کہ انہوں نے اس کی تجویز مان لی تھی۔ سب کو پانچ پانچ ہزار روپے حاصل کرنا تھے۔ فرید اور محسن کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن عامر فکر مند تھا۔ اسے اپنے گھر کے حالات معلوم تھے۔ اس کی ماں نوکری کرتی تھی۔ ٹیوشن اب حنا پڑھاتی تھی۔ اس لیے شکیلہ پر یہ بوجھ کم ہوگیا تھا۔ حنا کالج سے آنے کے بعد روٹیاں ڈال لیتی تھی یا چاول بنالیا کرتی تھی۔ سالن یا دال شکیلہ صبح ہی بنا لیتی تھیں۔ حنا کی کوشش ہوتی تھی کہ ماں پر اب کم سے کم بوجھ ڈالے۔ ٹیوشن سے وہ اپنی تعلیم اور دوسرے اخراجات پورے کر کے گھر میں بھی بہت کچھ لے آتی تھی۔ دوسرے اخراجات شکیلہ کی تنخواہ اور مکان کے کرائے سے پورے ہوتے تھے۔ ایسے میں بچت مشکل کام تھا لیکن شکیلہ، حنا کا سوچ کر کچھ نہ کچھ بچاتی رہتی تھیں اور گزشتہ دس سال میں انہوں نے اس کا زیور تو تیار کرلیا تھا۔ اب باقی بھی آہستہ آہستہ جوڑ رہی تھیں۔

عامر کو معلوم تھا کہ ماں کے پاس رقم ہے لیکن اسے ان سے مانگتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ اس نے آج تک کما کر تو دیا نہیں تھا اور لیتا ہی رہا تھا۔ اب بھی وہ ان سے رقم مانگتا۔ رات کھانے کے بعد وہ کئی بار ماں کے کمرے میں گیا۔ حنا پڑھ رہی تھی اور شکیلہ اسکول کے بچوں کی امتحانی کاپیاں چیک کررہی تھیں۔ جب عامر تیسری بار بھی ہمت نہ ہونے پر اپنے کمرے میں آگیا تو اس کے کچھ دیر بعد شکیلہ خود آگئیں۔

”کیا بات ہے عامر؟“

”کچھ نہیں امی۔“ وہ بوکھلا گیا۔

شکیلہ مسکرائیں۔ ”عامر! میرے بچے... تم بھول جاتے ہو کہ میں تمہاری ماں ہوں اور تم سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اب بتاؤ، تم کیا کہنا چاہ رہے تھے؟“

عامر ہچکچایا۔ ”امی! آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟“

شکیلہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”رقم چاہیے؟“

”جی امی... آپ کو کیسے پتا چلا؟“ وہ حیران ہوا تھا۔ پھر شرمندہ ہوگیا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ اچھی بات نہیں ہے۔“

”روپے کس لیے چاہئیں؟“ شکیلہ نے نرمی سے پوچھا۔

”امی! میں نے فرید اور محسن کے ساتھ مل کر کام کرنے کا سوچا ہے۔“ عامر نے کہا اور ماں کو تفصیل سے بتایا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس رقم نہیں ہوتی اور پھر آپ حنا کے لیے بھی فکر مند ہیں۔“

”تم پاگل ہو، صرف حنا نہیں تم بھی میری اولاد ہو اور مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ اگر تم کام نہیں کرتے ہو تو اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ میں دوسری باتوں میں بھی تم سے ناخوش ہوں۔ مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نہ اپنی ماں کو دھوکا دے سکتے ہو اور نہ کسی برائی میں ہو۔“

”شکریہ امی۔“ وہ خوش ہوگیا۔

”رکو۔“ شکیلہ نے کہا۔ وہ اپنے کمرے میں گئیں اور اسے رقم لاکر دی۔ ”میری دعا ہے میرے بچے کہ تم کامیاب ہو اور حلال روزی کماؤ۔“

عامر نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی امی اس پر اتنا اعتماد کرتی ہیں اور وہ اسے فوراً رقم دے دیں گی۔ اس نے کہا۔ ”امی! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کامیابی کے لیے جان لڑا دوں گا لیکن ایک روپیا بھی حرام کا نہیں لاؤں گا۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے میرے بچے۔“ شکیلہ خوش ہوکر بولیں۔ ”حلال تھوڑا بھی ہو تو برکت والا ہوتا ہے... حرام تو نسل اجاڑ دیتا ہے۔“

☆☆☆

آج ان کی اسٹیٹ ایجنسی کا پہلا دن تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ پندرہ ہزار میں سارا کام بہت اچھی طرح ہوگیا تھا۔ فرنیچر، کارپٹ اور گلاس ڈور کی وجہ سے دکان سج گئی تھی اور خاصی ڈیکوریٹڈ لگ رہی تھی۔ فرید بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔ ”اسی خوشی میں مٹھائی ہوجائے۔“

”یہ لے۔“ محسن نے چائے اس کے سامنے رکھی۔

”ابے! کمایا ہے نہیں اور خرچ کرنے کی فکر پڑگئی۔“

”اور تو میمن ہے۔“ فرید نے جل کر کہا۔ ”بس کمانے کی فکر ہے۔“

”بیٹے! یہ کام کمانے کے لیے کیا ہے، مٹھائی کھانے کے لیے نہیں۔“

عامر ان کی نوک جھونک سنتے ہوئے رجسٹر دیکھ رہا تھا۔

ں نے کام کا سارا اشیڈول تیار کرلیا تھا اور سب کی ذمے ریاں بھی سوچ لی تھیں۔ اس نے ان سے کہا۔ ”ابھی تو ب نے صبح دس بجے یہاں آجانا ہے۔ دیگر اسٹیٹ ایجنسی ے عام طور سے بارہ ایک بجے کھولتے ہیں لیکن ہم نے دی کام کرنا ہے۔“

”او کے باس!“ فرید اور محسن نے شرارت سے ایک ساتھ کہا۔

”دوسرے یہ کہ ایجنسی پر صبح کے وقت فرید رہے گا اور شام کو میں رہوں گا۔ صبح میں کسٹمرز کے ساتھ جاؤں گا اور شام فرید۔“

”اور میں؟“ محسن نے پوچھا۔

”تو مستقل باہر کا ہی کام کرے گا اور اگر ایجنسی چل کلی، رش زیادہ ہونے لگا تو یہاں آنے والوں کو بھی ڈیل کرے گا۔ بائک تیرے پاس رہا کرے گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن تم دونوں باہر جاؤ گے تو تمہیں بھی یک بائک کی ضرورت تو پڑے گی؟“

عامر نے سوچا۔ ”ہاں، ایک بائک کی اور ضرورت تو پڑے گی لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ شروع میں تو ہمیں ایک بھی کافی ہے۔“

”کسٹمرز ڈیل کیسے ہوگی؟“ محسن نے پوچھا۔

”ہم دونوں کریں گے۔“ عامر نے جواب دیا۔ ”اپنا اپنا کسٹمر خود دیکھیں گے، اگر کوئی بہت ہی مجبوری والی بات نہ ہو۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ محسن نے سر ہلایا۔

انہوں نے سیٹنگ اس طرح کی تھی کہ لمبی فارمیکا ووڈ سے بنی میز کے دونوں طرف تین تین کرسیاں رکھی تھیں۔ یوار والی طرف وہ خود تھے اور سامنے ان کے کسٹمرز آکر بیٹھتے۔ اس کے علاوہ الگ سے صوفے یا دیوار کے ساتھ سیٹھی ی ضرورت تھی مگر ابھی نہیں۔ وہ باتیں کررہے تھے کہ ایک بڑے میاں اندر آئے۔ ”السلام علیکم۔“ انہوں نے کہا۔ بندے کو مکرم مرتضیٰ کہتے ہیں۔“

”وعلیکم السلام۔“ عامر نے کہا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ یا۔ ”فرمایئے... ہم آپ کی کیا خدمت کرسکتے ہیں؟“

بڑے میاں گرمی میں تپ کر آرہے تھے۔ ”بھئی اپنے سمدھی کی عیادت کو آئے تھے تو آپ کی اسٹیٹ ایجنسی پر نظر پڑ گئی، سوچا یہاں سے بھی ہولیں۔“

فرید نے ان کے سامنے ٹھنڈے پانی کا گلاس رکھا اور عامر نے رکھی سے انداز میں پوچھا۔ ”مہربانی آپ کی... یہ بتائیں کیا لیں گے؟“

”کچھ نہیں میاں... چائے کوک سب منع ہے، بس پانی پر گزارہ ہے۔“ اپنی بیماری کا بتا کر وہ اصل موضوع کی طرف آئے۔ ”بھئی ہمارا ایک مکان ہے۔ ریل پھاٹک کے ساتھ والی گلی میں ہے۔ اسے بیچنا ہے۔“

”ضرور!“ عامر نے اپنے سامنے رکھا رجسٹر کھولا۔ ”پتا بتایئے... آپ اسی مکان کے رہائشی ہیں؟“

”ہاں میاں... پچاس برس ہوگئے ہیں اب تو... ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھی۔ شادی کی، بچے ہوئے، ان کی شادیاں بھی کیں۔ ان کے بھی بچے ہیں۔ اب سب کو یہ جگہ بری لگنے لگی ہے۔ حالانکہ دونوں کو الگ پورشن بنا کر دیے مگر وہ ان سے آدھے سائز کے فلیٹ، گلشن اقبال اور گلستان جوہر میں لے کر خوش ہیں۔“

”مکان بڑا ہے؟“ عامر نے سوال کیا۔

”ہاں، کوئی بارہ سو گز پر ہوگا۔ اس لین میں سارے بڑے پلاٹ ہیں۔ بڑی گلی ہے۔“

”ہاں لیکن علاقے کی ویلیو نہیں ہے۔“ عامر نے کہا۔ ”میں کب آؤں دیکھنے کے لیے؟“

”ہم تو کہہ رہے ہیں کہ ابھی چلو۔“ مکرم صاحب نے کہا۔

عامر نے سوچا، وہ فارغ بیٹھے تھے اس لیے کام کا آغاز کرنا مناسب ہی ہوگا۔ اس نے سر ہلایا اور محسن سے بائک کی چابی لی۔ مکرم صاحب کا گھر زیادہ دور نہیں تھا اور گلی میں بھی بہت اندر نہیں تھا۔ مین روڈ سے پانچواں گھر تھا مگر کیونکہ پلاٹ بڑے تھے اس لیے دور لگ رہا تھا۔ البتہ گلی بہت کشادہ تھی۔ لوگوں کے ناجائز جگہ گھیرنے کے باوجود کم سے کم تیس فٹ کی تھی۔ باہر سے پیلی دیوار تھی اور اندر اینٹوں کا فرش تھا۔ پلاٹ واقعی بہت بڑا تھا۔ پہلے وسط میں تین کمروں کے ساتھ..... واش روم اور کچن تھا۔ پھر ایسے ہی دو پورشن دائیں بائیں تھے۔ ان میں دو دو کمرے تھے اور خاصے بڑے تھے۔ دائیں طرف والے پورشن کے بعد بھی خاصا بڑا حصہ کچا تھا جس پر کچھ پودے لگے سوکھ رہے تھے۔ جبکہ بائیں طرف بھی پورشن کے بعد ایک چھوٹا صحن تھا۔ یہ پورشن نسبتاً نیا تھا۔

”چھوٹے بیٹے کے لیے بنوایا تھا۔“ مکرم صاحب نے بتایا۔ ”لیکن وہ بھی بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چل نکلا۔ اچھی خاصی جگہ چھوڑ گیا۔“

عامر نے معائنہ کیا۔ مکان کا ایک پورشن بڑا پرانا تھا۔

یہ تین کمروں والا تھا جبکہ باقی دو اچھی کنڈیشن میں تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ مکان کیوں بیچ رہے ہیں؟''

''میاں! لڑکے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہیں اور ہماری بڑھیا کا بیٹوں کے بغیر دل نہیں لگتا ہے۔ اب یہ بیچ کر سب مل کر گلشن میں بڑا فلیٹ لینا چاہ رہے ہیں۔ ویسے میاں... تمہارے خیال میں اس مکان کی کیا ویلیو ہوگی؟''

عامر کو ابھی اتنا تجربہ نہیں تھا لیکن اس نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ آپ کو اس کے زیادہ نہیں ملیں گے کیونکہ اتنے بڑے مکان کے خریدار کم ہوتے ہیں۔''

''پھر بھی میاں... کوئی نہ کوئی تو لینا چاہے گا۔ بھئی، ہمارے برابر والا پلاٹ دو سال پہلے چھ لاکھ میں بکا تھا۔ اگر ہمیں اس کے آٹھ نو بھی مل جائیں تو ہم دے سکتے ہیں۔''

''گویا آپ کی ڈیمانڈ نو لاکھ ہے۔'' عامر نے کہا اور یہ ساری باتیں اپنی نوٹ بک میں درج کرلیں۔ ''میں پوری کوشش کروں گا۔'' اس نے کہا۔

وہ واپس آیا تو پتا چلا کہ محسن کسی کے ساتھ محلے میں اس کا مکان دیکھنے گیا ہے جسے وہ کرائے پر دینا چاہ رہا تھا۔ فرید نے خوش ہو کر بتایا۔ ''پہلے ہی دن کام ملنا شروع ہوگیا۔''

''اصل کام تو اس دن ہوگا جب نوٹ آنا شروع ہوں گے۔'' عامر نے نوٹ بنانے کا اشارہ کیا۔

فرید نے اسے تسلی دی۔ ''وہ بھی ہو جائے گا یار... جب محنت کریں گے تو اللہ صلہ کیوں نہیں دے گا۔''

شام تک کافی لوگوں نے اسٹیٹ ایجنسی کا چکر لگایا۔ ایک تو یہ مین جگہ پر تھی۔ علاقے میں آنے والا فرد اسی جگہ سے گزرتا تھا۔ دوسرے انہوں نے پمفلٹس کی مدد سے تشہیر بھی کی تھی۔ محسن جس شخص کا مکان دیکھنے کے لیے گیا تھا، اس کا کرایہ دار بھی آگیا تھا۔ بات ہوگئی تھی، معاملات اگلے روز طے ہونا تھے۔ دکان بند کرتے ہوئے وہ سب خوش تھے۔

☆☆☆

دو مہینے میں ان کا کام اتنا چل نکلا کہ انہوں نے نہ صرف ایک بائک اور لے لی... بلکہ ایک ملازم بھی رکھ لیا جو اوپر کے کام کرتا تھا۔ عامر نے اپنی امی کو پانچ ہزار واپس کردیے تھے لیکن ابھی ان میں سے کوئی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اپنے گھر میں کچھ دے سکے۔ ان کے اخراجات پورے ہو رہے تھے اور باقی سے وہ ایجنسی کا کام بڑھا رہے تھے۔ انہوں نے موبائل بھی لے لیے تھے کیونکہ انہیں ہمہ وقت ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

ابھی تک وہ کوئی بڑا سودا کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے لیکن چھوٹے موٹے کام ملتے رہتے تھے۔ اس روز عامر صبح کے وقت بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی اندر آیا۔

''میں اسی علاقے میں ایک پلاٹ لے رہا ہوں۔'' ارشد نامی شخص بولا۔

''کس سے؟'' عامر نے پوچھا۔

''لکی اسٹیٹ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اخبار میں اشتہار آیا تھا۔''

لکی اسٹیٹ شاکر رانا کی تھی۔ عامر اس کا نام سنتے ہی محتاط ہوگیا۔

''تب آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟''

''وہ مجھے پلاٹ کے مکمل کاغذات نہیں دکھا رہے ہیں۔ اس سے مجھے شک ہو رہا ہے۔ مجھے پلاٹ کی لوکیشن پسند ہے۔''

''کیا آپ پلاٹ کا نمبر بتا سکتے ہیں؟'' عامر کو اس معاملے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ شاکر رانا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دو نمبر کام کرتا ہے۔

''اس نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میں نے خود سے معلوم کرلیا ہے۔'' ارشد نے بتایا۔ اس نے نمبر سامنے رکھا۔ ''پڑوسیوں کے مطابق یہ کسی بیوہ کا پلاٹ ہے۔''

عامر کو نمبر جانا پہچانا لگ رہا تھا لیکن جب ارشد نے کہا تو اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں ممکنہ طور پر اس کے مالک سے واقف ہوں لیکن اس کی تصدیق کل تک ہی ہو سکے گی۔ آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔''

ارشد نے اسے نمبر دے دیا۔ جیسے ہی محسن آیا، وہ اسے بٹھا کر خود گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ شکیلہ اسکول سے آچکی تھیں۔ عامر نے ان سے پوچھا۔ ''امی! زبیدہ آنٹی کا کوئی پلاٹ ہے؟''

''ہاں بیٹے ہے تو۔''

''اس کا نمبر پتا ہے؟''

''نہیں، اس سے معلوم کرلوں گی... لیکن بات کیا ہے؟''

عامر نے ٹال دیا۔ ''بس وہ ایک آدمی اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں ان کے گھر جا کر ان سے بات کرلوں؟''

''ارے تو چلے جاؤ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

عامر گھر سے نکلا۔ زبیدہ آنٹی اسی لائن میں لیکن ...ی آگے رہتی تھیں۔ عامر ان کے گھر پہنچا تو وہ بھی اسکول ...آچکی تھیں۔ زبیدہ آنٹی کے شوہر چند سال پہلے کینسر کے ...میں مبتلا ہو کر دنیا سے گزر گئے تھے۔ وہ خود سرکاری ...ول ٹیچر تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ رومانہ بڑی تھی۔ ...کی عمر بیس برس تھی۔ دوسری میمونہ تھی، وہ ابھی سترہ برس ...تھی۔ دونوں کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ زبیدہ کا مکان ...رائے کا تھا۔ اتنی گنجائش نہیں تھی کہ مکان بنا سکتیں۔ عامر کو ...کھ کر وہ خوش ہوگئیں۔

''ارے بیٹا! تم پہلی بار آئے ہو... خیریت، شکیلہ ٹھیک ...ہیں نا؟''

''امی بالکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے کہا اور مطلب کی ...ت پر آگیا۔ ''آنٹی! آپ کا کوئی پلاٹ ہے؟''

''ہاں بیٹا ہے تو لیکن...''

''آپ مجھے اس کا نمبر بتائیں گی؟''

''نمبر تو مجھے یاد نہیں ہے۔ ایسا کرو تم اندر آ کر بیٹھو، ...دیکھ کر بتاتی ہوں۔''

وہ اسے اصرار کر کے اندر لے آئیں۔ اسے نشست ...میں بٹھایا۔ کچھ دیر بعد رومانہ اس کے لیے شربت بنا کر ...آئی۔ عامر کو لگا جیسے کمرا روشن ہوگیا ہے۔ اس نے شوق ...سے اسے دیکھا تو وہ شرما گئی۔ اس نے سلام کیا اور شربت رکھ ...کر جانے لگی۔

''رومانہ!'' عامر نے بے ساختہ پکارا تو وہ رک ...گئی۔ آگے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ رومانہ نے ...خود ہی پوچھا۔

''جی کہیے؟''

''وہ... کچھ نہیں۔'' اس نے کہا تو وہ خاموشی سے اندر ...گئی۔ نہ جانے کیوں اسے لگا جیسے وہ اس سے کچھ سننا چاہتی ...تھی۔ کچھ دیر بعد زبیدہ آنٹی آگئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک ...فائل تھی جو انہوں نے عامر کو دے دی۔

''بیٹا! مجھے تو اس کا اتنا نہیں معلوم ہے تم خود دیکھ لو کیا ...لکھا ہے۔''

''مجھے پلاٹ نمبر معلوم کرنا ہے۔ جو مکان کا نمبر ہوتا ...ہے، وہ اصل میں پلاٹ کا نمبر ہوتا ہے۔'' عامر نے فائل ...کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔ پھر اس کا خدشہ درست نکلا۔ یہ ...وہی نمبر تھا جو اسے ارشد نامی شخص نے دیا تھا۔ اس کا ...مطلب تھا کہ کہیں گھپلا ہو رہا ہے۔ اس نے زبیدہ آنٹی سے ...کہا۔

''آنٹی! کیا آپ نے یہ فائل کسی کو دی تھی یا آپ کا پلاٹ بیچنے کا ارادہ ہے؟''

وہ پریشان ہوگئیں۔ ''نہیں تو... میں نے نہ تو کسی کو فائل دی ہے اور نہ ہی پلاٹ بیچنے کا ارادہ ہے۔''

''آنٹی! بات تو پریشانی کی ہے لیکن آپ کو حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ کچھ لوگ غلط طریقے سے اس پلاٹ کو فروخت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اتفاق سے یہ بات میرے علم میں آگئی۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو، میں اس کی مالک ہوں۔ میری مرضی کے بغیر کوئی کیسے بیچ سکتا ہے؟'' آنٹی نے حیرت و پریشانی سے کہا۔

''آنٹی! یہاں سب ہو رہا ہے۔ آپ شکر ادا کریں کہ مجھے پتا چل گیا اب آپ پہلی فرصت میں اس کا کچھ کریں۔''

''میں کیا کروں بیٹا؟'' زبیدہ بولیں۔ ''میرا تو اس دنیا میں سوائے ان دو بچیوں کے اور کوئی نہیں ہے۔ میں کیا کرسکتی ہوں؟ تم ہی کچھ کرو۔''

''آنٹی! میں کیا کرسکتا ہوں؟ آپ کو خبردار کردیا۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ شاکر رانا سے ٹکر لینا آسان کام نہیں تھا۔

''بیٹا! تم اسے بکوا نہیں سکتے؟'' زبیدہ نے سوچ کر کہا۔ ''اب میں کب تک اس کی دیکھ بھال کروں گی۔ آج بچاؤں گی تو کل کوئی اور خاموشی سے بیچ دے گا۔ میں بیوہ عورت کہاں تک دیکھوں گی۔''

عامر سوچ میں پڑ گیا۔ اسی لمحے رومانہ اندر آئی۔ اس نے کسی قدر خفا لہجے میں کہا۔ ''امی! آپ فکر مت کریں، ہم دیکھ لیں گے۔ آپ کو کسی سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

عامر شرمندہ ہوگیا اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں انکار نہیں کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کام کیسے کروں۔ آپ بے فکر رہیں آنٹی... اب کوئی آپ کے پلاٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔''

''نہیں بیٹا! اس خبر نے مجھے پریشان کردیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ تم بھی شریف ماں باپ کی اولاد ہو۔ کہاں ان غنڈوں سے لڑتے پھرو گے، میں اسے اب بیچ دینا چاہتی ہوں۔''

''میں کوشش کروں گا کہ پلاٹ اچھی قیمت میں نکل جائے۔''

''انشاء اللہ۔'' وہ بولیں۔ ''تم چاہو تو یہ فائل ساتھ

لے جاؤ۔''

عامر خود بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا مگر جھجک رہا تھا کہ وہ کچھ اور نہ سمجھیں۔ زبیدہ آنٹی کو پتا تھا کہ اس نے اسٹیٹ ایجنسی کھول لی ہے۔ عامر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''آنٹی! میرے لیے آپ امی کی طرح ہیں اور آپ مجھ پر حق رکھتی ہیں۔ میں نے کبھی آپ کو غیر نہیں سمجھا۔''

''میں جانتی ہوں بیٹے، ورنہ تمہیں کیا پڑی تھی کہ اپنا کام چھوڑ کر مجھے خبردار کرنے کے لیے بھاگے آتے۔ اور یہ رومانہ پاگل ہے، اس کی باتوں پر زیادہ توجہ مت دیا کرو۔''

رومانہ شرمندہ لگ رہی تھی۔ عامر نے ایک نظر اسے دیکھا اور سلام کر کے نکل گیا۔

☆☆☆

محسن اور فرید یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''یار! اس معاملے میں پڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم جانتے ہو رانا پارٹی بدمعاش ہے اور ہم سیدھا سادہ کام کر رہے ہیں۔''

''تم لوگ فکر مت کرو، میں خود بھی تم لوگوں کو اس چکر میں شامل نہیں کروں گا۔''

''ہم تجھ سے الگ نہیں ہیں۔'' محسن غصے سے بولا۔ ''تُو غلط سمجھ رہا ہے، ہمیں تیری بھی اتنی ہی فکر ہے جتنی کہ اپنی۔''

''میں اس کام سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔'' عامر نے کہا۔

''ابے ہاں نا، اپنے بھائی کے ہونے والے سسرال کا معاملہ ہے۔'' فرید ہنس کے بولا تو عامر جھینپ گیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''ابے بے وقوف کسی اور کو بنانا۔'' محسن نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ''ہم کون سا پیچھے ہٹ رہے ہیں، بس تو ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا۔''

''تم بے فکر رہو۔'' اس نے جواب دیا۔

عامر نے ارشد کو فون کر کے بلوا لیا تھا لیکن اس نے اسے اسٹیٹ ایجنسی کے بجائے ائرپورٹ پر جناح ٹرمنل کے سامنے سبزہ زار پر بلایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے ان کی اسٹیٹ ایجنسی پر دیکھے۔ وہ ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ عامر نے اسے بتایا۔

''آپ کا اندیشہ درست ہے۔ پلاٹ کا اصل مالک نہ تو اسے بیچ رہا ہے اور نہ ہی اس نے اصل فائل کسی کو دی ہے۔ میں خود اس کے پاس اصل فائل دیکھ کر آیا ہوں۔''

ارشد نے سر ہلایا۔ ''میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے ان لوگوں کے بارے میں کچھ تحقیق کی ہے۔ یہ قبضہ مافیا ہے۔''

''اب آپ کو پتا چل گیا ہے، تب بھی آپ اس پلاٹ میں دلچسپی رکھتے ہیں؟''

''بالکل... کیوں نہیں۔''

عامر کو تعجب ہوا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک پارٹی اس کے پیچھے پڑی ہے۔''

''میں اسے دیکھ لوں گا، وہ مجھے جانتے نہیں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اصل مالک کیا مانگ رہا ہے؟''

عامر نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اس کی ڈیمانڈ دس لاکھ روپے ہے۔''

''یہ زیادہ ہیں... میں نو دے سکتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''اگر مالک مان جائے تو مجھے کال کر دینا۔ میں دو دن میں سودا کر لوں گا۔ اس کے بعد کے معاملات میرے ذمے ہوں گے۔''

''میں آپ کو بات کر کے بتاتا ہوں لیکن کیا آپ نو سے اوپر نہیں جا سکتے؟''

''نہیں، یہ آخری ہے اور وہ بھی اس لیے کہ مجھے پلاٹ کی لوکیشن پسند آئی ہے۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

عامر اس کے پاس سے اٹھا تو خوش تھا کیونکہ کچھ ہی عرصے میں اس فیلڈ میں کام کر کے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پلاٹ کے اس سے زیادہ ملنا ممکن نہیں اور وہ بھی اس حالت میں مل رہے تھے جبکہ قبضہ مافیا پلاٹ کے پیچھے پڑی تھی۔ وہ سیدھا زبیدہ آنٹی کے پاس آیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے میمونہ نے جھانکا۔

''عامر بھائی۔'' وہ شوخی سے بولی۔ ''اندر آئیں۔''

''مجھے آنٹی سے ملنا ہے۔''

''وہ بھی آجاتی ہیں، آپ تو اندر آئیں۔'' وہ اسے تقریباً زبردستی اندر لے گئی۔ ''امی سامنے گئی ہیں۔''

''تو میں بعد میں آجاؤں گا۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

''بیٹھ جائیں، ہم آپ کو کھا نہیں جائیں گے۔'' اس نے ڈانٹ کر کہا۔ وہ خاصی تیز تھی۔ عامر بیٹھ گیا۔

''اور کوئی حکم؟''

''ابھی باجی آپ کے لیے چائے بنائیں گی اور میں بسکٹ لاتی ہوں۔ آپ کو دونوں کھانے ہوں گے۔''

''چائے کیسے کھاؤں؟'' وہ معصومیت سے بولا۔

''چا... آپ پی سکتے ہیں۔''

وہ اندر غائب ہوگئی اور اس کے کچھ دیر بعد پردہ ہٹا اور رومانہ یوں اندر آئی جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔ وہ نروس تھی اور اسے دیکھ کر عامر بھی نروس ہوگیا۔ وہ اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ پھر اس نے ہمت کر کے کہا۔

''وہ... مم... میں آپ سے اس دن کی بات پر سوری کرنے آئی ہوں۔''

''کس دن کی بات پر؟'' عامر اَن جان بن گیا۔

''وہ اس دن جب میں نے امی سے کہا تھا کہ... کہ آپ سے پلاٹ کا کام نہ کہیں۔ آپ کو بُرا لگا تھا؟''

''کوئی اور کہتا تو مجھے اتنا برا نہیں لگتا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

رومانہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر اس کے آنسو ٹپکنے لگے۔ عامر بے قرار ہوگیا۔ ''لیکن اب مجھے ذرا بھی خیال نہیں ہے بلکہ میں تو اس واقعے کا شکر گزار ہوں ورنہ تم مجھ سے بات کیوں کرتیں۔''

رومانہ نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ ''یعنی آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' عامر نے جلدی سے کہا۔

''شکریہ۔'' رومانہ مسکرائی تو عامر کو لگا جیسے بارش کے فوراً بعد سورج نکل آیا ہو۔ وہ دم بہ خود رہ گیا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے رومانہ شرما گئی پھر وہاں سے بھاگ گئی۔ جب تک چائے اور بسکٹ آئے، آنٹی زبیدہ بھی آگئیں اور وہ بیٹیوں پر خفا ہونے لگیں کہ انہوں نے صرف چائے اور بسکٹ سے اس کی تواضع کی تھی۔

''آنٹی! میں تو جا رہا تھا، میمونہ نے روک لیا۔''

''اس نے اچھا کیا۔ تم اس گھر کے لیے غیر نہیں ہو۔''

''آنٹی! آپ کے لیے خوش خبری ہے۔ آپ کے پلاٹ کا گاہک مل گیا ہے اور وہ اس کے نو لاکھ دینے کو تیار ہے۔''

''بیٹا! یہ قیمت مارکیٹ کے مطابق ہے؟'' زبیدہ کسی قدر خوش ہوئیں۔

''جی آنٹی! ویسے آپ چاہیں تو دو تین اسٹیٹ ایجنسی والوں سے اور معلوم کر لیں۔''

زبیدہ آنٹی خفا ہوگئیں۔ ''اب تم نے غیروں والی بات کی ہے۔ اگر تم مطمئن ہو تو مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن یہ پلاٹ میں نے اپنی بچیوں کے لیے رکھا تھا۔ آج کل رقم کا پتا نہیں چلتا۔''

''آنٹی! میری مانیں تو اس رقم سے کوئی اور زمین لے لیں۔''

''اتنے میں تو پلاٹ ہی ملے گا۔ مکان ملے گا بھی تو کسی چھوٹے سے علاقے میں جو بس اسٹاپ اور مارکیٹ سے بھی دور ہوگا۔''

''آنٹی! میں دیکھتا ہوں اور اگر آپ کہیں تو اس شخص کو بتا دوں، وہ دو دن میں سودا کر لے گا۔''

''اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ میں نے تو جب سے اس کا سنا ہے مجھے ہول ہی اٹھ رہے ہیں۔''

اس علاقے میں زمینوں پر قبضہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ زبیدہ جانتی تھیں کہ ان کا پلاٹ اگر بک گیا تو وہ کسی سے داد و فریاد نہیں کر سکیں گی۔ اس لیے وہ جلد از جلد پلاٹ بیچ دینا چاہتی تھیں۔

''بس تو میں اس سے کہہ دیتا ہوں اور نظر رکھتا ہوں، ممکن ہے کوئی مکان مل جائے۔''

''ہاں اگر ایسا ہو تو ہم کرائے سے بچ جائیں گے۔''

''سچ امی! کیا ہمارا اپنا مکان ہو سکتا ہے؟'' میمونہ خوش ہوگئی۔

''کیوں نہیں، آدمی کوشش کرے تو کیا نہیں ہو سکتا۔'' عامر نے یقین سے کہا۔ ''ٹھیک ہے آنٹی میں جلد از جلد اسے لانے کی کوشش کروں گا۔''

☆☆☆

شاکر رانا چہرے سے سخت گیر نظر آنے والا تقریباً پچپن سال کا شخص تھا۔ وہ گزشتہ تیس سال سے اسٹیٹ ایجنسی کے شعبے میں کام کر رہا تھا لیکن اس کے زیادہ تر کام دو نمبر ہوتے تھے۔ لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کرنا اور ان کے جعلی کاغذات تیار کر کے انہیں دوسروں کے ہاتھ بیچنا۔ جہاں اسے پتا چلتا کہ کوئی پلاٹ یا زمین لاوارث پڑی ہے... یا کسی کا مالک باہر ہے تو وہ اس پر قبضہ کر کے اسے فروخت کر دیتا تھا۔ اس دو نمبر کام میں اس نے بڑی دولت کمائی تھی اور اب وہ سپر ہائی وے کی ایک اسکیم شروع کرنے والا تھا۔ سپر ہائی وے پر یہ زمین ایک گوٹھ کی ملکیت تھی لیکن اس نے چکر چلا کر گوٹھ کے لوگوں کو راضی کر لیا تھا کہ وہ اسے مختار بنا دیں، وہ ان کی زمینیں اچھے داموں بکوا سکتا ہے۔ وہاں بجلی اور گیس تھی اس لیے زمین کی اصل ویلیو تھی۔

شاکر نے ملیر کینٹ میں ایک شان دار سے بنگلے کے سامنے والے حصے میں اپنی اسٹیٹ ایجنسی کا دفتر بنا رکھا تھا۔ یہاں وہ اور اس کے تینوں بیٹے بیٹھتے تھے۔ تینوں بیٹے خود بدمعاش قسم کے تھے اور ان کی وجہ سے اب شاکر کو کرائے کے

...عاشوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس معاملے میں وہ ...کفیل ہو گیا تھا۔ اس روز بھی وہ اسٹیٹ ایجنسی پر اپنے ...ن دار ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا کچھ شغل کر رہا تھا۔ ...ب سے اسے دل کی تکلیف ہوئی تھی، اس نے پینا کم کر دیا ...۔ گھر میں وہ ویسے بھی نہیں پیتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں ...بھی یہی تربیت کی تھی کہ جو بدمعاشی اور عیاشی کرنی ہے، ...گھر سے باہر کریں۔ گھر کے اندر وہ صرف بیٹے، بھائی، ...ہر اور باپ ہوں گے۔ اس نے اوائل جوانی میں تینوں ...شادی کر دی تھی اور اب وہ تینوں ہی باپ بن چکے ...۔ شاکر جانتا تھا کہ کھلا پیسا انہیں غلط راہوں پر لے ...ئے گا۔ اس لیے اس نے شروع سے انہیں اپنے ساتھ ...م پر لگا لیا تھا۔ اس کے تینوں بیٹوں کی بیویاں ایک سے ...ھ کر ایک تھیں۔ اس نے ملیر کینٹ کے پاس ہی ایک بڑا ...ٹ لے کر اس پر شان دار سا گھر بنوا لیا تھا۔ سب کے ...س گاڑیاں تھیں۔ وہ مزے میں رہ رہے تھے اور لوگ ان ...رشک کرتے تھے۔

شاکر خوش تھا۔ اس نے اپنے اور بیٹوں کے لیے جو ...چا تھا، وہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کی بیٹیاں ابھی چھوٹی تھیں۔ ...ب سولہ سال کی تھی اور دوسری چودہ سال کی۔ دونوں اسکول ...ں پڑھ رہی تھیں۔ ان کے لیے بھی شاکر کا یہی ارادہ تھا کہ کم ...ری میں ان کی شادی کر دے گا۔ وہ اپنی دولت اور ...کامیابیوں پر مغرور ہو گیا تھا۔ اسے کبھی خیال نہیں آتا تھا کہ ...اس نے یہ دولت کس طرح حاصل کی ہے اور اسے اس کا ...حساب بھی دینا ہے۔

وہ گلاس خالی کر رہا تھا کہ بہرام نے اسے ایک خاتون کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ بزنس کے سلسلے میں اس سے ملنا ...ہتی تھی۔ بہرام آنے والے کسٹمرز کے استقبال پر مامور تھا۔ ...س کے علاوہ تین افراد اور تھے۔ ایک چپراسی تھا۔ ایک کمپیوٹر ...پریٹر تھا جو ڈاکومینٹیشن کا کام کرتا تھا اور ایک مسلح گارڈ تھا۔ ...خود شاکر اور اس کے بیٹے بھی گھر سے باہر ہمہ وقت مسلح رہا ...کرتے تھے۔ ان کے دو نمبر کاروبار میں دشمنی لازمی تھی۔ کئی ...ان پر حملے بھی ہوئے تھے مگر ہر بار وہ کسی نقصان سے بچ ...گئے تھے۔ صرف ایک بار شاکر کا بڑا بیٹا سلطان زخمی ہوا تھا، ...اس کے بازو پر گولی لگی تھی۔ اس نے بہرام سے کہا۔

''خاتون کو اندر بھیج دو۔''

چند لمحے بعد جو عورت اندر آئی، اسے دیکھ کر شاکر ...سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ چہرے سے بہت ہوشیار اور پُراعتماد ...لگ رہی تھی۔ اس کی عمر تیس کے اندر تھی لیکن جسمانی طور پر فٹ اور نہایت حسین تھی۔ اس نے گہرا میک اپ کر رکھا تھا اور کانوں میں بیش قیمت ٹاپس تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے ایک کارڈ شاکر کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس پر لکھا تھا:

''رحمان ایسوسی ایٹس!''

شاکر ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن وہ اَن جان بن گیا۔ ''میں سمجھا نہیں مس... اوہ، آپ بیٹھیں نا۔''

''اگر تم رحمان کو نہیں جانتے تو تمہیں یہ کاروبار کرنے کا حق نہیں ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

شاکر کا دماغ گھوم گیا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ ''مس... میں نے یہ اسٹیٹ ایجنسی کسی کے دیے حق سے قائم نہیں کی ہے اور اگر تمہارے پاس کہنے کو کچھ ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔''

''وقت سب کا قیمتی ہوتا ہے۔ میں یہ کہنے آئی ہوں کہ تم سپر ہائی وے پر گوٹھ والی زمین سے دست بردار ہو جاؤ۔''

''وہ کیوں؟'' اس بار شاکر کو سچ مچ غصہ آگیا۔

''کیونکہ رحمان ایسا چاہتا ہے۔ تم نے وہاں جو خرچہ کیا ہے، وہ تمہیں واپس مل جائے گا۔''

''مجھے اس معاملے میں رحمان یا کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شاکر بگڑ کر بولا۔ ''اب تم جا سکتی ہو۔''

عورت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم ہائی بلڈ پریشر اور انجائنا کے مریض ہو اس لیے آرام سے بات کرو۔''

شاکر خود پر قابو پانے لگا۔ ''دیکھو، میرا وہ زمین کسی کو دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ خرچ تو کیا، اس سے دس گنا قیمت پر بھی نہیں دوں گا۔''

''تم شاید زیادہ کے چکر میں ہو لیکن تمہیں اس سے زیادہ نہیں ملے گا اور اگر تم نے گوٹھ والوں سے معاہدہ منسوخ نہ کیا تو خرچ بھی نہیں ملے گا۔''

''دفع ہو جاؤ۔'' اس بار شاکر دہاڑا... ''جا کر اپنے باپ سے کہہ دو کہ شاکر کسی سے نہیں ڈرتا۔''

عورت سکون سے کھڑی ہوئی اور بے حد طنزیہ انداز میں بولی۔ ''ہاں... جو بیواؤں اور یتیموں کی زمین اور مال کھاتے ہوئے خدا سے نہ ڈرے، وہ کسی اور سے کیا ڈرے گا۔''

''تم جاتی ہو یا...'' شاکر نے اپنی دراز میں رکھا پستول نکال لیا۔

عورت اس بار زیادہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ”شاکر! تمہارے اعصاب قابو میں نہیں ہیں، تم ایک عورت پر گن نکال رہے ہو۔“ یہ کہتے کہتے اس کے لہجے میں حقارت آ گئی۔ ”افسوس کہ تم اتنے بدمعاش بھی نہیں ہو جتنے مشہور ہو۔“

”گیٹ لاسٹ۔“ شاکر چیخا۔ اشتعال میں اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ عورت باوقار انداز میں دروازے کی طرف بڑھی پھر رک کر بولی۔

”میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ وقت آنے سے پہلے رحمان کی بات مان لو جب تم صرف پچھتا سکو گے لیکن خود کو اس سزا سے نہیں بچا سکو گے جو تمہارا مقدر بن چکی ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ شاکر نے پستول میز پر رکھا اور کانپتے ہاتھوں سے اپنے لیے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔ وہ رحمان کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ شہر کا ایک بڑا بلڈر اور اسٹیٹ کا ماہر تھا۔ اس نے درجنوں کے حساب سے پلازا، فلیٹس اور بنگلوز کی اسکیمیں تیار کی تھیں۔

ولی رحمان افغانی تھا اور افغان جنگ کے دوران وہ پاکستان آ کر یہیں آباد ہو گیا تھا۔ پہلے وہ منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ کرتا تھا۔ پھر اس نے قبضہ مافیا کا روپ اختیار کر لیا۔ اپنے کام کو قانونی حیثیت دینے کے لیے اس نے بہ ظاہر بلڈر اور لینڈ ڈیولپر کا روپ دھار لیا تھا لیکن اندر سے وہ جرائم پیشہ تھا۔ اس کے آدمی پورے شہر میں ایسی جگہوں کی بو سونگھتے پھرتے تھے جو لاوارث ہوں یا سرکار کی ہوں۔ وہ ایسی زمینوں پر راتوں رات کچی آبادیاں بسا کر قبضہ کر لیتا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوشش ہوتی کہ سرکار یہ زمین لیز کر دے۔ اس صورت میں وہ مہنگے داموں یہ زمین بیچ دیا کرتا تھا۔

ولی رحمان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ عام لوگوں کو تنگ نہیں کرتا۔ جن کو زمین بیچتا تھا، بعد میں بھی ان کے مفادات کا خیال رکھتا۔ لیکن جو اس کے راستے میں آتا اس کے ساتھ بہت سفاکی سے پیش آتا تھا۔ اس کے کئی مخالف پراسرار طور پر مارے جا چکے تھے یا غائب ہو گئے تھے۔ اب کوئی اس کی راہ میں آنا پسند نہیں کرتا تھا۔ پولیس اور سرکاری افسران اس کی مٹھی میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے خلاف بے شمار شکایات ہونے کے باوجود کبھی اس کے خلاف پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ حکومتیں بدل جاتیں لیکن اس کی پوزیشن میں فرق نہیں آتا۔

اب اسے ولی رحمان کا پیغام ملا تو شاکر کے لیے پریشان ہونا لازمی تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے بیٹوں کو بلا لیا اور ان کے آنے تک پیتا رہا۔ لیکن جب وہ آئے تو اس نے بوتل اور گلاس میز سے ہٹا دیے۔ شاکر کا بڑا بیٹا سلطان سب سے پہلے آیا۔ اس نے آتے ہی پوچھنا چاہا لیکن شاکر نے اشارے سے روک دیا۔

”وہ دونوں بھی آ جائیں تو بات ہوتی ہے۔“

منور اور انور کچھ دیر بعد آئے تھے۔ شاکر نے انہیں عورت اور اس کے توسط سے رحمان کی دھمکی سے آگاہ کیا۔ سلطان نے بے یقینی سے کہا۔ ”کیا رحمان کے پاس اب مرد نہیں رہے جو وہ عورتوں کی مدد سے بات کر رہا ہے؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ عورت ولی رحمان نے نہیں بھیجی تھی؟“

”ایسا ہو سکتا ہے۔“ منور نے بھی بھائی کی تائید کی۔ ”ممکن ہے کوئی اور چھوٹی پارٹی ولی رحمان کی آڑ میں گیم کھیلنے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”تب کیا کیا جائے؟“ انور بولا۔ وہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی باتوں میں کم بولتا تھا مگر شاکر اس کی بات بھی پوری توجہ سے سنتا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ ولی رحمان سے بات کی جائے۔“ سلطان بولا۔

”میں نے سنا ہے کہ جلد ولی رحمان اور دوسرے قبضہ گروپ کے خلاف کارروائی کی جانے والی ہے۔“ انور نے پھر کہا۔

”ان خبروں میں کوئی صداقت نہیں ہے۔“ سلطان بے زاری سے بولا۔ ”دس سال سے تو سنتے آ رہے ہیں۔“

”لیکن اس بار اس میں سچ محسوس ہو رہا ہے کیونکہ ایک مقامی سیاسی پارٹی جو اقتدار میں شامل ہے، ایسا چاہتی ہے۔ اس لیے لگ رہا ہے کچھ عرصے کے لیے ولی رحمان چپ ضرور ہو جائے گا۔“

”وہ تو ہاتھ پاؤں پھیلا رہا ہے۔“ شاکر نے کہا۔ ”اس سے مجھے بھی شبہ ہو رہا ہے کہ یہ ولی رحمان کی کارروائی نہیں ہے۔ اگر اس سے بات کر لی جائے تو معاملہ کلیئر ہو جائے گا۔“

”اس سے فون پر بات ہو سکتی ہے۔“ منور بولا۔ ”خود تو وہ سامنے آتا نہیں ہے۔“

شاکر نے رحمان ایسوسی ایٹس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے آپریٹر نے جواب دیا۔ اس نے کسی اہم آدمی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی، کچھ دیر بعد منیجر لائن پر تھا۔ شاکر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے رحمان سے بات کرنے

کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے شاکر سے نمبر لے کر فون بند کر دیا۔ اس کے چند منٹ بعد شاکر کے موبائل پر کال آ گئی۔

”بولو، میں بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے کسی نے نام لیے بغیر کہا۔ ”میں نے ہی اس لڑکی کو بھیجا تھا۔“

شاکر نے محتاط انداز میں پوچھا۔ ”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم وہی ہو جس کا ذکر لڑکی نے کیا تھا؟“

”تم کم عقل آدمی ہو۔ ابھی تم نے کہاں فون کر کے میرا نمبر لینے کی بات کی تھی؟“

”ٹھیک ہے لیکن میں تمہارا مطالبہ نہیں مان سکتا، میں نے اپنا سب کچھ اس زمین پر لگا دیا ہے۔“

”کیا جان بھی لگا دیا ہے۔“ ولی رحمان کا لہجہ سفاک ہو گیا۔

”دیکھو، خالی ہاتھ ہم بھی نہیں ہیں اور چوڑیاں بھی نہیں پہن رکھی ہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم لڑنا چاہتا ہے؟“

”نہیں لیکن میں یہ جگہ بھی نہیں چھوڑ سکتا۔“

”تب دیکھا جائے گا۔“ ولی رحمان نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شاکر نے بیٹوں کی طرف دیکھا، اس نے اسپیکر فون آن کر دیا تھا اس لیے سب نے گفتگو سنی تھی۔ سلطان نے کہا۔ ”یہ ولی رحمان کی آواز ہی تھی۔ میں اس سے دو بار مل چکا ہوں۔“

”یعنی اس دفعہ ہمارا ٹاکرا ولی رحمان سے ہے۔“ شاکر فکرمند ہو گیا۔

”لیکن ہم وہ زمین کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے۔“ سلطان بولا۔

”ہم اس کے خلاف دوسروں سے مدد لے سکتے ہیں۔“ انور نے تجویز دی۔ ”ہم مقامی پارٹی سے بھی بات کر سکتے ہیں اور ولی رحمان کے دشمنوں سے بھی۔ اس سے سب تنگ آئے ہوئے ہیں۔“

شاکر اور اس کے بیٹوں نے طویل بحث کے بعد طے کیا کہ انہیں اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔

☆☆☆

عامر اور محسن ایک مکان کا سودا کروا کر آئے تھے اور بہت خوش تھے کیونکہ انہیں پہلی بار کوئی بڑا سودا ملا تھا۔ یہ دو سو گز کا مکان تھا جس کی مالیت لاکھوں میں تھی۔ یعنی انہیں دونوں طرف سے ملا کر ایک لاکھ دس ہزار روپے مل جاتے۔ دونوں پارٹیاں ان سے خوش تھیں کیونکہ انہوں نے سودا اچھے طریقے سے کرایا تھا۔

عامر نے زبیدہ کا پلاٹ بکوا دیا تھا۔ نو لاکھ روپے ان کے بینک اکاؤنٹ میں آ چکے تھے اور وہ اس کی بے حد شکر گزار تھیں۔ انہوں نے عامر کو اس کا کمیشن دینے کی کوشش کی تو وہ ناراض ہو گیا۔ پھر زبیدہ، رومانہ اور میمونہ خاص طور سے اس کے گھر اس کو منانے آئی تھیں۔ چوتھے مہینے میں ان کی آمدنی اتنی اچھی ہو گئی کہ انہوں نے پہلی بار ایک جگہ پلاٹ لے لیا۔ یہ انہیں صرف ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کا پڑا تھا۔ زمین و جائداد کی قیمت بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ہر مہینے اضافہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ جو اضافی آمدنی ہوگی، اسے پراپرٹی میں لگاتے جائیں گے۔

عامر مکرم صاحب کے لیے کئی گاہک لے جا چکا تھا۔ مگر سب کو اتنا بڑا پلاٹ اور اس پر بنے پرانے طرز کے پورشن برے لگتے اور پلاٹ نہیں بک پاتا۔ مکرم صاحب آٹھ لاکھ میں بھی دینے کو تیار تھے۔ وہ عامر سے شکوہ کرتے۔ ”میاں... چار مہینے ہو گئے ہیں۔ اب تک تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔“

عامر نے جواب دیا۔ ”آپ فکر مت کریں، مارکیٹ تیزی سے اوپر آ رہی ہے۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد آپ کو اس سے زیادہ مل جائے۔“

”کچھ عرصے بعد!“ وہ مایوسی سے بولے۔ ”تب تک وہ فلیٹ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا جو میرے بیٹے لینا چاہتے ہیں۔“

عامر کو ان سے ہمدردی تھی۔ وہ اچھے آدمی تھے۔ اچانک... اسے ایک خیال آیا۔ اس نے مکرم صاحب سے کہا۔ ”ایک آئیڈیا ہے مکرم صاحب... اگر آپ مانیں تو؟“

”ہاں کہو۔“

”اگر آپ اپنا مکان پورا بیچنے کے بجائے اس کے حصے کر کے بیچیں تو مجھے امید ہے کہ یہ آسانی سے بک جائے گا اور آپ کو آپ کی ڈیمانڈ سے زیادہ قیمت مل جائے گی۔“

”حصے کر کے...؟“ وہ سمجھے نہیں۔

عامر نے انہیں سمجھایا۔ ”دیکھیں، آپ کے پلاٹ کا رقبہ بارہ سو گز ہے لیکن خوش قسمتی سے اس کی لمبائی اس کی چوڑائی کے مقابلے میں کم ہے۔ یعنی یہ کوئی ستر فٹ لمبا ہے لیکن گلی میں اس کی چوڑائی ڈیڑھ سو فٹ سے زیادہ ہے۔ اب اس کے آسانی سے پانچ حصے کیے جا سکتے ہیں۔ ہر حصہ تیس فٹ سے کچھ چوڑا ہوگا جو بہت اچھا فرنٹ ہے۔ پلاٹ دو سو بیس گز کا بنے گا۔ اس علاقے میں بارہ سو گز کا پلاٹ کوئی

نو لاکھ میں نہیں لے گا۔ لیکن دو سو بیس کا پلاٹ دو لاکھ میں لے لے گا۔ اس طرح آپ کو دس لاکھ سے زیادہ ہی مل جائیں گے۔"

"اصل میں ریلوے لائن ایک گلی پیچھے ہونے کی وجہ سے اس کی ویلیو نہیں ہے۔" مکرم صاحب مایوسی سے بولے۔

عامر ہنسا۔ "جناب! اب یہاں سے ٹرین دن میں صرف دو بار گزرتی ہے۔ ذرا ملیر ہالٹ اور اس کے ساتھ ملحق...... آبادی کا حال سوچیں جہاں سے دن بھر ٹرینیں گزرتی رہتی ہیں۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بتائیں کہ میری تجویز کیسی لگی؟"

"تجویز تو اچھی ہے۔" مکرم صاحب رضا مند نظر آنے لگے۔

عامر کو ایک خیال اور آیا۔ "میرے پاس اتنے بڑے پلاٹ کے لیے دو کسٹمرز تو یقینی ہیں لیکن ان کے لیے آپ قیمت دو لاکھ سے اوپر نہیں مانگیں گے۔" عامر کو زبیدہ آنٹی کا خیال آیا تھا۔ اسی طرح ایک انویسٹر بھی تھا۔

مکرم صاحب مسکرائے۔ "اگر تم جلدی گاہک لا رہے ہو تو یہ بھی منظور ہے۔"

عامر نے ایک بار پھر ان کے مکان کا معائنہ کیا، اس نے محسوس کیا کہ دائیں طرف والا حصہ خالی پلاٹ ہی تھا۔ لیکن اس کے بعد والا دوسرا حصہ مع پورشن کے خریدنے والے کے حصے میں آجاتا لیکن اس کے بعد والے تین پلاٹوں میں درمیان والا اور بائیں طرف والا پورشن بٹ جاتا۔ یعنی خریدنے والے کو انہیں تڑوانا پڑتا۔ عامر وہاں سے سیدھا زبیدہ آنٹی کے پاس پہنچا۔

"عامر بیٹا تم۔" وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ "بہت دنوں بعد صورت دکھائی۔"

"جی آنٹی! بس مصروفیت بہت زیادہ تھی، ابھی بھی ایک کام سے آیا ہوں۔" اس نے کہا تو زبیدہ اسے اندر لے گئیں۔

"کہو بیٹا!"

"آنٹی! ایک مکان کا پورشن بک رہا ہے۔ خاصا بڑا ہے اور قیمت بھی کم ہے۔"

"کتنا بڑا ہے؟"

"دو سو گز سے اوپر ہے اور اس میں دو بڑے کمرے، باتھ روم اور کچن بھی بنا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ کچھ اس طرح کا ہے کہ اس میں آسانی سے ایک کمرے اور واش روم کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اور فرنٹ کو جدید اسٹائل میں بنایا جا سکتا ہے۔"

عامر کی توقع کے خلاف زبیدہ آنٹی خوش نہیں ہوئیں۔ "دو سو گز سے بڑا ہے، تب تو اس کی قیمت بھی بہت زیادہ ہو گی۔"

"یہی تو مزے کی بات ہے آنٹی... وہ پورا پورشن آپ کو صرف دو لاکھ میں مل رہا ہے۔"

زبیدہ آنٹی چونک گئیں۔ "صرف دو لاکھ میں... کیا کسی گوٹھ میں ہے؟"

عامر مسکرایا۔ "نہیں آنٹی یہیں ہے۔ ریلوے پھاٹک سے ایک گلی پہلے سڑک کے بائیں طرف ہے اور مین روڈ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

"سچ۔" وہ تعجب سے بولیں۔ "یہاں اتنا بڑا پلاٹ اتنا سستا کیسے مل رہا ہے؟"

عامر نے انہیں مکرم صاحب کے بارے میں بتایا۔ زبیدہ سوچ میں پڑ گئیں۔ عامر سمجھا کہ شاید وہ راضی نہیں ہیں مگر کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر کہا۔ "عامر بیٹا! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں یہ پورا پلاٹ خرید لوں؟"

عامر حیران رہ گیا۔ یہ خیال تو اسے آیا ہی نہیں تھا۔ "کیوں نہیں آنٹی... مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ واقعی آپ پورا پلاٹ لے سکتی ہیں اور پھر خود اس کے حصے کر کے بیچ سکتی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو اپنی پوری رقم سے زیادہ ہی مل جائے گا اور آپ کا اپنا مکان بھی ہو جائے گا۔ وہ بھی بہت اچھا۔ مجھے وہ جگہ بہت اچھی لگی ہے۔"

"ایسا کرو، مجھے لے چلو۔"

"ابھی نہیں، کل چلیے گا... ایسا نہ ہو مکرم صاحب سمجھیں کہ آپ بہت بے تاب ہیں اور وہ قیمت بڑھا دیں۔ ابھی تو وہ آٹھ لاکھ میں بھی دینے کو تیار ہیں۔"

"ٹھیک ہے کل چلنا۔" زبیدہ آنٹی رضا مند ہو گئیں۔

"میں چلتا ہوں، کل شام کو آؤں گا... آپ تیار رہیے گا۔"

عامر خوش خوش ان کے گھر سے نکلا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ رومانہ کے گھر والوں کے کام آ رہا ہے۔ آنٹی کے انداز میں اپنے لیے ایک خاص خاطر داری نظر آنے لگی تھی۔ شاید وہ خود بھی اس لحاظ سے سوچ رہی تھیں۔ عامر میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ خوش شکل اور پڑھا لکھا تھا۔ ان کا اپنا گھر تھا اور اب تو اس نے بہت اچھا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ کسی بھی لڑکی کی ماں کے لیے وہ ایک آئیڈیل داماد ہو سکتا ہے۔ عامر سوچ رہا تھا کہ اب وہ رومانہ کے لیے امی سے بات کر لے۔ اسے

یقین تھا کہ امی اس کی بات کو رد نہیں کریں گی۔ وہ خود بھی رومانہ کو پسند کرتی تھیں۔

وہ اسٹیٹ ایجنسی میں داخل ہوا تو محسن اور فرید کے چہروں سے پتا لگ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس وقت دو افراد وہاں بیٹھے تھے اس لیے اس نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے جاتے ہی محسن نے جلدی سے اندر سے شیشے کے دروازے پر کلوزڈ کی تختی لگا دی اور سامنے پردہ کھینچ دیا۔

"کیا بات ہے، تم لوگ سنجیدہ لگ رہے ہو؟" اس نے فرید اور محسن کی طرف دیکھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے شاکر کا سب سے بڑا اور سب سے حرامزادہ فرزند آیا تھا۔" فرید بولا۔ "ان لوگوں کو پتا چل گیا ہے کہ وہ پلاٹ ہم نے فروخت کرایا ہے۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟" عامر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم جھگڑا نہیں چاہتے تو انہیں پانچ لاکھ دے دیں کیونکہ ان کا اتنا نقصان ہوا ہے۔" محسن نے بتایا۔

"ان کا کہاں سے نقصان ہوا ہے؟" عامر کو غصہ آ گیا۔ "وہ کسی کا پلاٹ دھوکے سے بیچ رہے تھے۔ اور تم نے کہا نہیں کہ ایسا کوئی سودا ہماری ایجنسی کے توسط سے نہیں ہوا ہے۔"

"کہا تھا مگر اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔" فرید بولا۔ "اپنے ساتھ ایک گوریلا لایا تھا جو بار بار کرتے کے نیچے موجود پستول کی نمائش کر رہا تھا۔"

"اب کیا کریں؟" محسن بولا۔ "انہیں پکی اطلاع ملی ہے۔"

"وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" عامر بولا۔ "اول تو ہمارے ریکارڈ میں اس پلاٹ کی فروخت شامل نہیں ہے۔ دوسرے سارا معاملہ خریدار اور بیچنے والے کے درمیان براہِ راست ہوا۔ اس میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔"

"تو کیا شاکر اور اس کی اولاد کو بے وقوف سمجھتا ہے؟" محسن نے خفگی سے کہا۔ "وہ مکمل معلومات لے کر آیا تھا اور بڑی دھمکیاں دے کر گیا ہے۔"

"وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" عامر یقین سے بولا۔

"یار! ہم شریف لوگ ہیں۔" فرید نے اسے یاد دلایا۔ "اگر کسی نے ایک گولی بھی چلا دی تو ہمارے گھر والے ہمیں پھر گھر سے نکلنے نہیں دیں گے۔"

عامر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے دوست ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ یہاں کام کرنے بیٹھے تھے۔ کسی سے جھگڑے کی صورت میں سب سے پہلے ان کے گھر والے ہی انہیں کام سے روک دیتے جبکہ شاکر اینڈ سنز دنگے فساد کے لیے مشہور تھے۔ ان کے بارے میں سنا تھا کہ ہمہ وقت اسلحہ لگا کر گھومتے ہیں۔ عامر نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں جا کر شاکر سے بات کرتا ہوں۔"

"تو کہاں جائے گا؟" فرید پریشان ہو گیا۔

"میں اس کے دفتر جاؤں گا۔"

"نہیں، وہ خطرناک لوگ ہیں۔ تیرے ساتھ کوئی غلط سلوک نہ کریں۔"

"کچھ نہیں ہوتا یار... جب یہ کام کیا ہے تو خطروں کا سامنا تو کرنا پڑے گا۔" عامر کھڑا ہو گیا۔ "ڈرنے سے کام نہیں چلے گا دوست... دنیا میں جینا اتنا آسان نہیں ہے۔"

شاکر کے دفتر کے باہر کھڑے گارڈ نے عامر کو روک لیا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

"شاکر رانا سے۔"

گارڈ نے اندر کہلوایا مگر خاصی دیر گزر گئی کوئی جواب نہیں آیا۔ تنگ آ کر عامر نے کہا۔ "اگر شاکر رانا مصروف ہے یا مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تو میں جا رہا ہوں۔"

جیسے ہی وہ جانے کے لیے مڑا، اندر سے ایک آدمی نکلا۔ اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "اے... کہاں جاتے ہو؟ سیٹھ بلاتا ہے۔"

عامر غصہ ضبط کرتے ہوئے اس کے ساتھ اندر آیا۔ شاکر اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے بنا کسی اخلاق کے رکھائی سے اس سے پوچھا۔ "کیوں آئے ہو؟"

"پانچ لاکھ دینے۔" عامر کے منہ سے نکل گیا۔

شاکر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"تمہارا بیٹا ہماری ایجنسی پر آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔"

"اچھا، وہ معاملہ۔" شاکر مکاری سے بولا۔ "اس نے صحیح تو کہا ہے، ہمارا پانچ لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔"

"اگر آپ کا کسی پلاٹ کے سلسلے میں پانچ لاکھ کا نقصان ہوا ہے تو اس میں ہماری ایجنسی کہاں سے آ گئی؟"

شاکر کا موڈ آف ہو گیا۔ "لڑکے! مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ مجھے سب علم ہے کہ تم نے کیا چکر چلایا ہے۔"

"میں نے کوئی چکر نہیں چلایا۔ ایک آدمی اس پلاٹ کے بارے میں مجھ سے پوچھنے آیا تھا اور میں اتفاق سے اس کے مالک کے بارے میں جانتا تھا اس لیے میں نے بتا دیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ دونوں کے درمیان ہوا اس کا ہماری ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کیوں... ارشد نامی بندے نے تمہیں بتایا نہیں تھا

کہ وہ پلاٹ میں اسے بیچ رہا ہوں؟'' شاکر نے طنز کیا۔

''نہیں، اس نے کسی کا ذکر نہیں کیا تھا۔'' عامر نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

''میں نہیں مان سکتا۔''

''میں تمہیں ماننے کو نہیں کہہ رہا۔ جو کچھ ہوا، وہ بتا رہا ہوں کیونکہ معاملہ میری ایک آنٹی کا تھا اس لیے میں نے خود دخل نہیں دیا کہ وہ سمجھیں کہ میں کمیشن کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔''

شاکر نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ ''یعنی تمہیں پتا نہیں تھا کہ یہ پلاٹ اصل میں میرا ہے۔''

''مجھے صرف یہ پتا ہے کہ وہ پلاٹ میری آنٹی کا تھا اور وہ اسے ارشد کو بیچ چکی ہیں۔ اگر وہ تمہارا تھا تو انہوں نے اسے کیسے بیچ دیا؟ وہ سیدھی سی عورت ہیں، نہ تو دوسروں کی زمین پر قبضہ کر سکتی ہیں اور نہ اس کے جعلی کاغذات بنوا سکتی ہیں۔'' عامر نے سادہ سے لہجے میں اسے بتایا۔

شاکر کا چہرہ بگڑ گیا۔ ''تم کل کے لڑکے میرے منہ لگنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے، تم لوگ بلاوجہ ہمیں تنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اب مجھے کوئی الہام تو نہیں ہوا کہ تم کسی پلاٹ کو اپنا سمجھ رہے ہو اور اسے بیچنا بھی چاہ رہے ہو۔''

''میرا پانچ لاکھ کا نقصان ہوا ہے اور وہ مجھے تم دو گے کیونکہ تمہاری وجہ سے وہ پلاٹ میرے ہاتھ سے نکلا ہے۔''

''میں اپنی پوزیشن واضح کر چکا ہوں۔'' عامر کھڑا ہو گیا۔ ''اگر کوئی بات تمہارے ذہن میں بیٹھ چکی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''مجھے پانچ لاکھ روپے چاہئیں ورنہ تم لوگ یہاں کام نہیں کر سکو گے۔''

''ہم اپنا کام کریں گے۔'' عامر نے نرمی سے کہا۔ ''ہم شریف لوگ ہیں لیکن یہ مت سمجھنا کہ تمہاری طرف سے کوئی زیادتی برداشت کر لیں گے۔ نہ ہم کوئی بیوہ ہیں اور نہ ہی کوئی یتیم!''

عامر یہ کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ شاکر صرف بدمعاشی کر رہا ہے۔ وہ اس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس لیے اس نے بھی اسی کے انداز میں بات کی تھی۔ وہ اسٹیٹ ایجنسی پہنچا تو محسن اور فرید فکرمند بیٹھے تھے۔ اس نے ان کی صورتیں دیکھیں۔ ''کیا پھر کوئی آیا تھا؟''

''نہیں، ہم تیرے لیے فکرمند تھے۔'' فرید ہنستا کر بولا۔ ''شیر کی کچھار سے واپسی بھی ہو گی یا نہیں۔''

''وہ شیر نہیں ہے بلکہ دوسروں کو ڈرا کر کام نکالنے والا ہے۔ اب وہ ہمیں دھمکا کر پانچ لاکھ وصول کرنا چاہتا ہے۔''

''ہم پانچ لاکھ کہاں سے دے سکتے ہیں؟''

''کہیں سے بھی نہیں۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا ہے کہ ہم شریف لوگ ہیں لیکن کوئی ہمیں چھیڑ نہیں سکتا۔''

''مروا دیا۔'' فرید کراہا۔ ''وہ چھیڑتے نہیں ہیں، گولی مار دیتے ہیں۔''

''یار! اسی طرح ڈرتے رہے تو یہ کام بند کرنا ہو گا۔'' عامر بولا۔

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہمیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔'' محسن نے کہا۔ ''ہم نہ پانچ لاکھ دے سکتے ہیں اور نہ کام بند کر سکتے ہیں۔''

''میرے بھائیوں کو پتا چل گیا تو وہ فوراً مجھے گھر بٹھا لیں گے۔'' فرید بولا۔

''یہی کام میری اماں کریں گی۔'' محسن نے کہا۔

عامر نے تائید کی۔ ''اس لیے فی الحال یہ بات گھر تک نہیں جانی چاہیے۔''

☆☆☆

سلطان سخت مشتعل تھا۔ وہ چاروں باپ بیٹے دفتر میں تھے۔ بزنس کی ساری بات وہ دفتر میں ہی کرتے تھے۔ سلطان نے طیش سے کہا۔ ''ان لوگوں کا دماغ درست کرنا ہی پڑے گا۔''

''اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔'' شاکر نے اسے گھورا۔ ''ابھی میں نے اس سے بات کی ہے۔ دو تین دن رک جاؤ۔''

انور نے باپ کی تائید کی۔ ''ابھی ولی رحمان والا معاملہ بھی ہے، ہم کسی اور معاملے میں ٹانگ نہیں اڑا سکتے۔''

''اگر ہم نے انہیں سبق نہیں سکھایا تو آئندہ کبھی اپنے علاقے میں بھی کام نہیں کر سکیں گے۔ باہر تو بھول ہی جائیں۔''

''بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' منور نے بھی سلطان کی تائید کی۔

شاکر اور انور، عامر اور اس کے دوستوں کے خلاف فوری کارروائی کے حق میں نہیں تھے جبکہ منور اور سلطان ان کی گوشمالی چاہتے تھے۔ سلطان نے کہا۔ ''ابا جی! آپ نے ان سے پانچ لاکھ کا کہہ دیا ہے۔ اتنی رقم وہ کسی صورت نہیں دے سکتے اور نہ ہی کام چھوڑ سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں عبرت بنا دیا جائے تاکہ دوسرے ہمارے سامنے آنے کی جرأت نہ کریں۔''

شاکر سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، پر کسی کو جسمانی نقصان نہ ہو۔ ابھی ہم پولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔ بندے کا معاملہ تھانے تک جاتا ہے اور دوسری پارٹی بھی مشتعل ہو جاتی ہے۔''

''کیوں نہ رات میں آگ لگا دیں۔'' منور نے تجویز پیش کی۔ ''ایک منٹ لگے گا۔''

''اس طرف چوکیدار ہوتا ہے۔'' انور بولا۔

''اس کی خیر ہے، اس نے زیادہ چوں چاں کی تو اسے سو دو سو دے دینا۔'' شاکر بولا۔ ''یہ کام جلد از جلد کر دو۔''

''آج رات ہی ہو جائے گا ابا جی۔'' سلطان خوش ہو کر بولا۔

''پر تم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔ منظور کو کہہ دینا۔ وہ ہوشیار آدمی ہے۔ صفائی سے کام کرتا ہے۔''

منظور ایک معمولی درجے کا بدمعاش تھا۔ کبھی کبھی شاکر اس سے کام لیتا تھا۔ سلطان اگرچہ خود کچھ کرنے کے لیے بے تاب تھا مگر باپ نے حکم دیا تو اسے ماننا ہی پڑا۔ طے پایا کہ منظور کے سپرد یہ کام کیا جائے گا۔

☆☆☆

منظور ایک ڈبو کی دکان پر موجود تھا۔ اس کے موبائل کی آواز بلند ہوئی، اس نے موبائل نکال کر دیکھا اور دکان سے باہر آ گیا۔ ذرا دور جا کر اس نے کال ریسیو کی اور مدھم آواز میں بولا۔ ''حکم سرکار! آج بہت دن بعد یاد کیا؟''

''منظور! عوامی ہوٹل کی طرف آ جاؤ۔ میں اپنی گاڑی میں ہوں گا۔ اسے پہچانتے ہو نا؟''

''لو جی! آپ کی گڈی کو کیوں نہیں پہچانوں گا؟''

''بس آ جاؤ ایک کام ہے۔''

کام کا سن کر منظور سب بھول گیا۔ ان دنوں اسے رقم کی اشد ضرورت تھی اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر عوامی ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلطان کی کار اسے دور سے نظر آ گئی۔ وہ کار کے پاس پہنچا تو سلطان نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور اس کے بیٹھتے ہی کار آگے بڑھا دی۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ منظور نے کہا۔ ''خیریت سرکار! آج بڑے پُراسرار لگ رہے ہو۔ کام کیا ہے؟''

''اوئے! تجھ سے ہم نے کوئی مزدوری تو نہیں کرانی ہے۔'' سلطان اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''ایک بندہ کچھ اکڑ رہا ہے، اس کی اکڑ نکالنی ہے۔''

منظور نے انگلیاں چٹخائیں۔ ''حکم سرکار... بندے کو بھی بہت دن ہو گئے ہیں ہاتھ پاؤں کھولے۔''

''ابھی ہاتھ پاؤں کا کام نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ بعد میں ہو۔''

''اچھا۔'' منظور کسی قدر مایوسی سے بولا۔ ''پھر کیا کرنا ہے سرکار؟''

''ایک دکان میں آگ لگانی ہے۔''

منظور گویا مزید مایوس ہو گیا۔ ''یہ تو کوئی کام ہی نہیں سرکار... یہ کام تو گلی کے بچے بھی کرتے ہیں۔''

''پر یہ کام بہت صفائی سے کرنا ہے اور گلی کے بچے صفائی سے کام نہیں کر سکتے۔ پھر سب سے اہم بات زبان بندی ہے۔ کوئی دوسرا کام کر کے کہیں بھی بک سکتا ہے۔ تو ایسا بندہ ہے جو راز رکھنا جانتا ہے۔''

''ہو جائے گا سرکار... ایک کاغذ پر دکان کا نمبر لکھ دو۔ ساتھ ہی کچھ کاغذ اور لگا نا۔''

''نمبر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، زبانی یاد کر لو۔ عام اسٹیٹ ایجنسی دیکھی ہے؟''

''عام... نہیں سرکار۔''

''اے اے ایم اسٹیٹ۔'' سلطان بولا تو منظور کی سمجھ میں آ گیا۔

''وہی جو گلزار اسٹیشنری والے کے ساتھ ہے؟''

''وہی... صبح تک اس کے اندر راکھ ہونی چاہیے۔'' سلطان نے کہا اور جیب سے ایک لفافہ نکال کر منظور کی گود میں ڈال دیا۔ اس نے اٹھا کر اندر جھانکا۔

''سرکار! کچھ کم لگ رہے ہیں۔ آج کل پٹرول بہت مہنگا ہو گیا ہے۔''

''یہ آدھا ہے، جب کام ہو جائے گا تو اتنے ہی اور مل جائیں گے۔''

منظور نے سر ہلا کر لفافہ رکھ لیا۔ سلطان نے اسے لے کر ملیر کینٹ روڈ کا ایک چکر لگایا اور واپس عوامی ہوٹل کے پاس اتار دیا۔ منظور نے ڈبو کے بجائے اے اے ایم اسٹیٹ کا رخ کیا۔ اس نے دکان کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ علاقے کے چوکیدار سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اگر وہ مداخلت کرتا تو منظور اسے آسانی سے چپ کرا سکتا تھا۔ وہ رات دو بجے پھر دکان کے پاس تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی بیٹری سے چلنے والی اسپرے مشین تھی۔ اس میں اس نے پٹرول بھر رکھا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر اس کی پلاسٹک کی نوزل دکان کے نیچے موجود رخنے سے اندر ڈالی۔ شیشے کی دیوار میں موجود وہ یہ رخنہ پہلے ہی تاڑ چکا تھا اور اب اس کی مدد سے پٹرول اندر اسپرے کرنے جا رہا تھا۔

اسپرے مشین چلاتے ہی پیٹرول نوزل سے نکل کر اندر جانے لگا۔ کچھ وہیں گر رہا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی بلکہ وہ جان بوجھ کر زیادہ پیٹرول گرا رہا تھا۔ اسپرے مشین میں ایک لیٹر سے زیادہ پیٹرول تھا۔ جب مشین خالی ہو گئی تو اس نے نوزل نکالی اور مشین بند کر کے پیچھے ہٹا۔ اس نے اپنی جیب سے ماچس نکالی اور ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں سے لگالی۔

''اوئے! کون ہو تم... کیا کر رہے ہو؟'' اچانک ہی عقب سے آواز آئی۔ منظور نے مڑ کر دیکھا۔ وہ علاقے کا چوکیدار تھا۔

''جا کر اپنا کام کر۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

چوکیدار نے اس پر ٹارچ سے روشنی ڈالی اور حیرت سے بولا۔ ''منظور بھائی! تم ہو... یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''جو کر رہا ہوں اس سے تیرا تعلق نہیں ہے اس لیے یہاں سے چلا جا اور بھول جا کہ تو نے مجھے یہاں دیکھا تھا۔'' اس نے تیلی جلائی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ چوکیدار وہاں سے جانے کے بجائے وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس نے ناک سکیڑی۔

''یہ پیٹرول کی بُو کہاں سے آ رہی ہے؟''

''یہاں سے۔'' منظور نے کہا اور جلتی تیلی دکان کی طرف پھینک دی۔ تیلی گرتے ہی اچانک آگ بھڑک اٹھی۔

''یہ... یہ کیا کیا تم نے...؟'' چوکیدار بدحواسی میں بولا۔

منظور نے اچانک اسے کھینچ کر دیوار پر دے مارا اور غرا کر بولا۔ ''کتے کے بچے! سمجھ میں بات نہیں آتی ہے... جاتا ہے یہاں سے یا تیرا سر کھول دوں۔'' اس نے پستول نکال لیا۔

''م... مجھے معاف... کر دو۔'' چوکیدار گھگیا کر بولا۔

''اگر کسی کو بتایا کہ آگ کس نے لگائی ہے تو اگلی بار تجھ پر پیٹرول ڈال کر آگ لگا دوں گا۔'' منظور نے کہا اور اسے دھکا دیا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس کے جانے کے بعد منظور بھی مزے سے سگریٹ پیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ عقب میں دکان کے اندر آگ اب پوری طرح بھڑک اٹھی تھی۔

☆☆☆

عامر سو رہا تھا اور رومانہ کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی ان کے گھر کا دروازہ کسی نے پیٹا۔ شکیلہ پریشان ہو کر اٹھ گئیں اور انہوں نے عامر کو اٹھایا۔ ''نیچے دیکھ کون ہے؟''

عامر نے اوپر سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

صبح ہو چکی تھی۔ فرید کی آواز آئی۔ ''عامر، نیچے آ...''

فرید کی آواز بتا رہی تھی کہ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ عامر چپل پہنتا ہوا...... نیچے بھاگا۔ فرید اور محسن دونوں موجود تھے۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''کسی نے دکان کو آگ لگا دی ہے۔'' محسن بولا۔

''میرے خدا۔'' عامر کراہا اور پھر غضب ناک ہو کر بولا۔ ''یہ انہی حرامزادوں کی حرکت ہے۔''

''چل کر دیکھتے ہیں۔''

چوکیدار نے رات کو فرید کو بتایا تھا۔ اس وقت تک دکان کی آگ از خود بجھ چکی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ آگ دوسری دکانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ چوکیدار نے بتایا کہ اسے نہیں معلوم کہ آگ کس طرح لگی۔ اسے بڑی مشکل سے فرید کا گھر ملا تھا کیونکہ وہ باقیوں کے گھر جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ دکان کے سامنے پہنچے تو وہاں جلا ہوا شٹر بتا رہا تھا کہ اندر کیا حالت ہو گی۔ ان تینوں کے چہرے اتر گئے۔ تالا آگ لگنے سے ناکارہ ہو گیا تھا، اسے توڑ کر دکان کھولنا پڑی تھی۔ جب شٹر ہٹا تو اندر کا منظر توقع سے زیادہ خوفناک نظر آیا۔ ہر شے جل چکی تھی۔۔۔ حتیٰ کہ دکان کی وائرنگ اور سوئچ بورڈ بھی جل چکے تھے۔ ان تینوں کا غم و غصے سے برا حال ہو گیا۔ فرید نے کہا۔ ''ہم پولیس میں رپورٹ درج کرائیں گے۔''

''فائدہ؟'' محسن تلخی سے بولا۔

''نہیں، رپورٹ کرانا ضروری ہے۔'' عامر نے کہا۔ ''لیکن نامعلوم افراد کے خلاف... اور اس چوکیدار کو بھی پکڑنا ہو گا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اسے نہ معلوم ہو۔''

انہوں نے دن نکلتے ہی تھانے جا کر رپورٹ درج کرائی۔ محسن کا ایک ماموں ایف آئی اے میں تھا۔ محسن نے اس کا دباؤ استعمال کیا تو پولیس نے شرافت سے ایف آئی آر درج کر لی۔ رپورٹ لکھنے والے ایس آئی نے بڑی کوشش کی کہ وہ کسی کا نام لیں لیکن انہوں نے کسی کا نام لینے سے گریز کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا البتہ بات بڑھے گی۔ انہیں یہ نقصان خاموشی سے برداشت کرنا تھا۔ اسٹیٹ ایجنسی جلنے سے ان کا سارا ریکارڈ بھی جل گیا تھا۔ اب انہیں پھر سے سب کرنا تھا۔

وہ دکان میں لگے تھے کہ مکرم صاحب آ گئے...... وہ دکان دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ''ارے میاں... یہ کیا ہوا؟''

''بس کل رات کوئی شرپسند اپنا کام دکھا گیا۔'' عامر نے کہا۔

''ہم ادھر سے گزر رہے تھے تو سوچا تم سے بھی سلام دعا کرتے چلیں... لیکن یہاں تو دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے۔''

''بس جناب! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''آج مجھے ایک کسٹمر کو لے کر آپ کے پاس آنا تھا لیکن آپ دیکھ رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں میاں... آج تو ہم خود کہیں جا رہے ہیں۔ تم ہو سکے تو کل آ جانا۔''

''ایک بات اور ہے کہ یہ کسٹمر پورا مکان لینے میں دلچسپی لے رہا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولے۔ ''ہمارے بیٹوں کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے کہ مکان کے حصے کر کے بیچے جائیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم گھڑی کی چوتھائی میں مکان بیچ کر رقم ان کے حوالے کر دیں۔'' مکرم صاحب افسردہ ہو گئے۔ ''خیر، ویسے بھی سب ان کا ہی ہے تو ان کی خواہش کیوں نہ پوری کی جائے۔''

ابھی تو دکان میں کام ممکن نہیں تھا اس لیے وہ پرانے گاہکوں کو نمٹانے لگے۔ اگلے دن عامر شام کے وقت زبیدہ آنٹی کے گھر پہنچا۔ رومانہ نے دروازہ کھولا تو عامر نے پُرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ شرما گئی۔

''آپ اندر نہیں آئیں گے؟''

''نہیں۔ آنٹی کو کہو تیار ہو کر آ جائیں۔''

''مجھے آپ کی ایجنسی کے جلنے کا پتا چلا تھا، بہت افسوس ہوا۔''

''بس کاروبار میں نقصان تو ہوتا ہی ہے۔'' عامر نے کہا۔ کچھ دیر بعد زبیدہ آنٹی اندر سے نکل آئیں اور وہ انہیں لے کر مکرم صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب انہوں نے باہر سے مکان دیکھا تو حیران ہو گئیں۔

''یہ تو بہت بڑا ہے۔''

''اسی وجہ سے بک نہیں رہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خریدنے والا دیکھتا ہے کہ اسے ٹھیک کرانے پر اسے خریدنے سے زیادہ خرچہ آئے گا تو وہ ارادہ بدل لیتا ہے۔ کوئی نصف درجن لوگ اسے دیکھ کر جا چکے ہیں۔''

''تب میں اسے کس طرح فروخت کروں گی؟'' وہ فکر مند ہو گئیں۔

''آپ کیوں فکر کرتی ہیں، میں ہوں نا، اس کام کے لیے۔'' عامر نے انہیں تسلی دی۔ ''انشاء اللہ آپ کا نقصان نہیں ہو گا۔''

مکرم صاحب نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ان کی بیگم بھی باہر آئیں اور زبیدہ کو اندر لے گئیں۔ کچھ خاطر تواضع کے بعد زبیدہ نے مکان دیکھا اور اسے پسند کر لیا۔ انہیں ان چیزوں کی اتنی سمجھ نہیں تھی۔ وہ تو عامر پر بھروسا کر رہی تھیں۔ انہوں نے ہامی بھر لی۔ مکرم صاحب نے عامر سے کہا۔

''میاں... تم بس کل ہی کاغذات بنوا لو، اب ہمیں جلدی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں... یہ میرا کام ہے۔ اگرچہ دکان تو جل گئی ہے لیکن میں کام کروا لوں گا۔'' عامر بولا۔ ''آپ کو انشاء اللہ کل ہی بیعانہ مل جائے گا۔''

وہ باہر آئے تو زبیدہ آنٹی مطمئن تھیں لیکن انہیں فوراً ہی ایک اور فکر نے گھیر لیا۔ ''آٹھ لاکھ انہیں دے دوں گی تو میرے پاس بس ایک لاکھ ہی بچیں گے جبکہ اس گھر کو ٹھیک بھی کروانا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں... جب میں آپ کو یہ جگہ دلوا رہا ہوں تو باقی کام بھی میرے ذمے ہی ہیں۔ آپ اگلے دو مہینے میں اپنے گھر میں ہوں گی۔''

زبیدہ خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگیں۔ ''خدا تمہیں خوش رکھے اور تم سے تمہاری ماں کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔''

وہ انہیں چھوڑنے گیا تو انہوں نے اسے زور دے کر کھانے پر روک لیا۔ وہ اندر آیا تو میمونہ خوش ہو گئی۔ ''شکر ہے آپ نے اندر آ کر شکل دکھائی ورنہ باہر سے ہی چلے جاتے تھے۔''

''مصروفیات ایسی ہو گئی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''مبارک ہو، آنٹی نے مکان پسند کر لیا ہے۔ انشاء اللہ کچھ عرصے میں تم لوگ اپنے گھر میں ہو گے۔''

''سچ!'' میمونہ خوش ہو گئی تھی۔ ''مجھے بہت شوق ہے اپنے گھر کا اور خوب بڑا سا ہو۔''

''خوب سے بھی بڑا ہے۔'' زبیدہ آنٹی نے اسے ڈانٹا۔ ''چل کر روٹی ڈال، آج عامر کھانا یہیں کھا کر جائے گا۔''

میمونہ کے جانے کے بعد زبیدہ آنٹی اس سے طے کرنے لگیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ عامر نے ان سے بیعانے کا پوچھا تو انہوں نے ایک لاکھ کہہ دیا۔

''میں کل کاغذ تیار کروا لوں گا۔'' عامر نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ اسے ابھی تک رومانہ نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس کی آواز آئی تھی۔ کچھ دیر بعد زبیدہ آنٹی ہانڈی دیکھنے چلی گئیں اور میمونہ آئی تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''رومانہ کہاں ہے؟''

''آپ ان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' اس نے شوخی سے کہا۔

''بتانی ہو یا...'' عامر نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''یا میں جاؤں۔''

''اچھا سر بتاتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''موصوفہ محلے میں ایک محفل میں گئی ہیں، درس ہے۔ آج کل روحانیت کی طرف مائل ہیں۔''

''واپسی کب تک ہو گی؟''

''جلد ہو گی، کھانے سے پہلے آجائیں گی۔''

یہ سن کر عامر نے سکون کا سانس لیا۔ رومانہ ان چند ملاقاتوں میں اس کے لیے اتنی ناگزیر ہو جائے گی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ اسے صرف پسند کرتا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ امی سے اس کے بارے میں کیسے بات کرے؟ مگر بات تو کرنا تھی۔ اچانک پردہ ہٹا اور رومانہ اندر آئی۔ وہ نہ جانے کس وقت آئی تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیسی ہو تم؟'' عامر نے جواب دے کر پوچھا۔ اس کی نگاہوں کو محسوس کر کے رومانہ کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

''آپ کب آئے؟''

''بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''میں محلے میں گئی تھی۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

''ہاں، میمونہ نے بتا دیا تھا۔''

اسی لمحے اندر سے زبیدہ آنٹی نے پکارا تو وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔ عامر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

لالہ کے دوست نے اپنی دکان مزید کرائے پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا جو نقصان ہوا تھا، وہ اس نے ان کے ایڈوانس سے کاٹ لیا تھا۔ وہ پریشان تھے کہ اب کہاں دکان حاصل کریں۔ مین روڈ پر دکان حاصل کرنا آسان نہیں تھا اور پھر کرائے بہت زیادہ تھے۔ ان کا کام تو چل رہا تھا۔ لوگ فون پر رابطہ کر لیتے تھے۔ جس کا سودا اچھی طرح کراتے تھے، وہ دوسرے کو بتاتا تھا۔ اس طرح کام تو تھا، وہ فارغ نہیں تھے۔ پھر بھی ایک باقاعدہ دفتر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

ان دنوں عامر کو ماڈل موڑ کے پاس ایک جگہ کا پتا چلا۔ یہ ایک بڑا بنگلا تھا۔ سڑک کے ساتھ ہونے کی وجہ سے مالک اس میں دکانیں بنا کر کرائے پر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ انہوں نے پہلے ہی بات کر لی اس لیے انہیں اتنے ہی کرائے پر دکان مل گئی جتنا وہ پہلی دکان کا دے رہے تھے۔ مالک نے تیزی سے کام کرایا اور ایک مہینے میں دکانیں تیار ہو گئیں۔ انہوں نے دکان ملتے ہی اسے ڈیکوریٹ کرا لیا۔ ان کا کام تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

''شاکر بھائی۔'' فون پر دوسری طرف سے کریم بھائی نے کہا۔

''حکم کریم بھائی۔'' شاکر نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''شاکر بھائی! پچھلے چھ مہینے میں مارکیٹ اتنا اوپر جا رہا ہے اور تم نے کچھ نہیں کیا۔'' کریم بھائی کا لہجہ سرد تھا۔ کریم بھائی کا شمار شہر کے چند سرکردہ پراپرٹی انویسٹرز میں ہوتا تھا۔ شہر کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں اس کے نمائندے اس کی طرف سے پراپرٹی میں سرمایہ کاری نہ کر رہے ہوں۔ اس علاقے کے لیے اس نے شاکر کو مقرر کر رکھا تھا۔ یہ نمائندے اس کی طرف سے کوئی بھی سودا کرنے کے مجاز تھے مگر اس کی طرف سے آخر میں رائے لینا ضروری تھی۔ شاکر نے واقعی کچھ نہیں کیا تھا کیونکہ اس نے کریم بھائی کی رقم سپر ہائی وے والی زمین میں لگا دی تھی۔ اس لیے وہ اس کی طرف سے کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

''کریم بھائی... یہ پرانا علاقہ ہے اور یہاں اتنا بزنس نہیں آتا۔''

''اچھا۔'' کریم بھائی نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تب تم نے یہ بزنس کیوں کر رکھا ہے؟ اور ابھی چھ مہینے پہلے تک تو بزنس ہو رہا تھا اور جب مارکیٹ چڑھی ہے تو تم کہہ رہے ہو کہ بزنس نہیں ہے۔''

شاکر کے حلق میں آواز پھنسنے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں کریم بھائی کو چند غلیظ گالیاں دیں اور بولا۔ ''وہ بات یہ ہے کریم بھائی کہ میں ذرا مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ آج کل میرا ہاتھ تنگ ہے...''

''شاکر بھائی! میری رقم کہاں ہے؟'' کریم بھائی کا لہجہ پھر سرد ہو گیا۔

''کریم بھائی! آپ کی رقم محفوظ ہے لیکن مجھے کچھ مہلت چاہیے۔''

''تیرے پاس تین دن کی مہلت ہے، میری رقم واپس کر دے۔ دیر ہوئی تو شکایت مت کرنا۔'' کریم بھائی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ شاکر کا پریشانی سے بُرا حال ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کریم بھائی جتنا اچھا تھا، وقت پڑنے پر اتنا ہی

خطرناک ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی پچاس برس سے پراپرٹی کے کام میں نہیں ٹکا ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو جائداد اور اسٹاک مارکیٹ کو اٹھاتے اور گراتے تھے۔ شاکر اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا آدمی تھا۔ وہ ولی رحمان جیسے لوگوں کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا۔ کریم بھائی کے سامنے کھڑے ہونے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جب اس نے کریم بھائی کی رقم سپر ہائی وے والی زمین میں لگائی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مارکیٹ اتنی تیزی سے بڑھ جائے گی۔ دوسری طرف گوٹھ کے کرتا دھرتا بھی لالچ میں آگئے اور اس سے مزید رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دوسری صورت میں وہ اسے زمین کی کٹنگ کرنے نہیں دیں گے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ کسی کو ایک گز زمین بھی نہیں بیچ سکے گا اور اس کی ساری رقم پھنس جائے گی۔ اسے ولی رحمان کی اتنی فکر نہیں تھی لیکن کریم بھائی کی کال نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس نے فوری طور پر اپنے بیٹوں کو کال کی۔

''جلدی آؤ، مسئلہ ہو گیا ہے... نہیں، ولی رحمان نہیں... کریم بھائی کا فون آیا تھا۔''

اس کے تینوں بیٹے کچھ دیر میں اس کے سامنے تھے۔ وہ پریشان اور کسی قدر غصے میں تھے۔ منور نے آتے ہی کہا۔

''ابا جی! کیا کریم بھائی نے رقم مانگی ہے؟''

''ہاں... اسے پتا چل گیا ہے کہ ہم نے رقم کہیں اور انویسٹ کر دی ہے۔'' شاکر مردہ لہجے میں بولا۔

''میں نے اس وقت بھی مخالفت کی تھی کہ کریم بھائی کی رقم مت لگائیں۔ اب اسے کیا جواب دیں گے؟''

''معاملہ ختم ہو گیا۔'' شاکر نے سرد آہ بھری۔ ''اس نے تین دن کی مہلت دی ہے۔''

''ہم اتنی جلدی رقم نہیں دے سکتے۔'' سلطان بے پروائی سے بولا۔ ''آپ اس سے صاف بات کر لیں۔''

''یہ ولی رحمان نہیں ہے۔'' منور نے طنز کیا۔

''ابا جی! ہمیں بہرصورت کریم بھائی کو منانا ہو گا۔ ورنہ ہم کام نہیں کر سکتے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شاکر نے سوچ کر کہا۔ ''مجھے خود اس کے پاس جانا ہو گا۔''

اگلے روز شاکر کریم بھائی کے دفتر گیا۔ یہ دفتر تو کریم بھائی کی میرین لائن کا تھا لیکن وہ یہاں سے دوسرے کاموں کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا لیکن جب شاکر نے اس کے پی اے کی خوشامد درآمد کی تو اس نے بادل ناخواستہ پھر بات کی اور شاکر کو اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ اندر جاتے ہی عملاً کریم بھائی کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ اس نے اتنی التجائیں کیں کہ کریم بھائی جیسے آدمی کا دل بھی پسیج گیا.... اس نے تین دن کی مہلت بڑھا کر تین مہینے کر دی تھی۔

''شاکر بھائی! اگر تم نے ان تین مہینوں میں رقم واپس نہ کی تو میں سمجھ جاؤں گا کہ تیری نیت ہی نہیں ہے۔ آج کل دھندا زوروں پر ہے اور کمانے والے چاروں ہاتھ پیروں سے کما رہے ہیں۔''

شاکر نے کریم بھائی کو یقین دلایا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

☆☆☆

عامر، محسن اور فرید بہت خوش تھے۔ ان دنوں چاروں طرف سے اتنا کام آ رہا تھا کہ ان کے لیے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر روز وہ ایک دو سودے کرا رہے تھے اور اب بڑی مالیت کے سودے آنے شروع ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حد رکھ دی تھی۔ وہ دس لاکھ سے کم مالیت کا سودا ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ اس طرح ان کی آمدنی کا تناسب خود بہ خود بڑھ گیا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت وہ اضافی آمدنی انویسٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے مختصر عرصے میں کئی پلاٹ اور مکانات خرید لیے تھے یا ان کا سودا کر لیا تھا اور رقم مستقبل میں ادا کرنا تھی۔

اب انہوں نے دو مستقل ملازم رکھ لیے تھے۔ ایک ڈاکومینٹیشن کا کام کرتا تھا اور دوسرا آنے والے کسٹمرز کی خاطر تواضع کرتا تھا۔ اس روز عامر ایک خاتون سے بات کر رہا تھا جو اپنا معمولی سا مکان بہت اچھی قیمت پر بکوانا چاہتی تھی اور کسی صورت اس سے نیچے آنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ عامر بے زار ہو گیا مگر اخلاقاً اسے برداشت کر رہا تھا۔ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ نمبر اجنبی تھا۔ اس نے خاتون سے معذرت کر کے کال ریسیو کی۔

''عامر بولتا ہے؟'' دوسری طرف سے کسی نے کہا۔

''جی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں سیٹھ کریم بھائی بات کرتا ہوں۔''

اتنے عرصے اس فیلڈ میں کام کرنے کے بعد عامر کے لیے یہ نام اجنبی نہیں رہا تھا۔ پھر بھی اس نے تصدیق کی۔

''کریم بھائی بلڈر اینڈ ڈیولپر والے؟''

''ہاں وہی کریم بھائی۔''

''فرمائیے کریم بھائی... کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس نے اپنا جوش دباتے ہوئے کہا۔ اس جیسے معمولی

اسٹیٹ ایجنسی والے کے پاس کریم بھائی کا فون آنا معمولی بات نہیں تھی۔

"تیرے سے ملاقات کرنے کو ہے۔ میرے دفتر آسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں کریم بھائی آپ حکم کروگے تو کیوں نہیں آؤں گا۔"

"بس تو کل صبح دس بجے آجانا۔"

اس نے بہ مشکل خاتون سے جان چھڑائی... اس وعدے پر کہ وہ اس کے مکان کے لیے گاہک ضرور تلاش کرے گا۔ اس نے فوری طور پر محسن اور فرید کو یہ بات بتائی۔ فرید خوش ہوگیا۔ "مجھے اس سے چانس کی بُو آرہی ہے۔"

"معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔" محسن نے خبردار کیا۔ "کہیں اسے ہمارے کیے گئے کسی سودے پر اعتراض نہ ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔" عامر بولا۔ "مجھے فرید کی بات درست لگ رہی ہے۔"

"تو اکیلا ہی جا۔" محسن نے کہا۔ "اس نے صرف تجھے بلایا ہے۔"

عامر اکیلا ہی گیا۔ کریم بھائی اپنے دفتر میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے سلام دعا کے بعد مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے اس علاقے کے لیے اپنا ایجنٹ بنانا چاہتا ہوں۔ تو میری طرف سے وہاں پراپرٹی میں انویسٹ کرے گا اور میں تجھے ہر سودے کا دوفی صد کمیشن دوں گا۔"

"یہ تو میری خوش نصیبی ہے جناب!" عامر خوش ہوگیا۔ "لیکن میں اکیلا نہیں ہوں، میرے دو ساتھی اور ہیں اور ہم مل کر کام کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے تم لوگوں کے بارے میں مکمل پتا کرایا ہے۔ میں ایسے ہی کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔"

"ہم آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے۔"

"بس تو تو کل آجا... میں کاغذات بنوالوں گا۔ چاہے تو اپنا وکیل بھی لے آنا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے کریم بھائی۔" عامر نے اعتماد سے کہا۔ "ہم کسی سے دھوکا نہیں کرتے لیکن کسی سے دھوکا بھی نہیں کھاتے۔"

"آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔" کریم بھائی نے سر ہلایا۔ "تیرے کو میری طرف سے پچاس لاکھ تک کی انویسٹ منٹ کا اختیار ہوگا۔"

یہ ان کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ دو دن بعد کریم بھائی اور ان کے درمیان معاہدہ ہوگیا۔ اس معاہدے کی وجہ سے انہیں بڑی خریداری کا موقع بھی ملتا اور کریم بھائی کمیشن بھی زیادہ دے رہا تھا۔ اگرچہ اس کام میں محنت زیادہ تھی کیونکہ پھر انہیں سیل بھی بڑھانی تھی تاکہ نفع ملتا رہے۔ آنے والے دو ہفتوں میں انہوں نے کریم بھائی کی رقم سے دو بڑے سودے کیے۔ انہیں صرف کمیشن کی مد میں چار لاکھ روپے ملے تھے۔ جس وقت رقم ان کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے اس کا جشن منانے کے لیے ائرپورٹ کے میکڈونلڈ کا رخ کیا۔ فرید نے برگر کھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ لوگ اتنا بڑا برگر بناتے کیوں ہیں جو انسان کے منہ میں کسی طرح نہیں آسکتا؟"

"بیٹے! اسے کھانے کا طریقہ ہوتا ہے۔ امریکیوں کو نہیں دیکھا فلموں میں کیسے کھاتے ہیں؟" عامر بولا۔

محسن نے کوک کا گھونٹ لیا۔ "آج سے چھ مہینے پہلے ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آج اس مقام پر ہوں گے۔"

"اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ ہم نے کام پورے خلوص سے کیا ہے۔ ایک دوسرے کو تو کیا، ہم نے اپنے کسی کسٹمر کو بھی دھوکا نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاروبار میں برکت ہے۔"

"اگر ایک دو سال ایسے گزر گئے تو ہم کوٹھیاں کھڑی کر سکتے ہیں۔" فرید بولا۔

"تیرے منہ میں گھی شکر۔" عامر بولا۔ "میں تو امی سے بات کرنے کا سوچ رہا ہوں۔"

"رومانہ کے بارے میں؟" محسن نے پوچھا۔

"ہاں کیونکہ میں اب اس معاملہ میں دیر نہیں کرنا چاہتا۔" عامر سنجیدگی سے بولا۔ "بے شک امی شادی بعد میں کر دیں لیکن رشتہ ابھی ڈال دیں۔ آنٹی بھی مطمئن ہوجائیں گی۔"

"ان کے پلاٹ کا کام کردیا تو نے؟"

عامر نے پلاٹ زبیدہ آنٹی کے نام ہونے کے بعد اس کے دائیں طرف والے ایک حصے کو دیوار اٹھا کر الگ پلاٹ کی صورت دے دی تھی۔ اس طرف کا پورشن ایسا تھا کہ اس میں کم خرچ سے بہت اچھا کام ہوسکتا تھا۔ اس نے ایک واقف کار ٹھیکے دار سے کام کرایا تھا۔ اس نے اچھا کام کیا تھا۔ ایک کمرے اور ایک واش روم کا اضافہ کیا تھا۔ ایک اٹیچڈ باتھ ... بنادیا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ کچن کو اوپن کرکے اس میں کیبنٹ لگوادیا تھا اور پورے گھر میں ماربل لگادیا تھا۔ آگے پیچھے دونوں طرف کشادہ صحن تھا۔ مکان کے دونوں طرف دیوار اٹھانے سے ایک طرف دوسو بیس گز کا پلاٹ بچا

تھا اور دوسری طرف تقریباً ساڑھے چھ سو گز کا پلاٹ بچا تھا۔ اس میں مزید تین پلاٹ نکالے جاسکتے تھے۔ عامر نے زبیدہ آنٹی سے کہا۔

''آنٹی! آپ کچھ مہینے رک جائیں، مارکیٹ بہت چڑھنے والی ہے۔ اس وقت آپ ایک پلاٹ اتنے کا بیچ سکتی ہیں جتنے کا آپ نے یہ پورا پلاٹ لیا ہے۔''

زبیدہ آنٹی حیران رہ گئیں۔ ''اتنی قیمت...؟''

''جی آنٹی! اس وقت بھی ایک پلاٹ کے آپ کو آرام سے چھ سات لاکھ مل سکتے ہیں۔ مکرم صاحب اور ان کے بیٹے جلد باز ثابت ہوئے ورنہ انہیں اس جگہ کی بہت اچھی قیمت مل سکتی تھی۔''

عامر یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ رہا تھا۔ انہوں نے چند دن پہلے ہی اس گلی سے آگے ایک سو ستر گز کا پلاٹ ساڑھے سات لاکھ کا بیچا تھا۔ ابھی قیمتیں مزید بڑھ رہی تھیں اس لیے عامر زبیدہ کو منع کر رہا تھا اور وہ مکمل طور پر اس کے کہنے میں تھیں۔ وہ عامر کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

''بیٹا! تم میرے اور میری بیٹیوں کے لیے رحمت کے فرشتے بن کر آئے ہو۔ ورنہ ہمارا پلاٹ ہماری بے خبری میں بک چکا ہوتا اور ہم اب تک اس کرائے کی کھولی میں پڑے ہوتے۔''

''آنٹی! شرمندہ مت کریں۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ وہ جس سے جیسا چاہے کام لے لیتا ہے۔'' عامر نے کہا۔

فرید اور محسن نے اس کے ان کاموں پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ اس نے زبیدہ آنٹی سے کوئی کمیشن نہیں لیا تھا اور اپنا وقت دے کر ان کا مکان مکمل کراتا رہا تھا۔ وہ سچ مچ اس کے پُرخلوص دوست تھے۔ اس کا اندازہ اسے کاروبار کے دوران بہ خوبی ہو گیا تھا۔ وہ خدا کا شکر گزار تھا جس نے اسے اتنے اچھے دوست دیے تھے۔ شاکر رانا والا معاملہ بھی بہ ظاہر ختم ہو گیا تھا۔ دکان جلانے کے بعد ان کی طرف سے مزید کوئی کارروائی یا دھمکی نہیں ملی۔ ایسا لگ رہا تھا... انہوں نے اپنا نقصان فراموش کر دیا ہے حالانکہ عامر کا خیال تھا کہ شاکر اور اس کے بیٹوں جیسے کینہ پرور لوگ اپنا نقصان اتنی آسانی سے فراموش نہیں کرتے بلکہ جب تک ان کی کوئی مجبوری نہ ہو وہ کسی کو معاف نہیں کرتے۔

''اب موقع ہے، تو آنٹی سے بات کر لے۔'' فرید نے کہا۔ ''ایسا نہ ہو زبیدہ آنٹی کسی اور رشتے پر ہاں کر دیں۔''

''خدا نہ کرے۔'' عامر کے منہ سے نکلا۔ اس نے خفگی سے فرید کی طرف دیکھا۔ ''تیرے منہ سے کوئی اچھی بات نہیں نکل سکتی۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' محسن نے فرید کی تائید کی۔ ''رومانہ لاکھوں میں ایک ہے اور اس کے یقیناً اور بھی رشتے ہوں گے۔ اس سے پہلے کوئی مسئلہ ہو تو آنٹی سے بات کر لے۔''

''میں آج ہی امی سے بات کرتا ہوں۔'' عامر نے کہا۔

لیکن جب وہ گھر آیا تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں سے یہ بات کس طرح کرے؟ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اور جھجک بھی آڑے آ رہی تھی۔ اس نے دو تین بار شکیلہ کے کمرے میں جا کر ان سے بات کرنا چاہی مگر پھر ہمت نہ ہوئی تو وہ واپس آ گیا۔ شکیلہ خود سمجھ گئیں۔ اس لیے کچھ دیر بعد وہ اس کے کمرے میں آئیں۔

''بیٹا! کیا بات ہے، تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی امی... جی نہیں امی۔'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''کوئی بات ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ''کیا رقم کی ضرورت ہے؟''

''نہیں امی! وہ تو میرے پاس بھی بہت ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟ میں تمہاری ماں ہوں، تم مجھ سے ہر بات کر سکتے ہو۔'' شکیلہ نے نرمی سے کہا تو اسے حوصلہ ہوا۔

''امی! وہ زبیدہ آنٹی ہیں نا۔''

''ہاں ہے تو پھر...؟''

''امی! میں رومانہ کو پسند کرتا ہوں۔'' اس نے بالآخر کہہ دیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے اپنی... بہو بنا لیں۔''

شکیلہ یک دم ہی چپ ہو گئیں۔ عامر امید بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس کا دل بھی ڈوب رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ امی کے منہ سے انکار نکلے گا۔ وہ بہت دیر بعد بولیں۔

''میرے بچے... رومانہ بہت پیاری اور اچھی لڑکی ہے۔ مجھے اسے بہو بنا کر بہت خوشی ہوتی لیکن...''

''لیکن کیا امی؟'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''کچھ عرصے پہلے تمہارے ماموں نے مجھ سے بات کی تھی۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ان کی سارا کو لے لوں اور وہ حنا کو اسد کے لیے لے لیں۔''

عامر پر بجلی سی گر پڑی..... اسد اس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ ان دنوں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سارا اس سے ایک سال بڑی تھی اور اس نے حال ہی میں گریجویشن مکمل کیا تھا۔ سارا خوش شکل لڑکی تھی اور سیرت میں بھی ماں سے مختلف تھی۔ وہ اپنی پھوپھی سے بہت پیار کرتی تھی لیکن مسئلہ یہ نہیں تھا... کوئی اور لڑکی چاہے وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہوتی اور اس کی سیرت میں دنیا جہاں کی اچھائیاں ہوتیں، تب بھی وہ عامر کے لیے رومانہ کا متبادل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے التجا بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

''امی! حنا ابھی پڑھ رہی ہے، اس کی عمر نہیں نکلی ہے۔ اسے کوئی اچھا رشتہ ضرور ملے گا۔''

''میرے بچے! آج کے دور میں اچھے رشتے نایاب ہیں اور لڑکی کی جتنی جلدی شادی کر دی جائے اتنا اچھا ہوتا ہے۔ حنا انیس سال کی ہونے والی ہے۔'' شکیلہ نے کہا اور کھڑی ہو گئیں۔ ''مجھے افسوس ہے میرے بچے۔''

شکیلہ کمرے سے چلی گئیں اور عامر کو لگا جیسے وہ اس کی جان بھی لے گئی ہوں۔ اس کے پاس اب کچھ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

رومانہ خوابوں اور محبت پر یقین کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ اصل محبت وہی ہوتی ہے جو لڑکی شادی کے بعد اپنے شوہر سے کرتی ہے۔ لیکن جب وہ عامر سے ملی تو نہ جانے کیسے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے محبت کر بیٹھی تھی، اب وہ اس راہ پر اتنی آگے جا چکی تھی کہ واپسی محال تھی۔ اگر وہ سوچتی کہ اسے عامر کے بغیر جینا پڑے تو اس کی سانس رکنے لگتی تھی۔ ان میں کبھی محبت کے بارے میں ایک لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا تھا لیکن وہ ایک دوسرے کے دل کا حال جان گئے تھے۔ اس کے کئی رشتے آئے تھے اور جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے، اس کے ان رشتے داروں کو بھی ان لڑکیوں کا خیال آ گیا تھا جو کبھی بھولے سے بھی ان کے گھر نہیں آئے تھے۔ اب جن کے گھر میں لڑکے تھے، وہ سب خواہش مند تھے کہ زبیدہ کی لڑکیاں ان کے گھر جائیں۔ پہلے وہ صرف یتیم بچیاں تھیں اور اب ایک ایسی جائداد کی وارث بن گئی تھیں جس کی مالیت تیس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ زبیدہ خوش تھیں۔ رومانہ تو شرم کی وجہ سے کہہ نہیں پاتی تھی لیکن میمونہ ماں سے بحث کرتی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے ان لوگوں کو منہ لگانے کی... پہلے کبھی انہیں ہمارا خیال آیا۔''

''تو چپ کر... کچھ بھی سہی ہیں تو رشتے دار۔'' زبیدہ اسے جھڑکتیں۔

''اچھے رشتے دار ہیں جن کو اس مکان میں آنے کے بعد ہماری یاد آئی اور آ گئے اپنے بونگے لڑکوں کے رشتے لے کر... امی! میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ اگر آپ نے ان لالچی لوگوں میں ہماری شادی کا سوچا بھی نہ تو میں ریل کے نیچے آ کر خودکشی کر لوں گی۔''

''تیری زبان بہت چلنے لگی ہے۔'' زبیدہ نے چپل اٹھائی تو میمونہ اٹھ کر بھاگی۔ اپنے کمرے میں آنسو بہاتی رومانہ نے اسے دیکھ کر جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ میمونہ اس کے خدشات سے آگاہ تھی۔ اس نے بہن کے آنسو صاف کیے اور بولی۔

''نہ رو، امی کون سا سچ مچ ان لوگوں میں رشتہ کرنے جا رہی ہیں۔''

''مومی! مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے روندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مت ڈرو اور چلو میرے ساتھ، کچھ چیزیں لے کر آنی ہیں۔'' میمونہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ ماں سے اجازت لے کر باہر آئیں۔ اس جگہ سے بازار بہت قریب پڑتا تھا۔ یہاں پر ہر طرح کی دکانیں بھی تھیں۔ میمونہ کو اسٹیشنری کی دکان سے کچھ کام تھا۔ رومانہ کے بی اے فائنل کے امتحانات ہو چکے تھے۔ اس نے دو دن پہلے ہی آخری پیپر دیا تھا۔ میمونہ بی اے پارٹ ون میں آئی تھی اور اس کی کلاسز جاری تھیں۔ وہ اپنے کام کی چیزیں لینے لگی۔ رومانہ کارڈ دیکھنے لگی۔ ابھی نیا سال شروع ہونے میں پورا مہینا پڑا تھا لیکن وشنگ کارڈز ابھی سے آ گئے تھے۔ وہ کارڈز دیکھ رہی تھی کہ اسے ایک عجیب سا کارڈ نظر آیا۔ اس میں اردو میں نیا سال مبارک اس طرح لکھا تھا کہ سال کے لام کا نچلا حصہ گھوم کر کسی سانپ کی طرح بل کھا گیا تھا اور اس کے بننے والے دائرے میں ایک انسان کا بے نقوش چہرہ تھا۔ آدمی کا ہاتھ پشت پر تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی مجبور یا قیدی ہو... جیسے وقت نے اسے قید کر لیا ہو۔ رومانہ کو یہ کارڈ اچھا لگا۔ اس نے ریک سے نکال کر اسے دکان دار کو دیا۔

''اس کی کیا قیمت ہے؟'' وہ پرس کھولتے ہوئے بولی۔

''پیچھے لکھی ہے۔'' دکان والے نے کہا۔

رومانہ نے ٹیگ دیکھ کر قیمت ادا کر دی۔ میمونہ نے کارڈ دیکھا۔ ''ارے، یہ کیسا کارڈ لیا ہے؟''

''مجھے اچھا لگ رہا ہے۔'' رومانہ نے کہا اور کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ چیزیں لے کر وہ واپس گھر کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے میں میمونہ نے کہا۔

"بہت دن ہو گئے عامر بھائی نہیں آئے۔"

"مصروف ہوں گے۔" رومانہ نے بے خیالی میں کہا۔

"باجی... سچ سچ بتانا، تم انہیں پسند کرتی ہو نا؟"

"جب پتا ہے تو پوچھ کیوں رہی ہو؟"

"اور عامر بھائی بھی تمہیں پسند کرتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" رومانہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ رونا شروع کر دے۔ بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل بھر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بہت دن سے عامر نہیں آیا تھا۔ جب سے ان کے گھر کا کام مکمل ہوا، وہ پھر نہیں آیا۔ اس کے بعد ان دونوں نے گھر کو پھولوں اور پودوں سے سجانے کی مہم شروع کر دی تھی اور قریبی نرسری سے بے شمار پھول دار اور دوسرے خوب صورت پودے لا کر آگے اور پیچھے صحن میں لگائے تھے۔ انہوں نے مین گیٹ کے ساتھ کے دونوں ستونوں پر بوگن ویلیا کی بیلیں چڑھائی تھیں۔ باقی دیواروں پر مختلف طرح کی بیلیں چڑھائی تھیں۔ گلاب، موتیا اور رات کی رانی کے پودے بڑے ہو رہے تھے اور ان پر کلیاں آنے لگی تھیں۔ ان کا کمرا عقبی طرف تھا۔ جب رات ہوتی تو کھڑکی سے بڑی پیاری خوشبو آتی تھی۔

زبیدہ یہاں آنے سے پہلے اچھا خاصا کرایہ دیتی تھیں، اب وہ بچنے لگا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اس سے کمیٹی ڈال کر لڑکیوں کے لیے کچھ جوڑنا شروع کر دیں۔ مگر میمونہ نے ضد کر کے پہلے گھر کے لیے چیزیں لیں۔ انہوں نے ڈرائنگ روم کے لیے نئے صوفے اور پردے لیے۔ اس کے علاوہ کمرے کے لیے الماری اور کچھ کچن کا سامان لیا۔ اب ان کا گھر سج گیا تھا لیکن رومانہ کو لگ رہا تھا جیسے اس کا دل سونا ہو گیا ہے اور اس کے دل کیفیت صرف میمونہ جانتی تھی۔

☆☆☆

عامر ایجنسی پر تھا۔ اس روز رش ذرا کم تھا۔ محسن اور فرید کسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ ایک جوڑا آیا جو کسی اچھی جگہ مکان لینا چاہتا تھا۔ عامر نے انہیں چھٹی والے دن بلایا تھا۔ ان کے جانے کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی تو وہ سمجھا کہ پھر کوئی گاہک آیا ہے مگر میمونہ کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ وہ اٹھا۔

"ارے تم... کیسے آئیں؟" وہ بے ساختہ بولا۔

"کیا آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا؟" میمونہ کا منہ اتر گیا تھا۔ اتفاق سے کلرک نہیں تھا اور چپراسی چائے لینے گیا ہوا تھا۔

"نہیں نہیں۔" عامر نے جلدی سے کہا۔ "میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔"

میمونہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "آپ بہت دن سے ہمارے گھر نہیں آئے؟"

عامر نے اس سے نظریں چرائیں۔ "مصروفیت بہت تھی۔"

"اتنی زیادہ کہ آپ کو کوئی یاد نہیں رہا جو آپ کی راہ دیکھتا ہے؟" میمونہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"مجھے یاد ہے لیکن میں نے بتایا نا کہ میں بہت مصروف رہا۔" عامر اس بار بھی اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولا۔

"عامر بھائی! میں آپ کو یہ دینے آئی تھی۔" میمونہ نے اسے ایک لفافہ دیا۔ اس میں کوئی کارڈ جیسی چیز تھی۔ اس سے ہلکی سے مہک آ رہی تھی۔ وہ بنا بتائے جان گیا کہ یہ لفافہ کس نے بھیجا ہے۔ "اب میں چلتی ہوں۔"

"بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے منگواتا ہوں۔"

میمونہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے نظر جما کر عامر کو دیکھا۔ "رہنے دیں، آپ بہت مصروف ہیں اور مجھے بھی گھر جانا ہے۔ امی کو نہیں پتا کہ میں آپ کی طرف آئی ہوں۔ اس لیے کبھی ملاقات ہو جائے تو بتائیے گا مت۔"

"میمونہ..." عامر نے کہنا چاہا لیکن وہ دروازہ کھول کر چلی گئی۔

☆☆☆

شاکر اور اس کے بیٹے تلملا رہے تھے۔ ایک تو کریم بھائی نے ان سے اپنا بزنس واپس لے لیا تھا۔ دوسرے اس نے بزنس اے اے ایم اسٹیٹ کو دے دیا تھا اور اب وہ اس کی طرف سے اس علاقے میں خرید و فروخت کر رہے تھے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ کریم بھائی کا ایجنٹ ہونا معمولی بات نہیں تھی۔ ان سے یہ حیثیت چھنی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی قدر بھی کم ہو گئی ہے۔ وہ لوگ جو پہلے ان سے جھک کر ملتے تھے، اب انہیں نظر انداز کرنے لگے۔ جو پہلے بزنس کے لیے ان کے پاس آتے تھے، اب وہ اے اے ایم اسٹیٹ کے پاس جاتے تھے۔ سلطان حسب معمول جذباتی ہو رہا تھا۔

"میں ان لوگوں کو گولی مار دوں گا۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" انور بولا۔ "کیا ہمارا بزنس ہمیں واپس مل جائے گا؟"

"لیکن یہ راستے سے ہٹیں گے تو بزنس خود بہ خود ہمارے پاس آئے گا۔" سلطان بولا۔

"یہ خوش فہمی ہے۔ اصل بزنس کریم بھائی کا ایجنٹ ہونا ہے جو ہمیں اب کسی صورت نہیں مل سکتا۔" انور کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اب ہم ان تینوں کو مار دیں یا اس علاقے کے سارے پراپرٹی کا کام کرنے والوں کو قتل کر دیں... یہ بزنس ہمیں کسی صورت نہیں ملے گا۔"

"ہمارے دل کو ٹھنڈ تو پڑے گی۔"

"معاف کرنا بڑے بھائی، تم جذباتی ہو کر سوچ رہے ہو۔ ہماری پوزیشن ٹھیک نہیں ہے۔"

"انور ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شاکر نے کہا۔ "کریم بھائی نے ہمیں تین مہینے کی مہلت دی ہے۔ اگر اس دوران میں رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا تو ہمیں شاید سپر ہائی وے والی زمین سے دست بردار ہونا پڑے گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا، وہی تو ہمارا مستقبل ہے۔" منور بے تابی سے بولا۔

"اگر ہمیں کہیں اور سے رقم نہیں ملی تو شاید ہمیں یہ پروجیکٹ کریم بھائی کے سپرد کرنا پڑے۔"

"تب ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟" سلطان نے مایوسی سے کہا۔ "ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"ہمارے پاس یہ اسٹیٹ ایجنسی ہے۔" انور بولا۔ "اگر ہم دوسرے چکروں میں پڑنے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دیں تو جلد ہم بھی بزنس میں شامل ہو جائیں گے۔"

"مجھ سے یہ چھوٹے موٹے کام نہیں ہوتے۔" سلطان نے منہ بنایا۔

شاکر نے اسے گھورا۔ "یہ ایجنسی ایسے ہی نہیں بنی ہے، میں نے بہت محنت کی ہے۔"

سلطان تلخی سے ہنسا۔ "جو آپ نے کیا، وہ آج کل بہت مشکل ہے کیونکہ اس کھیل میں اب بڑے مگر مچھ شامل ہو گئے ہیں۔"

"بہر حال، ہمیں پھر سے خود کو کاروبار میں شامل کرنا ہے۔" انور نے کہا۔ "اور اس کا واحد طریقہ کام کرنا ہے۔ ہمیں دوسرے معاملات میں نہیں الجھنا چاہیے۔ ہماری مشکلات پہلے ہی بہت زیادہ ہیں۔"

شاکر نے انور کی تائید کی اور طے پایا کہ وہ پرانے رابطے پھر سے بحال کر کے کام حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کی بقا کا یہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

میمونہ کے جانے کے بعد عامر نے لفافہ کھولا۔ اس میں سے ایک کارڈ نکلا۔ یہ سالِ نو کی مبارک کا کارڈ تھا لیکن خاصا عجیب سا کارڈ تھا۔ اندر رومانہ نے ایک چھوٹی سی نظم لکھی تھی۔

کوئی اَن جانا آ کے
مجھے جان کر
پھر اَن جان بن گیا
مجھے اپنا بنا کر
مجھے خود میں بسا کر
خود سے بے گانہ بنا کر
پھر سے اَن جان بن گیا

عامر کا دل پگھلنے لگا۔ رومانہ نے ان چند الفاظ میں اپنی ساری کیفیت اور اس کی ساری بے رخی بیان کر دی تھی۔ اسے لگا جیسے سال کے لام کے حلقے میں بے نقوش چہرہ رومانہ کا ہے۔ وہ منتظر ہے کہ وہ آئے اور اسے نقش دے، جیسے نیا سال امید لے کر آتا ہے۔ انسان مایوسی، ناکامی کو بھول جاتا ہے۔ اس نے نظر جما کر کارڈ دیکھا اور سوچا۔

'کیا یہ امید اور نیا سال میرے نصیب میں ہے؟'

اسی لمحے دروازہ کھلا تو اس نے جلدی سے کارڈ لفافے میں ڈال دیا۔ فرید اور محسن آ گئے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا۔ ان کے لیے زندگی میں کتنی امیدیں اور خوشیاں تھیں اور اس کے لیے سب اَن جان بن گیا۔ رومانہ کے ان چند الفاظ نے اس کے اندر کی یخ بستگی کو بڑھا دیا تھا۔ اس نے فرید اور محسن کے آنے پر لفافہ اپنے سویٹر کے اندر رکھ لیا۔ لیکن فرید نے اس کے چہرے سے تاڑ لیا تھا۔

"کیا بات ہے... تیرے منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "بس سر میں ذرا درد ہے۔"

"تب تو گھر جا کر آرام کر۔" محسن بولا۔ "ویسے بھی آج کوئی خاص کام نہیں ہے، ہم دیکھ لیں گے۔"

"نہیں اتنا درد نہیں ہے، میں نے دوا لے لی ہے۔ یہ بتاؤ کہ شیٹ نمبر نو والے مکان کا کیا ہوا؟"

"ہم نے بلاوجہ اس کے مالک کی بات پر اعتبار کیا۔ اس کی قیمت کسی طرح بھی پندرہ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے جبکہ وہ بیس مانگ رہا ہے۔ مکان میں کام بہت ہے۔ کسٹمر دیکھ کر بھاگ جائے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اگر پندرہ لاکھ والا گاہک چاہیے تو ہمارے پاس آ جانا۔"

"تو نے ٹھیک کیا۔" عامر نے سر ہلایا۔ "آج کل کام

بہت ہے، ایسے کام نہیں لینے جن میں اُلجھا ؤ ہو۔“
”میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔“ فرید نے محسن کو گھورا۔
”لیکن یہ ہے عقل مند... ہر کام لے لیتا ہے۔“
”یار! دیکھے بغیر کس طرح انکار کر دیں۔ ابھی مکان دیکھ کر انکار تو کیا ہے۔“ محسن چڑ گیا۔ ”اس طرح کام نہیں چلے گا۔ آنے والوں کو کچھ نہ کچھ مطمئن کرنا پڑے گا، تب ہی لوگ یہاں آنا پسند کریں گے۔“

ان کی نوک جھوک کے درمیان عامر زیادہ تر خاموش رہا۔ اس کی خاموشی دیکھ کر انہوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ آج گھر جا کر آرام کر لے۔ عامر اٹھ گیا۔ وہ گھر آیا تو شکیلہ کھانا بنا رہی تھیں۔ انہوں نے عامر کے مجبور کرنے پر نوکری چھوڑ دی تھی۔ عامر گھر کے تمام خرچ سے زیادہ ہی رقم انہیں دیتا تھا پھر کرایہ بھی آتا تھا۔ ان کے کرائے دار ندیم صاحب کچھ عرصے بعد لاہور جانے کا سوچ رہے تھے۔ انہوں نے تبادلے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ عامر کا ارادہ تھا کہ اب مکان کرائے پر دینے کے بجائے اس کو پھر سے تعمیر کے مرحلے سے گزار کر ون یونٹ کی صورت دے گا۔

وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ حنا اپنے کمرے میں کچھ کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے کمرے میں آئی۔ ”بھائی! کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے؟“
”ہاں ٹھیک ہے، بس ہلکا سا سر میں درد ہو رہا ہے۔“
”بھائی! آج کل آپ چپ چپ رہنے لگے ہیں؟“
”نہیں تو۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔
”اور بہت دنوں سے زبیدہ آنٹی اور ان کی صاحبزادی کا ذکر بھی نہیں کیا؟“ حنا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔
”ان کا ذکر کیوں کروں گا؟“ اس بار عامر زبردستی مسکرایا۔
”بھائی! ایک بات پوچھوں، صحیح صحیح بتایئے گا؟“
”پوچھو۔“
”کیا آپ رومانہ باجی کو پسند کرتے ہیں؟“
عامر چپ رہا جب حنا نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”نہیں... میں اسے پسند نہیں کرتا۔“
”بھائی! آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ حنا بے یقینی سے بولی۔
”ہاں... اس میں پسند کرنے والی کون سی بات ہے، عام سی لڑکی ہے۔“
”کیا کہہ رہے ہیں، اتنی پیاری سی تو ہیں اور میں تو سمجھتی تھی کہ آپ انہیں پسند کرنے لگے ہیں۔“
”تو یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہوا نا۔“ عامر کہتے ہوئے اٹھا اور چپل پہن کر باہر نکل کر جانے لگا۔ شکیلہ نے پکارا۔ ”عامر! کھانا کھا کر جانا۔“
”امی! ابھی بھوک نہیں ہے آ کر کھا لوں گا۔“ اس نے کہا اور بائک لے کر نکل گیا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کس طرف جا رہا ہے بس جو گلی سامنے آتی گئی، اس میں بائک گھماتا رہا۔ اچانک اس نے خود کو رومانہ کے گھر کی گلی میں پایا۔ وہ اس کے گھر کے سامنے رک گیا۔ نہ جانے وہ کیوں رک گیا تھا حالانکہ اس کا اندر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ بائک واپس موڑتا، دروازہ کھلا اور سامنے رومانہ نظر آ گئی۔ وہ حیران ہوئی۔ ”آپ... کب آئے؟“
”ابھی آیا ہوں۔“ اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔
رومانہ خوش نظر آنے لگی۔ ”آیئے نا... اندر آیئے۔“
وہ بائک کھڑی کر کے اندر آ گیا۔

☆☆☆

عامر کے جانے کے بعد حنا اس کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔ اس نے تکیہ ٹھیک کیا تو اس کے نیچے سے ایک لفافہ نکل آیا۔ اس نے اسے کھولا تو اندر نئے سال کا وش کارڈ تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے اسے کھولا۔ اندر چند الفاظ میں ایک چھوٹی سی نظم لکھی تھی۔ وہ تحریر بھی پہچانتی تھی اور اب تحریر والی کے جذبے کو بھی جان گئی تھی۔ وہ کچھ دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس کا بھائی یہ بات دل میں دبائے بیٹھا تھا مگر کیوں؟ اس نے امی سے کیوں نہیں کہا؟ یا اس نے امی سے بات کی ہے؟ اس نے کارڈ واپس تکیے کے نیچے رکھا اور ماں کے پاس آئی۔ وہ وضو کرنے جا رہی تھیں۔
”امی! ایک بات بتایئے؟“
”پوچھو بیٹا؟“ وہ رک گئیں۔
”امی! کیا بھائی نے آپ سے رومانہ باجی کے رشتے کے بارے میں بات کی تھی؟“
شکیلہ نے گہری سانس لی۔ ”یہ بات تمہیں عامر نے بتائی ہے؟“
”نہیں، میں نے خود جانی ہے۔ وہ تو صاف انکار کر رہے تھے۔“
شکیلہ نے سر ہلایا۔ ”ہاں کی تھی۔“
”پھر آپ نے کیا جواب دیا؟“
”میں نے انکار کر دیا۔“
”مگر کیوں امی؟“ حنا تڑپ کر بولی۔
”میں عامر کی شادی وہاں نہیں کر سکتی۔“ شکیلہ نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ”تمہارے ماموں نے مجھ

سے سارا کے لیے بات کی ہے۔“
”سارا باجی بھی بہت اچھی ہیں لیکن اصل چیز تو بھائی کی خوشی ہے۔“
شکیلہ نے سرد آہ بھری۔ ”میں جانتی ہوں میری بچی لیکن تیرے ماموں نے تیرے لیے اسد کی بات بھی کی ہے۔“
حنا سمجھ گئی۔ ”امی! آپ بھائی کی خوشی کو میرے مستقبل پر قربان کر رہی ہیں۔“
”اسد اچھا لڑکا ہے۔“ شکیلہ نے اصرار کیا۔ ”پھر جانا پہچانا ہے۔ آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔“
”امی! بات آج کل کی نہیں، نصیب کی ہے۔ اگر میرے نصیب میں اچھا رشتہ ہے تو مجھے ضرور ملے گا لیکن بھائی...“
”حنا! کچھ نہیں ہوتا ہے۔“ شکیلہ زور دے کر بولیں۔ ”یہ آج کل کے لڑکے ایسے ہی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ جب اس کی سارا سے شادی ہو جائے گی تو خود ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ عرصے بعد وہ اسے یاد بھی نہیں ہوگی۔“
”امی! ایسا نہیں...“
”حنا! بس اب تم اس معاملے میں نہیں بولو گی۔“ شکیلہ فیصلہ کن لہجے میں بولیں تو حنا مجبوراً خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

زبیدہ آنٹی گھر میں نہیں تھیں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ میمونہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔ جب عامر کو پتا چلا تو وہ کچھ نروس ہو گیا لیکن اسے رومانہ سے بات کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ شاید قدرت نے اسے یہ موقع دینے کے لیے گھر سے نکالا تھا۔ اس نے رومانہ کے سامنے سب کھول کر رکھ دیا۔ وہ کہتا رہا اور رومانہ کی خوشی ماند پڑتی چلی گئی۔ وہ رونے لگی۔ عامر کو اذیت ہو رہی تھی لیکن وہ چاہتا تھا کہ ایک ہی بار بات کر لے۔ بات مکمل کر کے وہ چپ ہو گیا۔
”اب میں کیا کروں؟“ رومانہ نے بھیگی آواز میں پوچھا۔
”میں... میں نہیں جانتا۔“
”پھر... پھر میری زندگی میں کیوں آئے تھے؟“
عامر نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں نے یا تم نے جان کر یا سوچ کر کچھ نہیں کیا... یہ سب تو جیسے خود ہو گیا۔“
”لیکن اب میں اس احساس کے ساتھ کیسے زندہ رہوں گی؟“ رومانہ شدت سے رو دی۔ ”کیا میں ساری عمر خود کو اور کسی دوسرے کو دھوکا دیتی رہوں گی؟“
”رومانہ! میں... میں کیا کروں... میں اپنی ماں سے نہیں... کہہ سکتا...“
”میں جانتی ہوں۔“ رومانہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ”شاید ہمارے مقدر میں یہی ہے۔“
عامر کھڑا ہو گیا۔ ”رومانہ! مجھے معاف کر دینا... شاید یہ سب میرے کسی گناہ کی سزا ہے... تم بلاوجہ اس میں حصے دار بن گئی ہو۔“

☆☆☆

سلطان اور منور دفتر میں تھے۔ شاکر کی طبیعت خراب تھی اور انور کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اس لیے دونوں آزادی سے بات کر سکتے تھے۔ سلطان طیش میں تھا، اس نے منور سے کہا۔ ”سارا علاقہ ہم پر ہنس رہا ہے۔ ان لوگوں نے کسی سے نظر ملا کر بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔“
”جب تک ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی ہماری ساکھ بحال نہیں ہو گی۔“ منور نے اس کی تائید کی۔ ”ابا جی اور انور تو اب شریف بننے کی فکر میں لگے ہیں۔ بھلا شرافت سے کام چلتا ہے۔ رحمان کا ڈٹ کر سامنا کیا تو اس نے دوبارہ بات نہیں کی۔“
”یہی تو میں نے ابا جی سے کہا تھا لیکن ان پر کریم بھائی کا خوف سوار ہے کہ ہم نے ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی تو کریم بھائی کا عتاب نازل ہو گا۔ حالانکہ.. ہمیں کریم بھائی کو بتانا چاہیے کہ وہ ہماری مدد کے بغیر یہاں کچھ نہیں کر سکتا۔“
”ایسا ہی ہو گا۔ اگر ہم نے ان کا حشر نشر کر دیا تو اس سے سب کو عبرت ہو گی اور پھر کوئی ہمارے مقابل آ کر کام نہیں کرے گا۔ کریم بھائی کو بھی اس علاقے میں بزنس کے لیے ہم سے بات کرنی ہو گی۔“
”لیکن ابا جی نہیں مانیں گے۔“ منور مایوسی سے بولا۔
سلطان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”ابا جی اب بوڑھے ہو چلے ہیں۔ انہیں ہر بات بتانا ضروری نہیں ہے... بعد میں پتا چلے گا تو دیکھا جائے گا۔“
منور کی آنکھوں میں چمک نظر آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”بھائی جی! کیا ارادہ ہے؟“
”ان میں سے کم سے کم ایک کو اڑانا ہے۔“ سلطان بولا۔
”عامر ٹھیک رہے گا؟“
”ہاں بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کام اس کے گھر میں کرتے ہیں۔ اس کی ماں اور بہن کے سامنے!“
منور نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میں نے دیکھا ہے، اس کی بہن بہت خوب صورت ہے۔“

سلطان ہنسا۔ ''جب وہ ہمارے قابو میں ہوں گے تو ہم سب کرسکیں گے۔ یہ اچھا خیال ہے، مرنے سے پہلے وہ اپنے سامنے اپنی بہن کی آبروریزی دیکھے گا۔''

دونوں بھائی اس وقت شیطان کے چیلے بن کے پوری بے حیائی سے اپنے عزائم پر بات کر رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ سال کی آخری رات بارہ بجے کے قریب عامر کے گھر میں داخل ہوں گے اور اپنا کام کر کے عامر کو گولی مار دیں گے۔ اس وقت ہر طرف سالِ نو کی خوشی میں فائرنگ ہو رہی ہو گی اس لیے کوئی متوجہ نہیں ہو گا۔ ان دونوں کے لیے صرف عامر خطرناک ہوسکتا تھا مگر اسلحے کے سامنے وہ بھی بے بس ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہوتے۔ دونوں بھائیوں نے طے کیا کہ شاکر اور انور کو اس منصوبے سے بے خبر رکھنا لازمی ہے۔ ورنہ وہ ان کے راستے کی رکاوٹ بن جاتے۔ عامر کا انجام دیکھ کر محسن اور فرید خود ہی عبرت پکڑتے اور ان کے راستے سے ہٹ جاتے۔

☆☆☆

شکیلہ دیکھ رہی تھیں کہ عامر بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ صبح کا نکلتا تو شام کو گھر آتا۔ گھر آ کے بھی خاموشی سے کھانا کھا کر سو جاتا۔ ان لوگوں سے بات کرتا تو بہت محدود سی... لیکن ساتھ ہی ایک ایک چیز کا خیال رکھتا تھا۔ کبھی کبھی شکیلہ کا دل چاہتا کہ اس کی بات مان جائیں۔ حنا واقعی ابھی کم عمر تھی اور بہت پیاری تھی۔ اسے رشتہ مل ہی جاتا مگر جب وہ ماں بن کر سوچتیں اور آج کل کے حالات دیکھتیں تو انہیں اسد کا رشتہ بہت غنیمت لگتا۔ شکیلہ کو معلوم تھا کہ اسد کی ماں اس رشتے کی مخالف ہے مگر ان کا بھائی اور اسد اس رشتے کے حامی تھے۔ پھر سارا بھی ان کے گھر آ رہی تھی تو شکیلہ کی بھابھی کی مخالفت خود دم توڑ جاتی اور وہ حنا کے ساتھ کوئی زیادتی بھی نہیں کر پاتیں۔ اس لیے شکیلہ دل پر جبر کر کے عامر کی خوشی نظر انداز کر رہی تھیں۔ حنا نے دو تین بار ان سے بات کرنا چاہی مگر ان کے تیور دیکھ کر اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔

حنا بھائی کی حالت دیکھ دیکھ کر اندر سے کڑھتی رہتی تھی۔ اس کا ہنسنے مسکرانے والا بھائی کس قدر سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح بھائی کی خوشی خود پوری کر دے۔ مگر وہ چھوٹی تھی، وہ کیا کرسکتی تھی۔ اس روز عامر آیا تو اس نے حنا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر رکھا تھا۔

''چڑیل... آج تیرے لیے ایک چیز لایا ہوں، دیکھے گی تو اچھل پڑے گی۔'' عامر نے بہت دنوں بعد اس سے اس انداز میں بات کی تھی۔ ''لیکن پہلے بتا، کیا لایا ہوں؟''

''سوٹ!''

''وہ تو تو ہر ہفتے نیا بنا لیتی ہے۔'' عامر نے منہ بنایا۔

اچانک حنا کو خیال آیا۔ وہ کچھ عرصے سے بھائی سے موبائل کی فرمائش کر رہی تھی اور وہ اسے ٹال رہا تھا۔ کہیں بھائی موبائل تو نہیں لائے ہیں؟ اس نے اچھل کر کہا۔ ''بھائی! موبائل...''

''بہت چالاک ہے، ڈبا دیکھ لیا ہوگا۔'' عامر نے ہنس کر ہاتھ سامنے کیا۔ اس کے ہاتھ میں نیا ڈبا پیک موبائل تھا۔ حنا سچ مچ خوش ہو گئی۔

''تھینک یو بھائی۔'' اس نے کہا اور جلدی سے ڈبا لے کر اسے کھولا پھر موبائل ماں کو دکھانے بھاگی۔ عامر اس کے کمرے سے جاتے ہی پھر سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے سنجیدہ رہنے سے گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا ہے۔ اسے رومانہ نہیں مل سکتی تھی لیکن وہ اپنی ماں اور بہن کو تو خوشیاں دے سکتا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر میں نارمل رہنے کی کوشش کرے گا۔ حنا کی چہکاروں نے گھر کا ماحول بدل دیا تھا۔ عامر بھی خود پر جبر کر کے ہنسنے مسکرانے لگا۔ اس نے حنا سے کہا کہ اب وہ ٹریٹ دے۔ اس کا نیا موبائل آیا ہے۔

''بھائی! ٹریٹ تو ایسی دوں گی کہ آپ یاد کریں گے۔'' حنا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تو میں آپ کو آپ کی پسند کے پراٹھے، شامی کباب اور کھیر بنا کر کھلاؤں گی۔''

''سچ!'' عامر خوش ہو گیا۔ اسے یہ تینوں چیزیں بہت پسند تھیں۔

رات کو جب سب سونے کے لیے لیٹے تو حنا انتظار کرتی رہی کہ امی بھی سو جائیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکی ہیں تو وہ چپکے سے اٹھ کر باہر آئی۔ اس نے اپنا موبائل نکالا اور اسد کا نمبر ملانے لگی۔ بیل جاتی رہی، اسد نے خاصی دیر کے بعد کال ریسیو کی۔

''میں... میں حنا بات کر رہی ہوں۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔

''حنا! تم اس وقت...'' اسد کو حیرت ہوئی۔ ''خیریت؟''

''وہ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' وہ ہمت کر کے بولی۔ اسد سنجیدہ ہو گیا۔

''کہو، میں سن رہا ہوں۔''

سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ رات کو

پنکھے کے بغیر رضائی وغیرہ لے کر سوتے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اسی وجہ سے عامر کو احساس ہو گیا کہ صحن میں کوئی ہے۔ وہ چوکنا ہو کر اٹھا۔ اس نے دروازہ ذرا سا کھولا تو اسے سامنے حنا موبائل پر کسی سے بات کرتی نظر آئی۔ وہ باہر جانے والا تھا کہ اس نے حنا کو دھیمی آواز میں اسد ..... کہتے سنا اور وہ وہیں سے واپس پلٹ آیا۔ اسے خیال آیا کہ کیا حنا بھی اسد کو پسند کرتی ہے؟ یہ جان کر اس کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ اس کے اندر کہیں ایک موہوم سی امید تھی سو آج وہ بھی دم توڑ گئی۔ اب معاملہ اس کی بہن کی خوشیوں کا تھا اور وہ کسی قیمت پر اس کی خوشیاں نہیں چھین سکتا تھا۔

☆☆☆

ان کے کام میں بہت تیزی آ گئی تھی۔ بہت منتخب سودے لینے کے باوجود یہ حال تھا کہ انہیں سر کھجانے کی فرصت بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی۔ صبح گیارہ بجے سے رات بارہ ایک بجے تک لازمی مصروفیت رہتی۔ اس سے پہلے اسٹیٹ ایجنسی کے کام میں کبھی اتنی تیزی نہیں آئی تھی۔ قیمتیں اس وقت مہینے یا ہفتے نہیں بلکہ دن کے حساب سے بڑھ رہی تھیں۔ زبیدہ نے عامر سے دو تین بار کہا تھا کہ وہ ان کا کم سے کم ایک پلاٹ بکوا دے تاکہ وہ لڑکیوں کے لیے کچھ بنانا شروع کر دیں۔ عامر نے ابھی انہیں انتظار کرنے کا کہا۔ زبیدہ کے علاقے میں دو سو گز کے پلاٹ کی قیمت دس لاکھ سے اوپر جا چکی تھی اور ابھی اس میں مزید بہتری آنے کا پورا امکان تھا۔

عامر نے شاہ فیصل ٹاؤن میں ایک مکان کا سودا کرایا۔ اس کی مالیت ستر لاکھ تھی۔ خریدنے والے سے انہیں نقد کمیشن مل گیا لیکن جس نے بیچا تھا، اس نے عامر سے کہا کہ اس کے پاس کے ایک ترانوے ماڈل کی نسان یلو کیب کھڑی ہے۔ گاڑی کی قسطیں باقی تھیں۔ اس نے عامر سے کہا کہ وہ گاڑی لے لے اور اس کی باقی قسطیں خود ادا کرتا رہے کیونکہ وہ امریکا جا رہا ہے۔ وہ اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے اس کی بینک سے بات کرا دیتا۔ ان دنوں بینک ڈیفالٹ گاڑیاں کلیئر کرنے کے لیے رعایتی اسکیمیں نکال رہے تھے۔ عامر کو وہ بہت سستی پڑ رہی تھی، اس نے فوراً یہ سودا ڈن کر دیا۔ دو دن میں مالک نے بینک سے اس کی بات کرا دی اور کار اسے مل گئی۔

کار اتفاق سے دسمبر کے آخری دن ملی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ حنا کو گھمانے کے لیے باہر لے جائے گا۔ مگر کار کی سروس میں وقت بہت لگ گیا۔ وہ دیر سے گھر پہنچا تو ماموں آئے ہوئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ امی رات گیارہ بجے کے بعد حنا کو جانے نہیں دیں گی۔ اس لیے اس نے حنا سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ گاڑی کا بتایا تو سب خوش ہو گئے۔ وہ مٹھائی ساتھ لایا تھا۔ ماموں رات کے کھانے کے بعد چلے گئے۔ اس نے حنا سے کہا کہ وہ اسے کل گھمانے لے جائے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

سلطان اور منور رات تک گھر میں ہی تھے۔ پھر انہوں نے شاکر سے کہا کہ وہ ایک پلاٹ کے سلسلے میں سہراب گوٹھ جا رہے ہیں۔ شاکر نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ان دنوں وہ بہت پریشان تھا کیونکہ کریم بھائی کی دی ہوئی مہلت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ سلطان اور منور مسلح ہو کر نکلے۔ یہ کام انہوں نے سب سے چھپ کر کیا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ بارہ بجے کے قریب عامر کے گھر کا دروازہ بجائیں گے اور جو نکلے گا، اسے اسلحے کے زور پر اندر لے جائیں گے۔ سب کو باندھ کر اور ان کے منہ بند کر کے وہ اپنا کام کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی عامر کی گلی سے کچھ دور ایک تاریک جگہ کھڑی کی اور اس کے بعد پیدل ہی روانہ ہوئے۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور سردی کی شدت کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ عامر کے گھر کے سامنے تھے۔ گلی بھی سنسان تھی۔ سلطان نے اپنا پستول نکال لیا اور سرگوشی میں منور سے بولا۔

''ہوشیار رہنا... کسی کو آواز نکالنے کا موقع نہ ملے۔''

''تم بے فکر رہو۔'' منور نے تیزی سے کہا۔

☆☆☆

عامر خاموش لیٹا ہوا تھا۔ محسن اور فرید نے اس سے کہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ سی ویو چلے مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ دونوں کچھ اور دوستوں کے ساتھ سی ویو جا رہے تھے۔ اسے رہ رہ کر رومانہ سے آخری ملاقات اور اس کے آنسو یاد آ رہے تھے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ گیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور شکیلہ اندر آئیں' وہ اپنے بھائی کے جانے کے بعد نماز میں مصروف ہو گئی تھیں۔ انہوں نے عامر سے نرمی سے کہا۔

''بیٹے! تم سوئے نہیں۔''

''امی! نیند نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اگر تم سو نہیں رہے ہو تو ایک جگہ چلنا ہے۔''

وہ حیران ہوا۔ ''اس وقت امی؟''

''ہاں اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو۔''

''کیسی بات کر رہی ہیں امی؟'' وہ بولا۔

حنا اندر آئی تو وہ تیار اور خوش لگ رہی تھی۔ ''بھائی تیار ہو گئے؟''

''مجھے کیا تیار ہونا ہے، ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

''میں کہہ رہی تھی کہ آپ چلنے پر تیار ہو گئے؟''

''امی نے کہا ہے تو کیوں نہیں چلوں گا۔''

''چلو، اب دیر ہو رہی ہے۔'' شکیلہ نے کہا۔

عامر نے گاڑی کی چابی لی۔ اب انہیں یہ سہولت ہو گئی تھی کہ تینوں ایک ساتھ کہیں بھی جا سکتے تھے۔ وہ اوپر کا گھر بند کر کے نیچے آئے اور تالا لگا کر روانہ ہو گئے۔ عامر کا خیال تھا کہ امی اور حنا شاید گھومنے کے ارادے سے نکلی ہیں۔ اس نے کار کسی .... طرف موڑنا چاہی تو شکیلہ نے روک دیا۔

''اس طرف نہیں، اس طرف جانا ہے۔'' انہوں نے ریلوے لائن والی سمت کی طرف اشارہ کیا۔ عامر حیران ہوا مگر اس نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔

''امی! کہاں جانا ہے؟''

''چلتے رہو، میں بتاتی ہوں۔'' شکیلہ نے کہا اور جب رومانہ کے گھر والی گلی قریب آئی تو عامر کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو تیز ہو گئی۔ پھر شکیلہ نے اس گلی میں مڑنے کو کہا تو عامر چونکا۔

''اس طرف کیوں امی؟''

''بس میں کہہ رہی ہوں نا۔'' وہ بولیں۔

عامر نے گاڑی موڑ دی۔ چند لمحے بعد وہ رومانہ کے گھر کے سامنے تھے۔ شکیلہ نے گاڑی روکنے کو کہا تو عامر نے روک دی اور پلٹ کر ماں سے کہا۔ ''امی! یہ سب کیا ہے... آپ مجھے یہاں کیوں لائی ہیں؟''

''اندر چلو، بتاتی ہوں۔'' وہ کار سے اترتے ہوئے بولیں۔ حنا بھی اتر گئی۔ مجبوراً عامر کو بھی اترنا پڑا۔ حنا نے کال بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد زبیدہ کی فکرمندی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''زبیدہ! میں ہوں شکیلہ۔''

''شکیلہ؟'' اندر سے زبیدہ کی حیرت زدہ آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ شکیلہ کے گلے لگ گئیں۔ ''اس وقت... خیریت تو ہے؟''

''ہاں زبیدہ! میں تمہاری بیٹی لینے آئی ہوں اور اپنا بیٹا تمہیں دینے آئی ہوں۔'' شکیلہ نے عامر کو بازو سے پکڑ کر آگے کیا۔ ''یہ ہمارے بچوں کی خوشی ہے۔''

زبیدہ کو ان کی بات کچھ دیر سے سمجھ میں آئی اور جب سمجھ میں آئی تو دوبارہ شکیلہ کے گلے لگ گئیں۔ عامر کو لگ رہا تھا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ امی اسے اس لیے لے کر گھر سے نکلی ہیں۔ زبیدہ نے کہا۔ ''شکیلہ! تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری دی ہے لیکن اس وقت...''

''میں نے سوچا جب فیصلہ کر لیا ہے تو کل تک کا انتظار کیوں کروں؟ اپنے بچوں کو آج رات ہی خوشی دے دوں۔ اب کل صبح کا سورج ان کے لیے خوشی کے ساتھ طلوع ہوگا۔''

زبیدہ انہیں اندر لے آئیں۔ میمونہ جو ماں کے پیچھے آئی تھی، اس نے سب سن لیا تھا، وہ رومانہ کو اٹھانے کے لیے بھاگی۔

☆☆☆

شاکر رانا نے ابھی اپنے بیٹوں کو نہیں بتایا تھا کہ اس نے کریم بھائی سے سپر ہائی وے والی زمین کی بات کر لی ہے اور کریم بھائی نے اس کے بدلے تیس لاکھ دینے کی ہامی بھر لی تھی۔ یہ اس کی خرچ کی ہوئی رقم سے کم تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ وہ بیک وقت کریم بھائی اور ولی رحمان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ بیک وقت دونوں سے جان چھڑا لے۔ ابھی کام عروج پر تھا۔ وہ اور اس کے بیٹے اپنا وقت کام کو دیتے تو بہت کچھ کما سکتے تھے جبکہ موجودہ حالات میں وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

سلطان اور منور کے جانے کے کچھ دیر بعد کال بیل بجی۔ انور کی بیوی اپنی بیٹی کو بہلا رہی تھی۔ وہ باہر جانے کی ضد کر رہی تھی۔ وہ سمجھی کہ سلطان اور منور میں سے کوئی آیا ہے۔ اس نے پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا اور فوراً ہی ایک... تنومند آدمی اندر گھس آیا۔ اس نے بچی کی طرف پستول تان لیا۔

''آواز نہ نکلے ورنہ میں اسے مار دوں گا۔''

انور کی بیوی دہشت سے ساکت ہو گئی۔ اس آدمی کے پیچھے چھ افراد اور گھس آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ وہ ان سب کو فوراً اندر لے گئے تاکہ کسی کی نظر ان پر نہ پڑے۔ اندر جاتے ہی انہوں نے سب کو اسلحے کے زور پر لاؤنج میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ شاکر اور اس کی بیوی سونے کے لیے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ایک شخص انہیں بھی اٹھا لایا۔ اتنے مسلح افراد کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ انور اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ جب اسے اٹھایا گیا تو اس نے مزاحمت کی کوشش کی اور سر پر رائفل کا بٹ کھا کر بے ہوش ہو گیا۔ وہ لوگ اسے بھی لاؤنج میں لے آئے۔ دس منٹ کے اندر گھر کے تمام افراد کو مع بچوں کے لاؤنج میں جمع کر دیا گیا۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے۔ انور کو زخمی اور بے ہوش دیکھ کر اس کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ شاکر نے آنے والی عورت کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔

''تم...''

یہ وہی عورت تھی جو ولی رحمان کی نمائندہ بن کر آئی تھی۔ وہ مسکرائی۔ ''تم نے میری بات نہیں مانی تھی، اب اس کا نتیجہ بھگتو گے۔''

''میں وہ زمین کریم بھائی کو دے چکا ہوں۔'' شاکر بولا۔ ''اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ زمین تم نے کس کو دی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ تم نے وہ زمین ہمیں نہیں دی۔''

عورت کے اشارے پر اس کے ساتھیوں نے سب سے پہلے شاکر کو رسیوں سے جکڑ دیا۔ پھر یہی سلوک انہوں نے بے ہوش انور کے ساتھ کیا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے بعد انہوں نے شاکر کی بیوی، اس کی بہوؤں اور دیگر افراد کو بھی باندھ دیا۔ وہ ہر چیز اپنے ساتھ لائے تھے اور پیشہ ور لوگ لگ رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے سب کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ اب چھ عدد بچے تھے۔ عورت نے اپنے بیگ سے ایک بڑی سی سرنج نکالی جس میں کوئی محلول تھا۔ وہ بچوں کی طرف بڑھی تو ان کی مائیں مچلنے لگیں۔ اس نے کہا۔

''فکر مت کرو، اس میں صرف نیند کی دوا ہے، یہ بچے سکون سے سو جائیں گے اور ابھی یہاں جو کچھ ہوگا، اسے دیکھنے سے بچ جائیں گے۔''

بچے رونے لگے مگر جس کو انجکشن لگتا وہ فوراً ہی بے ہوش ہو جاتا۔ عورت اس کام میں ماہر لگ رہی تھی کیونکہ اس نے ہر بچے کو اس کی عمر کے حساب سے ڈوز دی تھی۔ شاکر پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی بے ہوش ہو گئی۔

اپنا کام کر کے عورت شاکر کی طرف آئی اور اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم نے خاصا مال کمایا ہے۔ آج وقت آ گیا ہے، تم وہ مال نکال دو۔''

شاکر نے جلدی جلدی سر ہلایا کہ وہ راضی ہے۔ عورت بولی۔ ''گڈ! میں تمہارا منہ کھول رہی ہوں لیکن کوئی فالتو بات نہ نکلے۔ تم صرف یہ بتاؤ گے کہ نقد رقم اور قیمتی چیزیں کہاں ہیں۔ یاد رکھنا کہ ہم پورے گھر کی تلاشی لیں گے۔ اگر کوئی ایسی چیز نکل آئی جو تم نے چھپائی تو تمہیں بڑے دردناک حالات سے گزرنا پڑے گا۔''

''میں سب دے دوں گا لیکن میرے بچوں کو کچھ نہ کہنا۔'' شاکر نے منہ کھلتے ہی کہا۔

شاکر نے اسے اپنے کمرے میں موجود سیف کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح کھلتا ہے۔ عورت نے جا کر کھولا اور اس میں موجود سارا مال سمیٹ لیا۔ اس میں کوئی تیس لاکھ روپے نقد کے علاوہ کئی کلوگرام سونا بھی تھا، یہ سب اس کی بیوی اور بہوؤں کا تھا۔ مال خاصا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے باقی کمروں کی تلاشی لی اور وہاں سے بھی جو ملا، وہ سمیٹ لیا۔ سب مال و زر اس عورت نے ایک بیگ میں ڈال دیا۔

''تم لوگوں نے جو لینا تھا، وہ لے لیا۔'' شاکر نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''اب تم لوگ جاؤ۔''

عورت اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اس نے پھر شاکر کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ ''نہیں، ابھی کچھ مال باقی ہے۔ وہ بھی سمیٹ لیں پھر جاتے ہیں۔''

جب اس کے ساتھی شیطانی عزائم لے کر عورتوں کی طرف بڑھے تو انہوں نے مچلنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کچھ بے ہوش ہو گئیں۔ وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ شاکر بے بس تھا۔ جب عورت کے ساتھیوں نے شاکر کی بیوی، بہوؤں اور بیٹیوں کو بے لباس کرنا شروع کیا تو شاکر کو لگا کہ وہ ابھی مر جائے گا مگر وہ مرا نہیں۔ آنے والے ایک گھنٹے میں وہ مر مر کر جیتا رہا اور مرنے کی آرزو اتنی شدت سے کرتا رہا کہ اتنی شدت سے اس نے کبھی جینے کی خواہش بھی نہیں کی تھی۔ عورت یہ سب بہت سکون سے دیکھ رہی تھی۔ ان لوگوں نے شاکر کی بیوی کو بھی نہیں بخشا تھا۔ عورت نے شاکر کی طرف ذرا جھک کر کہا۔

''یہ سب شریف عورتیں ہیں۔ تم نے کبھی سوچا کہ دنیا کی سب عورتیں شریف ہی ہوتی ہیں۔ یہ تو تم جیسے مرد ہوتے ہیں جو انہیں بُرا بننے پر مجبور کرتے ہیں جیسے میری ماں بنی تھی کیونکہ تم نے اس کی واحد متاع چپکے سے ہتھیا لی تھی۔ تم نے اس کا گھر اس سے چھین لیا تھا۔ میرا باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ جب میری ماں کے سر سے گھر کی چھت ہٹی تو وہ بے لباس ہو گئی۔ زمانہ اسے نوچنے کھسوٹنے لگا، بالکل ایسے ہی...'' اس نے اشارہ کیا۔ ''ماں کے بعد میری باری تھی۔ اب میں اس راہ پر چل رہی ہوں۔ شاکر رانا! اگر تم ہمارے سر سے چھت نہ چھینتے تو میں اور میری ماں بھی شریف عورتیں

ہوتیں۔ تم نے ہمارا گھر صرف پچیس ہزار میں بیچا تھا۔ کتنا سستا بیچا تھا تم نے ہمیں... آج وہ سودا تمہیں کتنا مہنگا پڑ رہا ہے... ہے نا... اب یہ عورتیں کیا اپنی اس بربادی کو کبھی نہیں بھول سکیں گی؟ یہ تباہ ہو جائیں گی... جیسے کبھی میری ماں تباہ ہوئی تھی اور پھر میں تباہ ہوئی۔''

آخر شاکر کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش گیا۔ عورت نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اب بس کرو... اس سے پہلے کہ کوئی آئے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

اس کے ساتھی جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے وہ حیوان سے انسان کے جامے میں آئے مگر صرف لباس کی حد تک وہ انسان بنے تھے۔ ورنہ ان کے چہرے کے تاثرات حیوانوں کو بھی شرمانے کے لیے کافی تھے۔ انہوں نے اپنے سارے نشانات مٹائے۔ عورت نے اس سارے منظر کا معائنہ کیا اور پھر اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرا نکال کر تصویریں لینے لگی۔ یہ کام شاید ان لوگوں کو قانونی یا انتقامی کارروائی سے روکنے کے لیے کیا گیا تھا۔ جانے سے پہلے عورت شاکر رانا کے پاس رکی اور آہستہ سے کہا۔

''میں نے اپنا بدلہ لے کر تیری نسلوں تک کو تباہ کر دیا ہے۔''

انور کسمسا کر ہوش میں آنے لگا اس لیے وہ جلدی سے نکل گئے۔

☆☆☆

سلطان نے کال بیل بجانا چاہی تو اس کی نظر تالے پر پڑی۔ اس کے منہ سے غلیظ... گالی نکل گئی۔ اس نے مڑ کر منور سے کہا۔ ''وہ گھر پر نہیں ہیں، تالا لگا ہے۔''

منور پہلے ہی اوپر مکان میں تاریکی دیکھ چکا تھا۔ اس کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ ''شاید کہیں نیا سال منانے نکلے ہیں۔''

''ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔'' سلطان بولا۔

''اس جگہ کھڑا ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو بعد میں مصیبت ہو جائے گی۔''

وہ واپس گاڑی کی طرف آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ بے شک گلی سنسان تھی لیکن کوئی انہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے بہتر سمجھا کہ وہاں سے ہٹ جائیں۔ وہ گاڑی لے کر نکلے اور بلاوجہ گلیوں میں چکر لگانے لگے۔ ایک گھنٹے بعد وہ پھر عامر کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ وہاں ابھی تک تالا تھا۔

''کہیں یہ لوگ رات بھر کے لیے تو نہیں گئے ہیں؟'' منور نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''اپنے رشتے داروں کے ہاں بھی جا سکتے ہیں۔''

بارہ بجے کا وقت گزر گیا تھا۔ فائرنگ کا شور شروع ہو کر ختم بھی ہو گیا یعنی ان کے لیے مناسب وقت نکل چکا تھا۔ دوسری بار وہ ڈیڑھ بجے وہاں سے گزرے، تب بھی تالا لگا ہوا تھا۔ سلطان نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

''لگتا ہے آج اس کا مقدر ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے... کسی اور دن کا رکھ لیتے ہیں۔'' منور بولا اور انہوں نے گاڑی کا رخ گھر کی طرف موڑ لیا۔ جیسے ہی وہ گھر کے سامنے پہنچے، منور کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔

''بھائی! کوئی چکر ہے... ساری لائٹس بند ہیں۔''

وہ اتر کر اندر آئے۔ دروازہ کھلا پا کر ان کے خدشات بڑھ گئے۔ جیسے ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئے، ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ وہاں موجود عورتوں اور گھر کی حالت بتانے کے لیے کافی تھی کہ ان پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ شاکر اور انور ہوش میں آ گئے تھے لیکن بے بس اور بندھے ہوئے تھے۔ سلطان نے روتے ہوئے باپ اور بھائی کو کھولا۔ انور تو کھڑا ہو گیا لیکن سلطان ایسے ہی بے حس پڑا رہا۔ سلطان اور انور کی بیویاں بھی ہوش میں آ گئی تھیں۔ انور نے انہیں کھولا اور ان سے کہا کہ باقی عورتوں کو ہوش میں لائیں اور ان کا حلیہ درست کریں۔ بچے بے ہوشی کی نیند سو رہے تھے مگر ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

کچھ دیر میں انہیں احساس ہوا کہ شاکر کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ اسے لے کر اسپتال بھاگے۔ وہاں انہیں پتا چلا کہ شاکر پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ انہیں رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ وہ جو عامر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ کرنا چاہ رہے تھے، ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔ مکافاتِ عمل اتنا تیز اور بھیانک ہوگا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ انور اور باقی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ سب کس نے کیا ہے۔ شاید صرف شاکر جانتا تھا مگر وہ فالج کا شکار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کی جان بچ بھی گئی، تب بھی وہ مکمل طور پر مفلوج رہے گا۔

☆☆☆

رومانہ کو لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ سو چکی تھی جب میمونہ نے اسے اٹھا کر شکیلہ آنٹی، عامر اور حنا کی آمد کے بارے میں بتایا۔ اس نے میمونہ کو جھڑک دیا۔

''پاگل ہوئی ہے، کوئی خواب دیکھا ہوگا۔''

''باجی! یہ بہت پیارا خواب ہے، آنٹی آپ کو اپنی بیٹی بنانے آئی ہیں۔''

''میمونہ!'' رومانہ کا لہجہ ڈوبنے لگا۔ ''تُو مجھ سے ایسا مذاق کر رہی ہے؟''

''باجی! یہ مذاق نہیں ہے۔'' میمونہ نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آؤ خود دیکھ لو۔''

پھر ڈرائنگ روم کی طرف سے آتی آوازوں نے رومانہ کو یقین دلایا کہ میمونہ سچ کہہ رہی ہے۔ ''تو تُو سچ کہہ رہی ہے؟'' رومانہ کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ جیسے ابھی بند ہو جائے گی۔

''تمہاری قسم باجی... اور اب اٹھ کر حلیہ درست کر لو۔''

زبیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کس طرح سے ان لوگوں کی خاطر تواضع کرے۔ وہ تو میمونہ نے آ کر سنبھال لیا۔ ''امی! میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔''

''ہاں، آج تو ہم چائے پی کر جائیں گے۔'' شکیلہ بولیں۔

عامر نے ان کے کان میں کہا۔ ''امی! میں مٹھائی لے آؤں؟''

شکیلہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''میری عقل دیکھو، مارے خوشی کے مٹھائی لانا یاد نہیں رہا۔ عامر... جلدی جا۔''

''عامر باہر نکل گیا اور حنا، میمونہ کے ساتھ کچن میں آ گئی۔ ''بی بنو کہاں ہیں؟'' اس نے شوخی سے پوچھا۔

''تیار ہو رہی ہیں۔ انہیں تو یقین ہی نہیں آ رہا۔''

''فکر نہ کرو، ہم ابھی یقین دلاتے ہیں۔'' حنا اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ رومانہ اسے دیکھ کر شرما گئی۔ حنا اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔ ''مبارک ہو۔''

''خیر مبارک۔'' رومانہ اور شرما گئی۔ ''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟''

''بس ہو گیا... آپ آم کھائیے پیڑ مت گنیں۔''

حنا نے اسے تیار کیا، دوسرے کپڑے تبدیل کرائے اور ہلکا پھلکا میک اپ کیا۔ اس دوران میں عامر مٹھائی اور کھانے پینے کا دوسرا سامان لے آیا تھا۔ نیو ایئر نائٹ کی وجہ سے بیکریاں اور دکانیں کھلی تھیں۔ میمونہ نے بھی بہت کچھ بنا لیا تھا۔ شکیلہ نے زبیدہ سے کہا۔ ''باقاعدہ منگنی کی ضرورت نہیں ہے۔ بس آج رسم کریں گے اور ایک مہینے بعد تاریخ لینے آئیں گے۔ البتہ شادی مکان کو نئے سرے سے بنانے کے بعد ہوگی۔''

''اب تو یہ آپ کی بیٹی ہے، جب چاہے لے جائیں۔''

رومانہ تیار ہو کر آئی تو عامر کی ساری جان جیسے آنکھوں میں آ گئی۔ رسم ہوئی اور اس کے بعد کھانا پینا ہوا۔ حنا اور میمونہ جان بوجھ کر رومانہ کو جلد وہاں سے لے گئیں۔ عامر بے چارہ بیٹھا رہ گیا لیکن وہ بور نہیں ہوا۔ یہ تصور ہی ہر چیز پر حاوی تھا کہ اب رومانہ اس کی تھی اور کچھ عرصے بعد مکمل طور پر اس کی ہو جائے گی۔ وہ لوگ کوئی پونے بارہ بجے آئے تھے اور ان کی واپسی ڈھائی بجے ہوئی۔ جانے سے پہلے عامر نے چپکے سے میمونہ سے رومانہ کو پیغام بھیجا۔ ''میں نے اس بے نقش خاکے کو نقوش دے دیے ہیں۔''

جب وہ گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی چلی تو عامر نے بے تابی سے شکیلہ سے سوال کیا۔ ''امی! یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی؟''

''آج تیرے ماموں آئے تھے۔ وہ اب صرف حنا کو لینا چاہتے ہیں۔ سارا کے لیے ان کا ارادہ بدل گیا ہے۔ وہ اب اس کی شادی تمہاری ممانی کے خاندان میں کرنا چاہتے ہیں۔''

عامر نے سکون کا سانس لیا۔ ''تو یہ وجہ ہے۔''

''ہاں... حنا کا گریجویشن مکمل ہوتے ہی وہ اسے لے جانا چاہتے ہیں۔'' شکیلہ نے پیار سے بیٹی کی طرف دیکھا، وہ شرما گئی۔ ''جب میں اپنے بیٹے کی خوشی پوری کر سکتی ہوں تو میں نے اس میں دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''شکریہ امی۔'' عامر بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، میرے لیے تم دونوں کی خوشیاں سب سے اہم ہیں۔''

''میرا بھی شکریہ ادا کریں۔'' حنا بولی۔

''وہ کس لیے چڑیل!'' عامر انجان بنا حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ ماموں کا ارادہ کس طرح بدلا تھا۔ اس میں یقیناً حنا کا ہاتھ تھا۔ اس نے اسد سے بات کی تھی اور اسد نے کسی طرح باپ اور ماں کو منا لیا تھا۔ جب وہ گھر کے سامنے اترے تو حنا نے سرگوشی میں کہا۔

''کیسی رہی میری ٹریٹ بھائی جان۔''

''بہت اچھی میری بہن۔'' عامر نے شکر گزاری سے کہا۔ وہ اس بات پر شکر ادا کر رہا تھا کہ اسے اس کی محبت مل رہی ہے۔ وہ اس سے بے خبر تھا کہ کتنا بڑا طوفان اس کے گھر کی طرف آتے آتے رخ بدل کر جا چکا ہے۔

التفاتِ دوستاں

غوثیہ شبیر

حیاتِ دوراں میں لوگوں کے درمیاں سب سے قیمتی سرمایہ دوست ہیں ...دوستوں کی قربت میں ہی زندگی پنہاں ہوتی ہے ...اور ان کی فرقت زندگی کو بے رنگ و بو بنا دیتی ہے جیسے صحراؤں میں اڑتے بگولے ...چند ایسی ہی دوستوں کا احوالِ محبت جو ایک دوسرے کے لیے سب کچھ تیاگ دینے کا جذبہ رکھتی تھیں۔

سالِ نو کے آغاز پہ قارئین کے لیے یاد رہ جانے والا سرورق

''میرا چکن بریانی کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔ اپنے کک کو بتا دو کہ آج لنچ میں بریانی بنے گی۔'' تکیہ اٹھا کر گود میں رکھنے کے بعد اس پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے روشی نے فرمائش کا اظہار کیا۔

''ساتھ شامی کباب بھی بنوا لینا۔ بغیر کبابوں کے بریانی ایسی لگتی ہے جیسے بغیر دولہا کے برات!'' عروج نے بھی فوراً اپنی فرمائش نوٹ کروائی۔

''میٹھے میں فروٹ ٹرائفل ٹھیک رہے گا۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟'' مہ پارہ کے کون سے پیٹ میں درد تھا جو وہ اس فرمائشی پروگرام سے الگ رہتی... چنانچہ اپنی فرمائش پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں سے رائے بھی لی۔

''ٹھیک ہے... ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' اس کی تجویز کا بڑی شانِ بے نیازی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔

''میری جان پر بنی ہے اور تم لوگوں کو کھانے کی سوجھ رہی ہے۔'' کسی ریڈیو پریزنٹر کی طرح اس پے در پے نوٹ کروائی جانے والی فرمائشوں کو سنتی لبنیٰ نے روہانسی ہو کر شکوہ کیا۔

''اس ملک میں سب کو کھانے کی ہی سوجھتی ہے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص اسی کام میں مصروف ہے۔ کلرک ہے تو لوگوں سے رشوتیں لے کر کھا رہا ہے، پولیس بھتا خوری میں مصروف ہے، ایجنٹ حضرات کمیشن کھانے میں مصروف ہیں... حکمراں ملکی خزانہ خالی کرنے کے بعد بھی ڈکار نہیں لے رہے اور اب ملک ہی ہڑپ کرنے کے چکر میں ہیں تو بھلا بتاؤ، ہم بھی اس ملک کے باشندے ہیں... ہم ''کھائے'' بغیر کیسے رہ سکتے ہیں؟ ہم بھی کھانا چاہتے ہیں لیکن شرافت کے جامے میں رہتے ہوئے اور کسی کے حقوق غصب کیے بغیر بہت عام سی دو تین ڈشز...! اور بہرحال اس ''کھانے'' کو قابلِ اعتراض نہیں کہا جا سکتا۔ یہ زندگی کے سلسلے کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ایک اہم ضرورت ہے۔'' لبنیٰ کے شکوے کا عروج نے نہایت فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

''کیسی دوست ہو تم لوگ؟ میں نے اتنی دردمندانہ اپیل کر کے تمہیں یہاں بلایا ہے لیکن تم میں سے کسی کو اتنی بھی زحمت نہیں ہو رہی کہ مجھ سے میرا مسئلہ ہی پوچھ لو۔ کیسی بدقسمت لڑکی ہوں میں، جس کے بچپن کے دوست بھی اس کی پروا نہیں کرتے۔'' لبنیٰ نے انہیں اپنے مسئلے کی طرف سنجیدگی سے متوجہ کرنے کے لیے لہجے میں بے پناہ دکھ بھرتے ہوئے قسمت کو کوسا۔

''ہائے ہائے کیا کہہ ڈالا ظالم! چلو اسی بات پر ایک شعر سن لو۔'' اس کے درد بھرے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر روشی بولی اور دونوں ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے شعر سنانا شروع کیا۔

دوستوں میں خلوص مت ڈھونڈو
ورنہ تم دوستوں کو کھو دو گے
یہی بہت ہے کہ ساتھ بیٹھے ہیں
اس زمانے میں اور کیا لو گے؟

''واہ، واہ... کیا شاندار اور حقیقت سے قریب تر شعر سنایا ہے۔ مزہ آ گیا بھئی۔'' عروج اور مہ پارہ نے بڑھ چڑھ کر اسے داد دی۔ جواباً روشی خالص شاعرانہ انداز میں پیشانی پر ہاتھ رکھ کے جھک جھک کر انہیں آداب کرنے لگی۔

''تمہیں ہمارا ذرا سی فرمائش کرنا اتنا برا لگ رہا ہے کہ

دوستی کے رشتے پر ہی شک کر رہی ہو... ورنہ سوچو، اس شخص پر کیا گزری ہوگی جس نے یہ شعر کہا تھا۔

دیکھا جو تیر کھا کر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

عروج نے لبنیٰ کو طعنہ دیتے ہوئے اس میں احساسِ تشکر جگانے کی کوشش کی۔

''بالکل ٹھیک بات ہے۔ ہمیں کم از کم تمہارا اتنا خیال تو ہے کہ ایک فون کال پر دوڑے چلے آئے، ورنہ آج کل دوست تو دوست خون کے رشتوں کا بھی کوئی اعتبار نہیں رہا۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے...'' مہ پارہ نے کنپٹی پر شہادت کی انگلی سے ہلکی سی ضرب لگاتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔ پھر یاد آ جانے پر بڑے پُرجوش انداز میں شعر سنایا۔

وفا ہوتی اگر خون کے رشتوں میں
تو یوسف نہ بکتے مصر کے بازاروں میں

''ٹھیک کہتی ہو تم لوگ... میرے تو خون کے رشتوں میں ہی وفا نہیں۔ سگے ماں باپ سولی پر لٹکانے چلے ہیں۔ دوستوں سے امید تھی کہ وہ مصیبت کی اس گھڑی میں میرا ساتھ دیں گی مگر تم لوگوں کے پاس میری بات سنجیدگی سے سننے کی فرصت ہی نہیں۔ پہلے اپنی پیٹ پوجا کی فکر میں لگی رہیں اور اب یہ محفلِ مشاعرہ سجا کر بیٹھ گئی ہو۔ کسی کو احساس نہیں کہ میں کتنی بڑی مشکل میں پھنسی ہوئی ہوں۔'' اس بار لبنیٰ نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تو ان تینوں کو احساس ہوا کہ معاملہ کچھ شدید نوعیت کا ہے ورنہ اب تک وہ لوگ اس کے بلاوے کو اس لیے خاطر میں نہیں لا رہی تھیں کہ وہ لبنیٰ کی فطرت سے واقف تھیں۔ وہ شروع ہی سے ذرا ذرا سی بات پر جلد گھبرا جانے والی کچھ کنفیوژ سی لڑکی تھی جو چھوٹے چھوٹے

مسائل پر گھبرا کر انہیں اکثر و بیشتر اسی طرح اپنے گھر جمع کر لیتی تھی اور جب مسئلہ سامنے آتا تھا تو ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا'' والی صورتِ حال ہوتی تھی۔ اس لیے اس بار بھی وہ اس کی ایمر جنسی کال پر پہنچ تو گئی تھیں لیکن سنجیدہ نہیں تھیں۔

''رومت یار! ہمیں بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے؟ تمہارا مسئلہ حل کرنے کے لیے ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔'' روشی جس نے اس سارے مذاق کی ابتدا کی تھی، گود میں رکھا تکیہ ایک طرف ڈال کر لپک کر اس کے قریب پہنچی اور اس سے ہمدردی جتاتے ہوئے دعویٰ کیا۔

''اور کیا... روشی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تُف ہے ہماری دوستی پر جو ہم تمہارے کام نہ آسکیں۔'' عروج بھی سنجیدہ ہوئی اور روم ریفریجریٹر سے پانی کی بوتل نکال کر اسے پانی پیش کیا۔ سرد موسم میں ٹھنڈا یخ پانی پی کر لبنیٰ کپکپا اٹھی۔

''لگتا ہے بہت ہی سیریس معاملہ ہے، جبھی بے چاری کی حالت اتنی غیر ہو رہی ہے۔'' اس کے کپکپاتے وجود کو دیکھ کر مہ پارہ ہمدردی سے بولی اور اس کی ہتھیلیاں سہلانے لگی۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں ہی لبنیٰ سنبھل گئی اور عروج کو یخ پانی پلانے والی حرکت پر زور سے گھورا مگر زبان سے کچھ کہنے سے گریز کرتی ہوئی اصل مسئلے کی طرف آئی۔

''ڈیڈی میری شادی کر رہے ہیں۔'' اس نے گویا دھماکا کیا۔ اس خبر کو سن کر وہ سب حیرت سے اچھل پڑیں۔

''کب کر رہے ہیں؟ دیکھو پلیز! کوئی قریب کی تاریخ مت رکھنے دینا انکل کو۔ گروپ میں پہلی شادی ہو گی۔ ہم سب کو اس شادی پر خصوصی تیاری کرنی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری شادی میں ہم بھی کسی کی نظر میں آجائیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمیں تیاری کے لیے مناسب وقت ملنا چاہیے۔'' سب سے پہلے روشی حیرت کے جھٹکے سے سنبھلی اور نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔ لبنیٰ نے اس کے بازو پر ایک دھپ لگائی تو اس کی زبان رکی۔

''ناراض کیوں ہو رہی ہو یار! ہم کوئی اتنے خود غرض تھوڑی ہیں کہ صرف اپنی تیاریوں کے لیے زیادہ وقت مانگ رہے ہوں۔ تمہاری تیاری بھی تو ہم لوگ ہی کروائیں گے۔ اس کے علاوہ گانوں اور ڈانس وغیرہ کی پریکٹس بھی کرنی ہو گی۔'' اپنا بازو سہلاتے ہوئے روشی نے معصومیت سے وضاحت پیش کی۔

''تم لوگ اس کی زبان قابو میں کر والو ورنہ میں اسے مار بیٹھوں گی۔'' لبنیٰ نے عروج اور مہ پارہ کی طرف دیکھتے ہوئے خوں خوار لہجے میں دھمکی دی۔

''اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ انکل تمہاری شادی کس سے کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' مہ پارہ نے معاملے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے تفصیلات نہیں معلوم۔ ڈیڈی کی اس شخص سے ابھی حال ہی میں دوستی ہوئی ہے۔ ڈیڈی نے اس کا اپنڈکس کا آپریشن کیا تھا۔ پہلے وہ شکریہ ادا کرنے گھر پر آیا اور پھر ملنے کے لیے آنے لگا۔ بہت زیادہ دولت مند آدمی ہے۔ جتنی بار آتا ہے، بے شمار تحفے ساتھ لاتا ہے۔ ممی ڈیڈی دونوں اس سے بہت متاثر ہیں جبھی تو اس کے پروپوز کرنے پر میری اس سے شادی کرنے پر تل گئے ہیں مگر مجھے وہ شخص ذرا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی میرا اتنی جلدی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' انہیں سنجیدہ ہوتے دیکھ کر لبنیٰ نے فوراً اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''تمہیں وہ کیوں اچھا نہیں لگتا؟ بدصورت ہے یا اِل مینرڈ؟'' مہ پارہ نے پوچھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اچھا خاصا خوش شکل ہے۔ بات چیت کرنے میں بھی ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس سے الجھن محسوس ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''کیا بھینگا ہے؟'' روشی نے پوچھا۔

''نہیں بھئی... کہا نا کہ اس میں کوئی ظاہری عیب نہیں، بس یہ میرے اندر کا احساس ہے جو مجھے وہ اچھا نہیں لگا۔'' لبنیٰ نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں وضاحت پیش کی۔

''تم نے انکل اور آنٹی سے اس بارے میں کچھ کہا؟''

''ان سے کچھ کہنے کا فائدہ ہی نہیں۔ وہ لوگ تو ہر وقت اس کی تعریف ہی کرتے رہتے ہیں۔ بہت متاثر کر رکھا ہے اس نے دونوں کو۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے ڈیڈی کے اسپتال کے لیے اچھا خاصا فنڈ دیا ہے۔ ڈیڈی کے مطابق وہ مختلف یتیم خانوں اور دوسرے رفاہی اداروں کو بھی باقاعدگی سے ڈونیشن دیتا ہے۔''

''نام کیا ہے اس کا؟'' روشی نے پُرخیال لہجے میں پوچھا۔

''اسد شاہ... بزنس مین ہے۔''

''اسد شاہ...'' روشی نے اپنی یادداشت پر زور دیا۔ ''اس نام کے کسی بندے کا میں نے ذکر نہیں سنا ورنہ پاپا کے بزنس سرکل میں تو شہر کے سارے ہی بڑے بزنس مین شامل ہیں۔ خیر، میں پاپا سے پوچھوں گی۔''

''اسد شاہ دبئی سے آیا ہے۔ بہ قول اس کے اس نے دبئی میں اپنا بزنس وائنڈ اپ کر دیا ہے اور اب یہاں سیٹل

ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس کی بزنس سرکل میں ابھی زیادہ جان پہچان نہیں ہوئی۔'' لبنیٰ نے بتایا۔

''اوہ، آئی سی۔'' روشی نے ہونٹ سکیڑے پھر اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم جلد بازی سے کام نہ لو اور اس پروپوزل پر غور کر لو۔ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔ پڑھائی کو بنیاد بنا کر انکل کو ڈیڑھ دو سال تک رکنے کے لیے قائل کیا جا سکتا ہے۔''

''میرا بھی یہی مشورہ ہے۔ ایک اچھے پروپوزل کو اس لیے ریجیکٹ نہیں کیا جا سکتا کہ تمہیں اس شخص کی آنکھوں سے الجھن ہوتی ہے۔ تم اچھی طرح غور کرو۔ اس شخص سے ایک آدھ ملاقات کرو تا کہ انکار یا اقرار کے لیے کوئی ٹھوس دلیل دے سکو۔ اگر اس شخص میں کوئی قابلِ گرفت خامی نکلی تو ہم انکل کے سامنے تمہاری بھرپور وکالت کریں گے۔ بغیر دلیل کے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ خوامخواہ تمہیں انکل کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' مہ پارہ نے بھی اسے رسان سے سمجھایا۔ دوستوں کی یہ آرا سننے کے بعد لبنیٰ نے مزید کوئی نقطۂ اعتراض نہیں اٹھایا اور ذرا مطمئن سی ہو کر انٹر کام پر خانساماں کو ان کی فرمائشوں پر مشتمل لنچ کا مینیو بتانے لگی۔

☆☆☆

''آج رات اسد شاہ کے گھر پر نیو ایئر پارٹی ہے۔ تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تیار رہنا۔ میں تمہیں پارٹی کے لیے ڈھنگ کی شاپنگ کروا دوں گی اور پھر پارلر پر چھوڑ دوں گی۔ اتنی بے ڈھنگی لڑکی ہو تم۔ تمہارے وارڈ روب میں نہ تو کوئی ڈھنگ کا ڈریس ہے اور نہ ہی تمہاری اپنی حالت ایسی ہے کہ تمہیں کسی اہم دعوت میں لے جایا جائے۔ اسکن ہے تو اتنی رف، بال جیسے برتن مانجھنے کا جونا... اس پر سے تمہاری اونگی بونگی حرکتیں!'' مسز مونا یوسف اپنا حکم سنانے کے بعد اب اسے لتاڑنے کا فریضہ بھی ساتھ ساتھ انجام دے رہی تھیں۔

لبنیٰ نے ہاتھ میں موجود توس پلیٹ میں پٹخا اور بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔ ''اگر میں اس لائق نہیں ہوں تو مت لے کر جائیں مجھے پارٹی میں۔ میں نے کون سی فرمائش کی ہے کہ مجھے وہاں جانا ہے۔''

''مجھے خود بھی زیادہ شوق نہیں ہے تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے جا کر اپنی انسلٹ کروانے کا لیکن مجبوری ہے۔ تمہیں کسی ڈھنگ کی جگہ ٹھکانے لگانے کا جو اتنا اچھا چانس مل رہا ہے میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔'' اگرچہ وہ بہت دھیمی آواز میں بڑبڑائی تھی لیکن مونا نے اس کی بات سن لی تھی اور حسبِ توفیق مزید بے عزتی کر ڈالی تھی۔ اکلوتی اولاد کی حیثیت سے ان کی اور ایس یوسف کی لبنیٰ سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن وہ ان کے معیار کے مطابق نہ تو بہت ذہین ثابت ہوئی تھی اور نہ ہی ایکٹو... اس لیے اکثر والدین میں سے کسی نہ کسی کی ڈانٹ ڈپٹ کا شکار بنی رہتی تھی۔

''آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں ممی! میں اتنی گئی گزری بھی نہیں ہوں کہ آپ مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے اس طرح پاپڑ بیلیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو میری اتنی فکر کرنے کی۔ ختم کر دیں آپ یہ فضول سلسلہ اور مجھے سکون سے پڑھنے دیں۔'' ناراضی سے احتجاج کرتی ہوئی لبنیٰ کی آواز جملے کے اختتام تک رندھ چکی تھی۔ مسز مونا یوسف کو اس کا ردِعمل دیکھ کر اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ وہ اسے کچھ زیادہ ہی سخت الفاظ میں ڈانٹ گئی تھیں۔ اب جو اسے ہرٹ ہوتے دیکھا تو آواز دھیمی کر کے نرم لہجے میں بولیں۔

''میرا مطلب تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں صرف تمہیں تمہاری غلطیوں کا احساس دلا رہی تھی۔ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو۔ تم سے بڑھ کر مجھے اور تمہارے ڈیڈی کو کچھ بھی عزیز نہیں۔ اسی لیے تو ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی اسد شاہ سے ہو جائے۔ وہ بہت گڈ لکنگ، ایجوکیٹڈ، کلچرڈ اور ویل آف شخص ہے۔ ہمیں تو بہت خوشی ہے کہ اتنی زبردست پرسنالٹی کے مالک شخص نے تمہیں پروپوز کیا ہے اور اسی وجہ سے میں کانشیئس بھی ہوں کہ تم آج کی پارٹی میں بہت شان دار نظر آؤ۔ ابھی ہم نے اسد کو پوزیٹو جواب نہیں دیا ہے لیکن ذہنی طور پر ہم ''ہاں'' کرنے کے لیے ایگری ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج کی پارٹی میں اسد اپنے کچھ دوستوں وغیرہ سے تمہارا تعارف کروائے۔ اگر تم میں کوئی کمی نظر آئی اور اس کے احباب میں سے کسی نے تم پر تنقید کی تو اس کی رائے بدل بھی سکتی ہے۔ ایسی پارٹیز میں ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار اور فیشن ایبل لڑکیاں شرکت کرتی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اسد تمہارا خیال چھوڑ کر ان میں سے کسی لڑکی کی طرف متوجہ ہو جائے۔'' ان کی اس وضاحت پر لبنیٰ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور آنسوؤں کے ساتھ حلق سے چائے کے گھونٹ نیچے اتارتی رہی۔ ان کی وضاحتی تقریر کے اختتام تک وہ چائے کی پیالی خالی کر چکی تھی چنانچہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتی ہوئی ڈائننگ روم سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ممی کی باتوں نے اس کا موڈ اس بری طرح آف کر دیا تھا کہ اب اس کا یونیورسٹی جانے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا، چنانچہ وہ بجائے تیار ہونے کے ایک شیلف سے کتاب نکال کر بیڈ پر جا

بیٹھی۔فوجی زندگی کے پُرلطف واقعات پر مشتمل یہ کتاب اس کی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک تھی اور اسے امید تھی کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے اس کا موڈ بحال ہو جائے گا۔اس کا یہ خیال غلط ثابت نہیں ہوا۔نیم دراز حالت میں مسکراہٹیں بکھیرتی اس کتاب کا مطالعہ کرتے اس کا ذہن اتنا ہلکا پھلکا ہو گیا کہ اسے احساس ہی نہیں ہو سکا اور وہ پڑھتے پڑھتے ہی نیند کی وادی میں اتر گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ ممی کے شانہ ہلانے پر کھلی۔

''اٹھ کر فریش ہو جاؤ۔ میں لنچ پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔آج ہم ذرا جلدی لنچ کرلیں گے تاکہ تمہیں شاپنگ اور پارلر کے لیے زیادہ وقت مل سکے۔ویسے اچھا ہوا کہ آج تم نے یونیورسٹی کی چھٹی کرلی۔ میں خود بھی یہی چاہ رہی تھی کہ تم گھر پر رہ کر ریسٹ کرو تاکہ رات کو فریش نظر آسکو۔'' اس کے آنکھ کھولتے ہی انہوں نے بولنا شروع کر دیا... اور ان کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے مشن پر ڈٹی ہوئی ہیں۔

''آپ جائیں، میں آتی ہوں۔'' لبنیٰ نے بیزاری سے جواب دیتے ہوئے کروٹ بدلی۔

''جلدی آجانا۔اگر تم نے سستی سے کام لیا تو ہم لیٹ ہو جائیں گے۔'' انہوں نے باہر نکلتے نکلتے اسے ہدایت دی جسے اَن سنی کرتے ہوئے اس نے سرہانے رکھا اپنا موبائل اٹھا لیا۔موبائل پر اس کی تینوں دوستوں کی مس کالز اور میسجز آئے ہوئے تھے۔ ہر میسجز میں انہوں نے اس کی غیر حاضری پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے نہ آنے کا سبب پوچھا تھا۔ موبائل وائبریشن پر ہونے کی وجہ سے اسے نیند میں احساس نہیں ہو سکا مگر اب خیال آرہا تھا کہ اس کے کال ریسیو نہ کرنے اور میسجز کے جواب نہ دینے کی وجہ سے وہ تینوں تشویش میں مبتلا ہوں گی۔وہ انہیں کال بیک کرنے کا سوچنے لگی لیکن تینوں میں سے پہلے کس کا نمبر ملایا جائے، ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔کال روشی کی تھی۔

''کہاں غائب ہو تم؟ صبح سے تمہارا نمبر ڈائل کرتے کرتے انگلیاں گھس گئیں۔'' اس کے کال ریسیو کرتے ہی روشی نے ناراضی کا اظہار کیا۔

''گھر پر ہی ہوں یار! بس صبح صبح ممی کی باتوں نے موڈ آف کر دیا اس لیے یونیورسٹی آنے کا دل ہی نہیں چاہا۔ پھر میں پتا نہیں کب سو گئی۔موبائل وائبریشن پر تھا اس لیے کال آنے کا معلوم ہی نہ ہو سکا۔ابھی ابھی اٹھی ہوں۔تم لوگوں کو کال کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ تم نے خود فون کر لیا۔'' اس نے وضاحت پیش کی۔

''مونا آنٹی کی کس بات نے تمہارا موڈ آف کر دیا تھا؟'' روشی نے نرم پڑتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''اسد شاہ آج اپنے گھر نیو ایئر پارٹی سیلیبریٹ کر رہا ہے۔ممی مجھے اپنے ساتھ وہاں لے جانا چاہتی ہیں، وہ بھی کیل کانٹوں سے لیس کر کے۔ابھی ان کا مجھے اپنے ساتھ شاپنگ پر پھر پارلر لے جانے کا ارادہ ہے۔'' اس نے اکتاہٹ سے بتایا۔

''ڈزن میٹر یار! آنٹی کی بات مان لو۔پارٹی میں شرکت کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ کوئی وہاں کھڑے کھڑے تمہارا نکاح تھوڑی پڑھا دیا جائے گا۔'' روشی نے اسے سمجھایا۔

''نصیحتیں مت کرو۔تمہاری نصیحت کے بغیر بھی میں ممی کے پروگرام پر عمل کرنے پر مجبور ہوں۔تم انہیں اچھی طرح جانتی ہو۔جب وہ اپنی مرضی کرنے پر آتی ہیں تو میری ان کے سامنے ایک نہیں چلتی۔''

اس نے اسی آف موڈ کے ساتھ روشی کو جواب دیا تو وہ ہنس دی پھر رسان سے بولی۔''اچھا اتنی ٹینس مت ہو۔میں نے تمہیں یہ خبر سنانے کے لیے فون کیا تھا کہ پاپا کو بھی اسد شاہ کی طرف سے انویٹیشن ملا ہے۔ویسے تو شاید میں اس فنکشن میں نہ جاتی لیکن اب تمہاری خاطر چلوں گی۔دیکھتے ہیں کہ موصوف کیسے ہیں؟''

''اوہ تھینک گاڈ! یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے مجھے۔ اب مجھے تسلی رہے گی۔'' لبنیٰ خوش ہو گئی۔

''مجھے معلوم تھا کہ تمہیں یہ خبر سن کر سکون ملے گا۔اب آرام سے فنکشن میں جانے کی تیاری کرو لیکن پہلے ذرا یہ پارو اور عروج سے بات کرلو۔تمہاری آواز سننے کے لیے بے تاب ہوئی جا رہی ہیں حالانکہ اتنی بے سری آواز ہے تمہاری۔'' روشی نے کہا تو وہ بجائے برا ماننے کے مسکرانے لگی۔ ان چاروں کے درمیان مثالی محبت تھی، یہ اور بات تھی کہ موقع ملنے پر وہ ایک دوسرے کو مذاق کا نشانہ بنانے سے ہرگز بھی نہیں چوکتی تھیں۔اس وقت روشی نے یہی حرکت کی تھی لیکن اس کے سر سے جتنا بڑا بوجھ ہٹا تھا اس کے سامنے یہ چھوٹا سا مذاق کچھ بھی نہیں تھا، چنانچہ وہ کوئی جوابی حملہ کیے بغیر باقی دونوں سے گفتگو میں محو ہو گئی۔

☆☆☆

لبنیٰ، ممی اور ڈیڈی کے ساتھ اسد شاہ کی کوٹھی پر پہنچی تو کوٹھی کے باہر موجود گاڑیوں کی طویل قطار دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ پارٹی میں مہمانوں کی بڑی تعداد مدعو ہے۔شاید اسد

شاہ اس نیو ایئر پارٹی کے ذریعے شہر کی چیدہ چیدہ شخصیات سے ربط ضبط بڑھانے کا خواہش مند تھا اس لیے اس نے بڑی تعداد میں لوگوں کو مدعو کیا تھا۔کوٹھی کے گیٹ پر تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ سے شخص نے ان کا استقبال کیا۔وہ اسد شاہ کا پی اے تھا۔چہرے پر بڑے اہتمام سے سجائی گئی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف سے کیے گئے ویلکم کو قبول کرتے ہوئے وہ لوگ آگے بڑھے۔یک دم ہی لبنیٰ کا پیر جانے کس طرح رپٹا کہ وہ دھڑام سے استقبال کے لیے بچھائے گئے سرخ قالین پر گر پڑی۔شاید یہ حادثہ اس اونچی ہیل کی وجہ سے پیش آیا تھا جو ممی نے اسد شاہ کے لمبے قد کو مدِنظر رکھتے ہوئے زبردستی اسے دلائی تھی۔

''اوہ، ویری سیڈ! آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں لگی مس؟''

ڈاکٹر یوسف اور مونا اس حادثے سے بے خبر چند قدم آگے بڑھ چکے تھے۔پی اے صاحب نے لبنیٰ کے گرنے کا منظر دیکھا تو لپک کر اس کی طرف بڑھا اور سہارا دے کر اسے کھڑا کیا۔

''میں ٹھیک ہوں... تھینک یو۔'' گھٹنے میں لگنے والی چوٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے پی اے کو جواب دیا۔ اس وقت اسے چوٹ سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ ممی یا ڈیڈی میں سے کوئی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھ لے۔اگر انہیں اس کے اس طرح گرنے کی خبر ہو جاتی تو وہ سخت خفا ہوتے۔

''آیئے، میں آپ کو اندر تک چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ پی اے کا شکریہ ادا کر کے لنگڑاتی ہوئی آگے بڑھی تو اس نے اس کی حالت کے پیشِ نظر پیش کش کی اور اس کی طرف سے کوئی جواب ملنے سے قبل ہی اس کا دایاں بازو تھام کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔لبنیٰ کو بڑا سہارا ملا۔گھٹنے کی چوٹ اور اونچی ہیل کی مصیبت کے باوجود اب وہ بڑے آرام سے چل رہی تھی۔

''اگر آپ کہیں تو اندر مہمانوں کے درمیان جانے سے پہلے میں آپ کی چوٹ پر کوئی آئنٹمنٹ وغیرہ لگانے کا بندوبست کر دوں؟'' پی اے نے مہذب لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''نہیں، ایسی کوئی خاص چوٹ نہیں لگی۔اصل پریشانی تو مجھے اس ہیل کی وجہ سے ہو رہی ہے۔'' اپنی ازلی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے پی اے کے سامنے حقیقت اگل دی جسے سن کر وہ بے ساختہ ہی مسکرا دیا اور مزید کوئی سوال کیے بغیر اسے اپنے ساتھ لے کر ایک بڑے سے ہال میں داخل ہو گیا۔

''آپ یہاں بیٹھ جائیں۔یہ جگہ آپ کے لیے مناسب رہے گی۔'' دروازے سے ذرا آگے ہی رکھے ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے لبنیٰ کو مشورہ دیا۔

''او کے! تھینک یو ویری مچ مسٹر...''

''علی محمد۔'' اس نے جھٹ اپنا تعارف کروایا۔

''آپ کے نام کی ترتیب تھوڑی سے الٹ ہے۔اگر آپ کا نام محمد علی ہوتا تو آپ کو بانیِ پاکستان یا فلم اسٹار محمد علی کے حوالے سے یاد رکھنا آسان ہو جاتا۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں لیکن افسوس جب میرے والدین نے میرا نام رکھا تھا تو میں انہیں مشورہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے لبنیٰ کو جواب دیا اور پھر پلٹ کر باہر کی طرف چلا گیا۔لبنیٰ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہال کا جائزہ لینے لگی۔اچھا خاصا وسیع ہال تھا جسے بے حد خوب صورتی سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ہال میں رکھے قیمتی صوفوں پر شہر کی کئی معروف شخصیات براجمان نظر آرہی تھیں۔ڈاکٹر یوسف کے ہم پیشہ دوستوں کے علاوہ کچھ بزنس مین اور سماجی شخصیات کو وہ خود بھی پہچانتی تھی۔ملک کے مختلف حصوں میں موجود یتیم خانوں کے سربراہ کو وہاں دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ان صاحب کو وہ اکثر ٹی وی کے مختلف چینلز پر دیکھتی رہتی تھی اور بہت متاثر تھی کہ کیسے ایک تن تنہا آدمی نے انسانیت کی خدمت کا اتنا بوجھ اپنے شانوں پر اٹھا رکھا ہے۔

''کیا ٹھاٹ ہیں محترمہ کے؟ پہلے ایک اسمارٹ سے بندے کے سہارے اندر تشریف لائیں اور اب مزے سے یہاں بیٹھی ہوئی ہیں۔'' اس سے قبل کہ وہ ان صاحب سے ملاقات کے لیے اپنی جگہ سے اٹھنے کا فیصلہ کرتی، اس کے شانے پر پیچھے سے ایک زوردار دھپ لگی اور روشی بولتی ہوئی اس کے برابر میں آبیٹھی۔

''کوئی مزے وزے نہیں ہو رہے۔پیر میں چوٹ لگ گئی ہے اس لیے یہاں بیٹھی ہوں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے اسے پورا واقعہ سنانے لگی۔

''اسد شاہ کا پی اے واقعی شان دار آدمی ہے۔اسے دیکھ کر میرا ابھی گرنے کا دل چاہا تھا لیکن افسوس کہ میں نے تمہاری طرح اونچی ہیل کے بجائے یہ گھسے پٹے پہن رکھے تھے اس لیے کوئی بہانہ ہاتھ نہ آسکا۔'' اس کی زبانی سارا قصہ سن کر روشی نے نہایت افسردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''بکواس مت کرو۔ وہ دیکھو، برکاتی صاحب آئے ہوئے ہیں۔چلو چل کر ان سے ملتے ہیں۔'' اس نے روشی کو گھورتے ہوئے ٹوکا اور پھر ایک جانب بیٹھے یتیم خانوں کے سربراہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''میرے خیال میں ان سے پہلے تم اس طرف چلی

جاؤ۔ یوسف انکل اور مونا آنٹی وہاں اسد شاہ کے ساتھ کھڑے ہیں اور شاید تمہیں ہی تلاش کر رہے ہیں۔'' روشی نے اس کی توجہ دلائی تو اس نے دیکھا، واقعی وہ لوگ متلاشی نظروں سے ہال میں موجود افراد کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ چونکہ بہت پیچھے بیٹھی ہوئی تھی اس لیے ابھی تک ان کی نظروں میں نہیں آسکی تھی۔

''تم میرے ساتھ چلو۔ میرا ہاتھ پکڑی رہنا۔ باہر گرنے پر تو میں ممی کی نظروں سے بچ گئی لیکن اگر یہاں گر پڑی تو بہت برا ہوگا۔ اس کم بخت ہیل نے تو میری جان عذاب میں کی ہوئی ہے۔'' اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے روشی سے درخواست کرنے کے ساتھ ساتھ ہیل کو کوسنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ روشی نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس طرف چل پڑی جہاں مسٹر اینڈ مسز یوسف، اسد شاہ کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔

''یہ لیجیے... لبنیٰ بھی آگئی۔ اس کے ساتھ اس کی بیسٹ فرینڈ روشی ہے۔ یقیناً روشی کے ساتھ مصروف ہونے کی وجہ سے ہی اسے یہاں تک پہنچنے میں دیر ہوگئی۔'' مونا نے ان دونوں کے قریب پہنچنے پر اس سے کہا۔

''کوئی بات نہیں مسز یوسف! مجھے خوشی ہے کہ دیر سے ہی سہی یہ مجھ تک پہنچیں تو۔'' لبنیٰ پر اپنی نظریں جماتے ہوئے اسد شاہ نے معنی خیز لہجے میں کہا تو اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ روشی جو خاموشی سے یہ سب دیکھ رہی تھی، اسے ایک پل میں ادراک ہوا کہ لبنیٰ کا اسد شاہ کے بارے میں تجزیہ غلط نہیں۔ خوش شکل ہونے کے باوجود اس شخص کی آنکھوں میں واقعی ایسا تاثر تھا جو دل کو برا محسوس ہوتا تھا۔

''آپ تک تو پہنچنا ہی تھا۔ آخر آپ کی دعوت پر ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔'' اس کے معنی خیز جملے کا برا منائے بغیر مسز مونا یوسف نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''میں روشی کے ساتھ ہوں ممی! ذرا عثمان انکل اور آنٹی سے مل لوں۔ ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ برکاتی صاحب بھی یہاں نظر آرہے ہیں، ان سے بھی ملنا ہے۔'' لبنیٰ سے یقیناً یہ صورتِ حال برداشت نہیں ہوئی اور وہ اپنی ممی سے کہتے ہوئے روشی کا ہاتھ تھامے وہاں سے ہٹ گئی۔ عثمان انکل اور آنٹی سے مل کر وہ برکاتی صاحب کی طرف بڑھ رہی تھی کہ یکایک ایک جانب بنے اسٹیج پر ہلچل کا احساس ہوا۔ نیلگوں روشنی میں ڈوبے اسٹیج پر اب تک صرف سازندوں کا راج تھا جو دھیمی سروں میں ساز بجاتے ماحول میں خوشگواریت بکھیر رہے تھے لیکن اب ان کی موسیقی کا انداز بدل چکا تھا۔ موسیقی کے سُر بلند ہوتے ہوتے ہیجان انگیز صورت اختیار کر چکے تھے۔ اسٹیج پر چھائی روشی میں اب دیگر روشنیوں کا بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ سرخ، نیلی، نارنجی اور زرد ناچتی ہوئی ان روشنیوں میں یک دم ہی ستارے سے جھلملانے لگے تھے۔ اسٹیج پر تیزی سے بدلتے اس منظر نے ہال میں موجود افراد کی توجہ اس طرح سے اپنی طرف مبذول کروائی کہ انہیں ہال کی روشیاں بجھا دیے جانے کا بھی احساس نہ ہوسکا۔ لبنیٰ اور روشی بھی برکاتی صاحب سے ملاقات کو بھول کر اسٹیج کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ یکایک اسٹیج پر ایک ہیولا سا نمودار ہوا۔ سر سے پیر تک سرخ رنگ کے لبادے میں ملبوس یہ ہیولا روشنیوں کی خوفناک یلغار اور بلند موسیقی کے ساتھ بے حد دہشت ناک تاثر پیش کر رہا تھا۔ ہال میں موجود افراد میں سے کئی ایک نے چیخیں ماریں۔ ان چیخوں میں خوف سے زیادہ ہیجان اور سُرور انگیزی تھی۔

سرخ لبادے میں موجود وجود دھیرے دھیرے چلتا اسٹیج کے عین وسط میں پہنچا اور لوگوں کی طرف پشت کر کے کھڑا ہوگیا۔ اس انداز میں کھڑے ہونے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ بلند کیے۔ دیکھنے والوں کو ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھوں سے روشنی کی کرنیں سی چھوٹی ہوں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کرنوں نے حروف میں ڈھلنا شروع کر دیا۔ تیس سیکنڈ بعد وہاں ہیپی نیوایئر کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ بے ساختہ ہی لوگوں نے سازندوں کی پشت پر موجود گھڑی پر نظر ڈالی۔ سنہری وال کلاک بارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ ہال میں موجود افراد نے تالیاں بجاتے ہوئے نئے سال کا خیر مقدم کرنے کے ساتھ ساتھ سالِ نو کی اس منفرد انداز میں دی جانے والی مبارک باد کو بھی سراہا مگر یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ اچانک ہی ان کی طرف پشت کر کے کھڑے ہیولے نے اپنے لبادے کی ڈوریاں کھینچیں اور ایک جھٹکے سے لبادے کو خود سے الگ کر کے پھینکتے ہوئے سامنے کی طرف رخ کر لیا۔ وہ تقریباً بیس بائیس سال کی ایک شعلہ جوالہ تھی جس نے گولڈن ہائی نیک کے ساتھ سیاہ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ یہ اسکرٹ اس کے گھٹنوں سے چند انچ اوپر ہی ختم ہوگیا تھا اور لمبی سڈول ٹانگیں دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ اس نے اپنی ان خوب صورت ٹانگوں کو غیر متحرک رکھنا پسند نہیں کیا اور تیزی سے رقص شروع کر دیا۔ برق رفتاری سے کیا جانے والا یہ رقص اچھا خاصا ہیجان انگیز تھا۔ رقاصہ کے سیاہ کھلے بال بری طرح منتشر ہوگئے تھے۔ بالوں کی اس بے ترتیبی اور چہرے پر موجود عجیب سے میک اپ کی

وجہ سے وہ کسی حسینہ سے زیادہ ویمپ لگ رہی تھی مگر اپنی اداؤں سے وہاں موجود بیشتر لوگوں کو دیوانہ کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ ہال میں موجود لوگ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے ناچنا شروع کر چکے تھے۔

''چلو، باہر لان میں چلتے ہیں۔'' روشی نے لبنیٰ کے کان کے قریب اپنے ہونٹ لے جاتے ہوئے کہا۔ وہاں اس قدر شور اور ہنگامہ برپا ہوچکا تھا کہ اس طریقے کے استعمال کے بغیر ایک دوسرے تک آواز پہنچانا ممکن ہی نہیں تھا۔ لبنیٰ نے روشی کی تجویز قبول کر لی۔ اس ہنگامے میں برکاتی صاحب سے ملنا تو یوں بھی ممکن نہیں رہا تھا اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس طوفانِ بدتمیزی سے خود کو الگ کر لیتیں۔ ہال کی روشنیاں ابھی تک دوبارہ روشن نہیں کی گئی تھیں۔ صرف اسٹیج پر موجود روشنیوں کی وجہ سے ہال کا دھندلا دھندلا سا منظر نظر آرہا تھا۔ وہ دونوں خود کو دوسروں سے ٹکرانے سے بچانے کی کوشش کرتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔ چونکہ وہاں موجود بیشتر افراد محوِ رقص تھے اس لیے انہیں اپنی اس کوشش میں مکمل کامیابی نہیں ہوئی اور وہ بچتے بچتے بھی ایک دو جوڑوں سے ٹکرا ہی گئیں۔ لوگ اس بری طرح مگن تھے کہ انہوں نے برا ماننا تو دور کی بات، محسوس بھی نہیں کیا۔ بالآخر وہ دونوں باہر آنے میں کامیاب ہوگئیں۔ باہر اچھی خاصی سردی تھی اس کے باوجود انہیں ہال کے مقابلے میں یہاں آکر زیادہ بہتر محسوس ہوا۔

''توبہ کیا بے ہودگی مچی ہوئی ہے اندر۔ اگر پاپا کو معلوم ہوتا کہ اس انداز کی پارٹی ہے تو وہ ہرگز بھی مجھے ساتھ نہ لاتے۔'' کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے روشی بڑبڑائی۔ ہائی کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود ان لوگوں کا شمار ان افراد میں نہیں ہوتا تھا جو جدت پسندی کے نام پر ہر طرح کی اخلاقی اقدار کو طاق پر اٹھا کر رکھ چکے تھے۔

''اور تم سوچو کہ ممی ڈیڈی میری شادی اس شخص سے کرنا چاہ رہے ہیں جس نے اس پارٹی کے انتظامات کیے ہیں۔ ایسا انتظام کرنے والا شخص خود ذاتی طور پر کتنا بے ہودہ ہوگا اس کا اندازہ اچھی طرح لگایا جاسکتا ہے۔'' لبنیٰ نے فوراً اپنے انکار کے حق میں دلیل دی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی اسد شاہ جیسا شخص تمہیں سوٹ نہیں کرتا۔'' لان میں مستعدی سے باربی کیو کا انتظام کرتے ہوئے بیروں کی طرف دیکھتے ہوئے روشی نے اس کی تائید کی۔

''کیا بات ہے میڈم! آپ دونوں اندر پارٹی انجوائے کرنے کے بجائے باہر کیوں آگئیں؟ اگر کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتائیں۔ میں آپ کی ہیلپ کر سکتا ہوں۔'' اسد شاہ کا سوٹڈ بوٹڈ پی اے ان کے قریب آکر ان سے مخاطب ہوا۔

''آپ اندر جاری پارٹی کو ختم کروا سکتے ہیں؟'' لبنیٰ نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

''جی...!'' وہ اس فرمائش پر ہکا بکا رہ گیا۔ ''میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟''

''جب آپ کچھ کر نہیں سکتے تو ہیلپ کی آفر کیوں کرتے پھر رہے ہیں؟'' وہ بدمزاجی سے بولتی ہوئی روشی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی۔ پی اے پہلے تو شرمندہ ہوا پھر اسے روشی کے سہارے چلتے دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دیا۔ وہ پہلے ہی یہ بات سمجھ چکا تھا کہ سینڈل کی اونچی ہیل اس کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

روشی اور لبنیٰ کے پیچھے کچھ اور افراد بھی ہال چھوڑ کر لان میں آچکے تھے۔ یہ یقینی طور پر وہ لوگ تھے جنہیں اندر جاری 'ہاؤ ہو' پسند نہیں آئی تھی۔ باہر آنے والوں میں ان دونوں کے والدین بھی شامل تھے۔ یہ افراد لان میں ادھر ادھر بکھر کر ایک دوسرے سے گپ شپ لگانے لگے۔ آہستہ آہستہ لان میں دیگر افراد نے بھی آنا شروع کر دیا۔ یقینی طور پر اندر جاری رقص و سرور کی محفل برخاست ہوچکی تھی اس لیے ان لوگوں کے اندر ٹھہرے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ ویمپ محسوس ہونے والی رقاصہ نے لان میں قدم رنجہ فرمایا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ ذرا دیر بعد باربی کیو کی مخصوص مہک کے ساتھ کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ دونوں بھی سب بھول بھال کر کھانے سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ اسد شاہ ایک اچھے میزبان کی طرح ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے ایک ایک کے پاس جا کر اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتا ہوا اچھی طرح کھانے کی تلقین کر رہا تھا۔ جن لوگوں کو اس کی محفل کا رنگ پسند نہیں آیا تھا، وہ بھی اس کی خوش اخلاقی سے متاثر ہورہے تھے۔ لوگوں سے ملتا ملاتا وہ کب نظروں سے اوجھل ہوا، کسی کو احساس بھی نہیں ہوسکا۔

''برکاتی صاحب نظر نہیں آرہے یار! مجھے تو ان سے ملنا تھا۔ ان سے ملنے کا اتنا اچھا موقع میں ہرگز بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی۔'' تکوں کا صفایا کرنے کے بعد لبنیٰ کو خیال آیا تو وہ روشی سے بولی۔

''انہیں تو میں نے لان میں سرے سے دیکھا ہی نہیں۔ شاید وہ ہال سے باہر ہی نہیں نکلے۔''

''تو چلو پھر ہم ان سے اندر ہی چل کر ملتے ہیں۔'' روشی

کے خیال ظاہر کرنے پر اس نے فیصلہ سنایا۔

وہ دونوں لان سے اندر ہال کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑیں مگر کوریڈور میں داخل ہونے سے پہلے ہی انہیں ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ اسد شاہ اور رقاصہ لڑکی وہاں پہلے سے موجود تھے، اسد شاہ موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں شیخ صاحب! ایک دم اچانک اتنے شارٹ نوٹس پر میں آپ کو اتنی زیادہ سپلائی کیسے کر سکتا ہوں؟ یہ کوئی فیکٹریوں میں تیار ہونے والا مال تو نہیں کہ میں اپنے بندوں کو اوور ٹائم پر لگا کر مطلوبہ پروڈکشن حاصل کر لوں۔'' وہ کسی سے کافی بلند آواز میں بات کر رہا تھا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا شیخ صاحب! ہم نے اگر اپنی ایکٹیوٹیز تیز کر دیں تو لوگ چیخ پڑیں گے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اپنے ہاتھ پیر بچائے بغیر اگر ہم پارٹیوں کے کہنے پر اس طرح اندھا دھند کام کرنے لگ جائیں تو پھر ہمارا ٹھکانا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی ہوگا۔'' دوسری طرف موجود شخص نے شاید اس پر زور ڈالنے کی کوشش کی تھی جس پر اس نے پہلے سے بھی زیادہ برہم ہو کر جواب دیا اور موبائل آف کر دیا۔

''ایزی ڈیئر! اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے کسٹمرز سے بگاڑ کر ہم اس فیلڈ میں کام نہیں کر سکتے۔'' اس کے ساتھ کھڑی رقاصہ لڑکی نے اس کے شانے پر ادائے دل ربائی سے ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''بگاڑوں نہ تو کیا کروں؟ تمہارے پاس کوئی راستہ ہے اس کی فرمائش پوری کرنے کا؟'' اس نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''راستہ ہے۔'' لڑکی معنی خیز لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب... کیسا راستہ؟'' وہ چونکا۔

''برکاتی...'' اس نے آنکھیں مٹکائیں۔ ''آخر اس سے دوستی کب کام آئے گی؟ اس کے پاس تو ہمارے مطلب کے مال کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔''

''اوہ، یس... مگر وہ شاید اتنی آسانی سے ہماری بات ماننے پر راضی نہ ہو۔''

''اس سے کام نکلوانا میرا ہیڈک ہے۔ تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو اور ریلیکس ہو جاؤ۔'' لڑکی نے اس سے کہا تو اس نے بے ساختہ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''تھینک یو ڈیئر! تم بہت کام کی چیز ہو۔''

''چلو، باہر لان میں چلتے ہیں۔ تمہارے گیسٹ تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔'' خوشی سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ وہ اسد شاہ سے بولی اور دونوں کوریڈور سے گزر کر باہر کی طرف آنے لگے۔ ناسمجھی کے عالم میں یہ ساری گفتگو سنتی روشی اور لبنیٰ اس قدر حیرت میں مبتلا تھیں کہ بروقت وہاں سے ہٹ بھی نہ سکیں۔ جب ہوش آیا تو لبنیٰ کی اونچی ہیل مسئلہ بن گئی، نتیجتاً جب اسد شاہ اور اس کی ساتھی لڑکی باہر پہنچے تو وہ دونوں سامنے ہی موجود تھیں۔

''خیریت... آپ دونوں یہاں کیسے؟'' بہ ظاہر شائستگی سے یہ سوال کرتے ہوئے اسد شاہ کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

''ہم برکاتی صاحب کی تلاش میں اس طرف آئے تھے۔ وہ باہر لان میں نظر نہیں آئے تو ہم نے سوچا کہ شاید وہ سردی کی وجہ سے اندر ہال ہی میں رک گئے ہیں۔ ہم ان سے ملنے کے لیے اندر جا رہے تھے۔'' روشی کو بروقت وہ وجہ یاد آگئی جس کے سبب وہ دونوں اس طرف آئی تھیں چنانچہ اس نے جلدی جلدی اسد شاہ کو بتایا۔

''برکاتی صاحب تو بہت دیر پہلے ہی یہاں سے جا چکے ہیں۔ انہیں ٹی وی کے کسی لیٹ نائٹ شو میں شرکت کرنی تھی اس لیے وہ کھانے کے لیے بھی نہیں رکے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوچ... ہم آج بھی ان سے ملنے کے اعزاز سے محروم رہ گئے۔'' گفتگو کی ساری ذمّے داری خود سنبھالتے ہوئے روشی نے افسوس کا اظہار کیا اور اب تک حواس باختہ لبنیٰ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''چلو لبنیٰ! پھر کبھی موقع ملا تو برکاتی صاحب سے ملاقات کی کوشش کریں گے۔'' وہ دونوں دھیرے دھیرے چلتی دوبارہ لان کی طرف بڑھ گئیں۔ تذبذب کا شکار اسد شاہ اور اس کی ساتھی لڑکی نے بھی ان کی پیروی کی لیکن وہ دونوں اپنی اپنی جگہ اس الجھن میں مبتلا تھے کہ ان لڑکیوں نے ان کی گفتگو سنی ہے یا نہیں... اور اگر سنی ہے تو کس حد تک؟

☆☆☆

''ہوں... یہ تو واقعی کافی مشکوک معاملہ لگتا ہے۔ اسد شاہ آخر ایسا کون سا بزنس کرتا ہے جس کے لیے وہ لوگ برکاتی صاحب کو گھیرنے کے چکر میں ہیں۔ برکاتی صاحب تو ایک سیدھے سادے سماجی کارکن ہیں جن کا کسی بھی طرح کے بزنس سے دور دور تک واسطہ نہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، ان کا ادارہ کلی طور پر لوگوں کے دیے ہوئے ڈونیشن پر چلتا ہے پھر آخر اسد شاہ اور اس کی ساتھی لڑکی ان سے کس قسم کا مال حاصل کرنا چاہتے ہیں؟'' یونیورسٹی لان میں گھاس پر بیٹھی وہ چاروں کل کی پارٹی کو ڈسکس کر رہی تھیں۔ لبنیٰ اور روشی نے کل پیش آنے والے واقعات حرف بہ حرف باقی دونوں کو سنائے تھے جنہیں سننے کے بعد عروج

نے یہ تبصرہ کیا تھا۔

''تمہیں نہیں معلوم لبنیٰ کہ اسد شاہ کا بزنس کیا ہے؟ اس نے تمہیں پروپوز کیا ہے تو یقیناً انکل اور آنٹی کو اپنے بزنس کے متعلق بھی کچھ بتایا ہوگا۔'' مہ پارہ نے پُرسوچ لہجے میں لبنیٰ سے پوچھا۔

''وہ یہاں آنے سے پہلے دبئی میں تھا۔ اس کے مطابق وہاں اس کے مختلف ہوٹلز وغیرہ میں شیئرز تھے۔ اب وہ اپنے شیئرز نکال کر پاکستان شفٹ ہو گیا ہے اور یہاں کوئی ہوٹل اور فیکٹری وغیرہ خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔'' لبنیٰ نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ سچ مچ ٹھیک ٹھاک اسامی ہے اسی لیے تمہارے ممی ڈیڈی اس کا پروپوزل ایکسیپٹ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔''

''لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کل پارٹی میں، میں نے اسد شاہ کو لبنیٰ کی طرف خاص توجہ دیتے ہوئے نہیں دیکھا حالانکہ اس نے اپنی ذاتی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ پروپوزل دیا ہے۔'' عروج کے تبصرے کے جواب میں روشی نے اہم نکتہ پیش کیا۔

''واقعی، یہ تو روشی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم لوگوں نے کل رات کے جو واقعات سنائے ہیں ان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسد شاہ کا اس ڈانسر لڑکی سے بہت قریبی تعلق ہے۔ ان حالات میں اس کا لبنیٰ کو پروپوز کرنا کچھ سمجھ نہیں آتا۔'' مہ پارہ نے روشی کے پیش کردہ نکتے کی تائید کی۔

''اس ساری گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے کہ معاملہ سخت گڑبڑ ہے اور اس سے قبل کہ یوسف انکل اور مونا آنٹی، اسد شاہ کی دولت اور خوب صورتی سے متاثر ہو کر لبنیٰ کے مستقبل کا فیصلہ کر ڈالیں، ہمیں حرکت میں آنا ہوگا۔ ''پرل'' کی ایک ممبر کا مستقبل سخت خطرے میں ہے اس لیے یہ کسی طور ممکن نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے چپ چاپ بیٹھے رہیں۔'' بالآخر روشی نے فیصلہ کن لہجے میں اعلان کیا۔

''مگر ہم کریں گے کیا؟''

''نگرانی... پہلا مرحلہ نگرانی کا ہوگا۔ اسد شاہ کی نگرانی کے ذریعے ہم کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' اٹھائے گئے سوال کا جواب مہ پارہ نے دیا۔

''لیکن یہ آسان کام نہیں ہے۔ آج کل یونیورسٹی کھلی ہوئی ہے۔ کیا ہم کلاسز چھوڑ کر اسد شاہ کے پیچھے بھاگتے پھریں گے؟'' لبنیٰ نے ایک اہم مسئلے کی طرف ان لوگوں کی توجہ مبذول کروائی۔ اس بار سردیوں کی چھٹیاں معمول کے شیڈول سے ہٹ کر ہونے کے باعث یونیورسٹی اٹھائیس دسمبر سے ہی کھل گئی تھی۔

''ہم اس معاملے کو ایڈجسٹ کر سکتے ہیں۔ نگرانی کا کام شفٹوں میں ہوگا۔ ایک دن میں اور روشی کلاسز بنک کریں گے، دوسرے دن تم اور عروج۔ اس طرح مس ہو جانے والے لیکچرز کو بعد میں کمبائنڈ اسٹڈی کے ذریعے کور کر لیا جائے گا۔'' مہ پارہ نے فوراً ہی مسئلے کا حل پیش کر دیا پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

''روشی اور لبنیٰ! تم دونوں کو اسد شاہ کی نگرانی کے دوران بہت احتیاط کرنی ہوگی۔ وہ تم دونوں سے واقف ہے اس لیے اگر نگرانی کے دوران اس نے تمہیں پہچان لیا تو چونک سکتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے تم لوگ اپنے حلیے تبدیل کر لینا۔''

''نو پرابلم! مجھے ایسی کئی میک اپ ٹپس معلوم ہیں جن کے استعمال سے اسد شاہ تو کیا، ہمارے پیرنٹس کے لیے بھی ہمیں پہچاننا مشکل ہوگا۔'' روشی نے چٹکی بجاتے ہوئے اس مسئلے کا بھی حل پیش کر دیا۔

''اوکے! پھر کل سے کام شروع۔ کل پہلی شفٹ میں، میں اور روشی جائیں گے۔ دوپہر کے بعد عروج اور لبنیٰ ہماری جگہ سنبھال لیں گی۔'' حسبِ معمول مہ پارہ نے غیر محسوس طور پر لیڈر کی جگہ سنبھالتے ہوئے فیصلہ سنایا جسے سب نے منظور کر لیا۔

☆☆☆

''اسد شاہ ضرورت سے کچھ زیادہ ایڈوانس آدمی نہیں ہے؟ کل کی پارٹی میں شرکت کرنے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ ہماری لبنیٰ ذرا سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اتنے ماڈرن آدمی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں اسے بہت مشکل پیش آئے گی۔'' ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اسے گردن سے نکال کر ایک طرف ڈالتے ہوئے ڈاکٹر یوسف نے مونا سے کہا۔ کل پارٹی سے وہ لوگ رات تین بجے کے قریب واپس آئے تھے۔ واپس آتے ہی وہ فوراً سو گئے تھے کیونکہ اگلے دن اسپتال بھی جانا تھا۔ اسپتال سے واپس آ کر اب انہیں موقع ملا تھا کہ اپنی شریکِ حیات کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔

''اس طرح کے ڈفرینس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لڑکیوں میں ایڈجسٹمنٹ کی بہت صلاحیت ہوتی ہے۔ یاد ہے، شادی سے پہلے میں کتنی ماڈ ہوا کرتی تھی۔ آپ سے شادی ہوئی تو آہستہ آہستہ آپ کی پسند میں ڈھلتی چلی گئی۔ لبنیٰ میری بیٹی ہے۔ میری طرح وہ بھی نئے ماحول میں ایڈجسٹ کر جائے گی۔'' مسز مونا کو یہ رشتہ بے حد پسند آیا تھا اور وہ کسی

MCOM

بھی طرح اس سے انکار کے موڈ میں نہیں تھیں اس لیے ڈاکٹر یوسف کے خدشے کو خاطر میں لائے بغیر دلیل پیش کی۔

''تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر یہ یاد رکھو کہ لبنیٰ تمہاری طرح ذہین اور ایکٹو نہیں ہے۔ وہ کہیں زیادہ ہی پرابلمز میں نہ گھر جائے۔'' وہ اب بھی مطمئن نہیں تھے۔

''یہ تو ایک پلس پوائنٹ ہے۔ ذہین عورت کے لیے اپنی سوچ کے برخلاف جا کر ایڈجسٹ کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ لبنیٰ جیسی لڑکیاں تو بہت جلد شوہروں کے سامنے ہتھیار ڈال کر ان کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔'' مونا نے بڑے اطمینان سے رائے پیش کی جس پر ڈاکٹر یوسف کوئی تبصرہ کرتے اس سے قبل ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''یس، ڈاکٹر ایس یوسف اسپیکنگ!'' انہوں نے ریسیور اٹھا کر باوقار لہجے میں کہا پھر دوسری طرف موجود شخص کی بات سننے کے بعد خوش اخلاقی سے بولے۔ ''اوہ اسد صاحب آپ! کل آپ کے ہاں کی پارٹی بڑی شان دار رہی۔ میں خود آپ کو فون کرتا لیکن مصروفیت کی وجہ سے موقع نہیں مل سکا۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی گھر پہنچا ہوں۔ اگر آپ کی کال نہیں آتی تو تھوڑی دیر میں، میں خود آپ کو کال کرتا۔'' جواباً دوسری طرف موجود اسد شاہ نے یقیناً شکریہ ادا کیا تھا جس کے جواب میں وہ مسکرائے پھر ذرا دھیان سے اس کی بات سننے لگے۔

''آپ مجھے کال کر لیتے۔ میں خود اسپتال پہنچ جاتا۔'' مونا جوان کے چہرے کے تاثرات سے دوسری طرف ہونے والی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس جملے سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی۔

''چلیں آپ مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں صبح اسپتال جاؤں گا تو خود اسے چیک کر لوں گا۔'' دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اسے سن کر وہ بولے پھر دو ایک رسمی باتیں کر کے فون بند کر دیا۔

''خیریت! کوئی پرابلم ہے کیا؟'' مونا نے ان سے پوچھا۔

''خیریت ہی ہے۔ اسد بتا رہا تھا کہ اسے سڑک پر ایک زخمی بچہ پڑا ملا تھا۔ کوئی گاڑی والا اسے ٹکر مار کر بھاگ گیا تھا۔ اسد نے اسے دیکھا تو رہ نہیں سکا اور اپنی گاڑی میں ڈال کے اسپتال لے گیا۔ یہاں کی پولیس کا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ مدد کرنے والے کو ہی الٹا مجرم قرار دے کر ستانے کی کوشش کرتی ہے اس لیے اسد پولیس کے چکر سے بچنے کے لیے میرے اسپتال لے گیا تو میں کافی دیر پہلے ہی وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ جونیئر ڈاکٹر رضا نے بچے کو ٹریٹمنٹ دیا ہے۔ اسد کے مطابق بچے کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ ڈاکٹر رضا اسے دیکھ رہا ہے لیکن اسے خدشہ تھا کہ میں پولیس کو انفارم نہ کرنے پر کہیں ناراض نہ ہوں اس لیے اس کی خواہش پر اسد نے فون کر کے مجھے اس واقعے کے بارے میں انفارم کر دیا ہے۔ اصولاً تو میں واقعی اس معاملے میں بہت احتیاط کرتا ہوں کہ کسی پولیس کیس کے بارے میں ضابطے سے ہٹ کر کام کیا جائے لیکن اس وقت مجبوری ہے۔ اسد شاہ کی حیثیت ہونے والے داماد کی سی ہے اس کی درخواست پر مجھے خاموشی ہی اختیار کرنی پڑے گی۔'' یوسف نے مونا کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''بالکل ٹھیک فیصلہ کیا آپ نے۔ اسد کو اتنی گنجائش تو دینی پڑے گی ہمیں۔ پھر اس بے چارے کا قصور بھی نہیں ہے۔ خوامخواہ ذرا سی ہمدردی کے چکر میں پولیس والوں کے جھنجٹ میں پڑ جائے گا۔'' مونا نے فوراً ان کے فیصلے کو سراہا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئے۔

''ویسے اسد ہے بہت نیک دل شخص۔ اس کی سخاوت کے کچھ مظاہرے تو ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، اب ایک اور واقعہ بھی سامنے آ گیا۔ آج کل کون خود کو مصیبت میں ڈال کے یوں کسی راہ چلتے کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے۔ ایسی ہمدردی کے لیے آدمی کا دل بہت بڑا ہونا چاہیے۔ حالات بتاتے ہیں کہ اسد ایسا ہی ہے۔ ایسے لوگ بہت اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔ میری مانیں تو فوراً لبنیٰ کے لیے ہاں کر دیں۔ جہاں تک کل کی پارٹی کا تعلق ہے تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ جوانی میں آدمی کو نت نئے تجربات کرنے کا شوق ہوتا ہے پھر وقت کے ساتھ ساتھ سب بدل جاتا ہے۔'' حالیہ واقعہ سن کر مونا کی اسد کے لیے پسندیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور وہ بھرپور طریقے سے میاں کو کنوینس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''او کے! دیکھتے ہیں اس معاملے کو... بلکہ ایسا ہے کہ اس سنڈے کو میں اسد کو ڈنر پر بلا لیتا ہوں۔ اس دوران تم لبنیٰ کو بھی کنوینس کر لو۔ شادی کے لیے اس کی رضامندی بہرحال ہمیں حاصل کرنی ہو گی۔'' وہ بیگم کے دلائل سے اچھے خاصے قائل ہو گئے تھے چنانچہ پروگرام ترتیب دیا اور خود کو پینٹ شرٹ کی قید سے آزاد کرنے کے لیے وارڈروب سے اپنا کرتہ شلوار نکالنے لگے۔

☆☆☆

''اسد شاہ کی نگرانی کا کام شروع کرنے کے لیے کس طرف کا رخ کیا جائے؟ تمہارے خیال میں اس وقت وہ اپنی کوٹھی پر ہو گا یا آفس جا چکا ہو گا؟'' مہ پارہ نے روشی کی طرف

THE LASERDOT

دیکھتے ہوئے پوچھا اور پھر زور سے ہنس دی۔ صبح سے یہ چھٹی بار تھا جب وہ اسے دیکھ کر ہنسی تھی۔ ہنسنے کی وجہ نہایت معقول تھی۔ بڑے بڑے شیشوں والے رنگین سن گلاسز کے ساتھ روشی کی بے حد پھولی ہوئی ناک خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ حلیے میں تبدیلی کے لیے اس نے ناک کے دونوں نتھنوں کے درمیان اسپرنگ رکھ کر اسے کافی موٹا کرلیا تھا۔

''وہ جہاں بھی ہو، ہمیں اس کی کوٹھی کا ہی رخ کرنا پڑے گا کیونکہ کوٹھی کے علاوہ ہمیں اس کے کسی اور ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔'' مہ پارہ کے ہنسنے کا نوٹس لیے بغیر اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ناک میں موجود اسپرنگز کی وجہ سے اس کی آواز بھی قدرے بدلی ہوئی نکل رہی تھی۔

''اوکے! وہیں چلتے ہیں۔ ویسے یہ کیس ہے خاصا الجھا ہوا۔ ہمیں ایک ایسے شخص پر کام کرنا ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس بنیادی معلومات بھی ڈھنگ سے موجود نہیں ہیں اور قیاس ہے کہ وہ کسی خطرناک کام میں انوالو ہے۔'' گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے مہ پارہ نے کسی بہت بڑے سیکرٹ ایجنٹ کی طرح صورتِ حال پر تبصرہ کیا جسے اسی جیسی سنجیدگی کے ساتھ سن کر روشی نے پورے تدبر کے ساتھ سر ہلایا۔

چالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد روشی کی راہنمائی میں وہ اسد شاہ کی کوٹھی کے قریب پہنچیں۔ مناسب جگہ پر گاڑی کھڑی کرنے کے بعد ان کے پاس صرف یہ کام تھا کہ کوٹھی کے گیٹ کو ٹکٹکی باندھ کے گھورتی رہیں اور انتظار کریں کہ کب اسد شاہ وہاں سے برآمد ہوتا ہے۔ انتظار کی اس کیفیت سے وہ آدھے گھنٹے میں ہی جھنجلا گئیں۔

''یار روشی! ایسا نہ ہو کہ ہم یہاں انتظار ہی کرتے رہیں اور اسد شاہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکا ہو۔'' آخر مہ پارہ نے پہلے زبان کھولی اور اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''ایسا ہو تو سکتا ہے لیکن ہمارے پاس یہاں کھڑے ہو کر انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔''

''ہم کم از کم یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ اندر ہے یا نہیں۔''

''کیسے؟ کیا تم کوٹھی کی بیل بجا کر کسی سے پوچھو گی کہ اسد شاہ گھر میں ہے یا نہیں؟''

''تم دیکھتی رہو۔ میں کیا کرتی ہوں۔'' مہ پارہ اس سے کہتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی اور کوٹھی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ فوراً ہی ایک بندوق بردار چوکیدار نمودار ہوا۔

''کس سے ملنا ہے بی بی؟'' اس نے مہ پارہ کا جائزہ لیتے ہوئے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

''میں ایک این جی او کی طرف سے آئی ہوں۔ ہماری این جی او معذور بچوں اور بے سہارا خواتین کی دیکھ بھال کا کام کرتی ہے۔ اپنی این جی او کے اس نیک مقصد کی خاطر ہمیں صاحبِ حیثیت لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ تم مجھے اپنی مالکن سے ملوا دو۔'' اس نے چوکیدار کے سامنے اپنا سوچا ہوا بہانہ پیش کیا۔

''مالکان ادھر نہیں رہتا ہے۔ ہم تمہیں اس سے نہیں ملوا سکتا۔'' چوکیدار بیزاری سے جواب دیتے ہوئے گیٹ بند کرنے لگا۔

''مالکن نہیں ہے تو صاحب سے ملوا دو۔ صاحب تو موجود ہوں گے؟'' اس کے دروازہ بند کرنے سے قبل اس نے تیزی سے درمیان میں اپنا ہاتھ رکھ کر اسے اس عمل سے روکا اور ساتھ ہی نیا مطالبہ بھی پیش کر دیا۔

''صاحب بھی ابھی گھر پر نہیں ہے۔ وہ سویرے ہی اپنے کام سے چلا گیا تھا۔ تم ہمارا جان چھوڑو اور کسی دوسری کوٹھی والے کے پاس جا کر یہ چندہ شندہ مانگو۔'' چوکیدار کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس کے درمیان .... رکھے ہوئے ہاتھ کی پروا کیے بغیر ہی دھڑ سے گیٹ بند کر دے گا، چنانچہ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی۔ ویسے بھی اسے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔

''کیا رہا؟'' وہ واپس گاڑی میں پہنچی تو روشی نے بے چینی سے پوچھا۔

''میرا خدشہ ٹھیک تھا۔ اسد شاہ کوٹھی میں موجود نہیں ہے۔''

''اوہ! یہ تو مسئلہ ہو گیا۔ اب کیا ہم یہاں انتظار میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہیں؟'' روشی کو یہ خبر سن کر سخت مایوسی ہوئی۔

''لیکن کیسے... گاڑی میں تو مکھیاں بھی موجود نہیں ہیں؟'' مہ پارہ نے گویا ایک عظیم مسئلے کی نشان دہی کی جس کے جواب میں روشی نے آنکھوں پر موجود سن گلاسز اتار کر اسے زوردار طریقے سے گھورا اور پھر سن گلاسز دوبارہ لگا کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ یہ اس کی طرف سے ناراضی کا اظہار تھا۔ مہ پارہ کو یقین تھا کہ عام حالات میں وہ غصے کی اس کیفیت میں اپنی ناک بھی پھلا لیتی لیکن اب وہ پہلے سے ہی اتنی پھولی ہوئی تھی کہ مزید کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

''روشی! میں ایک الجھن محسوس کر رہی ہوں۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے روشی کو پکارا۔

''الجھن کیسی؟ اگر یہاں مارنے کے لیے مکھیاں موجود نہیں ہیں تو تم اپنے سر میں موجود جوؤں کے ڈھیر میں سے تیس چالیس نکال کر انہیں مار سکتی ہو۔ اتنی معمولی تعداد میں قتل و غارت گری سے ان کی گنجان آبادی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔'' روشی نے گویا خود کو تپائے جانے کا بدلہ لیا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ چوکیدار نے یہ کیوں کہا کہ مالکن ادھر نہیں رہتی۔ اسے تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ یہاں کوئی مالکن نہیں ہے۔ ادھر نہیں رہتی سے تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی مالکن ہے جو کہیں اور رہتی ہے۔'' مہ پارہ نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی الجھن بیان کی جسے سن کر روشی بھی چونک گئی۔

''واقعی، یہ تو بہت اہم پوائنٹ ہے۔ اس بات کا مطلب ہے کہ اسد شاہ کی ماں، بہن یا بیوی وغیرہ جیسی کوئی خاتون رشتے دار ہے جسے چوکیدار نے مالکن کہا ہے۔ اگر بیوی والا خدشہ فی الحال ہم نظر انداز کر دیں تو اس کی ماں، بہن یا جو بھی رشتے دار خاتون ہیں ان کا تذکرہ اسد شاہ کو لبنیٰ کی فیملی سے کرنا چاہیے تھا لیکن لبنیٰ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق تو اسد شاہ بالکل تنہا ہے۔ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں اور بہن بھائی کوئی ہے ہی نہیں۔''

''مجھے تو دال میں کافی کچھ کالا لگ رہا ہے۔ اب ہم اس معاملے کو پوری طرح سلجھائے بغیر اپنے مشن سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔'' مہ پارہ نے تشویش سے کہتے ہوئے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس سے قبل کے روشی بھی اس کی تائید کرتی، انہوں نے ایک گاڑی کو آتے دیکھا۔ گاڑی لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر اسد شاہ بیٹھا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والی لڑکی کو روشی نے پہچان لیا۔ وہ کل نیو ایئر پارٹی والی رقاصہ تھی جس نے اس وقت اونچی سی پونی ٹیل کی شکل میں اپنے بال باندھ رکھے تھے اور بلیو رنگ کی جینز پر زرد رنگ کی ہائی نیک پہن رکھی تھی۔ وہ گاڑی کوٹھی کے اندر نہیں لے گئی تھی۔ اسد شاہ نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی اسے بانہوں میں لے کر الوداعی بوسہ دیا اور پھر گاڑی سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار نے باہر گاڑی رکنے کی آواز سن کر ذیلی گیٹ کھول دیا تھا۔ اس گیٹ سے گزر کر اسد شاہ جیسے ہی کوٹھی میں داخل ہوا، لڑکی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس دوران مہ پارہ بھی ایک فیصلہ کر چکی تھی چنانچہ جب لڑکی کی گاڑی ذرا آگے بڑھی تو اس کی گاڑی بھی تعاقب میں تھی۔ محتاط انداز میں تعاقب جاری رکھتے ہوئے اس نے اپنے موبائل پر عروج کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو پارو! کیا بات ہے، سب ٹھیک تو ہے؟'' دوسری طرف سے فوراً کال ریسیو کی گئی اور عروج نے بے قراری سے پوچھا۔

''فی الحال سب ٹھیک ہے، بس پروگرام میں چھوٹی سی تبدیلی ہوئی ہے۔ تمہیں اور لبنیٰ کو فوراً ہماری جگہ اسد شاہ کی کوٹھی کے سامنے پہنچنا ہو گا۔ اگر وہ کہیں جائے تو اس کا تعاقب کرنا۔ فی الحال وہ کوٹھی کے اندر ہی موجود ہے۔'' اپنی بات کہہ کر اس نے فوراً ہی کال منقطع کر دی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ توجہ بٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے کوئی ایسی غلطی کر بیٹھے کہ لڑکی کو اپنے تعاقب کا احساس ہو جائے۔

''اچھا ہے اس چنڈالن کا ٹھکانا معلوم ہو جائے تو ہم انکل اور آنٹی کی آنکھیں کھول سکیں گے۔ ذرا انہیں بھی تو معلوم ہو کہ وہ جس شخص سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ گلچھرے اڑاتا پھر رہا ہے۔'' روشی نے دانت کچکچاتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا جس پر مہ پارہ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور پوری توجہ سے آگے جاتی گاڑی کا تعاقب کرتی رہی۔ آخر گاڑی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔ مہ پارہ نے بھی دو تین منٹ کے وقفے سے اپنی گاڑی وہاں داخل کی۔ اس دوران لڑکی پارکنگ سے نکل کر لفٹ میں داخل ہو چکی تھی۔

''ابھی ابھی اس گاڑی میں جو لڑکی آئی ہے وہ کس اپارٹمنٹ میں رہتی ہے؟ وہ میری بہت اچھی سہیلی ہے۔ کالج کے بعد ہماری ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ آج میں نے اسے سگنل پر دیکھا تو اس کے پیچھے گاڑی دوڑا دی مگر افسوس کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی لفٹ میں اوپر جا چکی تھی۔'' لہجے میں بے حد جوش بھرتے ہوئے اس نے پارکنگ ایریا میں موجود چوکیدار سے لڑکی کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مس نازلی کے بارے میں پوچھ رہی ہیں؟'' چوکیدار نے استفسار کیا جس پر اس نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔ لڑکی کا نام نازلی ہے اسے قطعی علم نہیں تھا لیکن ان لوگوں سے قبل وہی وہاں پہنچی تھی۔

''وہ چوتھے فلور پر فلیٹ نمبر نائنٹی سکس میں رہتی ہیں۔ ابھی پندرہ بیس دن پہلے ہی یہاں آئی ہیں۔'' چوکیدار نے معلومات فراہم کیں جس پر شکریے کے ساتھ اسے پچاس کے نوٹ سے نواز کر وہ دونوں لفٹ میں سوار ہو گئیں۔ لفٹ کے فورتھ فلور پر پہنچنے سے قبل مہ پارہ اپنے ذہن میں موجود منصوبہ مختصر ترین لفظوں میں روشی کو سمجھا چکی تھی۔ چوتھی منزل پر جب وہ دونوں لفٹ سے باہر نکلیں تو حسبِ پروگرام دونوں کا رخ الگ الگ فلیٹوں کی طرف تھا۔ مہ پارہ نے فلیٹ نمبر نائنٹی سکس کی کال بیل بجائی تھی۔ کال بیل کے

جواب میں ذرا سے توقف کے بعد دروازہ کھلا۔

''یس۔'' نازلی سوالیہ صورت لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ہیلو میم! میں یونیورسٹی میں جرنلزم کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ہم لوگ سروے کررہے ہیں کہ ہماری سوسائٹی میں خواتین کو کن کن مشکلات کا سامنا ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی رائے بھی لینا چاہتی ہوں۔'' نہایت مہذب لہجے میں اس نے اپنا تیار کردہ بہانہ پیش کیا۔

''لیکن مجھے تو تمہارے پاس کوئی فائل یا ڈائری وغیرہ نظر نہیں آرہی جس میں تم میری رائے کو نوٹ کرسکو۔'' اس نے دوسرے دروازے کے آگے کھڑی روشی کی پشت کو دیکھتے ہوئے مشکوک لہجے میں اعتراض کیا۔

''ڈائری میرے بیگ میں ہے میم! آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں تو میں اسے باہر نکال لوں گی۔'' اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس کے اعتراض کا جواب دیا۔

''سوری... اس وقت میں بہت مصروف ہوں اس لیے آپ کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کرسکتی۔'' نازلی نے بداخلاقی سے کہتے ہوئے دروازہ بند کرلیا۔

''یہ کیا عورتوں کے مسائل بیان کرے گی؟ ان جیسی تو عورتوں کے لیے مسائل پیدا کرتی ہیں۔'' روشی جس دروازے پر کھڑی تھی، اس سے نکلنے والی خاتون نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''کیا مطلب؟ کیا یہ خاتون کچھ غلط قسم کی ہیں؟'' مہ پارہ تیزی سے پلٹی اور خاتون سے پوچھا۔

''کچھ نہیں کافی غلط قسم کی ہے۔ راتوں کو اس کے پاس مرد آتے ہیں۔ پہلے ایک ہی آتا تھا۔ میں سمجھی کہ شاید چھپ کر شادی وادی کرنے کا چکر ہے اس لیے میاں کبھی کبھار رات کو ملنے آتا ہے مگر کل تو حد ہوگئی۔ میں نے آدھی رات کو مشہور سماجی کارکن برکاتی کو اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں جاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔'' وہ شاید منتظر تھیں کہ یہ سنسنی خیز خبر کسی کو سنائیں چنانچہ آواز دھیمی کرکے راز داری کے ساتھ انہیں بتانے لگیں۔ اس خبر کو سن کر وہ دونوں ہی چونک گئیں۔ برکاتی صاحب کی شہرت کافی اچھی تھی اور ان کے بارے میں یہ خبر سن کر انہیں کافی شدید جھٹکا لگا تھا۔

''آپ کو یقین ہے کہ وہ برکاتی صاحب ہی تھے؟ آپ آدھی رات کے وقت کیا کررہی تھیں کہ آپ کو سامنے والے فلیٹ میں برکاتی صاحب جاتے دکھائی دیے؟'' روشی نے قدرے برہمی سے پوچھا۔

''غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برکاتی صاحب کو پہچاننا کون سا مشکل ہے؟ رہی بات میرے آدھی رات کو باہر جھانکنے کی تو بات یہ ہے کہ میں اپنے میاں کا انتظار کررہی تھی۔ ان کا میڈیکل اسٹور ہے اور وہ راتوں کو کافی دیر سے گھر آتے ہیں۔ میں اکیلی ہوتی ہوں اس لیے ان کے انتظار میں بار بار دروازے کے چکر لگاتی رہتی ہوں۔''

خاتون کی پیش کردہ وضاحت سن کر روشی ڈھیلی پڑگئی اور گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

''آپ کے تعاون کا شکریہ میڈم! آپ نے ہماری سروے رپورٹ کے لیے بڑا اہم پوائنٹ فراہم کیا۔ واقعی عورتوں کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔'' خاتون کو مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر وہ دونوں گم صم سی کیفیت میں وہاں سے پلٹ گئیں۔

☆☆☆

''یہ دونوں پتا نہیں کہاں گئی ہیں؟ یہاں آنے کے چکر میں مسز ربانی کا لیکچر چھوڑنا پڑا ہے۔ میری ان کے پاس اٹینڈنس پہلے ہی شارٹ ہے۔ اگر ایٹی پرسنٹ اٹینڈنس نہیں ہوئی تو وہ مجھے ایگزام میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیں گی۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی لبنیٰ نے اسد شاہ کی کوٹھی کی طرف نظر ڈالتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ وہ بھی روشی کی طرح پھولی ہوئی ناک پر بڑے فریم والا دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ حلیہ تبدیل کرنے کا یہی طریقہ سب سے آسان اور کم وقت لینے والا تھا۔

''ابھی تو تم اسد شاہ سے اپنی خیر مناؤ۔ اگر انکل اور آنٹی اپنے فیصلے پر قائم رہے تو تمہارا یونیورسٹی آنا ہی مشکل ہوجائے گا۔ شادی کے بعد پڑھنا پڑھانا بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔''

عروج نے اسے تصویر کا خوفناک رخ دکھایا تو وہ کانپ سی گئی پھر جھنجلا کر بولی۔ ''میں ہرگز بھی اسد شاہ سے شادی نہیں کروں گی۔ یہ بندہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا اور اب تو مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہے۔ کسی شریف آدمی کو تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے کا خوف نہیں ہوتا۔'' نیو ایئر نائٹ پر اسد شاہ کی جو باتیں اس نے سنی تھیں، وہ پوری طرح ذہن میں موجود تھیں اس لیے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بندہ کچھ غلط قسم کا ہے۔

''ہمیں اسی بات کا تو ثبوت حاصل کرنا ہے اسی لیے تو اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اسد شاہ کی کسی غیر قانونی سرگرمی کا ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو

تمہاری اس سے جان چھوٹ جائے گی۔'' عروج نے جواباً کہا پھر ذرا چونکتے ہوئے بولی۔ ''کوٹھی کا گیٹ کھل رہا ہے۔ لگتا ہے اسد شاہ کہیں جارہا ہے۔'' اس کے توجہ دلانے پر لبنیٰ نے جو پہلے ہی تیار بیٹھی تھی، جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ کوٹھی کے گیٹ سے نکلنے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر اسد ہی موجود تھا۔ وہ دونوں مناسب فاصلہ دے کر اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ پُرہجوم سڑکوں سے گزرتی ہوئی اسد شاہ کی گاڑی ایک ایسے علاقے سے گزرنے لگی جہاں رہائشی بنگلے اور پرائیویٹ اسکولز کثرت سے بنے ہوئے تھے۔ اسکولوں کی چھٹی کا وقت گزر چکا تھا اس لیے علاقے پر ویرانی .... چھائی ہوئی تھی۔ پُرہجوم سڑکوں کے مقابلے میں یہاں اسد کو تعاقب کا احساس آسانی سے ہوسکتا تھا اس لیے لبنیٰ نے اپنی اور اس کی گاڑی کا درمیانی فاصلہ بڑھا لیا تھا۔ اچانک ہی آگے جاتی اسد کی گاڑی رک گئی۔ لبنیٰ نے بھی جلدی سے اپنی گاڑی کو بریکس لگائے۔ اسد شاہ جہاں رکا تھا وہاں کوئی رہائشی بنگلا نہیں تھا۔ اس کی گاڑی ایک اسکول کی عمارت کے ساتھ متصل خالی پلاٹ کے سامنے رکی تھی۔ گاڑی روکنے کے بعد وہ اس سے باہر نکلا اور پھر انہیں اس کے وہاں رکنے کی وجہ سمجھ آگئی۔ وہ چھ سات سال کا ایک بچہ تھا جو اسکول یونیفارم میں شانوں پر بیگ لٹکائے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ اسد شاہ اس بچے کے قریب پہنچا اور اسے پچکارتے ہوئے اس سے سوال جواب کرنے لگا۔ اتنی دور سے وہ دونوں اس کی آواز تو نہیں سن سکتی تھیں لیکن یہ اندازہ ضرور تھا کہ وہ بچے سے اس کے گھر وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ آخر بچے نے رونا بند کردیا اور اسے کچھ بتانے لگا۔ اس کی بات توجہ سے سنتے اسد شاہ نے بات کے اختتام پر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا پھر بڑی محبت اور ہمدردی سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ بچے سمیت گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے گاڑی ایک بار پھر دوڑا دی۔

''یہ تو کافی ہمدرد اور مہربان آدمی لگ رہا ہے۔ جرائم پیشہ لوگ کب اس طرح راہ چلتے کسی سے ہمدردی جتاتے ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اور روشی کو یقیناً اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' اس سارے منظر کو بہ غور دیکھتی عروج نے تبصرہ کیا۔

''حیرت تو مجھے بھی ہے۔ بہرحال، آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا صورتِ حال ہے؟'' لبنیٰ نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور تعاقب جاری رکھا۔ اب گاڑی اس صاف ستھرے علاقے کو چھوڑ کر شہر کے اس حصے کی طرف جارہی تھی جہاں نچلے طبقے کے گھرانوں کی کثرت تھی۔ اس علاقے میں گاڑی چلاتے ہوئے لبنیٰ کو خاصی الجھن محسوس ہورہی تھی۔ دکانوں کے تھلوں پر بیٹھے مرد اور گلیوں میں کھیلتے میلے کچیلے بچے ایک خاتون ڈرائیور کو بڑی پُراشتیاق نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''میں مزید اس علاقے میں نہیں رک سکتی۔'' لبنیٰ نے تعاقب چھوڑ کر یک دم ہی اپنی گاڑی روک لی۔ اسد کی گاڑی آگے بڑھتی رہی اور ایک گلی میں مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''یہ کیا حماقت ہے؟ دیکھنے تو دیتیں کہ اسد شاہ کہاں جارہا ہے۔'' عروج نے خفگی کا اظہار کیا۔

''بچے کو اس کے گھر چھوڑنے گیا ہوگا اور کہاں جائے گا؟'' لبنیٰ نے اسے جواب دیا اور اس نوجوان کو خوں خوار نظروں سے گھورنے لگی جو ان کی گاڑی کے قریب سے سیٹی مارتا ہوا گزرا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنے سن گلاسز اتارنے پڑے تھے۔ نوجوان پر گھورنے کا کیا اثر ہوتا، الٹا اس نے مسکراتے ہوئے لبنیٰ کو آنکھ ماری اور آگے بڑھ گیا۔

''بے ہودہ!'' لبنیٰ بڑبڑائی اور گاڑی کو واپس موڑنے کے لیے تیزی سے بیک کیا۔ پیچھے سے آنے والا شخص بہ مشکل خود کو زد میں آنے سے بچا سکا۔ پھر تلملاتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ والی سائیڈ پر آکر دہاڑا۔

''محترمہ! یہ گاڑی بے شک آپ کے باپ کی ہوگی لیکن سڑکیں اور گلیاں آپ کی جاگیر نہیں ہیں جہاں آپ شتر بے مہار کی طرح دندناتی پھریں۔ اگر میں بروقت سائیڈ پر نہ ہوجاتا تو آپ نے تو مجھے زخمی کرکے یہاں سے بھاگ جانا تھا۔ آپ کا جاتا بھی کیا... لیکن میری بے چاری بوڑھی ماں کو تو مشکل ہوجاتی نا۔''

''سوری مسٹر! میں کچھ جلدی میں تھی۔'' لبنیٰ نے معذرت کرکے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''ارے، آپ تو وہی ہیں نا جو نیو ایئر نائٹ پر اسد صاحب کے ہاں آئی تھیں اور اپنی اونچی ہیل کی وجہ سے گر گئی تھیں۔'' اس نے یک دم ہی جیسے پہچان کے مراحل طے کیے اور حیرت سے بولتا ہوا اسے گھورنے لگا۔

''یہ آپ کی ناک کو کیا ہوا؟ کیا پھر کہیں گر کر چوٹ لگالی تھی جو ناک اس قدر پھول کر کُپا ہورہی ہے؟''

لبنیٰ بھی اس شخص کو پہچان چکی تھی۔ وہ اسد شاہ کا اسمارٹ سا پی اے تھا جو اس دن قیمتی تھری پیس سوٹ کے برخلاف آج گھسی ہوئی جینز اور سستا سا سوئٹر پہنے ہوئے

تھا لیکن اس معمولی لباس میں بھی وہ اسمارٹ ہی لگ رہا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا اپنے باس کے ساتھ آئے ہیں؟'' لبنیٰ نے اس کے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا تاکہ اسد شاہ کی منزل کے بارے میں سُن گُن لے سکے۔

''میں یہیں قریب میں رہتا ہوں۔ رہی باس کے ساتھ آنے کی بات تو شاید آپ اسد صاحب کو میرا باس سمجھ رہی ہیں۔ اصل میں، میں ان کا ملازم نہیں ہوں۔ انہوں نے بس ایک دن کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔'' اس نے لبنیٰ کے سوال کا جواب دیا۔

''میرے خیال میں آپ کہیں جا رہے ہیں۔ چاہیں تو گاڑی میں بیٹھ جائیں، ہم آپ کو آگے تک ڈراپ کر دیں گے۔'' اس کے جواب نے لبنیٰ کو تھوڑی سی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا چنانچہ وہ تفصیل سے سب کچھ جاننے کی خواہاں تھی لیکن اردگرد جس طرح لوگ جمع ہو رہے تھے، اس کو دیکھتے ہوئے وہاں مزید رکنا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا اسی لیے اسے پیش کش کی جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''علی محمد... میں نے اس دن بھی آپ کو بتایا تھا۔'' اس نے تھوڑی سی خفگی کے ساتھ جواب دیا۔

''اوہ یس۔ میں بھول گئی تھی۔ ویری سوری مسٹر علی!'' اس نے فوراً معذرت کرلی اور گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''ہاں تو آپ بتا رہے تھے کہ آپ مسٹر اسد کے مستقل ملازم نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف ایک دن کے لیے آپ کی خدمات مانگی تھیں... تو کیا وہ آپ کے واقف کار ہیں؟''

''نہیں، وہ مجھے یہیں ملے تھے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ چائے کے ہوٹل پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ مجھے تم جیسے اسمارٹ نوجوان کی ضرورت ہے جو ایک دن کے لیے میرے پی اے کا رول کر سکے۔ ان کی پیش کش مناسب تھی اس لیے میں نے قبول کرلی۔ پارٹی پر میری کارکردگی انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی ضرورت پڑی تو وہ میری خدمات ضرور لیں گے۔'' اس نے سادگی سے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اسد صاحب کا اس علاقے میں مستقل آنا جانا لگا رہتا ہے؟'' عروج جواب تک خاموش بیٹھی تھی، بول پڑی۔

''مستقل کا تو معلوم نہیں لیکن دو ایک بار میں نے انہیں چائے کے ہوٹل پر دیکھا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ ہمیں اپنا پتا اور فون نمبر نوٹ کروا دیں مسٹر علی! ہوسکتا ہے کہ کبھی ہمیں کوئی کام پڑ جائے تو ہم آپ کی خدمات سے استفادہ کرسکیں۔''

''بالکل میڈم، وائے ناٹ۔ میں آج کل جاب کی تلاش میں ہوں اگر آپ کو ضرورت پڑنے تک بھی بے روزگار ہی رہا تو بہت خوشی سے آپ کا کام کروں گا۔'' اس نے فوراً ہی جواب دیا اور اپنا پتا اور فون نمبر نوٹ کروانے لگا۔

☆☆☆

''معاملہ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ آخر اسد شاہ ایسا کیا کام کرتا ہے جو اسے نازلی کے ذریعے برکاتی صاحب کو گھیرنے کی ضرورت پڑ رہی ہے؟ تمہاری فراہم کردہ معلومات کے مطابق تو وہ ہوٹل کے بزنس میں دلچسپی رکھتا ہے اور برکاتی صاحب کا سرے سے اس کاروبار سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ وہ بھلا اس کے کام کیسے آسکتے ہیں؟'' وہ چاروں ایک جگہ جمع تھیں اور آپس میں آج کی تمام کارروائی کی رپورٹس شیئر کرنے کے بعد مہ پارہ نے یہ نکتہ اٹھایا تھا۔

''دوسرے اس کا اور نازلی کا چکر بھی سمجھ نہیں آرہا۔ وہ دونوں آپس میں جتنے بے تکلف ہیں اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی خاص تعلق ہے... ایسا تعلق جس کے بعد اسد کی زندگی میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں نکلتی پھر کیوں وہ تم سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے؟'' یہ دوسرا سوال عروج نے اٹھایا تھا، اس کا روئے سخن بھی لبنیٰ کی طرف تھا۔

وہ اس صورتِ حال پر جھنجلا گئی اور تڑخ کر بولی۔ ''مجھے کیا معلوم کہ وہ کیوں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ ممی اور ڈیڈی کا اس پر بری طرح دل آچکا ہے۔ وہ لوگ ہر وقت اس کی رحم دلی اور خدا ترسی کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ ابھی کل ہی ممی مجھے بتا رہی تھیں کہ اس نے سڑک پر زخمی پڑے کسی بچے کو اسپتال لا کر اس کا ٹریٹمنٹ کروایا تھا۔ ان کے سامنے اگر میں نازلی کے حوالے سے اسد کے کردار پر کوئی شک ظاہر کروں گی تو وہ میری بات پر ہرگز بھی یقین نہیں کریں گی۔ ان کے نزدیک تو وہ بہت ہی نیک شخص ہے۔''

''یہ بات کسی حد تک درست بھی لگتی ہے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ کیسے وہ راہ چلتے ایک بچے کو روتا ہوا دیکھ کر رک گیا تھا اور اسے بڑی ہمدردی سے اپنی گاڑی میں لفٹ بھی دی تھی۔'' عروج نے اسے یاد دلایا تو وہ چپ

رہ گئی۔ واقعی اس واقعے کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ پھر اسد اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے اس لیے یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کی وہ ہمدردی دکھاوے کے لیے تھی۔

''یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ بہت سے لوگ متضاد شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اسد بھی مجھے انہی لوگوں میں سے لگتا ہے۔ ایک طرف وہ ہمدرد اور خدا ترس ہے تو دوسری طرف اخلاقی کج روی کا شکار ہے۔ عورتوں کے معاملے میں تو یوں بھی بڑے بڑوں کی عقل جواب دے جاتی ہے۔ اب برکاتی صاحب کو ہی لے لو، کتنے نیک آدمی مشہور ہیں لیکن نازلی کی پڑوسن نے ہمیں ان کے بارے میں کیا بتایا ہے۔ انہوں نے نازلی کے اپارٹمنٹ میں رات گزاری ہے تو اس میں ان کی مرضی بھی تو شامل ہوگی۔ آدمی کے اپنے کردار میں کوئی کمی ہوتی ہے تو وہ بری عورت کے چکر میں پھنستا ہے۔''

''یہی تو اہم مسئلہ ہے۔ ہمیں اسد شاہ کے کردار کی طرف سے اطمینان نہیں اسی لیے لبنیٰ کی اس سے شادی رکوانا ضروری ہے لیکن یہ کام تب ہی ہوسکتا ہے جب ہمارے پاس کوئی ثبوت ہو۔'' روشی کی بات کے جواب میں عروج نے جوش وخروش سے کہا۔

''تو اس کا ایک حل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اب جب ہم اس کے تعاقب کے لیے جائیں تو اپنے ساتھ کیمرا رکھیں اور جیسے ہی وہ کوئی غیر اخلاقی حرکت کرتا ہوا نظر آئے، اس کی تصویر کھینچ کر ثبوت کے طور پر انکل اور آنٹی کے سامنے پیش کر دیں۔'' روشی نے جھٹ تجویز پیش کی جسے سب نے پسند کیا۔

''ٹی وی کی آواز تو بڑھا دو یار! کب سے بے چارہ کسی گونگے کی طرح چل رہا ہے۔'' گفتگو نتیجہ خیز پوائنٹ پر آکر اختتام پذیر ہوئی تو عروج کو بہت دیر سے بند والیوم کے ساتھ چلتے ٹیلی ویژن کا خیال آیا پھر اس نے خود ہی ریموٹ اٹھا کر آواز بڑھا دی۔ کوئی نیوز چینل لگا ہوا تھا جس پر اس وقت تفصیلی خبریں پیش کی جارہی تھیں۔

''کوئی اور چینل لگاؤ بھئی۔ میرا اس وقت قتل و غارت گری کی... خبریں سننے کا قطعی موڈ نہیں ہو رہا۔'' کمر کے پیچھے تکیہ لگا کر آرام دہ پوز میں بیٹھتے ہوئے روشی نے فرمائش کی جس پر عمل کرنے کے لیے عروج نے دوبارہ ریموٹ اٹھایا ہی تھا کہ نیوز ریڈر کی زبان سے ادا ہونے والی اگلی خبر نے اسے بٹن دبانے سے روک دیا۔

''برکاتی ویلفیئر ہوم سے تین سگے بہن بھائی حیرت انگیز طور پر غائب!'' اس ہیڈ لائن کے ساتھ مخصوص سنسنی

''مزید پریشانی''

ٹیچر نے بچے کی رپورٹ کارڈ اس کے والدین کو بھیجتے ہوئے لکھا:

''آپ کا بچہ نہ صرف بے انتہا شریر، جھگڑالو، بدتمیز اور نالائق ہے بلکہ اس کی ایک اور بری عادت یہ بھی ہے کہ نہایت باقاعدگی سے اسکول آتا ہے۔''

خیز میوزک بجا اور پھر نیوز ریڈر نے خبر کی تفصیل بتانا شروع کردی۔

''برکاتی ویلفیئر ہوم سے تین سگے بہن بھائی جن میں آٹھ سالہ صائمہ، سات سالہ احمد اور پانچ سالہ ساجد شامل ہیں، حیرت انگیز طور پر غائب ہوگئے۔ بچوں کے غائب ہونے کا علم اس وقت ہوا جب ان کے والدین ان سے ملنے کے لیے برکاتی ویلفیئر ہوم پہنچے۔ ویلفیئر ہوم کے عملے نے بچوں کے بارے میں قطعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے والدین کو جھڑک دیا۔ تفصیلات کے مطابق تین ماہ قبل بچوں کی ماں اپنے شوہر کی طویل بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آنے کے بعد انہیں یتیم ظاہر کر کے برکاتی ویلفیئر ہوم چھوڑ گئی تھی۔ بچوں کے والد کو نوکری ملتے ہی وہ لوگ سب سے پہلے اپنے بچوں کو لینے ویلفیئر ہوم پہنچے لیکن وہاں انہیں اپنے بچے نہ مل سکے۔'' وہ چاروں نہایت دلچسپی سے یہ خبر سن رہی تھیں۔ اب اسکرین پر بچوں کے والدین کو دکھایا جارہا تھا۔ دبلے پتلے، معمولی لباس پہنے دونوں میاں بیوی غربت کی منہ بولتی تصویر تھے۔

''گھر میں فاقے ہو رہے تھے۔ بچے روٹی کے لیے روتے تھے۔ تنگ آکر میرے شوہر نے مجھ سے کہا کہ بچوں کو کسی یتیم خانے چھوڑ آ۔ ادھر کم سے کم انہیں پیٹ بھر کے کھانا تو ملے گا۔ میرا جی نہیں مانتا تھا لیکن بچوں کو فاقوں سے بلکتا دیکھ کر میں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ ملنے بھی نہیں جاتی تھی کہ بچے مجھے دیکھیں گے تو میرے ساتھ گھر واپس جانے کی ضد کریں گے۔ بچوں کے آرام کی خاطر میں خود پر جبر کرتی رہی لیکن مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ یہ ظالم میرے بچے ہی غائب کر دیں گے۔ ایک ایک سے پوچھتی ہوں مگر کوئی کچھ بتاتا ہی نہیں۔'' دبلی پتلی سانولی سی وہ عورت اتنی بات بتا کر چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

''یہ کہتے ہیں بچے ادھر لائے ہی نہیں گئے۔ حالانکہ میں خود اپنی گھر والی اور بچوں کو یتیم خانے کے دروازے تک چھوڑ کر گیا تھا۔ آپ بتائیں، میں یہ بات کیسے مان سکتا ہوں کہ

میرے بچے یہاں نہیں ہیں۔ میری حکومت سے درخواست ہے کہ وہ میرے بچوں کو بازیاب کروائے۔'' بچوں کا باپ ویران آنکھوں کے ساتھ درخواست کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی اور خوف ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ طویل بے روزگاری کے بعد اس نئی مصیبت میں پھنس جانے والے اس مفلوک الحال شخص کو ظاہر ہے کہیں سے کوئی مدد ملنے کی امید نہیں تھی پھر بھی وہ اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

''ویلفیئر ہوم کے عملے اور ان مظلوم والدین کے بیانات کے درمیان جو اختلاف ہے، اس پر گفتگو کرنے کے لیے ہم برکاتی ویلفیئر ہوم کے روحِ رواں جناب منیر برکاتی کے پاس اپنے ناظرین کو لیے چلتے ہیں۔'' بچوں کے والدین کا بیان لیتے کمپیئر نے کیمرے کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا اور پھر اسکرین کا منظر بدل گیا۔ اب وہاں ایک دفتر کا منظر نظر آ رہا تھا جہاں برکاتی صاحب ایک بڑی سی میز کے پیچھے اجلے لباس میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''جی برکاتی صاحب! آپ اس واقعے کے بارے میں کیا کہیں گے؟ ایک جوڑے کے تین لختِ جگر غائب ہو گئے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو برکاتی ویلفیئر ہوم چھوڑ کر گئے تھے لیکن اب انہیں وہاں سے اپنے بچوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں مل رہی۔'' تیز و طرار کمپیئر نے برکاتی صاحب کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''واقعہ واقعی بے حد افسوسناک ہے۔ حکومت کو روز بروز .... بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور غربت کا کوئی مؤثر حل نکالنا چاہیے۔ یہ حالات جن میں والدین خود اپنے بچوں کو یتیم قرار دینے پر مجبور ہو جائیں، نہایت قابلِ مذمت ہیں۔'' برکاتی صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ بچوں کے برکاتی ویلفیئر ہوم سے غائب ہونے کے سلسلے میں کیا کہیں گے؟'' برکاتی صاحب کو لمبی تمہید کے لیے پر تولتے دیکھ کر نیوز چینل کے نمائندے نے درمیان میں دخل اندازی کر کے انہیں اصل موضوع پر لانے کی کوشش کی۔

''دیکھیں اس بارے میں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کو کوئی زبردست غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں برسوں سے یہ ویلفیئر ہوم چلا رہا ہوں۔ ملک بھر میں ہماری کئی برانچز کام کر رہی ہیں۔ ہمارا سارا کام نہایت مربوط طریقے سے ہوتا ہے۔ اگر بچے میرے ادارے میں لائے گئے ہوتے تو ان کا مکمل ریکارڈ موجود ہوتا لیکن ریکارڈ میں ایسا کچھ موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان صاحبان کی بتائی ہوئی تاریخ پر تین بچے یتیم خانے میں لائے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے بچے شہر کے کسی اور یتیم خانے میں داخل کروائے ہوں اور اب بھول گئے ہوں کہ وہ کون سا یتیم خانہ تھا۔'' انہوں نے اپنے ادارے کا دفاع کیا۔

''کیا یہ ممکن ہے برکاتی صاحب کہ صرف چند ماہ کے عرصے میں بچوں کے والدین یہ بات بھول گئے ہوں کہ انہوں نے اپنے بچے کہاں چھوڑے تھے؟ یہ کوئی ایسی شے تو نہیں جو بھلا دی جائے۔''

''دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔ آپ بچوں کے والدین کی اس وقت کی ذہنی حالت کے بارے میں تو غور کریں جب انہوں نے اپنے بچے یتیم خانے میں بھرتی کروائے تو وہ ذہنی طور پر بے حد پریشان تھے اس لیے ممکن ہے کہ انہیں دھیان ہی نہ رہا ہو کہ انہوں نے بچوں کو کس یتیم خانے میں چھوڑا ہے۔ اب چونکہ شہر میں میرا ادارہ ہی سب سے زیادہ مشہور ہے تو ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ انہوں نے بچوں کو برکاتی ویلفیئر ہوم میں چھوڑا تھا۔'' انہوں نے نہایت سلجھے ہوئے لہجے میں دلیل دی۔

''کیا آپ اپنے عملے سے مکمل طور پر مطمئن ہیں؟ عموماً ایسے اداروں میں نچلا اسٹاف کرپشن میں ملوث ہوتا ہے۔'' نیوز چینل کے نمائندے نے محتاط لہجے میں سوال کیا جس کے جواب میں برکاتی صاحب کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

''آپ قطعی بے بنیاد الزام لگا رہے ہیں۔ میرے ادارے کی ملک بھر میں ایک ساکھ ہے۔ یہاں کام کرنے والے تنخواہ سے زیادہ جذبۂ خدمت کے تحت کام کرتے ہیں۔ اس لیے کسی کو حق نہیں کہ ان پر کسی قسم کے شک کا اظہار کرے۔'' ان کا لہجہ کافی بلند ہو گیا تھا۔

''ناظرین! آپ نے دیکھا کہ بڑھتی ہوئی غربت اور بے روزگاری معاشرے میں کیسے کیسے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ آمنہ بی بی اور مختار کے بچے بھی ان بلاؤں کا شکار ہو کر اپنے والدین کی آغوش سے محروم ہو گئے۔ ماں باپ کی نگاہیں اپنے جگر پاروں کی تلاش میں بھٹک رہی ہیں۔ ہمارے چینل کی طرح اور کون ہے جو اس تلاش میں ان کا ساتھ دے گا؟'' نیوز چینل کا نمائندہ پیشہ ورانہ انداز میں، لگے ہاتھوں اپنے چینل کی تعریف و توصیف بھی کر رہا تھا۔ مزید چند سیکنڈ میں یہ رپورٹ ختم ہو گئی اور خبروں کا سلسلہ آگے چل پڑا۔

''ویری سیڈ! بے چارے غریب والدین کہاں اپنے بچوں کو ڈھونڈتے پھریں گے؟ مجھے لگتا ہے کہ برکاتی ویلفیئر ہوم کے اسٹاف نے کوئی ہاتھ دکھایا ہے۔ انہوں نے دیکھا ہو

گا کہ بچوں سے کوئی ملنے نہیں آتا تو انہیں لاوارث سمجھ کر ادھر ادھر کر دیا ہوگا۔ میں بہرحال یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کوئی ماں باپ اس جگہ کو بھول گئے ہوں جہاں انہوں نے اپنے بچے چھوڑے تھے۔'' رپورٹ ختم ہوئی تو عروج نے گہرا سانس لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''مگر برکاتی صاحب تو یہ بات ماننے کے لیے راضی ہی نہیں۔ انہوں نے تو اپنے اسٹاف پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے۔'' روشی نے اعتراض کیا۔

''انہوں نے اپنے ادارے کے تحفظ کے لیے ایسا ہی بیان دینا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ذاتی طور پر یہی خیال کرتے ہوں لیکن ذرا سوچو، ان کے ادارے کی اتنی شاخیں ہیں۔ وہ کون سا وہاں کام کرنے والے ایک ایک بندے سے ذاتی طور پر واقف ہوں گے۔ اتنے لوگوں کو سنبھالنا اور انہیں جاننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' لبنیٰ نے عقیدت مندی میں برکاتی صاحب کی حمایت کی۔

''اگر ان میں ایک اچھے نگراں کی خصوصیات موجود نہیں ہیں تو انہیں اپنے ادارے کو اتنی وسعت نہیں دینی چاہیے تھی۔ یہ کہہ دینے سے کہ اکیلا بندہ اتنے سارے لوگوں کو کیسے دیکھ سکتا ہے، جان نہیں چھوٹنے والی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کے زیرِ نگرانی موجود اسلامی ریاست کتنی وسیع تھی پھر بھی وہ کہا کرتے تھے کہ دجلہ کے کنارے اگر ایک بکری کا بچہ بھی بھوکا رہ گیا تو اس کا حساب عمرؓ سے ہوگا۔'' روشی نے فوراً دلیل دیتے ہوئے لبنیٰ کی بات رد کی۔ اس کی دی ہوئی دلیل ایسی تھی کہ لبنیٰ مزید کچھ نہیں کہہ سکی۔

☆☆☆

''کیا مصیبت ہے یار! صبح آٹھ بجے سے یہاں آ کر جمے ہوئے ہیں لیکن اسد شاہ کی کوٹھی کا گیٹ ایسے بند ہے جیسے غریبوں کے لیے انصاف کا دروازہ۔ لگتا ہے آج اس کا اپنی کوٹھی سے باہر نکلنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔'' انتظار کے طویل دورانیے سے اکتا کر لبنیٰ نے بیزاری سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''ایسا کرو اسے اطلاع بھجوا دو کہ تم اس کے انتظار میں دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھی ہو۔ دیکھنا فوراً سر کے بل چلتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل آئے گا۔'' عروج نے اسے چھیڑا۔

''سوری، میرا فی الحال سرکس دیکھنے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔'' لبنیٰ نے خشک لہجے میں جواب دیا تو عروج مسکرا دی۔ ان سب کو معلوم تھا کہ وہ اسد کے لیے اپنے دل میں اتنی شدید ناپسندیدگی رکھتی ہے کہ اس کے حوالے سے چھیڑے جانے کو قطعی برداشت نہیں کر پاتی۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اسد کوٹھی میں موجود ہی نہ ہو۔ نازلی کی پڑوسن کے مطابق کوئی مرد اکثر رات کو اس کے فلیٹ پر وقت گزارتا ہے۔ اسد کی اور اس کی دوستی دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مرد اسد ہی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے گزشتہ رات اسد نے اپنی کوٹھی کے بجائے نازلی کے اپارٹمنٹ میں گزاری ہو اور اب بھی وہیں ہو۔ ایسے میں ہمارا یہاں انتظار کرتے رہنا تو فضول ہی جائے گا۔ ہمیں اگر اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے ہیں تو نازلی کے اپارٹمنٹ چلتے ہیں، ہو سکتا ہے وہاں کسی طرح ہمیں ان دونوں کی تصاویر اتارنے کا موقع مل جائے۔'' عروج کی مسکراہٹ کو قطعی نظرانداز کرتے ہوئے لبنیٰ نے تجویز پیش کی۔

''آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن پہلے یہ تو کنفرم ہونا چاہیے کہ اسد واقعی اپنی کوٹھی میں موجود نہیں ہے جبھی ہم یہاں سے ہٹنے کا فیصلہ کر سکیں گے۔'' عروج نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

''ٹھیک ہے، میں معلوم کرتی ہوں۔'' لبنیٰ گاڑی سے اتر گئی۔ پھولی ہوئی ناک اور بڑے شیشوں والی عینک کی وجہ سے وہ خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ فوراً ہی بندوق بردار چوکیدار گیٹ سے برآمد ہوا۔

''میں ایک یتیم خانے کی طرف سے آئی ہوں۔ ہم یتیم بچوں کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ تم مجھے اپنے صاحب یا بیگم صاحبہ سے ملوا دو تاکہ میں ان سے اس سلسلے میں بات کر سکوں۔'' چوکیدار کے سامنے اس نے گھڑا گھڑایا بہانہ پیش کیا۔

''صاب لوگ گھر پر نہیں ہے... تم بعد میں آنا۔'' چوکیدار نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

''دیکھو خان! بہانہ مت بناؤ۔ سردی کے دن ہیں، بے چارے چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کے پاس گرم کپڑے اور بستر تک نہیں ہیں۔ اگر تم مجھے اپنے مالکوں سے ملوا دو گے تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ لوگ یتیم بچوں کی مدد کریں گے تو ان کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ثواب ملے گا۔'' چہرے پر دنیا بھر کی

نظریۂ ضرورت

فقیر عورت سے بولا۔ ''آپ کے پاس کوئی پھٹا پرانا کوٹ ہو تو مجھ غریب کو دے دو۔''

عورت نے کہا۔ ''مگر آپ نے جو کوٹ پہنا ہوا ہے وہ تو نیا ہے۔''

فقیر نے کہا۔ ''آپ کا کہنا بجا ہے۔ بیگم صاحبہ مگر اس نئے کوٹ نے ہی میرا دھندا چوپٹ کر رکھا ہے۔''

مظلومیت طاری کرتے ہوئے اس نے چوکیدار سے اصرار کیا تاکہ اسد کی کوٹھی پر عدم موجودگی کو حتمی طور پر کنفرم کر سکے۔

''خوچا! ہم جھوٹ نہیں بولتا اے۔ صاب تو رات سے ہی نہیں ہے پر اب تم نے ثواب کا ذکر کیا ہے تو ہم ایسا کرتا ہے کہ اپنے پاس سے تمہیں کچھ دے دیتا ہے۔'' چوکیدار نے اس بار ذرا نرم لفظوں میں اسے یقین دہانی کروائی اور پھر اپنی جیب ٹٹول کر بڑے اہتمام سے تہ کر کے رکھا ہوا دس کا نوٹ نکال کر لبنیٰ کو پیش کیا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے وہ نوٹ پکڑ لیا۔ اپنے جھوٹ کے بدلے اس کا اتنے خلوص سے پیش کیا ہوا نوٹ لینے میں شرمندگی محسوس ہو رہی تھی لیکن اب انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ دل ہی دل میں اس نوٹ کو خیرات کر دینے کی نیت کرتے ہوئے وہ وہاں سے پلٹنے لگی تھی کہ چوکیدار کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''ہمیں اس دس روپے کا رسید تو دے کر جاؤ۔'' وہ بڑے ٹھسے کے ساتھ اس سے مطالبہ کر رہا تھا جسے سن کر وہ گڑبڑا گئی۔ پھر ذرا سنبھلتے ہوئے اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھول کر اسے ٹٹولنے لگی۔

''معاف کرنا خان! میں رسید بک ساتھ لانا بھول گئی ہوں۔'' ایک ڈیڑھ منٹ کی فرضی تلاش کے بعد اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''ہمیں تو تم کوئی فراڈی لڑکی لگتا ہے۔ یتیم بچوں کا بہانہ بنا کر لوگوں سے روپیا بٹورتا ہے۔ لاؤ ہمارا دس روپیا واپس کرو۔'' خان جو اسے بڑی جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا، غضب ناک ہو کر بولا اور اس کے ہاتھ میں موجود دس کا نوٹ واپس جھپٹ لیا۔ شرمندہ سی لبنیٰ کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا اور وہ ایک آڑ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' عروج نے جو دور سے سارا منظر دیکھ رہی تھی، اس کی خفت زدہ شکل دیکھ کر پوچھا۔

''اسد اندر موجود نہیں ہے۔ وہ رات سے واپس نہیں آیا۔''

''اوہو! جب ہی تمہارا منہ اتنا لٹکا ہوا ہے۔ جیلس ہو رہی ہو کہ ہونے والا منگیتر اپنی راتیں نازلی کے ساتھ رنگ رلیوں میں گزار رہا ہے۔'' وہ جانتی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہی ہو گا پھر بھی لبنیٰ کو چھیڑنے سے باز نہیں آئی۔

''جلتی ہے میری جوتی۔ مجھے تو اس چوکیدار کے بچے نے شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے۔'' لبنیٰ تڑخ کر بولی پھر خود ہی سارا واقعہ سنا دیا جسے سن کر عروج خوب ہنسی۔

وہ بولی۔ ''چلو جانے دو۔ ہمیں اصل بات تو معلوم ہی ہو گئی ہے کہ اسد کوٹھی میں موجود نہیں ہے۔ اب یہاں سے نکلتے ہیں اور مہ پارہ سے پتا معلوم کر کے نازلی کے اپارٹمنٹ پہنچتے ہیں۔'' اس کی بات مکمل ہوتے ہی لبنیٰ نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی جبکہ عروج موبائل پر مہ پارہ سے بات کرنے لگی۔

''سحر اپارٹمنٹس چلنا ہے۔ نازلی کی رہائش وہیں پر ہے لیکن وہاں جانے سے پہلے راستے میں کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور پر گاڑی روک لینا۔ وہاں سے ہمیں کچھ چیزیں لینی پڑیں گی۔'' موبائل آف کرنے کے بعد اس نے لبنیٰ سے کہا جس نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسٹور سے سرف کے کئی پیکٹس خرید کر انہیں ایک بڑے سے تھیلے میں رکھ کر وہ اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔ راستے میں عروج نے اسے اس خریداری کے مقصد سے آگاہ کیا۔

''ہمیں پہلے یہ کنفرم کرنا ہو گا کہ نازلی اپنے اپارٹمنٹ میں ہے یا نہیں، تب ہی ہم آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے ورنہ خوامخواہ وقت ضائع ہو گا۔''

''بالکل صحیح۔'' لبنیٰ کو یہ حکمتِ عملی پسند آئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ سحر اپارٹمنٹس پہنچیں تو اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار تھیں۔ ان کی منزل چوتھی منزل پر واقع نازلی کا اپارٹمنٹ تھا۔ اپارٹمنٹ کی بیل کئی بار بجانے پر بھی اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو عروج نے مایوس ہو کر سامنے والے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجائی۔ فوراً ہی خاتون خانہ برآمد ہوئیں۔

''ہم سرف کمپنی کی طرف سے آئے ہیں۔ بازار میں ہماری کمپنی کا سرف جس قیمت پر مل رہا ہے، اسی قیمت میں ہم ایک کے بجائے دو پیکٹ دیں گے۔'' سیلز گرلز کے مخصوص اسٹائل میں لبنیٰ نے خاتون کو پرچایا۔

''کہیں دو نمبر سرف تو نہیں لائی ہو تم لوگ؟'' خاتون نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''بالکل نہیں... آپ چیک کر سکتی ہیں۔'' عروج نے تھیلے میں سے پیکٹ نکال کر انہیں دکھایا جس کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے آٹھ پیکٹ دے دو... میرا مطلب ہے میں چار خریدوں گی اور چار تم ساتھ میں فری دو گی تو اس طرح آٹھ ہو جائیں گے۔'' انہوں نے جھٹ معاملہ طے کیا جس پر عروج نے فوراً تھیلے میں سے آٹھ پیکٹ نکال کر ان کے حوالے کر دیے۔

''یہ آپ کے سامنے والے شاید موجود نہیں ہیں۔ ہم نے کئی بار بیل بجائی مگر کسی نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔'' جب خاتون آٹھ پیکٹ وصول کرنے کے بعد چار کی قیمت ادا کر رہی تھیں تو عروج نے ان سے دریافت کیا۔

''وہ گھر پر ٹکتی ہی کہاں ہے؟ گئی ہو گی کہیں مٹرگشت کرنے۔ ویسے تم افسوس مت کرو۔ وہ ہوتی، تب بھی تمہارا سرف نہیں خریدتی۔ اس جیسی ماری ماری پھرنے والی عورتوں کو کون سے کپڑے لتے دھونے کی فکر ہوتی ہے جو ایسی خریداریاں کرتی پھریں۔'' یہ وہی خاتون ہیں جو کل روشی اور مہ پارہ سے ملی تھیں، اس کا اندازہ انہیں ان کی باتوں سے ہو چکا تھا چنانچہ اپنے مطلب کی معلومات حاصل ہونے پر مسکراتی ہوئی پلٹنے لگیں۔

''اے لڑکی... بات سنو!'' خاتون کی آواز سن کر انہیں رکنا پڑا۔

''کیا تمہاری کوئی بہن بھی ہے جو یونیورسٹی میں پڑھتی ہے؟'' ان کا روئے سخن لبنیٰ کی طرف تھا۔

''جی نہیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں۔'' لبنیٰ نے ناسمجھی میں جواب دیا۔

''اچھا اچھا۔'' خاتون نے زور زور سے سر ہلایا۔ ''اصل میں کل یونیورسٹی سے دو لڑکیاں سروے کرنے آئی تھیں۔ ان میں سے ایک کی ناک بالکل تمہاری طرح پھولی ہوئی تھی اور اس نے چشمہ بھی ایسا ہی لگایا ہوا تھا تو مجھے لگا کہ شاید وہ تمہاری بہن ہو گی۔'' انہوں نے وضاحت پیش کی جس کے جواب میں کچھ بھی کہے بغیر وہ دونوں واپس پلٹ گئیں۔

''کیا کہنے ہیں روشی کے فن میک اپ کے۔ بالاجی والوں کو چاہیے کہ روشی کی خدمات فوراً حاصل کر لیں۔ اپنے ڈراموں کے اداکار غائب ہو جانے کی وجہ سے انہیں آئے دن ڈپلیکیٹ کی ضرورت رہتی ہے۔ روشی آسانی سے ان کا یہ مسئلہ حل کر دے گی۔'' لفٹ میں سوار ہوتے ہی عروج نے بلند قہقہہ مارا۔ نتیجتاً اس کی ناک کے نتھنے میں پھنسا ہوا اسپرنگ باہر نکل کر گر گیا۔

☆☆☆

''ایک بری خبر ہے لبنیٰ!''

''کک... کیا ہوا؟'' مہ پارہ کی طرف سے آنے والی بے وقت کال اور اس پر..... اس جملے پر لبنیٰ بری طرح گھبرا گئی۔ اسد اور نازلی دونوں کے اپنے ٹھکانوں سے غائب ہونے کی وجہ سے ان کے سارے ارادے ٹھپ ہو کر رہ گئے تھے اور وہ اچھے بچوں کی طرح باقی وقت یونیورسٹی میں گزار کر واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئی تھیں۔ آئندہ کا لائحہ عمل کل اسد کے ملنے یا نہ ملنے کی صورت میں طے کیا جاتا مگر ابھی تو وہ اس بری خبر میں الجھی ہوئی تھی جس کی اطلاع مہ پارہ دے رہی تھی۔

''سمیر کو شاید کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ اسکول گیا تھا لیکن واپس گھر نہیں آیا۔ ڈرائیور اسے لینے اسکول گیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ روشی کے گھر والوں نے اسے ہر جگہ تلاش کر لیا ہے لیکن اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔''

''لیکن وہ اسکول سے کہاں جا سکتا ہے؟ اسکول مینجمنٹ سے اس بارے میں کسی نے پوچھا نہیں؟'' لبنیٰ نے پریشانی کی کیفیت میں پوچھا۔

''اسکول مینجمنٹ کا تو عثمان انکل نے ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔ سمیر کے اسکول کے آنر کو باقاعدہ تھانے بلوا لیا گیا تھا لیکن اس سب سے کیا حاصل؟ اصل بات تو یہ ہے کہ سمیر غائب ہے اور کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ پولیس کی تفتیش سے بس اتنی بات سامنے آئی ہے کہ سمیر اور اس کے دو دوست بریک ٹائم میں کسی طرح اسکول سے نکل گئے تھے۔ بریک کے بعد ان لوگوں کا لائبریری کا پیریڈ تھا اس لیے فوری طور پر کسی کو ان کے غائب ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ نیکسٹ پیریڈ میں جب پتا چلا تو اسکول میں کھلبلی مچ گئی۔ اسکول کے اندر اور ارد گرد کے علاقے میں چوکیدار کی مدد سے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بچے نہیں ملے۔ آخر تنگ آ کر مینجمنٹ نے بچوں کے گھر فون کر کے واقعے کے بارے میں اطلاع دے دی۔ آسیہ آنٹی گھر پر نہیں تھیں اور ان کا موبائل بھی آف تھا اس لیے انہیں اطلاع نہیں مل سکی۔ اسکول والے پریشان تھے کہ کیا کریں... اسی دوران باقی دو بچوں کے گھر سے فون آ گیا کہ بچے گھر پہنچ چکے ہیں، بس وہ ایڈونچر میں اسکول سے بھاگے تھے۔ اسکول مینجمنٹ کا خیال تھا کہ سمیر بھی اپنے گھر واپس پہنچ چکا ہو گا لیکن وہ نہیں پہنچا تھا اور اب بھی اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔'' مہ پارہ نے تفصیل بتائی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ اس سیکیورٹی لیک پر اسکول مینجمنٹ کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی ہونی چاہیے۔'' لبنیٰ کو اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو اسکول والوں پر ہی غصہ کرنے لگی۔

''یہ بات تو اپنی جگہ ہے لیکن اس وقت اصل مسئلہ سمیر کے ملنے کا ہے۔ پریشانی میں عثمان انکل شہر کے تمام اسپتالوں سمیت مردہ خانے تک چیک کر آئے ہیں کہ اگر خدانخواستہ سمیر کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے تو معلوم ہو جائے لیکن ان

جگہوں سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا، اسی لیے سب کو شک ہو رہا ہے کہ شاید اسے اغوا کرلیا گیا ہے۔ ویسے بھی سنا ہے کہ آج کل شہر میں اغوا کی وارداتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔''

''میں ابھی روشی کو فون کر کے اس سے بات کرتی ہوں۔'' مہ پارہ کی باتیں سن کر اس کا دل کچھ اور بھی ہولنے لگا چنانچہ گھبرا کر پریشانی سے بولی۔

''میرے خیال میں ابھی رہنے دو۔ وہ لوگ پریشان ہیں اس وقت.... انہیں سمیر کے بارے میں اطلاع سننے کے سوا کسی سے بات کرنے میں دلچسپی نہیں ہو سکتی۔'' مہ پارہ نے کہا تو لبنیٰ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے فی الحال فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مہ پارہ کو خدا حافظ کہہ کر وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں ڈاکٹر یوسف اور مونا بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے لبنیٰ کو اس طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا اور اپنی گفتگو میں مصروف رہے۔

''آپ نے اسد سے سنڈے کے ڈنر کے لیے کہہ دیا یا نہیں؟'' مونا پوچھ رہی تھی۔

''میں نے اسے فون کیا تھا مگر اس نے بتایا کہ اسلام آباد جا رہا ہے۔ وہاں اس کا کسی ہوٹل کے شیئرز خریدنے کا ارادہ ہے اسی سلسلے میں جا رہا ہے۔'' ڈاکٹر یوسف نے بتایا۔

''لیکن وہ تو کہہ رہا تھا کہ یہیں کراچی میں ہی ساری انویسٹمنٹ کرے گا؟'' مونا نے حیرانی سے کہا۔

''بس موڈی آدمی ہے۔ اس کے ارادوں کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کیا کرنے والا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس نے ایک بچے کو میرے اسپتال میں داخل کروایا تھا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ صبح میں خود اسے چیک کرلوں گا لیکن میرے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ بچے کو ڈسچارج کروا کے لے جا چکا تھا۔''

''یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی موڈی فطرت کی وجہ سے وہ لبنیٰ کے پروپوزل کو بھی بھول جائے۔'' مونا نے تشویش کا اظہار کیا۔

اس سے قبل کہ گفتگو کا سلسلہ مزید دراز ہوتا، خاموشی سے یہ ساری گفتگو سنتی لبنیٰ نے ناگواری کے شدید احساس کے ساتھ اس سلسلے کو منقطع کرنا ضروری سمجھا اور لاؤنج میں داخل ہو کر بلند آواز سے بولی۔ ''ممی! سمیر کہیں غائب ہو گیا ہے۔ پورا دن گزر چکا ہے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو رہا۔''

''کیا کہہ رہی ہو لبنیٰ؟ ذرا تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔'' ڈاکٹر یوسف نے چونک کر پوچھا۔ جواباً وہ مہ پارہ سے حاصل شدہ معلومات انہیں فراہم کرنے لگی۔

''یہ تو بہت بری خبر سنائی تم نے۔'' ڈاکٹر یوسف نے افسوس کا اظہار کیا اور پھر بیوی کی طرف رخ کرتے ہوئے بولے۔ ''چلو مونا! ہم لوگ عثمان کی طرف چلتے ہیں۔ اس وقت ان لوگوں کو سہارے کی ضرورت ہوگی۔'' ان کی بات سن کر مونا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ پرانے تعلقات کی وجہ سے ان کے گھرانوں کے درمیان آپس میں کافی محبت تھی چنانچہ سمیر کی گمشدگی کی خبر سن کر ان کا پریشان ہونا بالکل فطری ردعمل تھا۔

''میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں ممی؟'' انہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر لبنیٰ نے پوچھا۔

''نہیں، میرے خیال میں ابھی تم رہنے دو۔ تمہیں خود اس قدر گھبرانے کی عادت ہے۔ وہاں جا کر تم بجائے کسی کو تسلی دینے کے خود ہی رونے دھونے بیٹھ جاؤ گی۔'' مونا نے انکار کر دیا جس پر اسے ناچار گھر میں ہی رکنا پڑا۔ ان لوگوں کی روانگی کے بعد اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اس افسردہ کیفیت میں طبیعت ٹیلی ویژن دیکھنے کی طرف بھی مائل نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی صوفے پر دونوں پاؤں اوپر رکھ کے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی لیکن اس طرح وقت گزارنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے کسی شغل کی تلاش میں لاؤنج میں نظریں دوڑائیں۔ ایک کونے میں رکھی ٹرالی کے نچلے حصے میں موجود اخبارات دیکھ کر اور کچھ نہیں سوجھا تو وہ اخبارات ہی نکال کر لے آئی۔ یہ پچھلے تین چار دن کے اخبارات تھے۔ اسے زیادہ پابندی سے اخبار کا مطالعہ کرنے کی عادت نہیں تھی اور جب سے ذہن اسد شاہ کے پروپوزل میں الجھا تھا، تب سے تو ایک بار بھی اخبار دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے محض وقت گزاری کے لیے ان اخبارات کا جائزہ لے لیا۔ وہ زیادہ تر ہیڈ لائنز اور تصویروں پر لکھے کیپشن پڑھنے پر ہی اکتفا کر رہی تھی۔ ایک دن پہلے کے اخبارات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر تلاش گمشدہ کے ایک اشتہار پر پڑی۔ اشتہار میں موجود بچے کی تصویر دیکھ کر وہ کچھ چونک سی گئی اور جلدی جلدی تفصیلات پڑھنے لگی۔ تفصیلات پڑھنے کے بعد اس نے تیزی سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا موبائل کمرے میں ہی رہ گیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے جلدی سے عروج کا نمبر ملایا۔

''عروج! ایک بہت زبردست کلیو ملا ہے۔'' دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی وہ جوش سے بولی۔

''کیا سمیر کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے؟'' وہ بھی فوراً پُرجوش ہوگئی۔

''نہیں، سمیر کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میں ایک دوسرے معاملے کی بات کررہی تھی۔ تم ایسا کرو کہ ایک دن پہلے کے اخبارات نکال کر دیکھو۔ آخری صفحے پر ایک بچے کی تصویر کے ساتھ تلاشِ گمشدہ کا اشتہار چھپا ہے۔ تم اس تصویر کو اچھی طرح دیکھ کر مجھے فون کرو۔'' اس نے عروج کو ہدایات دیتے ہوئے کال منقطع کردی اور اس کی کال کا انتظار کرنے لگی۔ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد ہی عروج نے کال بیک کی۔

''لبنیٰ! یہ تو وہی بچہ ہے جو اس دن...'' اس کے لہجے میں شدید ہیجان تھا۔

''ہاں، یہ وہی بچہ ہے۔ اب یہ سوچو کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' لبنیٰ سنجیدگی سے بولی۔

''اس وقت تو ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ صبح ہونے دو تب ہی آپس میں مل کر کوئی لائحۂ عمل طے کرتے ہیں۔ میں مہ پارہ سے بھی مشورہ کرلوں گی۔'' عروج نے جواب دیا تو اس نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے فون بند کردیا لیکن بہرحال دہری پریشانی کی اس رات کی صبح کرنا بہت مشکل تھا۔

☆☆☆

''اسد تو ہنوز کوٹھی سے غائب ہے۔ کیا خیال ہے ہم چل کر نازلی کو چیک نہ کریں؟ ممکن ہے اسد اس کے اپارٹمنٹ میں ہو... نہ بھی ہوا تو ہم نازلی کے ذریعے اسد تک پہنچ سکتے ہیں۔'' وہ تینوں حسبِ پروگرام ایک جگہ جمع تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اسد کی اس کی کوٹھی میں موجودگی کا پتا چلانے کی کوشش کی تھی اور اب اس طرف سے مایوس ہوکر نیا پروگرام سیٹ کررہی تھیں۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔ اسد کے بارے میں ہمیں اگر کوئی کلیو مل سکتا ہے تو وہ نازلی ہی سے مل سکتا ہے۔ مجھے اس بات پر تو بہرحال بالکل یقین نہیں ہے کہ وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ اگر یقین کر بھی لوں تو بہرحال، اس بات کا امکان موجود ہے کہ نازلی کی نگرانی بے سود ثابت نہیں ہوگی۔ ان کی آپس کی بے تکلفی بتاتی ہے کہ وہ دونوں بہت سے معاملات میں ایک دوسرے کے ہم راز ہیں۔'' مہ پارہ کی طرف سے پیش کیے گئے خیال کی تائید کرتے ہوئے لبنیٰ نے اپنے ذاتی خیالات کا بھی اظہار کیا جس کے بعد وہ تینوں نازلی کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئیں۔ مہ پارہ اور عروج ایک گاڑی میں تھیں جبکہ لبنیٰ اپنی گاڑی ڈرائیو کررہی تھی۔ سحر اپارٹمنٹس پہنچ کر انہوں نے اپنی گاڑیاں عمارت سے باہر ہی پارک کیں اور پیدل چلتی ہوئی اس بلاک کی لفٹ تک پہنچیں جس میں نازلی کی رہائش تھی۔ لفٹ میں سوار ہوکر انہوں نے چوتھی منزل کے لیے بٹن دبایا۔ لفٹ ان کی مطلوبہ منزل پر جاکر ٹھہری تو وہ باہر نکل آئیں لیکن نازلی کے اپارٹمنٹ کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہی انہیں ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ وہاں پہلے سے ہی کوئی ڈور بیل پر انگلی رکھے کھڑا تھا۔ پشت ہونے کی وجہ سے وہ اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر یہ اندازہ بہرحال ہورہا تھا کہ وہ ادھیڑ عمر کا کوئی آدمی ہے جو نہایت جھنجلاہٹ کے عالم میں بیل بجارہا ہے۔ اس کی یہ جھنجلاہٹ ڈور بیل کے بٹن پر مستقل رکھی انگلی سے ظاہر ہورہی تھی۔ ان تینوں کو یقین تھا کہ اس شخص کے عمل کی وجہ سے نازلی کے اپارٹمنٹ کے در و دیوار گونج اٹھے ہوں گے لیکن جواباً کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ نازلی اندر موجود نہیں ہے۔ ڈور بیل پر انگلی رکھے کھڑے شخص نے بھی یقیناً یہ بات سمجھ لی تھی چنانچہ مایوس ہوتے ہوئے واپس پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی وہ تینوں گنگ رہ گئیں۔ وہ برکاتی صاحب تھے جو چہرے پر پریشان سے تاثرات لیے اب لفٹ کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن ان کی اپنے اردگرد کے ماحول کی طرف قطعی توجہ نہیں تھی۔ وہ اپنے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کررہے تھے۔ ان تینوں کو موقع مل گیا کہ اوٹ میں ہوکر خود کو ان کی نظروں میں آنے سے بچاسکیں چنانچہ وہ تیزی سے حرکت میں آئیں۔

''حرافہ نے موبائل آف کررکھا ہے۔ مجھے مصیبت میں پھنسا کر خود غائب ہوگئی ہے۔ میڈیا والوں نے میرا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔'' لفٹ کے لیے بٹن پش کرکے وہ انتظار میں کھڑے بہ آوازِ بلند بڑبڑا رہے تھے۔ موبائل انہوں نے واپس اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یقیناً نمبر ملانے پر انہیں دوسری طرف سے پاورڈ آف کا پیغام سننے کو ملا تھا جس کی وجہ سے ان کی جھنجلاہٹ عروج پر تھی۔ لفٹ آئی تو وہ بنا دائیں بائیں دیکھے اس میں سوار ہوگئے۔ ان کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ان تینوں نے آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔ کل اخبار میں چھپنے والا اشتہار پڑھ کر انہیں شک گزرا تھا۔ برکاتی صاحب کی جھنجلاہٹ بھری بڑبڑاہٹ نے اسے کچھ اور بھی پختہ کردیا تھا۔

برکاتی صاحب کے گراؤنڈ فلور پر پہنچ جانے کے وقت کا اندازہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر لفٹ کو چوتھی منزل پر بلانے کے لیے بٹن پش کیا۔

''اب کیا ارادہ ہے... کس طرف چلیں؟ روشی کے گھر

بھی جانا ہے۔ سمیر کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ ہمیں اسے تسلی دینے کے لیے وہاں جانا چاہیے۔'' باہر نکلنے کے بعد عروج نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''روشی کے ہاں تھوڑی دیر بعد چلے جائیں گے۔ ابھی اس طرف چلتے ہیں جہاں تم لوگوں نے اسد کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہاں علی محمد کا گھر بھی ہے۔ وہ اسد کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اسد کی تلاش کے کام میں اسے اپنے ساتھ شامل کرنے سے شاید ہمیں کوئی مفید بات معلوم ہوجائے۔'' مہ پارہ نے خیال ظاہر کیا تو اس سے اتفاق کرتے ہوئے وہ تینوں روانہ ہوگئیں۔ اس وقت بھی لبنیٰ اپنی گاڑی میں اور عروج اور مہ پارہ اپنی گاڑی میں تھیں۔ بے ترتیب مکانات والے اس علاقے میں پہنچ کر جہاں تعمیراتی کام قطعی کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوا تھا، لبنیٰ کو پچھلی بار کی طرح ہی گھبراہٹ ہونے لگی۔ ادھر ادھر بیٹھے زمانے بھر کے فارغ مرد آج بھی اسے بڑی چھچھوری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان نظروں پر جھنجلاہٹ محسوس کرتے کب اس کی توجہ ہٹی اور ایک گلی سے نکلتا ہوا موٹر سائیکل سوار زد میں آیا، اسے علم ہی نہیں ہوسکا۔ ہوش آیا تو موٹر سائیکل اور اس کا سوار دونوں زمین پر پڑے نظر آئے۔ مہ پارہ اور عروج کی گاڑی اس سے ذرا آگے نکل چکی تھی۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس دوران موٹر سائیکل سوار اپنی دائیں کہنی کو بائیں ہاتھ سے تھام کر کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ڈاکٹر رضا آپ؟'' اس شخص کا چہرہ دیکھ کر وہ چونکی۔

''اچھا تو یہ آپ ہیں۔ بہت خوب! آپ اگر اسی انداز میں گاڑی چلاتی رہیں تو ڈاکٹروں کا خوب بھلا ہوگا۔'' اپنے باس کی بیٹی کو سامنے پاکر وہ تکلیف برداشت کرتا ہوا مسکرا کے بولا۔

''آئی ایم ریئلی ویری سوری ڈاکٹر رضا! مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ آپ کی بائیک بالکل اچانک ہی سامنے آگئی۔'' اردگرد جمع ہوتے ہجوم کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر رضا سے معذرت کی۔ اس دوران مہ پارہ بھی گاڑی موڑ کر واپس اس جگہ لے آئی تھی۔

''چلیں جانے دیں۔ معمولی چوٹیں لگی ہیں۔ میں خود ڈریسنگ وغیرہ کرکے کوئی میڈیسن لے لوں گا۔'' کپڑوں پر لگ جانے والی مٹی جھاڑتے ہوئے وہ اخلاقاً مسکرایا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ اردگرد جمع ہونے والا ہجوم اتنی آسانی سے معاملہ رفع دفع ہوتے دیکھ کر سخت مایوس ہوا تھا۔

''بائی دا وے... آپ اس علاقے میں کیا کررہی ہیں؟'' موٹر سائیکل کھڑی کرکے اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے لبنیٰ اور اس کی دوستوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ہم یہاں ایک یونیورسٹی فیلو سے ملنے آئے تھے۔'' اس نے بہانہ گھڑا اور ڈاکٹر رضا کی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوششوں کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی بار بار کی کوشش کے باوجود موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''میرے خیال میں آپ کی بائیک آپ سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ ایسا کریں، اسے ورکشاپ پر چھوڑ دیں اور آپ میری گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ آپ کو جہاں جانا ہے میں ڈراپ کردوں گی۔'' سامنے موجود ایک چھوٹی سی ورکشاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے رضا سے کہا۔

''موٹر سائیکل تو میں ورکشاپ پر دے دیتا ہوں لیکن آپ کو زحمت کی قطعی ضرورت نہیں۔ مجھے قریب ہی ایک گھر میں اپنے پیشنٹ کو دیکھنے جانا ہے۔ میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چاہے آپ کو دو قدم کے ہی فاصلے پر کیوں نہ جانا ہو، میں خود آپ کو ڈراپ کروں گی۔ آپ بائیک ورکشاپ پر دیں اور سیدھی طرح میری گاڑی میں آکر بیٹھیں۔'' اس کے تحکمانہ لہجے پر ڈاکٹر رضا کو مجبور ہوکر ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''اچھا بھلا وہ تمہاری جان چھوڑ رہا تھا پھر کیا ضرورت تھی اتنا اصرار کرنے کی؟'' رضا ورکشاپ کی طرف بڑھا تو عروج نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے ٹوکا۔

''سمجھا کرو یار! میں اس کو اپنی خوش اخلاقی سے اتنا متاثر کرنا چاہتی ہوں کہ اس کے دل میں ڈیڈی سے اس واقعے کا ذکر کرنے کا خیال بھی نہ آئے۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ ڈیڈی اس چھوٹے سے واقعے کو بنیاد بنا کر مجھ سے گاڑی کی چابی واپس لینے میں ذرا دیر نہیں کریں گے۔'' لبنیٰ نے سرگوشی میں اپنی اس درجہ خوش اخلاقی کا سبب بتایا پھر مزید بولی۔ ''ایسا کرو تم اور پارو، علی محمد سے ملنے چلی جاؤ۔ میں رضا کو ڈراپ کرکے واپس آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرلیتے ہیں۔'' عروج اور مہ پارہ فوراً ہی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔

''آپ نے خوامخواہ اپنا پروگرام خراب کیا۔ آپ اپنی دوستوں کے ساتھ چلی جاتیں۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں تھا، میں آرام سے پیدل بھی جاسکتا تھا۔'' رضا موٹر سائیکل ورکشاپ پر چھوڑ کر واپس آیا تو عروج اور مہ پارہ کی گاڑی وہاں سے روانہ ہوچکی تھی اور لبنیٰ نے بھی اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ

سنبھال لی تھی۔ اس کے اشارے پر گاڑی میں بیٹھتا ہوا وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔

''کوئی پروگرام خراب نہیں ہوا۔ آپ کو ڈراپ کرنے کے بعد میں دوبارہ اپنی دوستوں کو جوائن کرلوں گی۔'' لبنیٰ نے گاڑی اسٹارٹ کردی اور رضا کی راہنمائی میں گاڑی آگے بڑھا دی۔ رضا کی منزل بے شک اسی علاقے کا ایک مکان تھا لیکن یہ مکان باقی آبادی سے ذرا ہٹ کر بنائے گئے آخری دو مکانات میں سے ایک تھا۔ وہ لبنیٰ کو جس سمت سے مکان کی طرف لے گیا اس طرف مکان کا پچھلا دروازہ تھا۔

''تھینک یو سو مچ۔'' گاڑی سے اترنے سے قبل رضا نے اس سے کہا۔

''اس گھر اور ورکشاپ کے درمیان تو اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں باہر رک کر تھوڑی دیر آپ کا انتظار کرلیتی ہوں۔ آپ اپنے پیشنٹ کا چیک اپ کر کے آجائیں، میں آپ کو واپس ورکشاپ تک چھوڑ دوں گی۔'' لبنیٰ نے اسے پیش کش کی۔

''ارے نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے فارغ ہونے میں کافی دیر لگ جائے گی۔ آپ چلی جائیں، میری پروا مت کریں۔ میں جس بچے کو دیکھنے یہاں آیا ہوں، اس کے والد کے پاس سواری ہے۔ وہ مجھے ورکشاپ تک خود ڈراپ کردیں گے۔'' ڈاکٹر رضا نے جواب دیا تو اس نے اپنی گاڑی واپس موڑ لی اور علی محمد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ گنجان آبادی والے اس علاقے میں علی محمد کا گھر ایڈریس کی مدد سے ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ اس نے زحمت میں پڑنے کے بجائے عروج کے موبائل پر رابطہ کیا اور اس کی بتائی ہوئی نشانیوں کی مدد سے سیدھی علی محمد کے گھر تک پہنچ گئی۔ خود عروج اور مہ پارہ نے بھی وہاں پہنچنے کے لیے یہی طریقہ استعمال کیا تھا۔ ان کی راہنمائی کرنے والا یقینی طور پر علی محمد خود تھا۔

''السلام علیکم... آیئے۔ ہم لوگ آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' اس کی دستک کے جواب میں علی محمد نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ چھوٹی سی بیٹھک میں لے گیا۔ اسے بیٹھک تک پہنچا کر خود وہاں رکنے کے بجائے وہ ایک بار پھر باہر نکل گیا۔

''کیا ہوا... بات ہوگئی علی سے؟ وہ راضی ہے ہمارا کام کرنے کے لیے؟'' اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھیمی آواز میں ان دونوں سے پوچھا۔

''ابھی تو ہم نے اسے کام بتایا ہے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بے روزگار آدمی ہے، میرے خیال میں ہم رقم کی آفر کریں گے تو مان جائے گا۔'' عروج نے بھی اسی کی طرح نیچی آواز میں جواب دیا۔

''زیادہ بڑی رقم کی آفر مت کرنا۔ میری جمع پونجی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''مروت۔ ہم اپنے پاس سے دے دیں گے۔'' اس کی بے وقت کی راگنی سن کر مہ پارہ جھنجلائی۔ اسی لمحے علی محمد چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھے اندر داخل ہوا۔

''جی تو علی صاحب! آپ نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا۔ آپ ہمارا کام کردیں گے یا نہیں؟'' اس کی پیش کردہ چائے کی پیالی شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہوئے مہ پارہ نے اس سے پوچھا۔

''یہ فیصلہ سنانے سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ لوگ کس مقصد سے یہ کام کروانا چاہتی ہیں؟'' اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''کیا آپ نے ایک دن کے لیے اسد کے پی اے کا رول کرتے ہوئے اس سے یہ سوال پوچھا تھا؟'' اس کے سوال پر لبنیٰ نے چمک کر پوچھا۔

''نہیں پوچھا تھا، تب ہی تو خیال آرہا ہے کہ پوچھنا چاہیے تھا۔ یقیناً دال میں کچھ کالا ہے جب ہی مجھے یہ عجیب و غریب کام کرنے کے لیے ہائر کیا جارہا ہے۔'' اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ بہ دستور اپنے مطالبے پر ڈٹا رہا۔

''اصل میں بات یہ ہے علی محمد صاحب!'' مہ پارہ نے کھنکھارتے ہوئے گفتگو میں دخل دیا۔ ''اسد شاہ سے لبنیٰ کے رشتے کی بات چل رہی ہے لیکن لبنیٰ بلکہ ہم سب کو شک ہے کہ اسد اور اس روز پارٹی میں شریک لڑکی نازلی کا آپس میں کوئی چکر چل رہا ہے۔ اب بھی اسد اسلام آباد جانے کا بہانہ بنا کر دو دن سے غائب ہے لیکن ہمیں شک ہے کہ وہ اسلام آباد نہیں گیا بلکہ نازلی کے ساتھ اسی علاقے میں کہیں ٹھہرا ہوا ہے۔ اصل میں پچھلی بار جب آپ کی لبنیٰ سے یہاں پر ملاقات ہوئی تھی تو یہ اسد اور نازلی کا پیچھا کرتے ہوئے ہی یہاں آئی تھی لیکن اس گھر تک نہیں پہنچ سکی تھی جہاں وہ دونوں گئے تھے۔ اب بس، ہم اتنا چاہتے ہیں کہ اسد اور نازلی کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر اسد کی اصلیت سب کو بتا سکیں تاکہ لبنیٰ کی اس سے جان چھوٹ جائے۔''

''آپ لوگوں کا یہ شک تو بالکل ٹھیک ہے کہ اسد اسلام آباد نہیں گیا ہے۔ کل رات جب میں کلفٹن میں موجود ایک ٹیوشن سینٹر سے ٹیوشن پڑھا کر واپس آرہا تھا تو میں نے ان

دونوں کو ایک گاڑی میں ساتھ دیکھا تھا لیکن وہ یہاں اس علاقے میں کہیں رہ رہے ہوں گے، اس کا مجھے یقین نہیں۔ ایسے لوگوں کا بھلا یہاں کیا کام؟ اس قسم کے لوگوں کے لیے تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں بڑی سہولتیں ہوتی ہیں۔'' علی محمد نے مہ پارہ کی باتوں پر یقین ضرور کرلیا تھا لیکن یہ ماننے کے لیے راضی نہیں تھا کہ اسد اور نازلی یہاں کہیں ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے حساب سے ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اپر کلاس سے تعلق رکھنے والے عیش پرستوں کے لیے فائیو اسٹار اور سیون اسٹار ہوٹلز بڑی محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوتے تھے لیکن بہرحال، وہ تینوں اچھی طرح جانتی تھیں کہ اگر ان کا اسد پر شک درست ہے تو اس کے لیے یہ پُرپیچ گلیوں والا علاقہ سب سے مناسب پناہ گاہ تھی۔

''آپ کا خیال اپنی جگہ ٹھیک ہے مسٹر علی لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس علاقے میں اسد کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ وہ مل گیا تو ٹھیک ورنہ دوسری صورت میں بھی ہم آپ کو آپ کا پورا معاوضہ دیں گے۔'' گفتگو کی ذمے داری مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے مہ پارہ نے بات آگے بڑھائی۔

''او کے... ایز یو وش!'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے بالآخر اپنی رضامندی کا اشارہ دے ہی دیا۔

''آپ ہم تینوں کے موبائل نمبرز رکھ لیں۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہو، تینوں میں سے کسی کو بھی انفارم کردیجیے گا۔'' مہ پارہ اسے نمبرز نوٹ کروانے لگی۔

''دیکھیں، کام ایمان داری سے کیجیے گا۔ یہ نہ ہو کہ گھر میں ہی آرام سے بیٹھے رہیں اور بعد میں ہم لوگوں سے کہہ دیں کہ میں نے اسد کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہیں ملا۔'' باہر نکلتے نکلتے لبنیٰ نے اسے تاکید کی تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔

''اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں تو مجھے یہ کام مت سونپیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں علی! لبنیٰ ذرا ڈسٹرب ہے... پلیز! آپ اس کی بات کا برا نہ مانیں۔'' مہ پارہ نے فوراً ہی بات سنبھال لی اور لبنیٰ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئی۔

''یہ کیا حماقت تھی؟ اگر ابھی وہ ہمارا کام کرنے سے انکار کردیتا تو ہم کیا کرتے؟ اس علاقے میں خود گھوم پھر کر اسد کو تلاش کرنے کی جرأت ہے تم میں؟'' باہر آکر وہ اسے ڈپٹنے لگی۔

''میں تو بس اسے ذرا سی تنبیہ کر رہی تھی۔'' جواباً لبنیٰ منمنائی اور پھر خاموشی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''کوئی خبر ملی سمیر کے بارے میں؟'' علی محمد کے گھر سے وہ تینوں سیدھی روشی کے گھر پہنچی تھیں۔ اس کی شکل بے حد اتری ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یقیناً وہ روئی تھی۔

اس سے یہ سوال پوچھا گیا تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے اداسی سے بولی۔ ''پاپا پوری کوشش کر رہے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ بھی لکھوا دی گئی ہے اور اخبارات میں تلاشِ گمشدہ کا اشتہار بھی چھپوا دیا ہے لیکن ابھی تک کہیں سے کوئی رسپانس نہیں ملا۔ تمام رشتے دار اور سمیر کے دوستوں کے گھروں میں تو کل ہی چیک کرلیا گیا تھا۔ مجھے تو سمیر کے ساتھ ساتھ ممی کی بھی فکر ہو رہی ہے۔ ان کا بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔'' روشی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''حوصلے سے کام لو روشی! اگر تم نے حوصلہ چھوڑ دیا تو آسیہ آنٹی کو کون سنبھالے گا؟'' وہ تینوں اسے دلاسا دینے لگیں۔ ''سمیر انشاء اللہ جلد ہی مل جائے گا۔''

دوستوں کی اس ہمدردی پر روشی نے اپنے آنسو صاف کیے اور پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگ یونیورسٹی سے آرہی ہوگی؟''

''نہیں، یونیورسٹی کیسے جاسکتے تھے، ہمیں تو خود سمیر کی فکر لگی ہوئی تھی۔ تمہارے پاس آنے میں دیر اِس لیے ہوگئی کہ اسد شاہ والے معاملے سے بھی نمٹنا تھا۔'' مہ پارہ نے اسے بتایا۔

''کیا ہوا اس معاملے کا؟ کچھ پتا چلا اسد اور نازلی کے بارے میں؟'' اس کا دھیان تو سمیر کی طرف ہی لگا ہوا تھا لیکن وہ اپنا ذہن بٹانے کے لیے اس موضوع میں دلچسپی لینے لگی۔ جواباً مہ پارہ نے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''پارو! کہیں یہ کڈنیپنگ وغیرہ کا چکر تو نہیں۔ تم شروع سے آخر تک اس سارے معاملے پر غور کرو۔ اسد شاہ کی فون پر مشکوک گفتگو، نازلی کا برکاتی صاحب سے تعلق، ان کے ویلفیئر ہوم سے بچوں کا غائب ہونا، اسد کا اسکول کے ایک بچے کو لفٹ دینا اور پھر اس بچے کی گمشدگی کا اشتہار اخبار میں چھپنا... ان سب باتوں سے تو ایک ہی اشارہ مل رہا ہے کہ اسد کا کسی ایسے گروہ سے تعلق ہے جو بچے اغوا کرتے ہیں۔'' تفصیلات سن کر روشی نے کچھ دیر غور کیا پھر اپنے شکوک کا اظہار کرنے لگی۔

''روشی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے بھی یہی شک ہے۔'' لبنیٰ نے سب سے پہلے اس کی حمایت کی۔

''شک تو ہمیں بھی کچھ ایسا ہی ہے لیکن اس شک کی تصدیق اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک اسد اور نازلی سامنے نہ آجائیں۔''

’’تصدیق کے لیے برکاتی صاحب کو بھی گھیرا جاسکتا ہے۔ وہ اسد اور نازلی کا پتا بے شک نہ جانتے ہوں لیکن ان سے یہ تصدیق تو کی جاسکتی ہے کہ ان کے ویلفیئر ہوم سے غائب ہونے والے بچوں کی گمشدگی میں نازلی کا کوئی ہاتھ ہے یا نہیں۔‘‘ پریشانی کے باوجود روشی کا دماغ خوب چل رہا تھا۔

’’او کے! ہم کوشش کرتے ہیں برکاتی صاحب سے معلومات حاصل کرنے کی۔‘‘ مہ پارہ فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ ’’لبنیٰ! تم یہیں روشی کے پاس رکو۔ میں اور عروج برکاتی صاحب سے ملاقات کرکے آتے ہیں۔‘‘ اپنی بات کہنے کے بعد وہ رکی نہیں اور عروج کو اشارہ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

برکاتی ویلفیئر ہوم کے مرکزی دفتر کی طرف جاتے ہوئے اس نے اور عروج نے مل کر برکاتی صاحب سے ملاقات میں ہونے والی گفتگو کے اہم نکات آپس میں ڈسکس کرلیے۔ ہوم منسٹری کے اہم عہدے دار اپنے والد سہیل مرزا کے حوالے سے جب انہوں نے برکاتی صاحب کے آفس پہنچ کر ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو انہیں اس ملاقات میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ برکاتی صاحب نے انہیں فوراً ہی دفتر میں بلوالیا۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی دونوں بہنوں نے یہ بات نوٹ کی کہ برکاتی صاحب کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہیں جنہیں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر ان دونوں سے بیٹھنے کے لیے کہا۔

’’مرزا صاحب سے میری اچھی جان پہچان ہے لیکن اتفاقاً کبھی فیملی سے ملنا نہیں ہوا۔‘‘ ان دونوں سے آمد کا مقصد براہِ راست دریافت کرنے کے بجائے انہوں نے وضع داری سے گفتگو کا آغاز کیا۔

’’جی ہاں بس کبھی موقع ہی نہیں بن سکا ورنہ ہمیں اور ہماری دوستوں کو تو آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ کسی دن دوبارہ آنا ہوا تو ہم اپنی دوستوں کو ضرور ساتھ لائیں گے۔ اصل میں میری دوست روشی کا بھائی کل سے کہیں غائب ہوگیا ہے۔ شبہ ہے کہ اسے کسی نے اغوا کرلیا ہے، بس اسی پریشانی کی وجہ سے اس وقت وہ ہمارے ساتھ نہیں آسکی۔‘‘

’’بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔ آج کل شہر میں بچوں کے اغوا کی وارداتیں بڑھتی جارہی ہیں۔‘‘ انہوں نے سرسری انداز میں تبصرہ کیا۔

’’آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کے ویلفیئر ہوم سے بھی تو تین بچے غائب ہوگئے تھے۔ کچھ پتا چلا ان بچوں کا؟‘‘

مہ پارہ کا سوال سن کر ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ کچھ خفگی سے بولے۔ ’’میرے ویلفیئر ہوم سے کوئی بچہ غائب نہیں ہوا۔ یہ میڈیا والے ہیں جو اپنے چینل کی شہرت کے لیے بے بنیاد کہانیاں گھڑ رہے ہیں۔ آج کل لوگوں کو اپنے چینل کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔‘‘

’’یہ تو بڑا غلط طریقۂ کار ہے۔ آدمی کسی بھی فیلڈ میں ہو، اسے پوری ایمان داری سے کام کرنا چاہیے۔‘‘ عروج نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا پھر گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ’’خیر، ان باتوں کو تو جانے دیجیے۔ فی الحال ہم آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئے تھے۔ اصل میں ہماری دوست کی ممی اپنے بیٹے کے غائب ہونے کی وجہ سے شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہیں۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے کہ اگر ان کے بچے کا ہم عمر کوئی بچہ ان کے سامنے رہے تو شاید وہ بہل جائیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایسا کوئی بچہ ہے نہیں۔ ہمارے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ آپ سے مدد لی جائے۔ یہاں تو ہر عمر کے بچے ہوتے ہیں۔ آپ چند دن کے لیے ہمارے مطلب کا ایک بچہ دے دیں۔ جب ہماری دوست کا بھائی مل جائے گا تو ہم آپ کو بچہ واپس کردیں گے۔‘‘

’’سوری بیٹا! بچے اس طرح کسی کو نہیں دیے جاتے۔ اس کے لیے مکمل قانونی کارروائی کی جاتی ہے اور عارضی طور پر کسی کو بچہ دینے کی تو ہمارے ہاں کوئی مثال موجود ہی نہیں۔ بہرحال، آپ کے کہنے پر میں غور کرسکتا ہوں لیکن اس کے لیے اس فیملی کے سربراہ کو یہاں آکر قانونی کارروائی پوری کرنی ہوگی جس گھر میں بچہ دیا جائے گا۔‘‘

’’لیکن آپ نے مس نازلی کے سامنے تو ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ وہ تو بغیر کسی قانونی کارروائی کے یہاں سے بچے لے گئی تھیں۔‘‘ برکاتی صاحب کا جواب حسبِ توقع تھا چنانچہ مہ پارہ نے بہت سوچی سمجھی بات اچانک ہی کہہ ڈالی۔ یہ بات سن کر وہ اس بری طرح اچھلے جیسے کرسی کے نیچے سے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

’’کک... کون نازلی؟ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔‘‘

’’وہی نازلی جس نے اسد شاہ کی کوٹھی پر ہونے والی نیو ایئر پارٹی میں بڑا زبردست ڈانس کیا تھا اور جس سے ملنے کے لیے آپ اس کے اپارٹمنٹ جاتے رہے۔ اگر آپ اب بھی انکاری ہوں تو ہم ثبوت کے طور پر کچھ تصاویر پیش کرسکتے ہیں۔‘‘ آخری جملہ مہ پارہ نے یونہی انہیں پریشر میں لینے کے لیے بول دیا تھا مگر یہی جملہ سب سے کارگر ثابت ہوا۔ برکاتی صاحب کسی ہوا نکلے غبارے کی طرح بالکل پھُس نظر آنے لگے۔

’’یہ تصویریں تو میرے لیے عذاب بن گئی ہیں۔ صحیح کہتے ہیں لوگ کہ عورت کے حربوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔ زندگی میں پہلی بار میرے قدم ڈگمگائے اور نتیجے میں، میں اتنے بڑے عذاب میں پھنس گیا۔‘‘ کرسی پر نڈھال سے بیٹھے وہ اپنے آپ بڑبڑائے جارہے تھے۔

’’اگر آپ ہم پر اعتبار کریں تو ہم آپ کی مدد کرسکتے ہیں برکاتی صاحب! ہمیں اندازہ ہے کہ آپ کسی جال میں پھنس گئے ہیں۔ آج صبح بھی ہم نے آپ کو نازلی کے اپارٹمنٹ کے باہر دیکھا تھا۔‘‘ برکاتی صاحب کے ردِعمل نے ظاہر کردیا تھا کہ وہ خود براہِ راست کسی جرم میں ملوث نہیں بلکہ انہیں ٹریپ کیا گیا ہے چنانچہ مہ پارہ نے اپنے لہجے میں ہمدردی سموتے ہوئے ان سے کہا۔

’’کیا تم لوگوں کا تعلق کسی خفیہ ادارے سے ہے؟‘‘ وہ چونکے۔

’’آپ یونہی سمجھ لیں۔‘‘ اس نے گول مول سا جواب دیا اور انہیں تذبذب میں مبتلا دیکھ کر بولی۔ ’’آپ اپنی نیک نامی کی طرف سے مطمئن رہیں برکاتی صاحب! آپ کے تعاون کے بدلے ہم بھی آپ سے یہ تعاون کریں گے کہ آپ کا نام کہیں بھی نہ آنے دیا جائے۔‘‘

’’معاملہ ایسا ہے کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔‘‘ انہوں نے جھکی ہوئی نظروں سے جواب دیا لیکن ان کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اس قدر ذہنی دباؤ کا شکار ہیں کہ اب مزید خاموش نہیں رہ سکیں گے۔

’’جو بھی بات ہے آپ یقین رکھیں کہ پبلک کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔‘‘ عروج نے انہیں حوصلہ دیا۔

آخرکار انہوں نے اپنی زبان کھول ہی دی اور جھکی جھکی نظروں سے بتانے لگے۔ ’’اسد شاہ کے گھر ملنے والی نازلی کچھ ایسی تیز و طرار لڑکی تھی کہ میں پہلی ہی ملاقات میں اس سے متاثر ہوگیا۔ اس نے دوبارہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو میں انکار نہیں کرسکا۔ ہماری تیسری ملاقات اس کے اپارٹمنٹ میں ہوئی اور اس ملاقات میں نازلی کی بے باکی اور میری لغزش سے وہ کچھ ہوگیا جس نے میرے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ ہماری اس ملاقات کی یادگار، تصویروں کی صورت میں اب بھی نازلی کے قبضے میں ہے۔ انہی تصویروں کی بنیاد پر اس نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اسے اپنے ویلفیئر ہوم سے بچے فراہم کروں۔ اب تک وہ مجھ سے چھ بچے لے چکی ہے۔ ہر بچے کے عوض اس نے مجھے میری ایک تصویر واپس کی ہے۔ ابھی اس کے مطابق اس کے پاس دو تصویریں اور موجود ہیں۔ تم لوگوں نے تصویروں کا ذکر چھیڑا تو میں سمجھا کہ انہی تصویروں کی بات کررہی ہو۔‘‘

’’ٹی وی چینل پر جن تین بچوں کے بارے میں خبر آئی تھی، کیا وہ تینوں بچے بھی نازلی کے پاس ہی ہیں؟‘‘

’’ہاں، میری معلومات کے مطابق تو وہ لاوارث بچے ہی تھے لیکن بعد میں ان کے ماں باپ چلے آئے۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ کسی طرح نازلی ان تینوں بچوں کو واپس کردے لیکن میرا اس سے رابطہ ہی نہیں ہورہا۔‘‘ انہوں نے شرمندہ سے لہجے میں بتایا۔

’’آپ کی لغزش دوسروں کے لیے کیسی اذیت کا سبب بنی ہے، آپ یہ بات اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کا کوئی اپنا اس تکلیف سے نہ گزرے۔ ہم سے پوچھیں... ہم دیکھ رہے ہیں اپنی پیاری دوست اور اس کے گھر والوں کو اپنے لاڈلے کے لیے تڑپتا ہوا۔‘‘ مہ پارہ نے کرسی چھوڑ دی۔ ’’بہرحال، آپ اطمینان رکھیے گا۔ ہم اپنے وعدے کے مطابق اس معاملے میں آپ کا نام نہیں آنے دیں گے۔‘‘ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عروج اس کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

مہ پارہ اور عروج کو روانہ ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ لبنیٰ کا موبائل بجنے لگا۔ کال کرنے والا علی محمد تھا۔

’’مس لبنیٰ! آپ نے جو کام میرے ذمے لگایا تھا وہ ہوگیا ہے۔ آپ کا اندازہ درست تھا۔ اسد صاحب واقعی اسی علاقے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مس نازلی بھی ان کے ساتھ ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ان دونوں کو آتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ بتائیں میرے لیے کیا حکم ہے؟‘‘ لبنیٰ کے ’’ہیلو‘‘ کہتے ہی علی محمد کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔

’’آپ وہیں ٹھہریں علی صاحب! ہم لوگ خود وہاں پہنچ رہے ہیں۔‘‘ لبنیٰ نے اسے حکم دیتے ہوئے لائن کاٹ دی۔ ’’میرے خیال میں، میں مہ پارہ کو فون کرکے بلا لیتی ہوں۔ برکاتی صاحب کا معاملہ بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔‘‘ اب اس کی مخاطب روشی تھی۔

’’ان لوگوں کو رہنے دو۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔‘‘ روشی نے پیش کش کی۔

’’لیکن آسیہ آنٹی...‘‘ لبنیٰ ہچکچائی۔

’’ممی دوا کھا کر سو رہی ہیں۔ میری آنٹی یہاں موجود ہیں، اگر ممی اٹھ گئیں تو وہ انہیں سنبھال لیں گی۔‘‘ روشی نے اسے جواب دیا اور مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر اپنی آنٹی کو

اپنے گھر سے باہر جانے کے سلسلے میں مطلع کرنے چلی گئی۔

''ہم الگ الگ گاڑی میں چلیں گے تاکہ ضرورت کے وقت کوئی مشکل پیش نہ آئے۔'' گھر سے نکلتے وقت روشی نے یہ فیصلہ سنایا جس پر لبنیٰ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے گاڑیاں دوڑاتی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئیں۔ لبنیٰ کا موبائل پر مسلسل علی محمد سے رابطہ تھا۔ اس کی راہنمائی میں وہ جب ایک مکان کے سامنے پہنچی تو بری طرح چونک گئی۔ چند گھنٹے قبل وہ ڈاکٹر رضا کو اسی مکان پر ڈراپ کر کے گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ مکان کے پچھلے دروازے پر اترا تھا اور علی محمد فرنٹ پر موجود تھا۔ اپنی گاڑی مکان کے سامنے روکنے کے بجائے وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ علی محمد کو بھی اس نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ مکان سے ذرا آگے جاکر اس نے گاڑی روک لی۔ روشی کی گاڑی بھی ساتھ ساتھ تھی۔

''میں نے لوکیشن کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے' اسد صاحب جس مکان میں گئے ہیں، اس کے ساتھ والا مکان خالی ہے۔ دونوں مکانوں کی چھتیں ملی ہوئی ہیں۔ ہم اگر ساتھ کے مکان میں داخل ہو جائیں تو اس مکان میں اتر سکتے ہیں جس میں اسد اور نازلی موجود ہیں۔'' گاڑی روکتے ہی ہانپتا ہوا علی محمد قریب پہنچا اور لبنیٰ کو بتانے لگا۔

''ٹھیک ہے پھر ہم اسی طریقے سے چلتے ہیں۔'' لبنیٰ پُرجوش سی ہو کر گاڑی سے باہر نکلی۔ روشی بھی اس دوران اپنی گاڑی سے اتر کر وہاں آگئی تھی۔

''میرے خیال میں مہ پارہ کو میسج کر کے بتا دیا جائے کہ ہم کس جگہ ہیں تاکہ کسی خطرے کی صورت میں ہمیں مدد مل سکے۔'' اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف خیال ظاہر کیا بلکہ اس پر عمل بھی کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ تینوں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے خالی مکان کی طرف بڑھے۔ مکان کے گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔

''ہم اندر کیسے جائیں گے؟'' تالا دیکھ کر لبنیٰ پریشان ہوگئی۔

''مسٹر علی! آپ ذرا گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف کود جائیں اور اندر سے چھوٹا دروازہ کھول دیں۔'' روشی نے گیٹ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے علی محمد کو حکم دیا جس پر اس نے بے چون و چرا عمل کیا۔ چھوٹا دروازہ کھلنے پر وہ دونوں اندر داخل ہوئیں تو مکان کی حالت دیکھ کر عجیب سی وحشت ہونے لگی۔ بری طرح گرد و غبار سے اٹے ہوئے گھر کی دیواروں سے لمبے لمبے جالے لٹک رہے تھے۔ ان جالوں پر بڑی بڑی مکڑیاں جھول رہی تھیں۔

''چھت پر جانے کا راستہ اس طرف ہے۔'' علی محمد نے ایک طرف موجود سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ سب سے پہلے لبنیٰ نے پھرتی دکھاتے ہوئے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ پہلے قدمچے پر پیر رکھتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ بوکھلا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ جھاڑنے لگی۔ دراصل وہ ایک لمبے سے تار سے لٹکتی مکڑی تھی جس نے اس کے چہرے پر لینڈ کیا تھا۔

''ایک چھوٹی سی مکڑی سے اتنی بری طرح ڈر گئیں۔ اپنے متوقع منگیتر صاحب کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا کارنامہ کیسے انجام دیں گی؟'' علی محمد نے اس کی بزدلی پر اسے طعنہ دیا جسے نظر انداز کر کے وہ سنبھل کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت پر پہنچ کر دوسرے مکان کی چھت تک پہنچنے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ البتہ اس ڈر سے کہ ان کے قدموں کی آواز نیچے نہ سنی جائے، وہ لوگ بے حد احتیاط سے چل رہے تھے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے پہنچے تو اس احتیاط پسندی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ دبے قدموں سے چلتے ہوئے وہ لوگ کمروں کی کھڑکیوں سے جھانک کر اندر کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پہلا کمرا خالی تھا۔ دوسرے کمرے میں جھانکنے پر وہ لوگ چونک پڑے۔ وہ ڈاکٹر رضا تھا جو بستر پر لیٹے ایک بچے پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک عورت کھڑی تھی جس کی پشت کھڑکی کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اس کی شکل نہیں دیکھ پائے۔

''اس بچے کو اگر فوری طور پر کسی بڑے اسپتال نہیں پہنچایا گیا تو اس کی زندگی بچنا مشکل ہے۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا، میں نے کر لیا لیکن اب معاملہ میرے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔'' بچے کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر رضا نے لڑکی کی طرف اپنا چہرہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''اسے اسپتال تک لے جانا کسی طور ممکن نہیں۔ اس کا علاج تمہیں ہی کرنا ہوگا۔ ہم تمہیں اتنی بڑی رقم اس لیے نہیں دے رہے کہ تم عین وقت پر مایوس کر دو۔'' لڑکی نخوت سے بولتی ٹک ٹک کرتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے حرکت میں آنے سے وہ لوگ اس کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ نازلی ہی تھی۔ اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر رضا ایک بار پھر بچے پر جھک گیا لیکن اس کے چہرے پر مایوسی صاف پڑھی جا رہی تھی۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' علی محمد نے الجھے ہوئے لہجے میں سرگوشی میں لبنیٰ سے پوچھا۔

''سوری علی صاحب! ہم نے آپ سے تھوڑی سی غلط

بیانی کی تھی۔ آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ یہیں سے لوٹ جائیں۔'' لبنیٰ نے اسے جواب دیا تو اس کے چہرے کی الجھن کچھ اور بھی بڑھ گئی لیکن بہر حال اس نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اب وہ تینوں اگلے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اس کمرے میں نازلی کے ساتھ اسد بھی موجود تھا۔ نازلی یقیناً اسے ڈاکٹر رضا کے متعلق بتا رہی تھی۔

''یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ ہمارا پندرہ بچوں کا وعدہ ہے۔ اگر یہ بچہ مر گیا تو ہم پارٹی کو سپلائی کیسے دیں گے؟'' اسد شاہ کے لہجے میں اس مل اونر کی سی تشویش تھی جو وقت پر مارکیٹ میں پروڈکٹ فراہم کرنے سے لاچار ہو۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ جیتے جاگتے معصوم بچوں کے بارے میں بات کر رہا ہے۔

''ایسا کرو جیرے سے کہو کہ وہ باہر نکل کر شہر کا چکر لگائے۔ کہیں نہ کہیں سے تو مال مل جائے گا۔'' اس نے نازلی کو ہدایت دی۔ اس سے قبل کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی، کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لمبے تڑنگے سیاہ رنگت والے شخص نے اندر قدم رکھا۔ اس شخص کے بال گھنگریالے اور ہونٹ موٹے تھے۔

''جیرا خود ہی آگیا ہے۔ تم اس سے کہہ دو ورنہ پھر میں برکاتی سے بات کرتی ہوں۔ نخرے تو دکھائے گا لیکن تصویریں منظر عام پر آنے کے ڈر سے اسے میری بات ماننی ہی پڑے گی۔'' نازلی جو پہلی بار ہی ان لوگوں کو دیکھنے میں اچھی نہیں لگی تھی، مکارانہ انداز میں بات کرتی ہوئی اور بھی بھیانک لگ رہی تھی۔

''ہمیں پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔ یہ جس قسم کے لوگ ہیں ہمارے لیے ان سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔'' اندر ہونے والی گفتگو سے صورتِ حال سمجھتے ہوئے علی محمد نے سرگوشی میں مشورہ دیا جس کو مانتے ہوئے روشی نے اپنا موبائل کال کرنے کی نیت سے باہر نکالا۔ قبل اس کے کہ وہ نمبر ڈائل کرتی، اس کا موبائل زور و شور سے بجنے لگا۔ کال مہ پارہ کی طرف سے آرہی تھی۔ اس نے ریسیو کا بٹن تو بے اختیاری میں ضرور پش کیا لیکن بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ موبائل کی بیل نے اندر موجود لوگوں کو چونکا دیا تھا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

''پکڑو... جانے نہ دینا۔'' اسد شاہ چیخا۔

''بھاگیے یہاں سے۔'' علی محمد نے ان دونوں سے کہا اور اس راستے کی طرف بھاگا جہاں اوپر چھت کی طرف جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ حواس باختہ روشی اور لبنیٰ نے بھی اس کی پیروی کی۔

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

جنوری 2010ء

سالِ نو نمبر کی ایک جھلک

محبت کہیں زندگی کو رعنائیوں اور رنگوں سے مزین کرتی ہے تو کہیں زندگی کو صحرا بنا دیتی ہے...... کچھ اسی رنگ میں **سکینہ فرخ** کی تحریر

ایک لڑکی کی زندگی کے نشیب و فراز جو اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں تھی، **شیریں حیدر** کی ناقابلِ فراموش تحریر

غم، خوشی، امید و ناامیدی کی کیفیات کی بھرپور عکاسی کرتا ہوا **انجم انصار** کا ناول

عالیہ بخاری اور **قیصرہ حیات** کے سلسلے وار ناول

دل سے کوئی بات، کوئی یاد مٹتی ہی نہیں ہلکی یا گہری ہو جاتی ہے..... ایسی ہی یادوں اور آنے والے سال کے لیے دعائیہ کلمات کا تحفہ **شائستہ زریں** کا دلچسپ سروے۔

تکلیفیں انسان کی زندگی میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں لاتی ہیں انہی تبدیلیوں کے ساتھ اختتام کی طرف گامزن **میمونہ خورشید علی** کا ناولٹ

اس کے علاوہ

عالیہ بخاری ہالہ، ناہید فاطمہ حسنین، عاطفہ فاروق، سعدیہ رئیس، آصفہ شفیق، نیر فہیم عطاری اور **صائمہ اکرم** کی یادگار تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

''رک جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔'' وہ لوگ ابھی سیڑھیوں پر ہی تھے کہ خوفناک لہجے میں دی جانے والی اس دھمکی نے ان کے قدم جکڑ لیے۔ دھمکی دینے والے نے صرف زبانی دھمکی پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا' ایک ہوائی فائر کر کے یہ ثابت بھی کیا تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتا ہے۔

''نیچے آؤ۔'' اس دوسرے حکم پر ان تینوں نے مرے مرے قدموں سے عمل کیا۔ ان پر ریوالور تانے کھڑا شخص جیرا تھا جبکہ اسد اور نازلی اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ ... کے ہاتھ میں بھی ریوالور نظر آ رہا تھا۔

''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' لبنیٰ اور روشی کے چہرے پر نظر پڑی تو اس نے بے انتہا حیرت سے پوچھا۔ ان دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''انہیں اندر لے کر چلو۔'' اسد نے جیرے کو حکم دیا۔ وہ ان تینوں کو کور کیے اندر کی طرف بڑھا۔ راستے میں ڈاکٹر رضا ہونق صورت لیے کھڑا تھا۔ وہ یقیناً وہاں مچنے والی بھگدڑ اور فائر کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکلا تھا۔ لبنیٰ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی حیرانی نظر آنے لگی۔

''تم اپنا کام کرو ڈاکٹر! اپنے معاملات ہم خود دیکھ لیں گے۔'' اسد نے اسے سختی سے حکم دیا۔

میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ وہ بچہ مر چکا ہے۔'' ڈاکٹر رضا نے جواب دیا جس پر اسد نے طیش میں آتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا اور اسے دھکا دے کر کمرے میں دھکیلنے کے بعد کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس دوران وہ لوگ جیرے کے اشارے پر عمل کرتے ہوئے اگلے کمرے تک پہنچ چکے تھے۔

''ہاں تو اب بتائیے آپ لوگ کہ آپ کس سلسلے میں یہاں نظر آ رہے ہیں؟'' اسد نے وہاں پہنچ کر طنز و غصے کی ملی جلی کیفیت میں ان سے سوال کیا پھر کچھ خیال آنے پر جیرے سے بولا۔ ''ان لوگوں کی تلاشی لو۔'' جیرے نے اس حکم کی پیروی کی اور علی محمد کی جیبوں میں موجود کل سامان کے ساتھ روشی کی مٹھی میں دبا ہوا موبائل بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

''ہاں تو بھئی شروع ہو جاؤ اور بتاؤ کہ تم لوگ کس طرح اور کیوں یہاں پہنچے؟'' اسد نے بہ طورِ خاص لبنیٰ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یہ سوال کیا۔

''ہماری چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ عنقریب تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا ہوگا۔ ہم تمہارا مکروہ چہرہ سب کو دکھا دیں گے۔'' لبنیٰ نے اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آہ... اس حسین چہرے کو قبر کی گہرائی میں پہنچاتے ہوئے مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ میں تو تمہیں اپنی لائف پارٹنر بنانے کے بعد تمہارے باپ کو اپنا بزنس پارٹنر بنانا چاہتا تھا۔ بڑا ماہر ڈاکٹر ہے وہ۔ اس کا ساتھ مل جاتا تو میرا بزنس چمک اٹھتا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ پارٹنر شپ کے لیے ہم کسی اور کو تلاش کر لیں گے۔ تم تینوں بہرحال اب زندہ نہیں رہ سکتے۔'' اسد نے اپنا ریوالور سیدھا کیا۔

''کیا کرتے ہو جانی! دو اتنی خوب صورت لڑکیوں کی زندگی یونہی ضائع جائے، مجھے منظور نہیں۔ ان کے تو ہم بہت اچھے دام وصول کر سکتے ہیں۔ رہے یہ تمہارے ایک روزہ بی اے علی محمد صاحب تو یہ بھی ایسے ناکارہ نہیں۔ ڈاکٹر رضا سے کہو کہ ان کے دل، گردے، پھیپھڑے، آنکھیں سب نکال لیں۔'' اس کو مشورے سے نوازتی نازلی پر کسی خون آشام بلا کا گماں ہو رہا تھا جو اپنی بات کہنے کے بعد کسی ڈائن کی طرح ہی سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اب علی کی طرف مڑ گئی تھی۔

''امید ہے کہ آپ کو میرا مشورہ برا نہیں لگا ہوگا مسٹر علی! اس طرح آپ مرنے کے بعد بھی کئی سال تک دوسروں کے جسم میں تھوڑا تھوڑا کر کے جیتے رہیں گے۔'' علی جواب میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا، بس کھڑا خوف سے کانپتا رہا۔

''میرے خیال میں اب مزید وقت نہیں لگانا چاہیے جیرے! تم لڑکیوں کو نیچے تہ خانے میں پہنچاؤ، ہم مسٹر علی کو ڈاکٹر رضا کے پاس پہنچاتے ہیں۔'' اسد نے نازلی کے مشورے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جیرے کو حکم دیا۔ جیرا دونوں کو لے کر خفیہ طور پر بنائے گئے راستے سے نیچے تہ خانے میں جا پہنچا۔ تہ خانے میں پہنچ کر ان دونوں کو زبردست شاک پہنچا۔ وہاں کئی بچے موجود تھے۔ بچوں کی عمریں، حیثیت اور شکل و صورت یقینی طور پر مختلف تھیں لیکن چہرے پر منجمد جانے والے خوف و ہراس کے تاثرات یکساں تھے۔ وہ تمام بچے شاید کسی نشہ آور دوا کے زیرِ اثر غنودگی میں تھے۔ ان لوگوں کے قدموں کی آواز پر بھی کسی بچے نے سر نہیں اٹھایا لیکن ان بہت سے بچوں میں سے اسکول یونیفارم میں موجود ایک بچے کو دیکھ کر روشی چونک پڑی اور جھپٹ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ سمیر ہی تھا جو ہوش و خرد سے بیگانہ تہ خانے کے سیلن زدہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔

''تم لوگ انسان نہیں' درندے ہو۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تو بیچ چوراہے پر سو بار پھانسی دینی چاہیے۔'' یہ